

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM



ماہنامہ
پاک سوسائٹی

نومبر 2016

پاک سوسائٹی
مجلد 10 جلد 1

سورہ مطہ
ڈاٹ کام

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM



انجم انصار، رحمت سراج کے خوب صورت ناول
ماہیناز قلم کار گہمت سہما سے دلکش کہنگو
کہنہ مشق قلم کاروں کی لاجواب کہانیاں

www.paksociety.com



ماڈل: راقیہ خان
میک اپ: روز بیوتی پارلر
فوٹو گرافی: مونسسی رضا

پہلی
جلد

نگران ان اسٹریٹجی

مدیرہ اعلیٰ: سراج رسول

مدیرہ: سراج رسول

معاون: آمنہ جمالی



روکن الہ پاکستان پبلسٹی

شعبہ اشتہارات

نیو اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانالہ حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور سید فراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچہ (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچہ (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زر سالانہ (انڈرون بلک) 800 روپے جلد 44 شمارہ 08 نومبر 2016

افسانے

- 47 ثمینہ عظمت علی فیصلہ
 89 قانتہ رابعہ عزت دارا
 97 ہمایبگ بیانیہ کیجیو
 103 مریم جہانگیر نالائی
 131 تسنیم منیر علوی آج کل جگہ سبزی
 139 شیریں حیدر شیریں مارا
 151 ہاجرہ ریحان شیریں
 191 ماہ وش طالب دل ناوان
 211 کائنات غزل مان گل ناوان

خصوصی مضامین

- 256 شائستہ زریں پیروی
 261 نزہت اصغر وہاں کے زمین
 270 قارئین باتیں بہار و خزاں
 272 عظمی آفاق سعید شہزادوں کی مبارک
 276 رقیہ ابدالی بلواؤں کی لڑائی

اداریہ

- 15 مدیرہ

سلسلے وار ناول

- 18 انجم انصار

- 108 رفعت سراج

مثنوی ناول

- 156 سیما رضا ردا

ناولٹ

- 58 سحر ساجد

- 175 ام طیفور

- 194 فاطمہ چوہدری

مکمل ناول

- 216 نسرین جمیل سیال

پبلشر و پروفرائٹر: نیشنل رسول، مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور، C-63 فیڈر ایکس ٹینشن، ایف بی، من کورنگی روڈ کراچی 75500
 پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستند معارف

| | | | | | |
|-----|--------------|----------------|-----|-----------------|--------------------|
| 295 | پاکیزہ بہنیں | عزیزہ بیگم | 16 | ادارہ | دین کی باتیں |
| 297 | مہ حبیب | حسن نگار کھاری | 278 | مدیرہ | بہنوں کی محفل |
| 298 | پاکیزہ بہنیں | بڑا پاکیزہ | 286 | عظمیٰ آفاق سعید | پاکیزہ ڈائری |
| 300 | ادارہ | روحانی مشورے | 290 | انجم انصار | جلت رنگ |
| 302 | | ہومیو پیتھک | 292 | صغریٰ زیدی | میں اکثر نگینا ہوں |

Office: 63-C, Phase II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road, Karachi.
 Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74200
 Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com



موبائل فون کی قیمت میں پلاٹ

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد
کے سنگم پر گھربنانے کا سنہری موقع

محل وقوع:

نیا انٹرنیشنل اسلام آباد ٹیرپورٹ، اسلام آباد موٹروے (M-2) کے نزدیک بال تقاطع F-18، F-17 اور چائنہ پاک ایکسپریس کوریڈور (CPEG) کے نزدیک، سوارز میں بلوچ آبادی واقع ہے۔

سہولیات:

اس علاقہ میں پہلے ہی تقریباً 10 ہزار گھر تعمیر ہو چکے ہیں اور تمام بنیادی ضروریات زندگی مثلاً بجلی، پانی، ٹیلیفون، بینک، ڈاکخانہ، سرکاری دپارٹمنٹ، سکولز، کالجز، ہسپتال، موٹروے، انٹرنیٹ اور پبلک ٹرانسپورٹ کی سہولیات پہلے سے موجود ہیں۔

طریقہ کار الاٹمنٹ:

سادہ کاغذ پر درخواستیں ہمراہ پانچ ہزار (5000/-) روپے کا بینک ڈرائلٹ بے آرڈر بنام رالینڈ ایسوسی ایٹس (Raw Land Associates) یا پھر پانچ ہزار روپے آن لائن اکاؤنٹ میں جمع کروائیں اور رسید و درخواست دفتر کے پتہ پر بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک 1 کورئیر ارسال کریں۔ الاٹمنٹ پہلے آئیں پہلے پائیں کی بنیاد پر ہوگی یا پھر درخواستوں کی تعداد زیادہ ہونے پر بذریعہ قرعہ اندازی کی جائیگی۔ نوٹ: الاٹمنٹ نہ ہونے کی صورت میں درخواست دہندہ کو پوری رقم واپس کر دی جائیگی۔

رابطہ:

| | | |
|--------------------------------------|----------------------|-----------------------------------|
| رائلٹی آف اکاؤنٹ: رالینڈ ایسوسی ایٹس | فون آفس: 051-5950019 | رالینڈ ایسوسی ایٹس ^(P) |
| اکاؤنٹ نمبر: 0175861001 | فیکس: 051-5950039 | آفس نمبر 17، 2nd فلور، |
| بینک: دہلی اسلامک بینک پاکستان لمیٹڈ | موبائل: 0332-5557797 | موتی پلازہ، مری روڈ، راولپنڈی |
| بینک روڈ، صدر، راولپنڈی | | |



یہ حقیقت ہے کہ وقت کا پتلا کبھی رکا نہیں کرتا..... وقت کا پتلا چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

دنیا میں بے شمار دل کو تڑپا دینے والے واقعات ہوتے رہتے ہیں..... مگر وہ وقت کی گریب میں دب جایا کرتے ہیں..... مگر واقعہ کربلا کو انسانیت کی تاریخ کبھی بھلانا نہ پائے گی..... اور اس کی خاص وجوہات ہیں۔

واقعہ کربلا جہاں ایک طرف حصول رضائے الہی کی انتہا ہے وہیں دوسری طرف مصائب کی بھی انتہا ہے۔

کربلا کی جنگ ایک سچائی کی جنگ تھی، حق و باطل اور سچ و جھوٹ کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ..... جس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا اور یہ درس بھی سب کے سامنے آیا..... اسلام سے سچی و فادہ آری و قربانی کا بے مثل عمل وہی کر سکتا ہے جو واقعتاً اپنی پوری زندگی کے ہر کردار کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا مکمل اطاعت گزار ہو۔

یہی وجہ تھی کہ امام حسینؑ کا پورا کروار ان کی بے مثل تربیت کا شاہد ہے..... جس میں کسی بھی لحاظ سے کوئی کمی نہیں ہے۔

اگر یہ لوٹ مار اور جھوٹ و فریب کی جنگ ہوتی تو حسینیت کے تمام کردار یہ دنیا والے فراموش کر دیتے..... مگر سچائی میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ذہن سے محو نہیں ہو پاتی..... یہی وجہ ہے کہ صدیاں بیت گئیں اور صدیاں بیت جائیں گی مگر واقعہ کربلا ہمیشہ زندہ رہے گا۔

میدان کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا انداز رزم جہاں عظیم سیاسی حکمت عملی کے ایک نئے باب کا آغاز کرتا ہے..... وہیں انسانیت کو دین کی بقا اور اسلام کی سر بلندی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا بھی درس عطا کرتا ہے۔ (سبحان اللہ)

مدیر
انجم انصار

اور ان کے بعض باپ، دادا کو اور ان کی (بعض) اولاد کو اور ان کے بعض بھائیوں کو (بھی ہم نے ہدایت کی) اور انہیں برگزیدہ کیا اور انہیں راہ راست پر پہنچا دیا (۸۷) (دیکھو) یہ اللہ کی ہدایت ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے اس سے ہدایت کرتا ہے اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو بے شک جو (نیک کام یہ) کرتے تھے ضائع ہو جاتے (۸۸) یہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عنایت کی تھی پس اگر یہ لوگ اسے نہ مانیں تو (جان لیں کہ) بے شک ہم نے اس پر ایسے لوگوں کو مقرر کر دیا ہے جو اس کا (بھئی) انکار کرنے والے نہیں (۸۹) (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت کی تو تم ان کے طریقے کی پیروی کرو (اور ان کافروں سے) کہہ دو کہ میں اس (تخلیغ احکام) پر تم سے کچھ اجرت نہیں مانگتا یہ تو صرف لوگوں کی نصیحت ہے (۹۰) اور انہوں نے اللہ کی اس کے مرتبے کے موافق قدر نہ کی اس وجہ سے کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل (ہی) نہیں کیا کہو کہ کس نے نازل کی ہے وہ کتاب جسے موبئی لائے تھے جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی جسے تم اوراق بنا کر لکھا کرتے ہو اس (کے کچھ حصہ) کو تو لوگوں پر ظاہر کرتے ہو اور (اس کے) بہت (بڑے حصے کو) چھپاتے اور ہوتے ہیں وہ چیزیں تعلیم کی گئیں جنہیں نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ، دادا کہہ دو کہ اللہ نے نازل فرمائی ہے پھر انہیں چھوڑ دو اپنی بحث میں کھیلا کریں (۹۱) اور یہ (قرآن بھی) کتاب (الہی ہے) ہم نے اسے بابرکت نازل کیا ہے اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے اور اس لیے (نازل کیا) کہ تم مکہ (والوں) کو اور ان لوگوں کو جو اس کے پاس رہتے ہیں ڈراؤ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر (منور) ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں (۹۲) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ افتراء کرے یا یہ کہہ دے کہ مجھ پر وحی پہنچی گئی ہے حالانکہ اس پر کچھ وحی نہ کی گئی ہو اور جو شخص نے کہا میں (بھی) عنقریب اس کی مثل جو اللہ نے نازل کیا ہے نازل کروں گا (وہ بھی اعلیٰ درجے کا ظالم ہے) اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر تم (ان) ظالموں کو اس وقت دیکھو جب (وہ) موت کی تختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ (ان کی طرف) بڑھائے ہوں گے کہ اپنی جانیں نکالو آج تمہیں ذلت کا عذاب اس کے بدلے میں دیا جائے گا جو تم اللہ پر ناحق (افتراء کی باتیں) کہا کرتے تھے اور اس کے احکام سے سرکشی کیا کرتے تھے۔ (۹۳)

سورہ انعام آیت نمبر ۸۷ تا ۹۳

WWW.PAKSOCIETY.COM

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

الضَّلُوكَةُ وَالسَّلَامَةُ عَلَیْكَ يَا حَاشِرُ

افضل الانبياء ختمی مرتبت سید المرسلین، سرکارِ دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارک میں سے ایک نام حاشر بھی ہے جس کا مفہوم اٹھنے والے، اکٹھا کرنے والے کے ہیں۔

القرآن

ا: قل انما الاولین والآخرین (۴۹) لجموعون الی میقات یوم معلوم۔ الواقعہ۔

ترجمہ: تم فرمادو کہ سب اگلے اور پچھلے ایک جانے ہوئے (مقررہ) دن کی معیاد پر ضرور اکٹھے کیے جائیں گے۔

الحديث "حاشر" (اکٹھا کرنے والے)

ابن حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لیے اپنے نام بیان فرماتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں محمد ہوں، احمد ہوں، مفتی ہوں اور حاشر ہوں۔ (یعنی تمام لوگ میرے جہنم سے تلے جمع ہوں گے) (مسلم)

اٹھنے والے

ابن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں ان لوگوں میں سے پہلا شخص ہوں گا جو زمین سے برآمد ہوں گے (یعنی قیامت کے دن جب تمام خلقت اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر میدانِ حشر میں آئے گی تو سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی اور اپنی قبر سے اٹھنے والا پہلا شخص میں ہوں گا۔"

غیر ملکی مفکر تھامس کارلائل کے مطابق غیر متحد لوگوں کے ساتھ اچانک ایک عظیم معجزہ رونما ہوا کہ ایک آدمی اٹھا اور اس نے اپنی شخصیت اور وحی الہی کے بالواسطہ دعوے سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا یعنی تمام جنگی گروہوں کو اکٹھا کر دیا۔

ایک اور مفکر مغرب ای بلائیڈن کہتا ہے۔ اسلام نے انسانیت کو متحد کیا..... اسلام صرف عربوں تک محدود نہیں تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشن اور پیغام پوری انسانیت کے لیے تھا۔

الفضائل

ہر نماز کے بعد 100 مرتبہ اس اسم پاک حاشر کا ورد

کرنے سے کند ذہنی دور ہو جائے گی۔

مضبوط ہوگا اور اس پر ظلم کے اور وارے

کھل جائیں گے۔ نیز سید علم کے

نور سے منور ہوگا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار الہی ﷺ سے اقتباس

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک

سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

Downloaded From Paksociety.com

گرم شہ محبت

قطعہ 10

انجم انصار

انسان نہ کچھ کر سیکھتا ہے، نہ رو کر سیکھتا ہے، جب بھی
سیکھتا ہے، یا کسی کا ہو کر سیکھتا ہے، یا پھر کسی کو کھو کر
سیکھتا ہے... چونکہ لوگ دل کے امیر کم، کم ہوتے

ہیں، اس لیے زندگی کی کتاب میں

اتنی غلطیاں نہ کرو کہ پنسل

سے پہلے ریڑ ختم ہو جانے

اور توبہ سے پہلے

زندگی...

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا
نہ بہلا وا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے
ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

جست کے انوکھے روپ سنواری ایک حسین



ٹوٹ سا گیا ہے میرے اعتبار کا وجود

اب کوئی مخلص بھی ہو تو یقین نہیں آتا

بارش تھی کہ طوفان..... پورے شہر میں جل تھل سا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ آج بارش اس کی پہلی بن گئی ہو۔ نہ وہ رکنے کا نام لے رہی تھی اور نہ ہی شہلا کے آنسو..... شاید اسی لیے وہ دونوں ایک ساتھ ہی آنسو بہا رہی تھیں۔ آج کے اس پھرے ہوئے ساون نے اس کے زخم بھی ہرے کر دیے تھے۔ سو..... حارث کی ہر بے اعتنائی اسے یاد آ رہی تھی۔

”سینے..... میرا دل چاہ رہا ہے اس کیفے میں گھنٹوں بیٹھے رہیں۔“ ایک شام جب وہ حارث کے ساتھ آکس کریم پارکر میں آئی تھی تو اس نے سرشاری سے کہا تھا۔

”اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ فوراً سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں۔“

”کیوں.....؟ آپ کو یہ شام حسین نہیں لگ رہی ہے کیا.....؟“ اس نے خاصے لاڈ بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

”شہلا..... ہر ایک کی پسندنا پسند میں زمین آسمان کا فرق بھی تو ہو سکتا ہے نا.....“

”ہاں..... ایسا تو ہوتا ہے۔“ وہ ساوگی سے بولی تھی۔

”تو کیا اب میں مزید وضاحت بھی کروں.....؟“ لہجہ مستحضرانہ تھا۔

”بالکل..... کہ موج سب کو موج جیسی فریش ہی لگا کرتی ہے اور رات کی تاریکی میں..... سب کو ہی جھلمل کرتے

تارے مسور کیا کرتے ہیں۔“ وہ بڑے شاعرانہ انداز میں اسے سمجھانے کی سعی کر رہی تھی۔

”بے وقوف لڑکی..... جب میں آکس کریم ہی نہیں کھاتا تو پھر.....“

”اوہ تو یہ بات ہے..... مگر آپ کو بتانا تو چاہیے تھا نا.....“

”چلو اب بتا دیا، اب میں یہاں بیٹھ کر کتنا خوش ہو سکتا ہوں..... خود ہی جان لو۔“ وہ اپنی گھڑی پر نظر پڑ

جائے بول رہا تھا۔

”ہاں، بے وقوف تو میں تھی، جو اس وقت بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ میری موجودگی میں اسے وحشت سی ہوا کرتی

تھی۔“ اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا۔

اور پھر ایک شام وہ اسے بڑی خوشامدوں سے برگر کھانے ہوٹل لے گئی تھی۔

”یہاں کے برگر کا مزہ علیحدہ ہی ہوتا ہے۔“

”اچھا..... کیا واقعی.....؟“ اس نے اسے حیکمے چوتونوں سے دیکھا۔

”اور آج تو آپ کو سب سے ہی مختلف لگے گا۔“ وہ اکڑ کر بولی تھی۔

”اچھا، مجھے تو ہر جگہ کا ایک سا ہی لگتا ہے اور آج بھی.....“ وہ اس کی ہر اسی میں بھی خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔

”حارث، آج میرے ساتھ آپ کو یہاں چائے پینے کا لطف دو بالا محسوس نہیں ہو رہا؟“

”بالکل نہیں.....“ وہ نہایت سنجیدگی سے بولا تھا۔

”جھوٹ بول رہے ہیں نا؟“ وہ اس کی بات کو اس کی شرارت کی کوئی ادا سمجھی تھی۔

”لا حول ولا قوۃ! میں بھلا کیوں جھوٹ بولوں گا۔“

”رنگی حارث.....“ وہ روہانسی سی ہو کر اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں بھئی، میں تو سوچ رہا تھا کہ جلدی سے تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کروں اور پھر میں اپنے گھر جاؤں۔“

”کیوں گھر جاؤں؟“ وہ اسے روکنا چاہ رہی تھی۔

”بھئی بات بتاؤں شہلا؟“ اب وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں بتا کے.....“ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کہہ دے گا کہ میں یہ سب مذاق میں کہہ رہا تھا۔
 ”ایسی جگہوں پر جا کر میں پور ہوا کرتا ہوں۔“ کھنکھار کر کہا گیا کہ وہ چونکی سی ہو گئی۔
 ”حارث، کیا میں آپ کو اچھی نہیں لگتی ہوں؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔ ”میری سنگت میں کیا آپ بور ہوتے ہیں۔“
 ”اب تمہارے ساتھ آنے کا کیا مطلب ہے؟“ وہ الٹا اسی سے پوچھ رہا تھا۔ لہجے میں برہمی غلطی ہوئی تھی۔
 ”اب یہ مطلب ہی تو میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”اچھی ہوتی.....“ کچھ سوچ کر وہ بولا۔
 ”صرف اچھی.....؟“ لہجے میں احتجاج تھا۔
 ”نہیں..... بہت اچھی..... بہت اچھی۔“ وہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ ”اب تو خوش ہو یا نہیں؟“ وہ اس سے دیکھے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

وہ شرما رہی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ بھی چھپا لیا تھا۔
 ”ٹھیک ہے، اب گھر چلیں۔“

اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنے اوپر جبر کر کے اس سے مل رہا تھا۔ شہلا نے سسکی لی۔
 اکثر جب رات گئے وہ اسے فون کرتی تو وہ ہڑبڑا کر کہتا۔
 ”کیا بات ہے بھئی؟ چہن نہیں ہے تمہیں کیا؟ اتنی گہری نیند سو رہا تھا۔ لے کر خواہ مخواہ جگا دیا۔“
 ”میں نے تو سنا ہے کہ عاشقوں کو نیند ہی نہیں آیا کرتی ہے۔“ وہ ہنسی کی جھنکار میں پوچھا کرتی۔
 ”مگر میں رات کو ہمیشہ سویا کرتا ہوں۔“

”کیوں سوتے ہیں؟“ اس کا شرارتی لہجہ میڑھیاں چڑھتا۔

”شاید میں اس کی نیگاری میں نہیں آتا..... جس میں تم نے مجھے رکھا ہوا ہے۔“
 کتنا واضح انکار تھا اس کا..... مگر وہ سمجھ ہی نہیں پاتی تھی۔ اور مسلسل اس کو باتیں کرنے پر آمادہ کیا کرتی۔
 ”سنئے..... آپ مجھے یہ تو یادیں کہہ دوں میں کتنی مرتبہ میری یاد آئی تھی؟ دس مرتبہ، بیس مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ؟“
 ”پتا نہیں بھئی..... پلیز فون بند کرو۔“ اور وہ اس سے مزید کوئی بات کرنے سے پہلے ہی اپنا فون آف کر دیتا۔

ایک مرتبہ..... جب حارث سے پورے ہفتے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تو وہ بے چین ہو گئی تھی۔ اور جب حارث آفس میں آیا تو وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچی تھی اور ریحان مراد دیگر لوگوں کو دیکھے بغیر..... اس کے سامنے شکایات کا دفتر کھول دیا تھا۔

تب اس نے ایسی بے اعتنائی سے اسے ٹریٹ کیا تھا کہ وہ ہکا بٹکا سی رہ گئی تھی۔ ”شہلا صاحبہ..... آپ ریحان کے ادارے میں جاب کرتی ہیں اور میں آپ کا زرخیر ملازم نہیں ہوں..... جو آپ کے ایک فون پر کسی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔“

”مگر..... میں تو..... آپ کو یاد کر رہی تھی۔“ اس نے خاصا کھسیا کر کہا تھا۔

”جو شخص اپنے آپ کو بھولا بیٹھا ہو..... وہ کسی کو کیسے یاد کر سکتا ہے۔“ اس کے لہجے میں رکھائی تھی اور ریحان سر کو مسکراتا ہوا دیکھ کر وہ خاصی جھل بھی ہوئی تھی۔

اور جب بعد میں اس کے اس آف نوڈ پر احتجاج کیا تھا تو وہ کس منطقی سے اسے بے وقوف بنا گیا تھا کہ ایسا

”نہیں حارث..... تم نے سب کے سامنے میری بیٹی (بے عزتی) کی تھی۔“

”سنو شہلا! میں صرف اس بات کا ذمہ دار ہوں جو میں نے کہی..... نہ کہ ان باتوں کا جو آپ نے سمجھیں۔“

اور تب اس نے واقعی اپنے آپ کو کم عقل سمجھ لیا تھا۔

اور پھر جب اس نے اس کی سالگرہ پر ڈھیر سارے گفٹس بذر بیڈ ڈاک اس کے گھر بھیجے تو بجائے خوش ہونے

کے وہ اس پر چڑھا آیا تھا۔

”بڑی لاث صاحب کی بیٹی ہونا تم..... تمہارے گھر میں پیسے درخت پر لگے ہوئے ہوتے ہیں کیا؟ اتنے

پیسے غارت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”آپ کی سالگرہ تھی..... آپ کو میری جانب سے گفٹ ملے ہوں گے تو آپ کو اچھا تو لگا ہو گا ناں.....“

”ہاں بچہ ہوں ناں میں نے کارڈز اور گفٹس دیکھ کر خوب تالیاں بنائیں..... خوب اچھا..... اور مارے

خوشی کے رونے بیٹھ گیا۔ تم جیسی بے وقوف لڑکیاں خوشی میں بھی رویا کرتی ہیں ناں۔“ وہ مسخر بھرے لہجے

میں بولنے چلا جا رہا تھا۔ ”سنو..... شہلا..... یہ سب لڑکیاں ضرور کیا کرتی ہوں گی..... مگر مجھ جیسے لڑکے ایسی

باتوں سے کبھی خوش نہیں ہوا کرتے۔“

”تو آپ کو..... واقعی کوئی خوشی نہیں ہوتی؟“ اس کا دل بھر آیا۔ اور آنسو پلکوں کی منڈیوں تک آگئے۔ تب

چونک کر اس نے اسے دیکھا اور زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر بولا۔

”مجھے اس بات کا زیادہ رنج ہوا کہ تمہارے ڈھیر سارے پیسے خرچ ہو گئے..... چاہ کرنے کا مطلب یہ

تو نہیں کہ اپنے پیسے بیکار ہیں اڑا دو..... یہ پیسے تم اپنے اوپر خرچ کرتیں تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔“ اس نے اپنے لہجے

کو نرم کیا۔

”اور اب آئندہ تم ایسا بالکل نہیں کرو گی..... بلکہ کسی پر بھی ایسے خرچ نہیں کرو گی۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جب میری سالگرہ آئے گی..... تو آپ بھی مجھے کوئی تحفہ نہیں دیں گے..... کہ آپ

کے نزدیک پیسے جمع کیے جاتے ہیں، خرچ نہیں کیے جاتے۔“

”اچھا.....؟“ اس نے ایک لمحے سوچا اور پھر کہا۔

”میں تمہیں تحفہ ضرور دوں گا..... اور تمہاری پسند کے حساب سے۔“

”آپ کو میری پسندنا پسند کا کیا پتا؟“ اس نے قابلہ بن کر پوچھا۔

”کسی وجہ سے ہی تو کہہ رہا ہوں..... تمہاری پسند کے حساب سے اور وہ ایسے کہ تمہیں پیسے دے دوں گا تم خود

ہی خرید لینا..... سہیل.....“

”جی نہیں..... یہ تحفے دینے کا سب سے داہیات طریقہ ہے۔“ شہلا کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔ ”تحفہ نہ ہوا مہینے کا

سودا ہو گیا..... کہ اتنے پیسے میں لے لو۔“

”پھر خوب صورت طریقہ کیا ہے، وہ بھی مجھے بتا دو۔“

”آپ مجھے اپنے ساتھ مال لے کر جائیں گے اور مجھے گفٹس دلوائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ہائی بھر لی تھی۔ ”اب تو خوش ہونا چلو نہیں بھی دو۔“

تب شہلا ایسے خوش ہو گئی تھی کہ چند منٹ پہلے کی اس کی کڑوی کسلی باتیں تک بھول چکی تھی..... اور اس کی ہنسی

بھی نہیں رک رہی تھی۔

بارش کی چھٹا چھٹا میں بھی تیزی آئی۔ اور بارش کی چھٹا چھٹا میں دھڑ دھڑایا مگر بارش کے شور میں ہلکی سی دستک اسے سنائی دی اور وہ تپتی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”چلے جاؤ حارث.....“ اس نے جیسے سسکی بھری۔ ”اب تم سے کوئی رابطہ ہی نہیں رکھنا..... بالکل بھی نہیں۔ بہت بے وقوف بن چکی ہوں میں..... اور اب میں مزید بے وقوف نہیں ہوں گی۔“

اور حارث کو ایسا لگ رہا تھا..... جیسے اس بارش نے اس کے دل پر چڑھا کوئی غلاف ہی اتار پھینکا ہو۔ شہلا کے آنسو..... اس کے دل کو ایک عجیب سی ایذا سی پہنچا رہے تھے۔

وہ لڑکی..... جس سے وہ ہمیشہ عاجز سا رہا کرتا تھا..... جس سے ملنے اور بات کرنے کو بھی اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ آج اسے کیسی اپنی، اپنی سی لگ رہی تھی..... اس کا رونا..... اسے دکھی کر رہا تھا۔ اور اس وقت تمام بھولی ہوئی باتیں..... بھی اسے یاد آ رہی تھیں۔

جب پہلی مرتبہ..... اپنے بینک میں اس نے بڑی حیرت سے شہلا کا دیا گیا محبت نامہ پڑھا..... اور ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی ہوئی شرمائی ہوئی لڑکی کو دیکھا تو اسے وہ لڑکی بری نہیں لگی تھی..... مگر اس کے جھونڈے اظہار کا یہ طریقہ اسے واقعی پسند نہیں آیا تھا۔

اور جب اس کے سامنے اس نے اس کا خط پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈالا تھا..... تو جھک کر جب نظریں اٹھائی تھیں..... تو وہ واقعی ساکت سا رہ گیا تھا۔

شہلا کے آنسو..... تو اسے اس کے رخساروں پر بہ رہے تھے۔ شدت کرب سے وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی..... اور آواز اندر گھٹ گئی تھی۔ اس ایک لمحے کو اس کا دل چاہتا تھا..... اپنی انگلیوں کی پوروں سے وہ ان موتیوں کو سمیٹ لے..... (مگر صرف ایک لمحے کے لیے) وہ اس لیے کہ حارث دل کی باتوں پر کان دھرنے والا لڑکا تھا ہی نہیں اور جب وہ بینک کے کسی کام سے باہر نکلا..... تو اسے باہر کھڑا روتے دیکھ کر وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس نے اسے پکارا بھی تھا..... شاید وہ اسے سمجھانا بھی چاہتا تھا۔ مگر شہلا برہمی سے دیکھتے ہوئے تیزی سے چلی گئی تھی۔

اور اس کی وہ آنسو بھری آنکھیں..... کئی روز تک اسے بے چین کرتی رہی تھیں۔ اور وہ جان ہی نہیں پایا تھا..... اپنی اضطرابی طبیعت کی وجہ..... وہ شہلا ہی ہے۔

جوں، جوں وہ بارش میں بھیگ رہا تھا اس کی محبت کا تناور پودا سرعت سے سر اٹھا رہا تھا اور اب اسے شہلا کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

”ساجد ایک بد قماش شخص ہے..... وہ اپنی جھوٹی کہانیوں کے جال میں شہلا کو بہ آسانی پھانس سکتا ہے۔ اور وہ سیدھی سی لڑکی اس کی باتوں پر یقین بھی کر بیٹھی ہے کہ میری بہن نے ساجد کے ساتھ محبت کا ناکہ رچا یا تھا۔ اس پائل کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ میری تو کوئی بہن ہی نہیں ہے..... میرے تو چچا، تایا اور خالہ کے ہاں بھی کوئی لڑکیاں نہیں ہیں..... جنہیں وہ میری بہن سمجھا ہو۔“ اب وہ دروازہ ہیٹ رہا تھا۔ ”شہلا، ساجد ایک جھوٹا شخص ہے۔“ وہ ساتھ، ساتھ کہے جا رہا تھا۔ تم اس کی باتوں میں ہرگز نہیں آنا۔ تم اب اس کے آفس گئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا..... سنا تم نے تم بالکل نہیں جاؤ گی اس کے آفس.....“

مگر شہلا کوئی جواب ہی نہیں دے رہی تھی اور وہ ہی دروازہ کھول رہی تھی۔ تھک ہار کر وہ باہر بیچ پر ہی بیٹھ گیا۔ بارش اس وقت بھی بہت تیز تھی۔

اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں اپنا چہرہ چھپالیا اور سارے آج ہی نہیں چلا..... کہ بارش کب رکنی یا رات

☆☆☆

جتا نہیں کیوں بارش میں اسے وحشت ہی ہو کرتی تھی۔ اسے یوں لگا کرتا تھا جیسے یہ بارش سب کچھ بہا کر لے جائے گی اور وہ بے مایہ سا ہو کر رہ جائے گا..... بارش کی وجہ سے وہ آج بھی..... منع کر رہا تھا کہ کینسل کر دیں۔ مگر ماموں، ممانی نے بعد اصرار ڈنر پر بلایا ہوا تھا..... اور عامر کو نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا تھا..... کہ فرزانہ کو بارش کی تقاریب حد سے زیادہ پسند تھیں۔

ایک تو کھانا ہی خاصی تاخیر سے کھایا گیا پھر بارش ہو جانے کے سبب..... فرزانہ نے سب کو اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی کشمیری چائے کا ٹریلر کچھ اس انداز میں دکھایا کہ اسی کے ساتھ بڑی خالہ بھی اسی کی حای بن گئیں۔ اور وہ اتنی دیر میں بنا کر لائی جیسے اصل میں کشمیر سے لائی ہو..... عامر بار، بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ صبح آفس بھی جانا تھا، موسم کے تیور بھی خاصے خراب تھے اور اس کی ماں تو اپنے بھائی کے گھر جا کر بھول ہی جاتی تھیں کہ انہیں واپس اپنے گھر بھی جانا ہے۔

ابھی چائے کا دور ہی چل رہا تھا..... کہ ممانی نے اپنی شاپنگ دکھانی شروع کر دی..... جو وہ فرزانہ کے جینز کے لیے جمع کر رہی تھیں۔

”یہ میں نکاح کے بعد عامر کو پہناؤں گی۔“ ایک سونے کی ہیرے جڑی انگلی دکھاتے ہوئے وہ بولیں۔ اسی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھیں۔ اور عامر کو یہ سب بہت مہیوب سا لگ رہا تھا۔

اور پھر اچانک ہی وہ ہوا..... جسے دیکھ کر عامر کو سکتہ سا ہو گیا۔
فرزانہ نے وہ انگلی اپنے ہاتھ میں لی..... عامر کو دکھائی اور پھر سرعت سے وہ انگلی عامر کو پہنا دی۔
”ارے، ارے..... یہ کیا کر رہی ہو۔ اور یہ قبل از وقت کیوں پہنوں میں.....“ عامر نے انگلی اتارنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کے لیے ہی آئی ہے نا..... تو آپ بہن لیجیے..... مگن کے لیے تو پھوپھو نے منع کر دیا ہے۔ اچھا ہے کم از کم آپ یہ رنگ تو پہن لیں۔“ وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔
”مگر سونا پہننا تو مردوں کے لیے حرام ہے۔“ عامر جڑ سا ہو رہا تھا۔
”ٹھیک ہے..... شادی کے بعد آپ مجھے دے دیجیے گا۔ میں بہن لیا کروں گی۔“
”مگر ممانی تو یہ نکاح کے موقع پر پہنانا چاہتی تھیں نا۔“ عامر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا بہانہ کرے..... جس سے اس انگلی سے چھٹکارا پالے۔

”ارے جیٹا..... ہماری ایک ہی تو بیٹی ہے..... دل میں ارمان ہی ارمان ہیں..... کوئی ایک انگلی ہی تھوڑی پہناتی تھی۔ اللہ رکھے، گھڑی، چین، کف لکس سب ہی نہایت اعلیٰ اور قیمتی لے کر آئی ہوں۔“
”آپ سمجھیں کہ بس یہ آپ کی مگن کی انگلی ہے۔“ فرزانہ نے قہقہہ لگایا۔
”چلو تمہاری مگن کی انگلی اوجھار رہی۔“ خالہ نے قہقہہ لگایا۔

”میں اوجھار پر یقین نہیں رکھتی۔“ فرزانہ نے ریسیہ بیگم کے ہاتھوں میں پڑے کڑوں میں سے ایک کڑا اتار کر خود ہی پہن لیا۔

ریسیہ بیگم کو اس کی یہ حرکت پہلے تو بری لگی اور بعد میں سب کو مسکراتا دیکھ کر خود بھی زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولیں۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”تو بھیجی..... تم نے تو اپنی منہ دکھائی کا تحفہ پہلے ہی سے لے لیا۔“ اور فرزانہ ان کی بات پر ہستی ہی چلی گئی۔
 عامر کو پتا نہیں کیوں..... یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا ظاہر داری سے اسے شروع سے ہی چڑھی۔ ممانی
 کی مانی حالت ان سے زیادہ اچھی تھی..... اس لیے وہ اکثر اوقات اس کی نمائش بھی کر دیا کرتی تھیں۔ اور رشتہ طے
 ہونے کے بعد ان کی یہ اچھی حرکتیں مزید بڑھ گئی تھیں۔ یکبارگی اس کا دل جا ہا اپنی انگلی ہی وہ بیش قیمت انگلی اتار
 کر یہیں پٹخ کر چلا جائے..... مگر وہ انگلی تو اس کی انگلی میں آ کر یوں پھنس گئی تھی جیسے وہ اب کبھی لکھے گی ہی نہیں۔
 ”عامر آپ کی انگلی سے زیادہ اچھا میرا کڑا ہے۔“ اسے انگلی میں انگلی گھماتا دیکھ کر فرزانہ بولی۔

”ہاں، جب دل چاہے، اتار تو سکتی ہو۔“ وہ بولا۔
 ”جی نہیں، میں کیوں اتارنے لگی..... یہ تو میری منگنی کا گھیرا ہے..... اور اس گھیرے نے مجھے یہ بتا دیا ہے کہ
 اب میری دنیا اسی کے اندر ہے۔“ بادل کہیں زور سے گرجا..... تو عامر نے کہا۔
 ”ای اگر یہ بارش ساری رات نہیں رکی تو کیا آپ گھر نہیں جائیں گی؟“
 ”ہاں، ہماری پھوپھو تو بالکل بھی نہیں جائیں گی آپ نے رکنا ہے تو آپ بھی رک سکتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے تم اپنی دونوں پھوپھو کو روکو میں تو چلا..... صبح مجھے آفس بھی جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ گاڑی کی چابی
 اپنی انگلی میں گھماتا اٹھ کھڑا ہوا۔



کانوں میں اذان کی آواز آئی تو شہلا ہڑا کر اٹھی..... روتے، روتے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اسے پتا ہی
 نہیں چلا تھا۔
 وہ گھبرا کر اٹھی، وال کلاک پر نظر پڑی صبح کے پانچ بج رہے تھے..... اسے حادث کا خیال آیا اور کتنی دیر تک
 اس کی دستک کی صداؤں نے اس کے دل کو دھکی بھی کیا تھا..... مگر وہ اس سے بہت زیادہ ناراض تھی۔
 ”گھر جا کر سوچا تو ضرور ہوگا کہ کوئی ان کو بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے۔“ اس نے جیسے اپنے
 آپ سے کہا تھا۔
 کھڑکی کا پردہ برابر کرنے کے لیے وہ آگے بڑھی تو یہ دیکھ کر حیران اور پریشان رہ گئی کہ حادث کھلے آسمان
 تلے باہر بیچ پر بے سدھ سا پڑا تھا۔
 ”کیا... یہ ساری رات بارش میں بھیگتے رہے..... اور اپنے گھر نہیں گئے۔“ اس کو یوں چپ چاپ سا پڑا دیکھ
 کر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ مرنے نہیں گیا ہے۔
 ”اللہ نہ کرے اسے کچھ ہو.....“ وہ لرز ہی تو گئی۔
 وہ تیزی سے باہر نکلی تو وہ مدہوش سا پڑا تھا اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ بری طرح جل رہی تھی اور زندگی کی
 حرارت اس میں موجود تھی۔

”حادث، حادث.....“ اس نے بے قرار ہو کر اسے پکارا..... اسے ہلایا جلا یا۔ مگر اس نے تو آنکھیں کھول کر
 بھی اسے نہیں دیکھا۔
 ”پلیز حادث آنکھیں کھول لیں نا.....“ وہ روتے ہوئے اس پر جھکی..... اس کے آنسو اس کے چہرے پر
 گر رہے تھے تھوڑی دیر بعد حادث نے اپنی سرخ آنکھیں بہ مشکل کھول کر اس سے پوچھا۔
 ”کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے..... پلیز شہلا صرف اتنا بتا دو۔“

”ہاں..... معاف کر دیا ہے مگر پہلے اندر چلیں آپ کو بہت تیز بخار ہے۔“ اس کو سہارا دے کر وہ یہ مشکل اپنے

قلیٹ تک لائی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کی دیگر کون حالت دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔
 ”امی تیز بخار میں ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہیں۔“ اس نے بھی برف کے پانی کی پٹیاں رکھنی شروع کر دیں۔ اس کا بخار ہلکا ہوا..... تو حارث نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی گرم چائے اور ابلے ہوئے اٹھ لے آئی تھی۔ ہلکا سا ناشتا کرا کے اسے درد اور بخار کی گولی دی..... جسے کھا کر اس کے بخار میں مزید کمی آئی۔

”تم نے تو یہ بات مجھے بتائی ہی نہیں کہ کسی اسپتال میں تم مسیحا کے طور پر بھی کام کیا کرتی تھیں۔ واقعی میرے سر میں شدید درد تھا۔“ شہلا نے اس کا سر دبانے کے لیے اس کی پیشانی پر اپنے ہاتھ رکھے۔
 ”نہیں شہلا..... یہ ہاتھ اس لیے نہیں ہیں۔“

”مگر آپ کے سر میں درد جو ہے، ساری رات بھینکنے کی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔“
 ”درد میں اب کمی ہے میں تھوڑی دیر میں گھر جاتا ہوں۔“
 ”آپ کی امی تو آپ کو دیکھ کر پریشان ہو جائیں گی۔“
 ”شکر ہے امی گھر پر نہیں ہیں۔“

”اگر گھر پر کوئی نہیں ہے تو پھر آپ یہاں رکے رہیں..... تاکہ طبیعت تو بحال ہو جائے..... اس حالت میں تو آپ صحیح سے ڈرائیونگ بھی نہیں کر سکیں گے۔“

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جنہیں بہ مشکل کھول کر وہ اس سے بات کر رہا تھا۔ اور جب دن چڑھے وہ اٹھا تو اپنی طبیعت خاصی بہتر محسوس کر رہا تھا۔
 اس کے بیدار ہوتے ہی وہ اس کے لیے گرم، گرم سوپ بنا لائی تھیں..... جسے پی کر اسے مزید طبیعت بہتر محسوس ہوئی۔

”واہ شہلا..... تم تو بہت اچھی بیمار دار ہو..... اب تو میرا بار، بار بیمار پڑنے کو دل چاہے گا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ اس نے اس کے لبوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ جنہیں تمام کر اس نے گہرے لہجے میں کہا۔

”تم وعدہ کرو اب ساجد کے آفس بالکل نہیں جاؤ گی۔“

”کہیں آپ یہ تو نہیں سوچتے تھے کہ میں ساجد سے شادی کروں گی۔“

”نہیں، ایسا تو میں تصور تک نہیں کر سکتا..... مگر تم اب کہیں نہیں جاؤ گی..... نہ ساجد کے آفس اور نہ ہی ریحان کے آفس۔ تمہارے امی، ابو..... عمرے سے آجائیں..... میری امی تمہیں میرے لیے مانگنے آجائیں گی۔“ شہلا نے اس کی بات سنی اور کچھ سوچ کر کہا۔

”حارث، اب اگر میں نے ساجد کو یہ نہیں بتایا کہ مون تمہاری بہن نہیں ہے تو اصل کہانی کہیں اور چلی جائے گی اور وہ شخص آئندہ بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے.....“

”تم اسے اگر یہ بتاؤ گی کہ حارث کی کوئی بہن نہیں ہے تو اسے یہ یقین آ جائے گا کہ اس کے پاس میں نے ہی تمہیں بھیجا ہے۔“

”اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں..... ہر ریحان کے آفس میں بہت سے مذاکرے دیکھے ہیں کہ بائو ڈیٹا کس، کس طریقے سے معلوم کیا جاتا ہے۔“

”مگر شہلا..... اگر اس نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔“
 ”سہیل اب میری طاقت میں آپ کی محبت کی طاقت بھی شامل ہو گئی ہے اور وہ مجھے ہرگز زک نہیں

”انشاء اللہ.....“ حارث نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور شہلا اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگی کہ اب بخار کتنا ہے۔

”ڈاکٹر فی صاحبہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں، اب اجازت دے دیجیے، آپ کا مریض بھلا چکا ہے۔“

”ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں مگر کل شام چیک اپ کروانے ضرور آجائے گا تاکہ مجھے اپنے مریض کو دیکھ کر

تقویت بھی ہو۔“

”آپ بے فکر رہیے..... اب تو یہ بندہ سر کے بل آئے گا..... اپنے میچا سے دوری برداشت کرنا کہاں آسان

ہوتا ہے۔“ حارث نے شرارت سے کہا تو شہلا شرما سی گئی۔

☆☆☆

سینن آیا کی ساس عدت میں تھیں، اس کے باوجود سینن آپا اپنی والدہ اور ندیم خان کے ساتھ باقاعدہ طور پر اس کا رشتہ مانگنے آئی تھیں..... بلکہ آتے ہی صبا کی انگلی میں ندیم کے نام کی انگلی بھی پہنا دی تھی۔

”ہمارا ایک ہی بیٹی ہے اور ہمارے اپنے سمدھیانے سے بے حد اچھے تعلقات ہیں..... اس لیے ان کی

ساس کی عدت پوری ہوتے ہی ہم ندیم کی بارات لے آئیں گے اور اپنی بیٹی کو لے جائیں گے۔“

خالہ اور امی نے ندیم کو مٹھائی کھلاتے ہوئے ان کی ہر بات سے اتفاق کیا تھا۔ اور امی نے تو یہاں تک کہہ دیا

تھا کہ جب انہوں نے پہلی بار ندیم کی تصویر دیکھی تھی تو اسی وقت انہیں ایسا لگا تھا کہ یہ لڑکا تو میرا داماد ہونا چاہیے۔

”اور مجھے بھی صبا کی تصویر بے حد اپنی، اپنی ہی لگی تھی۔“ ندیم کی ماں نے محبت سے کہا تھا۔

”جس کا جو نصیب ہو وہی اسے ملا کرتا ہے..... اتنے عرصے انتظار کرنے کا مطلب ہی یہ نظر آتا ہے کہ صبا کو

ندیم کا انتظار تھا۔“ سینن آپا نے کہا تو ندیم بے اختیار ہنس دیا۔ اور صبا شرما کر رہ گئی۔

”کل آفس آر ہی ہو گیا.....؟“ رات کو ندیم نے فون کر کے اس سے پوچھا۔

”ہاں، آؤں گی..... سرفریڈ نے کہا ہے کہ اب چھٹی نہیں کرنی۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤ.....“ ندیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”آپ نے آفس میں کسی کو بتایا تو نہیں ہے نا.....“ اس نے شرما تے ہوئے پوچھا۔

”کیا نہیں بتایا تم“

”ہی..... اپنی ایجنٹ کا۔“

”ہم شو بزم کے لوگ تو ہیں نہیں جو اپنی ایجنٹ اور شادی کو لوگوں سے چھپاتے پھریں..... فریڈ کا فون آیا تھا وہ

میرے آفس نہ آنے کی وجہ پوچھ رہا تھا..... تو میں نے اسے بتا دیا کہ آج میں اپنی سسرال جا رہا ہوں..... امی نے

میری دلہن کا انتخاب کر لیا ہے۔“

”مگر یہ تو نہیں بتایا نا..... کہ آپ کی سنگیتر کون ہے؟“

”بھئی نہ اس نے پوچھا اور نہ میں نے بتایا۔“

”یہ بھی اچھا ہی ہے..... ورنہ آفس کے لوگ سمجھتے کہ ہمارا کوئی افیئر چل رہا تھا۔“

”ایسا تو واقعی تھا.....“ ندیم خان نے شوخی سے کہا تو وہ بھی ہنس دی۔

☆☆☆

لانگ ویک ایجنٹ تھا..... عام گھر پر آرام کر رہا تھا جو بال آف تھا تاکہ کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے آج وہ اپنے آپ

ماہنامہ پاکیزہ 27 نومبر 2016ء

سے باتیں کر رہا تھا۔

”صبا کونہ ملنا تھا نہ ملی..... اس سے زیادہ میں اسے نہیں ڈھونڈ سکتا تھا..... جتنا کہ میں نے اسے ڈھونڈا۔ اب اس کا چہرہ کلوز ہو گیا ہے تو پھر میں کیوں فرزانہ سے یوں اکتایا، اکتایا سا رہتا ہوں۔ وہ میری ہونے والی بیوی ہے، مجھے اس کے ساتھ ایسا سوکھا اور قدرے برہم سا رویتہ تو نہیں روار کھنا چاہیے۔ ہاں یہ تو اس کے ساتھ واقعی زیادتی ہے کہ میں اس کی خوشی کو خوشی سمجھوں ہی نہیں۔“ وہ خود کلائی کی کیفیت میں تھا۔

”اب اگر اس نے مجھے انگوٹھی پہنادی تھی تو مجھے یوں اکٹڑ سا انداز نہیں اپنانا چاہیے تھا۔ مجھے بھلا کیوں برا لگا.....“ اس وقت وہ اپنے آپ سے خود پوچھ رہا تھا۔

”وہ لوگ جن کی بیوی مر جاتی ہے، وہ بھی تو دوسری شادی کر کے اپنی زندگیوں کو سکون کے ساتھ بسر کیا کرتے ہیں۔“

”مگر صبا میری تو نہیں ہے؟“ اس کے دل سے کہیں ایک آواز آئی۔

”ہمارے لیے تو صبا زندہ یا مری برابر ہے.....“ اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی..... وہ اکثر صبا کا ذکر سن کر ہی پہلا جملہ یہی بولا کرتی تھیں۔

”ہاں، جب تم ہو ہی نہیں تو مر ہی تو گئیں.....“ اس نے جیسے اپنے آپ کو یقین دلایا پھر اپنا والٹ کھولا اور اس کے اندر کے خانے سے صبا کی پرانی تصویر نکالی..... اور پُرزے، پُرزے کر کے اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

اپنے اس اقدام پر اسے خود حیرت ہوئی..... مگر پھر اس نے اپنے آپ کو حیرت سمجھایا۔

”مجھے اپنی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہی اپنے ذہن پر سوار تمام پریشانیوں کو، تمام فکروں کو اور تمام چاہتوں کو اٹھا کر بھینک دینا ہوگا..... کہ جس چیز کا کوئی مصرف نہ ہو وہ بیکار ہوتی ہیں اور ہمیں بہت سارے دکھ، ناکارہ چیزوں کے طفیل بھی ملا کرتے ہیں۔“ تصویر کو کھڑے، کھڑے کرنے کا رنج اب وہ از خود ختم کرنے کے درپے تھا۔ اسی لیے اپنے آپ کو سمجھائے چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

سرفرید کی جانب سے پورے اسٹاف کو زبردست ہائی ٹی وی گئی تھی۔ اور اس پارٹی کے بعد انہوں نے سب کو بتا دیا تھا کہ ”اس پارٹی کا مل ندیم خان دیں گے کیونکہ انہوں نے ہم سب کو بتائے بغیر اپنی انگیجمنٹ کر لی ہے۔“

”کس سے کی ہے؟“ ناعمہ نے پوچھا۔ (دل ہی دل میں اسے ایک دھچکا سا تو لگا تھا)

”ضرورتی وی سے تعلق ہوگا..... سر کے چکران دونوں چیلن پر بہت لگ رہے ہیں۔“ یہ ساجد کی رائے تھی۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر ندیم کسی جا ب کرنے والی لڑکی سے شادی کریں..... یہ یقیناً ان کی فیملی کی کوئی لڑکی ہوگی..... اور میٹرک کر کے گھر میں چادر میں کاڑھ رہی ہوگی۔“ فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

”یہ کیونکر سوچا آپ نے۔“ اس کی باتیں سن کر ندیم کو ہنسی بھی آرہی تھی۔

”سر اگر آپ ایک دوسرے کے ساتھ کام کر رہے ہوں تو اپنے ساتھی درگزر کی پسندنا پسند سے تو آگاہ ہوتی جاتے ہیں۔“

”تم لڑکیوں پر واقعی مجھے حیرت ہے کہ عشق کی اس خوشبو کو پہچان نہیں سکیں جو گزشتہ ایک سال سے ہمارے آفس میں پھیلی ہوئی تھی۔“ سرفرید ہنسے اور پھر مسکرا کر بولے۔

”مس صبا رحیم آپ کو مبارک ہو..... ندیم خان..... میرا سب سے اچھا دوست ہے، ایسا دوست جس پر صرف فخر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور ایسا دوست کہ اس جیسا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔“

”مگر تم تو کبھی یا سچی ہی نہیں تھیں کہ سرندیم کو تم پسند کرتی ہو..... جبکہ میں نے بارہا ان سے کہا بھی تھا۔“ اب فرزانہ کھسیا کر کہہ رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہی نہیں تھا..... ایسا سب کچھ۔“ اب اس کے سوا میں کہہ بھی کیا سکتی تھی۔
 ”حد ہوگئی بھئی..... یہاں تین فلور تک تمہاری عاشقی کی دھوم مچی ہوئی تھی..... اور تم کو سب سے آخر میں پتا چلا..... واہ بھئی.....“

”سر یہ محبت کرنے والے اتنے لاعلم کیوں رہتے ہیں کہ انہیں کسی بات کا پتا سب سے آخر میں ہی چلا کرتا ہے۔“ صفدر نے تسخیر بھرے لہجے میں کہا تو سب ہی ہنس پڑے۔

”گائز میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا..... صبا چند ماہ آپ کے ساتھ ضرور رہیں مگر شادی کے بعد یہ جا ب کو خیر باد کہہ دیں گی۔“ اس ضمن میں ندیم خان نے پہلی مرتبہ مجھے بھرپور انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ اتنی ٹیلنٹڈ لڑکی کو شادی کے بعد گھر بٹھانا چاہتے ہیں۔“ لڑکیوں نے برا سامنہ بنا کر اسے دیکھا۔
 ”یہ بات نہیں ہے، واصل صبا پروڈکشن ہاؤس میں، اپنی مرضی کے حساب سے کام کرنے کی خواہش مند ہے..... اور میں بھی ضرور چاہوں گا پاکستان میں ایسے بھی ڈرامے بنیں جس سے عام آدمی گھر میں بیٹھ کر بہت سی

معلومات بھی حاصل کر لے..... مثلاً گڑکا کھانے سے منہ کا کینسر ہو جاتا ہے، پاکستان میں اس کی خرید و فروخت پر پابندی بھی لگ چکی ہے مگر پھر بھی اس کا کاروبار زور شور سے جاری ہے تو اس کے لیے یہ طریقہ ہی نہیں کہ اسے بند کر دیا جائے اور جرمانے اور گرفتاریاں ہوں..... اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ اس شوق کے

طفیل جب گھر اجڑا کرتے ہیں تو اس سے کتنے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور یہ ہی ایک معاشرتی ڈرامے کی کامیابی ہے..... کہ اس کا پیغام اس طرح پہنچے جو کہ کورٹ پکیریاں نہ پہنچا سکیں۔“

”ویل ڈن“ سرفریڈ تالیاں بجا رہے تھے..... اور مجھے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
 ”صبا آپ اپنا پروڈکشن ہاؤس ضرور چلائیے گا مگر اس اخبار سے بالکل کنارانہ کر لیجیے گا کہ اس اخبار نے آپ کو آپ کی زندگی کا سب سے بڑا تحفہ ندیم خان کی صورت میں دیا ہے۔“

اس سے قبل ان کی تقریر مزید گوہر افشائیاں کرتی تھی نے ان کی بات کاٹی۔
 ”سرا بھی تو میں کہیں نہیں جا رہی۔“ میں نے کہا۔ ”اور جب جاؤں گی تو کالم لکھنے کا سلسلہ تو انشاء اللہ جاری رکھوں گی۔“

”ہاں سزا سزا کے نام سے لکھنا چاہو تو لکھ سکتی ہو۔“ سرفریڈ مسکرا کر بولے تو میں ندیم کو دیکھ کر مسکرا کر رہ گئی۔
 جو اپنی ہنسی رد کے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

”کیا ضرورت تھی..... اپنے مستقبل کے پلان بتانے کی، ابھی ہماری شادی ہوئی نہیں ہے اور آپ شادی کے بعد کے پلان تک لوگوں کو بتا رہے ہیں۔“ میں نے گھر پہنچے ہی فون پر ندیم خان سے شکایتی لہجے میں کہا۔

”سچ بولنے کی عادت ہے، زندگی کی سب سے بڑی بات کے بارے میں کیسے جھوٹ بولتا..... شادی سے بڑی بات تمہاری نظر میں کوئی دوسری ہے؟“

”مگر آج کل کوئی اپنے دل کی بات یوں نہیں بتایا کرتا جیسے آپ بتاتے پھرتے ہیں۔“
 ”چلب..... اب تمہاری طرح اپنے دل کی باتیں دل میں ہی چھپا کر رکھا کروں گا..... اب خوش.....“

”سینے اگر شادی کے بعد..... میں سرفریڈ کے اخبار میں جا ب کرتی رہوں تو.....“

”میں تو تمہاری خوشی کے لیے کہہ رہا تھا..... جیسے تمہاری مرضی۔“
 ”میرا مطلب ہے، پروڈکشن ہاؤس فوراً ہی تو شروع نہیں ہو سکتا..... اس کے لیے ہمیں پہلے اس کا ہوم ورک تو کرنا پڑے گا ناں.....“
 ”تم ذرا بھی فکر مند مت ہونا..... میرے بہت سے دوستوں کو اس کا تجربہ بھی ہے اور ان کے اپنے ایسے ہاؤسز بھی ہیں.....“

”پھر تو ٹھیک ہے، مجھے اپنی مرضی کے حساب سے کام کر کے واقعی مزہ آئے گا۔“
 ”صبا..... مجھے صرف تمہاری خوشی ہی چاہیے..... جو چیز، جو کام تمہیں اچھا لگے، وہی کرنا۔“
 ”واؤ..... آپ تو بہت اچھے ہیں۔“ میں نے بے اختیار کہا۔
 ”اب قائم رہنا اپنی اس بات پر۔“

”آپ کا خیال ہے، کیا میں اس سچی بات سے مکر بھی سکتی ہوں؟“
 ”اب کیا کہہ سکتا ہوں میں..... اخبار میں کام کرنے والے..... اپنی غلط بات کو بھی اتنے ہی وثوق کے ساتھ کرنے کے عادی ہوتے ہیں..... جتنی کے سچی بات مگر میں ان میں شامل نہیں ہوں۔“
 ”اگر آپ شامل نہیں ہیں تو میں کیسے شامل ہوں گی۔“
 ”وہ اس لیے کہ تم تو اپنی محبت کو بھی نہیں پہچان پاتی تھیں جو تمہیں مجھ سے تھی.....“
 ”اگر پہچان نہ پاتی تو خواہ خواہ گولی کے آگے آ جاتی۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔
 ”اوہ..... تو یہ محبت کا تقاضا تھا۔“ اب وہ شوخ ہو رہا تھا۔

”چنانچہ میں نے فون ہی بند کر دیا تھا۔ اور بعد میں دیر تک میرا چہرہ شرم سے گلابی ہوتا رہا۔
 یہ ندیم جو بظاہر سنجیدہ سے ہیں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہہ دیتے ہیں جو شوخی کے زمرے میں آ جاتی ہے۔
 یہ ابھی کل ہی کی تو بات تھی..... جب میں نے کہا تھا۔ ”میرا پاسپورٹ ایکسپائر ہو گیا ہے وہ ریو کروانا ہے۔“
 تو انہوں نے بڑی بے پروائی سے کہا تھا۔

”بعد میں کرا لینا۔ تم نے کون سا ابھی کہیں باہر جانا ہے۔“
 ”مگر پھر بھی اگر پہلے سے تیار ہو تو بہتر رہتا ہے۔“
 ”کیا ہنی سون پر باہر جانے کا ارادہ ہے۔“ بے دھڑک پوچھ ڈالا۔
 ”یہ میں نے کب کہا ہے؟“ میرا لہجہ کھسیا یا ہوا سا تھا۔
 ”تم ہی تو کہہ رہی ہوناں..... اگر پہلے سے ہی تیار ہو تو بہتر رہتا ہے۔“ انہوں نے میرے ہی لہجے میں میری نقل اتاری۔

”سنیے..... میں اپنا ہر کام اپ نوڈیٹ کرنے کی عادی ہوں، اس لیے یہ بات کہہ دی تھی۔“
 ”اور میں بھی مگر.....“ وہ اوصوراجملہ چھوڑ کر مسکرائے۔
 ”آپ اپنی بات پوری کیجیے۔“ میں نے کہا تھا۔

”میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد پاسپورٹ بنوانا تاکہ ولدیت کے بجائے شوہر کے خانے میں میرا نام آ جائے اور ہم ساتھ، ساتھ کہیں بھی جائیں تو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔“
 ”اوہ..... اسی لیے آپ کہہ رہے تھے کہ میں تھوڑے دن رک جاؤں۔“ میں نے کہا۔
 ”اور کیا.....“ وہ ہنسے۔

”سنیے..... پہلے ہم عمرے کے لیے چلیں گے۔“ دل کی بات فوراً ہی لیوں پر آگئی۔
 ”چلو شادی کے بعد کے پروگرام بنا لو..... کہاں، کہاں جانا ہے۔“ ان کا لہجہ شوخ ہو رہا تھا۔ اور میں پھر شرم سے سرخ پڑ رہی تھی۔

☆☆☆

وقت، وقت کی بات ہے، کبھی شہلا..... فون پہ فون کیے جاتی اور حارث اس کی کال ریسیو کرنا ضروری نہ سمجھتا۔ اور آج وہ اسے فون کر رہا تھا..... اور اس کی کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی اور جب گیارھویں مرتبہ اس نے اسے فون کیا تو فوراً ہی اٹھالیا گیا۔

”کہاں تھیں تم..... کب سے فون کر رہا ہوں..... ریسیو کیوں نہیں کر رہی تھیں؟“

”ابھی، ابھی گھر میں داخل ہونی ہوں۔“ شہلا نے کہا۔

”اتنی دیر سے آئی ہو..... شام پانچ بجے تو تمہاری چٹھی ہو جاتی ہے۔“

”آج ساجد مجھے پانچ بجے کے بعد باہر لے گئے تھے۔“

”کیوں گئیں تم اس کے ساتھ؟“

”میں جا ب کر رہی ہوں..... اور ابھی میرا کام مکمل بھی نہیں ہوا۔“

”کہاں گئی تھیں..... تم اس منحوس شخص کے ساتھ۔“

”ہوٹل گئے تھے..... چائے پینے کے لیے۔“

”وہاں کوئی بات ہوئی میرے حوالے سے؟“

”نہیں، آپ کے اور آپ کی بہن کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔“

”میری کہاں سے کوئی بہن آگئی۔“ حارث تجل ہو کر بولا۔

”مگر وہ تو یہی سمجھتے ہیں۔“

”تو پھر کچھ نہ کچھ بکو اس تو ضرور کی ہوگی اس نے۔“

”ہاں، اب وہ مجھ سے شادی کے خواہش مند ہیں۔“

”تم نے بتایا نہیں کہ تمہارا رشتہ طے ہو چکا ہے۔“

”ہاں بتایا تھا..... مگر وہ اس ضمن میں کچھ سننے کو تیار نہیں ہے۔“

”کیا مطلب..... وہ تم سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے؟“

”ہاں، وہ جنونی انداز میں بات کر رہا تھا..... اس لیے میں نے اس کی آس نہیں توڑی۔“

”تو کیا کہا تم نے؟“ حارث کو اب اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

”یہی کہ پہلے آپ اپنے ادھورے کام مکمل کر لیں..... اتنے میں، میں اپنی ای کو بھی اپنا ہمنوا بنا لوگی..... کہ مجھے آپ جیسا جیون سانسھی کہاں مل سکے گا۔“

”تمہاری یہ بکو اس سن کر تو وہ خوش ہو گیا ہوگا۔“ حارث جل کر بولا۔

”ہاں، اور اس نے اپنی انگلی سے ایک انگلی اتار کر مجھے پہنا دی۔“

”اور تم نے وہ خوشی، خوشی بہن بھی لی۔“ وہ بڑی برہمی سے بولا۔

”ظاہر ہے اب میں اسے کسی شک و شبہ میں تو نہیں ڈال سکتی تھی۔“

”تم تو دل میں خوش ہو گئی ہوگی، اس کی نیچتی انگلی یا کر..... میں تو ساری زندگی تم کو چھتی تھا کف نہیں

”حادثہ، میں لعنت بھیجتی ہوں اس کے مخالف پر..... میں تو جس مقصد کے لیے گئی ہوں، وہ معلوم کرنا

چاہتی ہوں۔“

”مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ تم شاید کچھ معلومات حاصل کر نہ سکو..... مگر وہ اپنے مذموم مقاصد میں ضرور

کامیاب ہو جائے گا۔“

”آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟“

”تم پر تو ہے مگر اس شخص پر نہیں.....“

”ایک لحاظ سے وہ بھی لوگوں کا ڈسا ہوا شخص ہے۔ غلط تو اس کے ساتھ بھی ہوا ہے۔“

”اسی لیے اب وہ لوگوں کو ڈس رہا ہے۔“ حادثہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

”یہ سب باتیں چھوڑیں.....“ اور بتائے آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ شہلانے بات بدلنے کو کہا۔

”اب میرا بخار، میرے دماغ پر چڑھ گیا ہے۔ سمجھیں تم یہ کہہ کر فون منقطع کر دیا۔“

اور اس کی یہ جھنجلاہٹ محسوس کر کے وہ یک دم چپ سی ہو گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی..... حادثہ کو اس کا سناجد کے

آفس میں جانا اچھا نہیں لگ رہا ہے..... مگر وہ تو حادثہ کی پریشانی حل کرنا چاہتی تھی۔

اور ادھر حادثہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر اس نے اس کی بات نہیں مانی تو پریشانیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ

شروع ہو جائے گا..... اور جس میں شہلانے اپنے آپ کو مشکل سے ہی بچا پائے گی۔

☆☆☆

ہر شخص اپنے آپ کو جتنی اچھی طرح سمجھا سکتا ہے اتنا شاید دوسرا نہیں..... یہ لاجک بھی عامر کی تھی..... اور

وہ کئی روز سے اپنے آپ کو خود سمجھا رہا تھا..... یا اپنے آپ کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اچھے کے لیے

ہو رہا ہے۔

فرزانہ اس کی لائف پارٹنر بہت اچھی رہے گی..... اور اب ان دونوں کو مل کر اپنی زندگی کو مزید خوب

صورت بنانا ہے۔ اس لیے آج اس نے خود فرزانہ کو فون کیا تھا اور اس کے ساتھ باہر چلنے کی خواہش بھی کی تھی.....

وہ جانتا تھا کہ فرزانہ کو گھر میں بیٹھ کر انجوائے کرنے کے بجائے باہر گھومنا پھرنا زیادہ پسند ہے۔

اور آج وہ دونوں شہر سے دور خوب صورت جگہ پر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے..... فرزانہ اس

کے اس محبت بھرے رویے پر بے حد شاداں و فرحاں تھی۔ اور اس کو خوش دیکھ کر عامر بھی خوش محسوس کر رہا تھا۔

”اگر ہم شادی کے بعد امریکا جائیں تو؟“ فرزانہ نے پروگرام بتاتے ہوئے کہا۔

”امریکا تو نہیں جانا مجھے؟“

”وہ کیوں.....؟“

”سنا ہے وہاں تو صبار ہتی ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ذکر آئی گیا۔

”تو کیا پورا امریکا صبا کا ہو گیا..... وہ ہمیں وہاں نہیں آنے دے گی۔“ فرزانہ کا لہجہ تمسخر آمیز ہو گیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ وہ جڑ بڑ ہو کر بولا۔

”پھر کیا مطلب ہے؟ مجھے بھی تو پتا چلے.....؟“

”میں نہیں جانتا..... کہ اب وہ کبھی مجھ سے کہیں نکلے۔“ دل کی بات بادل کا چور سامنے آئی گیا تھا۔

”اس سے اتنی نفرت ہو گئی ہے آپ کو.....“ فرزانہ نے بات کا رخ ہی مشرق سے مغرب کی طرف پھیر دیا۔

”نفرت اور محبت کی تو بات ہی نہیں ہے بس اب میں اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔“
”دیکھنا تو میں میں بھی نہیں چاہتی.....“ فرزانہ بولی۔

”کیا تم ایسی کوئی بات نہیں کر سکتیں..... جس میں صبا کا ذکر نہ آئے۔“ عامر نے برہم لہجے میں کہا۔
”میں تو اس کا نام بھی نہیں لینا چاہتی..... آپ ہی نے اس کا ذکر کیا ہے۔“ فرزانہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ لڑکی ہے ہی بہت چالاک..... میرا پیچھا چھوڑتی ہی نہیں۔“ یہ سب اس نے دل میں سوچا تو ضرور مگر کچھ بولا نہیں۔

”اب خاموش کیوں بیٹھے ہیں..... کیا سوچ رہے ہیں۔“

”بھئی کہ اب گھر چلو.....“ وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور فرزانہ نے ایک لمحے کچھ سوچا اور پھر کھسیا کراٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ شخص تو میری سوچ سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہو رہا ہے۔“ اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔
”میرا نام بھی فرزانہ ہے، اگر نہ تمہیں فتح کیا تو تم کیا سب ہی دیکھیں گے۔“ اور اب وہ ہنستی مسکراتی گاڑی میں اس کے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔

اور عامر ایک تناؤ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی گاڑی کو نہیں چلا رہا بلکہ کوئی راکٹ اڑا رہا ہے سو اس کی گاڑی تمام سٹبل توڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

سب کو ہی ایسا لگ رہا تھا یا شاید صرف میں ہی ایسا محسوس کر رہی تھی کہ ہمارے اخبار کے آفس کا ماحول خاصا شگفتہ سا ہو گیا تھا۔

ساجد اب مجھے صبا کے بجائے شرارت میں میڈم کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ فرزانہ شوخی میں مجھے بھابی بلانے لگی تھی اور ندیم خان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے آفس میں ہی روکے رکھے۔

ناعمہ کا خیال تھا کہ میں اپنے کپڑوں کا جو تکیہ بے حد خیال رکھتی ہوں اس لیے سر بندیم کو میں نے بہ آسانی متاثر کر لیا۔ اس لیے اب وہ میری خوشامدیں کرنے لگی تھی کہ میں شاپنگ کرنے میں اس کی ہیلپ کروں۔

”مگر اب تم کس کو متاثر کرنا چاہتی ہو، صنفدر تو بغیر کسی وجہ کے تم سے بہت متاثر ہے۔“

”شادی تو میں کسی امیر لڑکے سے کروں گی، اپنے جیسے گھرانے کے کسی لڑکے سے شادی کر لی تو میں شاید مسکرانے کو ہی ترس جاؤں۔“

”ناعمہ اصل چیز پیار ہوتا ہے، جس سے ہم پیار کریں اور اس سے ہماری شادی بھی ہو جائے تو وہ بڑی خوش قسمتی ہوا کرتی ہے۔“ میں نے ناعمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اب ایسی بات تم تو نہ کہو.....“ ناعمہ برا سے منہ بناتے ہوئے بولی۔
”ایسا کیوں کہہ رہی ہو تم.....؟“ مجھے عجیب سا لگا۔

”تم نے ہی بتایا تھا ناں..... بچپن میں تمہاری مفتی تمہاری پسند کے حساب سے کسی لڑکے سے ہو گئی تھی..... اور تم جدا ہونے کے باوجود ایک عرصے اس کا انتظار کرتی رہیں۔“

”تو پھر.....؟“ اب مجھے اس کی باتوں سے الجھن ہی ہو رہی تھی۔
”میرا مطلب ہے تمہیں تمہارا تیار تو نہیں ملانا..... مگر ایک امیر لڑکے سے انکسٹری کے بعد تمہاری خوشی

میں کوئی بھی تو نہیں آئی تان.....
 ”ایسا صرف ہماری ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے ہے تاہم.....!“ میں نے زچ ہو کر اس سے کہا۔
 ”تمہاری ذہنی ہم آہنگی تو تمہارے سابقہ منگیتر کے ساتھ بھی تھی..... اور اب ندیم خان کے ساتھ بھی ہو گئی ہے..... ماشاء اللہ تمہارے مزاج میں بڑی لچک ہے۔“
 ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ میں واقعی تمہاری یہ گول مول باتیں سمجھ نہیں پائی ہوں۔“
 ”سیدھی سی بات ہے..... تمہارا منگیتر تمہیں چھوڑ گیا..... تو تم نے اس کی یادوں کو دفنانا کیا..... اور ندیم خان پر لٹو ہو گئیں۔“
 ”تاہم تمہیں کیا پتا..... میں نے عامر کا کتنا انتظار کیا تھا اور تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ ندیم خان پر میں لٹو نہیں ہوئی تھی۔“

”اوہ، جب ہی ان کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہو گئیں۔“
 ”اگر یہ سب کچھ صفر کے لیے ہوتا اور اس موقع پر تم بھی موجود ہوتیں تو کیا ایسا نہ کرتیں؟“
 ”ہمیں، میں تو اس کمرے میں ہی نہ جاتی جہاں مشکوک شخص کو جانا دیکھتی۔“
 ”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو صفر سے محبت تو کیا انیسیت بھی نہیں ہے۔“ مجھے اس کی بات کا یہی جواب سمجھ میں آیا تھا۔

”پیاری صبا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ندیم خان پر عرصے سے فدا تھیں اور جب ان کی جان پر بنی تو آپ میدان میں کو پڑیں۔“

”ہاں، یہی بات تھی..... پھر۔“ میں نے حتی لہجے میں کہا۔ ”اب وہ میرے منگیتر ہیں اور چند ماہ کے اندر ہماری شادی ہونے والی ہے اور برائے مہربانی آئندہ اس قسم کی گفتگو نہ کیجیے گا۔“

”وہ تو میں کبھی نہ کرتی..... مگر آج تمہاری وجہ سے میں صفر کی جانب سے ایک بڑا انعام جیت گئی ہوں..... جس نے کہا تھا صبا پر..... ندیم خان لٹو ہوئے تھے، ورنہ وہ بیچاری تو انہیں آکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ تب میں نے کہا تھا ندیم خان جیسی شاندار شخصیت پر صبا عاشق نہ ہوئی ہو میں یقین ہی نہیں کر سکتی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ تم نے خود اقرار کر لیا کہ یہی بات تھی۔“
 ”تم اور بھی جتنے اقرار کروانے چاہو کرو لو کہ اب ندیم خان کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔“ میرے لہجے میں زعم مزین تھا۔

”سرفریڈ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ہمارا اخبار چلے تو کیسے چلے..... یہاں کے ورکرز کو اپنے، اپنے مفاد کے سوا کچھ نظر کہاں آیا کرتا ہے.....“ صفر مٹھائی کا ڈبا ہمارے کہن میں لاتے ہوئے بولا تو میں کھسیا سی گئی جبکہ تاہم وہ، دو گز کے قہقہے لگا رہی تھی۔

☆☆☆

”کس قدر جھوٹا شخص ہے یہ ساجد بھی..... خواہ مخواہ کے بہتان مجھ پر باندھے ہوئے ہے کہ مونا میری بڑی بہن تھی اور اس سے ملنے میری امی کئی مرتبہ ملک سے باہر گئیں ایسے جھوٹ جن کا کوئی سر پیر ہی نہیں۔“
 شہلا سے فون پر بات کرنے کے بعد حارث اپنے کمرے میں بیٹنا آواز میں بڑ بڑا رہا تھا۔ اس کی امی چائے لے کر اس کے کمرے میں پہنچیں تو وہ چونک سی گئیں۔

”کیسے وہ شخص منورہ کو تو تمہاری بہن نہیں سمجھ رہا تھا؟“ وہ پرائیمنی میں بولیں۔

”کون منورہ...؟“ وہ حارث سے بولا۔
”یاد کرو، جب تم میٹرک میں پڑھتے تھے تو ہم نے اپنے مکان کی چھلی انگیسی ایک انر ہوسٹس کو کرایے پر
دے دی تھی۔“

”ہاں یاد آیا، جن کو میں آپا کہا کرتا تھا۔“
”ہاں اور وہ مجھے آٹی کے بجائے ماں جی کہتی تھی۔“
”مگر وہ تو بہت مختصر مدت کے لیے ہمارے ہاں کرایے پر آئی تھیں۔“
”ہاں انر لائن کے کسی فرد سے شادی کر کے وہ کینیڈا چلی گئی تھی بلکہ اس کی شادی بھی کینیڈا میں ہی ہوئی تھی۔“
”ٹھیک کہہ رہی ہیں ای آپ اس لڑکی کی ان دنوں ساجد سے دوستی رہی ہوگی اور ساجد سے میری بہن
سجھا ہوگا۔“

”اور جب تمہارے ماموں سے ملنے میں دو مرتبہ کینیڈا گئی تو اس نے یہی سجھا ہوگا کہ میں منورہ سے ملنے گئی
ہوں جس کو اس کے تمام ملنے والے مونا کہا کرتے تھے۔“

”ہاں شاید یہی غلط تھی..... مجھے تباہ کر گئی اور اتنا تو شاید انہوں نے ہماری انگیسی کا کرایہ بھی نہیں دیا ہوگا جتنی
ہماری چیت ان مومن آپا نے مجھے پہنچاوی۔“

”تم ساجد کی غلطی دور کر سکتے ہو بیٹا۔“ ای نے کہا۔
”یہ غلط تھی تو اب شہلا ہی دور کرے گی۔“ مگر اب وہ دل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا..... اور پرانے منظر اس
کی آنکھوں میں روشن ہو رہے تھے۔

منورہ جب اپنی فلائٹ سے واپس آتی تو حارث کے لیے چاکلیٹس اور سینڈوچز ضرور لایا کرتی..... اور جب
انر لائن کی گاڑی چھوڑنے آتی یا وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ واپس آتی تو حارث بھاگ کر جاتا..... اور آپا کہہ کر
اس کا بیگ تمام کمر میں لانا شاید ساجد بھی انہیں کبھی ڈراپ کرنے آیا ہوگا..... اور اسے آپا کہتے دیکھ کر اس کا چھوٹا
بھائی ہی سجھا ہوگا۔

ایک شام کوئی شخص لان میں بھی آ کر بیٹھا تھا۔
”میں آپ کے لیے چائے لاؤں آیا؟“ حارث نے اس سے کہا تھا۔
”ای نہیں ہیں کیا گھر پر.....؟“ اس نے حارث سے پوچھا تھا۔
”وہ پڑوسن کے ساتھ مال گئی ہیں..... آپ نے بھی تو ان سے اپنے لیے لان کے سوٹ لانے کو کہا
تھا۔“ حارث نے انہیں یاد دلایا۔

”ارے، میں تو واقعی بھول گئی تھی۔“

”سنیے..... آپ اس چھوٹے سے گلوگار سے کوئی گانا سنیے اتنے میں، میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“
مگر اس شخص نے حارث سے کوئی گیت نہیں سنا تھا۔ اس نے صرف یہی پوچھا تھا۔

”اس گھر میں، اور کون، کون رہتا ہے؟“ تب حارث نے سادگی سے اسے بتایا تھا۔
”میں، ای اور ہماری آپا۔“

”تمہارے ابا نہیں ہیں؟“
”نہیں، ان کا تو انتقال ہو گیا ہے اور مجھے تو اپنے ابا بالکل بھی یاد نہیں ہیں۔“

اور جب کہنا سنے کی کوئی چیز لیے آتا تو آتے ہی کہتا ہے کہ منورہ سے کہنے لگا۔
www.paksociety.com

شباب کے آئین کے تو تمہارے گانے اور سنیں گے..... اس وقت تو یہ کہاں کھائیں گے۔ اور حارث اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اسے آپا کے ملنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور پھر آیا ایک دن اچانک ہی چلی گئیں۔ امی نے بتایا تھا۔ ان کے پاس کینیڈا کی نیشنلٹی تھی..... اب انہیں وہاں اچھی جاب بھی مل رہی ہے اور ان کی شادی بھی وہیں ہوگی..... اس سے زیادہ جاننے کی امی خواہش مند بھی نہیں تھیں۔ مونا آیا، امی کی ایک پرانے ملنے والی کے طفیل ان کے ہاں پے اینگ گیٹ کے طور پر آئی تھیں..... سال سوا سال کے اندر چلی بھی گئیں۔ اس عرصے میں ان کا ساجد کے ساتھ کیسا افسیر چلا..... ان سب باتوں سے حارث تو کیا اس کی امی بھی لاعلم تھیں۔

”بیٹا، تمہیں خود ساجد کے پاس جا کر اس کی یہ غلط فہمی دور کرنی چاہیے.....“ والدہ نے اسے فوراً ہی کہا تھا۔
 ”امی، آج کل سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ کوئی کتنا ہی سچ بولے، اس پر یقین نہیں کیا جاتا۔“
 ”تو پھر نہیں بتاؤ گے اسے؟“

”بتاؤں گا مگر کسی دوسرے کے ذریعے سے۔“

”مگر یہ سب اسے بتا تو چلنا چاہیے ناں.....“

”ہاں، بتا چلے گا..... مگر وقت کے حساب سے ہی۔“ حارث نے سوچتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

”ساجد میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے مونا کے اور کتنے بہن بھائی ہیں، نادرا کا فیملی سٹوڈنٹ نکلوایا تو معلوم ہوا کہ وہ تو اکلوتی ہے اور اس کے والد کا نام راشد ہے۔“ شہلا اور ساجد لہجہ کر رہے تھے تب اچانک شہلانے کہا۔
 ”ارے..... آج کل جموٹے سٹوڈنٹ بنوانے کا رجحان عام ہے۔ تمہیں کیا معلوم..... اس بے ایمان نے کتنے ناموں سے اپنے کارڈز بنوائے ہوئے ہوں گے۔“
 ”یہی سوچ کر تو میں نے اس کے بھائی حارث کا بھی فیملی سٹوڈنٹ باہر نکلوایا تو معلوم ہوا کہ اس کی ولدیت کے خانے میں توفیاض احمد لکھا ہوا ہے..... اور حارث اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔“
 ”تم بھی کس پریشانی میں پڑ گئیں..... یہ جموٹے لوگوں کا خاندان ہے، تم کھانا کھاؤ۔“ ساجد بے پروائی سے بولا۔

”مگر میں تو آپ کی پریشانی دور کرنا چاہتی ہوں۔“

”تمہارے آنے سے میری آدمی سے زیادہ پریشانیاں دور ہو گئی ہیں۔ اور بقیہ پریشانیاں بعد میں..... ہے ناں۔“ وہ اپنے ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولا۔
 ”میرا مطلب ہے، ہمیں اپنا کام خوب سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا..... اور خوب چھان بین کے ساتھ..... کہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہیں ہونے پائے۔“ شہلانے سنبھل کر اس سے کہا۔

”سب سے زیادہ نقصان تو میرا ہوا، میرے اربانوں کا خون ہوا، میری محسوم محبت کو اس عیار لڑکی نے لوٹا..... اور مجھے اپنی انگلیوں پر خوب نچایا۔ اور اب نہ وہ اور نہ اس کا خاندان..... میرے غیظ و غضب سے کبھی سچ سکتے ہیں۔“

”کیا آپ حارث کے ساتھ ان کی امی کو بھی مار دیں گے؟“ شہلانے پوچھا۔

”بالکل..... ایسا ہی ہوگا؟“ اس نے جواب دیا۔

بھائی اور ماں کے مرنے میں وہ غرور آئے گی جب اس کی قبر بھی اپنی ماں اور بھائی کے برابر بن جائے گی۔
اب ساجد نہیں رہا تھا..... اور شہلا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔

☆☆☆

رئیسہ بیگم نے گھر کی صفائی ستھرائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ فرسٹ فلور پر دو کمرے تھے، ان میں رنگ و روغن کا کام شروع کر دیا تھا۔ اسی لیے عامر اب اپنا سامان لے کر نیچے آ گیا تھا۔
"ای آپ ماموں کو منع کر دیں..... فرزانہ کو زیادہ جھیز نہ دیں ہمارا گھرا تا کشا وہ نہیں ہے کہ اس میں وہ رکھا جاسکے....."

"میں تو یہ سن رہی ہوں وہ کوٹھی سیٹ کر کے دے رہے ہیں۔" رئیسہ بیگم نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔
"آپ انہیں منع کریں..... اور بتائیں۔ ہم تو خود اپنے گھر کو ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں۔"
"وہ تو میں بعد میں اس کو کرایے پر چڑھا دوں گی اس لیے صفائی ستھرائی کروا رہی ہوں؟" وہ ہنستے ہوئے بولیں۔
"مگر یہ تو زیادتی ہے ناں..... کوئی اپنی لڑکی بھی دے اور اپنا سب جمع جتھا بھی دے دے۔"
"اگر میرا بھائی اپنی بیٹی کو جھیز دے رہا ہے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ میں اسے بھلا روکنے والی کون ہوتی ہوں۔ فرزانہ اگر زیور لائے گی تو خود ہی پہنے گی ناں..... ورنہ چالاک لوگ تو دوسروں کا مال لے کر ہڑپ بھی کر جاتے ہیں..... تمہارے باپ نے صبا سے منگنی پر کتنا زیور چڑھا دیا تھا..... میرے منع کرنے کے باوجود بھی ڈھیروں زیورات اس ٹانگ برابر کی بچی کو دے دیے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ فقیر سب کھانی کر برابر کر گئے ہوں گے۔"
"ای، اس وقت صبا اور زیورات کا کہاں سے تذکرہ آ گیا۔ ایک لڑکی جو کہیں مر کھپ گئی، آپ اس سے وابستہ چیزوں کو رو رہی ہیں۔"

"میں تو بیٹا ویسے ہی ایک بات کر رہی تھی۔" رئیسہ بیگم نے بھی سنبھل کر کہا۔
وہ باتوں کی روانی میں بہت کچھ بول جایا کرتی تھیں اور یہ تو انہوں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ اب وہ عامر کے سامنے صبا کا ذکر کبھی نہیں کریں گی۔
"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ اگر وہ منحوس مری نہ ہو..... اور کہیں زندہ بھی بیٹھی ہو تو میں اسے زیور کو اپنے بیٹے کا صدقہ سمجھ کر بھول جاؤں گی۔"
"پھر وہی بات..... پھر اس کا ذکر....." عامر نے ماں کو دیکھ کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے بیٹا کچھ نہیں کہہ رہی بھاڑ میں جائیں وہ زیورات..... وہ سامان..... جو ہم نے صبا کو دیا تھا۔ اب خوش....."
"نہیں....." یہ کہہ کر عامر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

یہ کمال وقت کے ہی ہیں..... کہ وہ لوگوں کی ترجیحات بدل دیا کرتا ہے۔ وہ حادثہ جسے شہلا کے نام سے ہی چڑھی۔ جسے اس کا فون ریسیو کرنا ہی جان کا عذاب محسوس ہوا کرتا تھا۔ اب خالی بیٹھا ہوتا تو بھی اسے سوچے چلے جاتا۔
اس کی معصومیت، اس کی ہنسی..... اس کی شوخی اور پھر اس کی دلہانہ محبت وہ تو اس کی خاطر..... خطروں میں کود پڑی تھی اور وہ کیسا تماشائی بنا رہا تھا۔ اسے اپنے آپ اور اپنے رویوں پر تاسف ہو رہا تھا۔ ایک دن ایسا تو کوئی وہ ریحان کے آفس میں بیٹھا تھا۔

"کئی دن سے ان چھمکتے چھلکے کا فون نہیں آیا، تمہارا سے پاس آیا؟" ریحان نے پوچھا۔

”یہ تم کس طرح ذکر کر رہے ہو شہلا کا..... کیا لڑکیوں کا احترام کرنا بالکل ہی بھول گئے ہو.....“ وہ برہم سے لہجے میں بولا۔

”میرا مطلب ہے ایک سادی سی لڑکی جب تیار شیار ہو کر اپنے آفس جاتی ہے تو پناہ سی تو لگا کرتی ہے ناں.....“

”وہ لگتی ہوگی..... مگر وہ اس ٹائپ کی نہیں ہے۔“

”یہ تو میں شروع سے ہی کہتا تھا کہ بالکل بے وقوف سی لڑکی ہے۔“ ریحان کا لہجہ بے پروائی لیے ہوئے تھا۔

”وہ کہاں سے بے وقوف ہوگئی۔“ حارث نے برا مانا۔

”مجھ سے زیادہ تو تم کہتے تھے..... بلکہ تم تو اس کو پاگل تک کہا کرتے تھے.....“ اب ریحان ہنس رہا تھا۔

”وہ اس لیے کہتا تھا کہ میں خود پاگل تھا۔“ وہ لفظ چبا کر بولا۔

”اوہ..... یہ بات ہے۔“ ریحان کو صورت حال کی تبدیلی کا احساس ہوا۔

”اچھا..... تو میڈم کبسی ہیں؟“

”ٹھیک ہی ہوں گی۔“

”وہاں آفس تو جا رہی ہیں ناں.....؟“

”ہاں..... اور ساجد اس پر عاشق ہو گیا ہے۔“

”خوب صورت لڑکیوں کو سب ہی پسند کرتے ہیں، اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔“

”ساجد شادی کرنا چاہتا ہے..... شہلا سے۔“ حارث نے کہا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے..... شہلا شادی کے بعد بھی ہمارے لیے اپنے شوہر کے معمولات کی رپورٹنگ مزید آسانی سے کر سکے گی۔“

”لگتا ہے..... تمہاری عقل کہیں گھاس چر نے چلی گئی ہے۔“ اس کی باتیں سن کر حارث کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

”میرا مطلب ہے شہلا کو کہیں نہ کہیں شادی تو کرنی ہی ہے ناں..... اس کی اپنی فیملی میں تو کریم، شاہد، ناصر جیسے لڑکے ہی ہیں..... جو کھاتے خاک نہیں ہیں..... مگر کھاتی ہوئی بیوی لانے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔“

”وہ کیوں کرنے لگی ایسی جگہ شادی.....“ حارث نے کہا۔

”تو کیا وہ کہیں شادی نہیں کرے گی؟“ ریحان کلس کر بولا۔

”میں کروں گا اس سے شادی.....“

”اپنی ناپسندیدہ لڑکی سے تم شادی کرو گے.....“ باقی لفظ ریحان کے منہ میں ہی رہ گئے۔

”ہاں، اب اس سے بڑھ کر مجھے کوئی دوسری عزیز ہو ہی نہیں سکتی۔“

”ٹھیک ہے..... یہ فیصلہ تو تمہیں اسی وقت لے لیا پناہ چاہیے تھا..... جب وہ تمہارے بینک میں، تمہیں دیکھنے کے لیے روز چلی آیا کرتی تھی۔“

”اس وقت میں اسے سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔“

”چلو دیر سے ہی سہی..... مگر سمجھ میں تو آئی..... حالانکہ یہ لڑکیاں تو سمجھ میں آنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔“ ریحان نے شوخ لہجے میں کہا تو حارث کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اب پریشانی کیا ہے؟“

”وہی ساجد.....“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اب کوئی کسی سے زبردستی تو شادی کر کے رہا..... اپنی جا ب پر لاس مار کر وہ گھر آ جائے.....
سپل.....“ ریحان نے اسے سمجھایا۔

”مگر وہ فی الوقت جا ب نہیں چھوڑنا چاہتی۔“ حارث نے بتایا۔

”کہیں یہ وجہ تو نہیں کہ ساجد اسے اچھی تنخواہ بھی دے رہا ہے۔“

”وہ صرف اس کی یہ غلط فہمی ختم کرنا چاہتی ہے کہ منورہ میری بہن نہیں تھی..... بلکہ وہ ہماری کرایے دار تھی۔“

”تو وہ بتا دے اسے، کسی بھی طریقے سے۔“

”ہاں اس نے کہا ہے کہ وہ موقع دیکھ کر بات کرے گی.....؟ مگر وہ خاصا شاطر شخص ہے، اپنی زیادہ سنا تا ہے،

اس کی کم سنتا ہے۔“

”چلو ہفتہ بھر میں تو موقع مل ہی جائے گا..... تو پھر بائے، بائے کر کے وہ آ جائے۔“

”ہاں، دیکھتے ہیں کہ کب ملتا ہے، اسے یہ موقع.....“ حارث نے کہا۔

☆☆☆

اور پھر شہلا کو موقع مل ہی گیا..... جب وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر کافی پی رہا تھا۔

”سر میں نے مونا کا بائیوڈیٹا معلوم کر لیا ہے..... مختلف جگہوں سے مگر ہر جگہ سے ایک ہی بات معلوم ہوئی ہے۔“

”کیا پتا چلا..... میرا مطلب ہے اب مزید کیا جھوٹی باتیں معلوم ہوئیں۔“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ سچی ہیں یا جھوٹی..... مگر پتا یہ چلا ہے کہ یہ کچھ عرصے پاکستان میں دو جگہوں پر رہیں،

ایک جگہ فلیٹ میں کسی خاتون کے ساتھ شہر کر کے اور پھر دوسری جگہ..... حارث نای بیٹکر کے گھرائیکی میں وہاں وہ

پے انک گیسٹ تھیں۔“

”تو پھر میں کیا کروں..... رہتی ہوگی وہ.....“

”سر یہ بتا رہی ہوں..... کہ پاکستان میں ان کا کوئی رشتے دار نہ تھا اور نہ ہے..... کینیڈا میں شادی کے بعد

اب وہ جا ب بھی شاید نہیں کر رہی ہیں۔“

”ظاہر ہے کہ کسی موٹی اسائی سے شادی کی ہوگی..... جس کے پاس اتنی دولت ہوگی..... جسے وہ گھر میں بیٹھ

کر اڑ رہی ہوگی۔“

”جی سر..... مگر ان کا یہاں کسی سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ ہی کسی سے رابطہ۔“

”نہیں ہوگا۔“ وہ جمائی لے کر بولا۔ ”اور اب اس منحوس لڑکی کا میرے سامنے ذکر بھی نہیں کرنا۔“

”تو پھر آپ اس کی بابت اتنے پریشان کیوں رہتے ہیں؟“

”اب تو نہیں رہتا.....“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ اب آپ کو یا نہیں آتی؟“

”ہاں، نہیں آتی یا.....“

”شکر ہے..... آپ کی خواہ تنخواہ کی ٹینشن تو ختم ہوئی۔“

”ہاں..... اور اس کی وجہ نہیں پوچھو گی۔“ ساجد اب اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”جی بتائیے۔“ اب وہ اس کی جانب متوجہ تھی۔

”صرف تم ہو، صرف تم..... تم تو مونا سے بھی زیادہ پیاری ہو۔ معصوم ہو، بس مجھے دھوکا مت دینا..... مجھے

دھوکا دینے والے لوگ پسند نہیں ہیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ پاکیزہ 40 نومبر 2016ء

میرا آپ سے ایسا کون سا مالی معاملہ ہے..... جو میں دھوکا دوں گی۔ میں تو آپ کے ہاں جا ب کرنے آئی ہوں..... میری جا ب بھی تو عارضی ہی ہے۔“

”ہاں، جا ب تو تمہاری عارضی ہی ہے۔“

”سر، میرے والدین عمرے کی ادائیگی کر کے آنے والے ہیں..... میں آپ کی یہ جا ب اب چھوڑ دوں گی۔“

”تو کیا تم سزنا صر کے گھر سے اپنے گھر شفٹ ہو جاؤ گی؟“ ساجد نے پوچھا۔

شہلانے حیرت سے اسے دیکھا..... اس نے تو ایک پارٹی سزنا صر کے فلیٹ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

”بھئی سزنا صر..... کا پارلر ہے ناں..... اور وہ ہماری کلائمش کا میک اپ برائے نام پیسوں میں کیا کرتی ہیں۔“

”جی..... جی..... آنٹی سے ہمارے فیملی مراسم ہیں..... ہمارے گمران کا خاصا آنا جانا ہے..... اس لیے انہوں نے کہا تم میرے آ جانا۔ اکیلی گھر میں مت رہنا۔“

”اچھی بات ہے..... اچھی بات ہے..... حالانکہ سزنا صر تو اتنی بری عورت ہے کہ اس کے پاس خود اپنے لیے وقت نہیں ہوتا۔“

اب ساجد پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ اور شہلا متوجش ہی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا ہوا..... کہاں چلی گئیں۔ کہاں ہو..... مون.....“ اس نے لاڈ سے پکارا۔ شہلا اسے دیکھنے لگی۔

”آپ سزنا صر کے بارے میں بالکل صحیح کہہ رہے ہیں کہ واقعی ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔“

”اُف خدا یا..... تم اپنا قیمتی وقت اس فضول عورت کے بارے میں خرچ کر رہی ہو..... جو پہلے ہمارے پروڈکشن ہاؤس میں کام کرتی تھی اور جب اس کا یہاں دل نہیں لگا..... تو اس نے اپنا بیوی پارلر کھول لیا۔“

”مگر وہ اپنے بیوی پارلر..... پر اتنی سنجیدگی سے توجہ کہاں دیتی ہیں۔“ وہ چاہ رہی تھی کہ ساجد کے دل و دماغ میں جتنی بھی باتیں سزنا صر کے بارے میں ہی وہ آج ساری کی ساری حاصل کر لے۔

”بیچاری کا بیٹا سائیکس ہے..... اس کو چھوڑ کر لاہور چلا گیا ہے۔ بس وہ اس کے لیے پاگل ہی رہتی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ..... مگر پھر بھی ہمدرد قسم کی ہیں..... مجھ سے کہا جب تمہارے ای، ابو سعودی عرب میں ہیں تو تم میرے پاس رہو..... اور میرے پارلر میں اپنا ہاتھ بھی صاف کرو تا کہ اگر کسی تمہارا دل جا ب کرنے کو چاہے تو اپنا ذاتی کام کر سکو..... آخر بیوی پارلر کا کام تمہیں آتا تو ہے ہی تو پھر ٹریننگ کرنے کا کیا فائدہ کہ اسے کام میں بھی نہ لاؤ۔“

”اس پاگل عورت نے تمہیں بھی پاگل پنے کا ہی مشورہ دیا ناں.....“

”آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔“ شہلا کو اس کی برہمی پر حیرت سی ہوئی۔

”جب میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں..... تو تمہیں کیا ضرورت ٹھہری کہ تم اٹے سیدھے کام کرتی پھرو گی۔ تم تو آرام سے گھر میں بیٹھنا اور میرے دل پر راج کرنا۔“

”میری شادی کا فیصلہ تو میرے والدین ہی کریں گے۔“ اس نے کھسیا کر کہا۔

”تم کیا سمجھتی ہو..... تمہارے والدین کو مجھ جیسا داماد مل سکتا ہے۔“

”یقیناً نہیں..... بلکہ کسی بھی لحاظ سے نہیں.....“

”تو پھر یہ تصور بھی مت کرو کہ وہ میرا رشتہ قبول نہیں کریں گے۔“

”ڈنگر ڈریں گے تو ناں.....“

”کیلا ڈر..... میں کبھی نہیں.....“

”ایک کروڑ پتی، ارب پتی شخص..... ایک غریب لڑکی سے کیوں شادی کر رہا ہے۔“
”صرف تمہاری خوب صورتی کی وجہ سے..... میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں۔“
”مگر یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت لڑکیاں آپ کے اپنے ادارے میں، آپ کے اپنے حلقہ
اجاب میں ہر طرف ہیں..... تو پھر میں ہی کیوں؟“

”وہ اس لیے کہ تم میری مون ہو اور بس.....“

”اس کا مطلب ہے آپ اپنی پہلی محبت کو نہیں بھولے۔“

”کیا کوئی بھی شخص اپنی پہلی محبت کو بھول سکتا ہے؟“

”ہاں، اس نفسا نفسی کے دور میں تو ایسا ہی ہو رہا ہے۔ خوب سے خوب لڑکی کی تلاش میں آج کے لڑکے،
لڑکیاں اپنی پہلی تو کیا دوسری، تیسری محبتوں کو بھی بخوشی خیر باد کہہ کر راہیں الگ کر لیا کرتے ہیں۔“
”اور تمہارا اپنا کیا خیال ہے..... میرا مطلب ہے تم نے اگر محبت کی تھی تو وہ کیسی تھی؟“
”سر..... اب اس معاملے میں، میں کہاں سے آگئی۔“

”اس معاملے میں تم ہی تو ہو.....“ وہ ہنسا۔

”مگر میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔“

”ریٹلی.....“ اپنی سگریٹ..... لائٹر کی مدد سے جلاتے ہوئے وہ مسکرایا۔

”ہاں کسی سے بھی نہیں.....“

”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ پر ٹرسٹ نہیں کرتیں۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں..... کہ تم نے کسی سے
محبت نہیں کی یا تم سے کسی نے نہیں کی۔“

”اب بے تکی محبتوں کا ذکر کرنا بھی کیا ضروری ہوتا ہے۔“

”ہاں ہوتا تو ہے۔“ وہ پر شوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میرا کزن مجھے پسند کرتا تھا بلکہ محبت کے عامیانہ جملے بھی بولنے کی کوشش کرتا تھا..... مجھے وہ کسی بھی لحاظ سے
اچھا نہیں لگتا تھا..... جبکہ میری سوتیلی بہن اس کو بہت چاہتی تھی..... یوں ان دونوں کی شادی ہوگئی۔“
”اور تم نے اپنی بہن کو خواہ مخواہ چارایا بنا دیا.....“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”جو شخص کسی لڑکی کو پسند نہ کرے وہ اس سے شادی نہیں کیا کرتا۔“

”ہاں، ایسا تو اس نے کہا تھا۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔

”تو پھر..... یہ سمجھ لو..... کہ اس کے دل میں تم آج بھی بسی ہو۔“

”میں اس کا منہ نہ توڑ دوں گی۔“ شہلانے کہا

”وہ جلد اپنی بیوی سے جان چھڑا کر آئے گا..... اور تمہارے گرد گھومے گا۔“

”میں اسے جان سے مار دوں گی۔“ شہلا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”گڈ..... یہی میں چاہتا ہوں۔“ وہ ہنسا۔

”جی.....“ اب وہ لرزتے ہوئے ساجد کو دیکھ رہی تھی۔ نہ جلنے کیوں، اسے اس شخص سے خوف سا محسوس ہو رہا
تھا۔ ساجد کے تہقہ فلک شگاف تھے جو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اور پھر شہلا خوف اور ڈر سے ساکت سی ہوگئی۔

(جاری ہے)

Downloaded From
Paksociety.com

فیصلہ

شمینہ عظیم علی

”وائیہ، اٹھ جاؤ اب۔“ ماہم نے میرے سر سے کپل تھپتھپتے ہوئے کوئی تیسری مرتبہ کہا۔
”کیا مصیبت ہے یار..... چھٹی والے دن انسان سو بھی نہیں سکتا، کیا آفت آئی ہوئی ہے؟“
میں نے سخت جھنجلا کر کہا۔
”جیسے تم جانتی نہیں ہو کہ کیا آفت آئی ہوئی ہے یا آنے والی ہے۔“ ماہم نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

میرا دل لرز رہا تھا (کم بختی انہی آدمیوں سے) ”ماہم ابھی تو نہیں دیکھ رہی۔“ میں نے خواہ مخواہ سب کو اسیر کر لیتی ہے۔

”ہاں۔“ اس کی بات اور ہے۔“

”ہاں، میں نے دل میں تائید کی۔“ اس کی بات

اور ہے۔ اسے اب کسی کی ہار اور جیت سے کیا لینا۔“

”سنیے.....“ اسی وقت امی چلی آئیں۔ ”ماہم کی

کچھ فرینڈز کو نہ بلا لیں، ذرا رونق ہو جائے گی۔“

”کیا ضرورت ہے امی۔“ ابو کے بولنے سے

موتری میں بول اٹھی۔

”ابھی تو صرف رشتہ ہی آرہا ہے، آپ اتنی

ایکساٹھ کیوں ہو رہی ہیں۔“

میرے یوں ایک دم بولنے سے امی اور ابو چپ

سے ہو گئے۔ پھر ابو نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہی تو ہے مگنی میں بلا لینا سب کو۔“

”رشتہ تو ہو ہی چکا ہے۔“ امی نے آہستہ سے کہا۔

”کون سا اب؟“ ”ہاں“ اور ”نہ“ کا فیصلہ کرنا ہے۔“

”ہاں، رشتہ تو ہو ہی چکا ہے۔“ میں نے ذرا سنا

طوریہ کہا۔

”اچھا، تم ذرا گفٹس پیک کر دو جو آپا (پھوپھو)

والوں کے لیے ہیں۔“

”اچھا کر دوں گی۔“ میں نے کہا۔ گفٹس پیک

کرتے ہوئے میں سوچنے لگی کہ مجھے اتنا روکھا ہونے کی کیا

ضرورت ہے جو ہونا تھا ہو چکا... اب کیا فائدہ بد مزگی کا

میں نے خود کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

شام بڑی خوشگوار تھی۔ پھوپھو اور پھوپھا خوشی سے

پھولے نہیں سمارے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ

ابھی سے ماہم کو رخصت کروا کے لے جائیں اور امی

ابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ تارے تو ڈر کر ازین کے

قدموں میں رکھ دیں۔ ماہم کے لیے پھوپھو نے آج کے

دن کے لیے خاص ڈریس پہلے سے ہی بنا کر بھیج دیا تھا

جو کہ مجھے معلوم تھا کہ ازین کی پسند ہی کا تھا۔ جسے پہنے

ماہم اٹھاتی پھر رہی تھی۔ چاری تو وہ پہلے ہی تھی لیکن

اسی وقت امی اندر داخل ہوئیں۔

”دانیہ! شرم کر لو..... دوپہر ہونے کو آئی تمہاری

نیند پوری نہیں ہو رہی..... ماہم بیچاری صبح سے میرے

ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اسے فریش بھی ہونا ہے۔“

”افوہ امی، رشتہ ہی تو آرہا ہے کوئی ہارات تو

نہیں آرہی ناں، آپ لوگوں کی شاہی تیاریاں ختم

ہونے کو نہیں آرہیں۔ کون سا پھوپھا اور پھوپھو پہلی بار

آرہے ہیں اور ازین تو ہر وقت ہی یہیں پایا جاتا

ہے۔“ میں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا تو ماہم کا چہرہ ذرا

ساجھ گیا۔ امی کو تو خوب ہی غصہ آیا۔

”جانتی بھی ہو کہ آج کے آنے اور ہمیشہ کے

آنے میں فرق ہے اور کب ازین ہر وقت یہاں آتا

ہے اور آتا بھی ہے تو اس کا اپنا گھر ہے لیکن اب وہ ہمارا

دانا بننے والا ہے۔ تو ظاہر ہے فرق تو ہوگا۔“

میں منہ بتاتے ہوئے ہاتھ روم میں گھس

گئی۔ میں نے سارے گھر کا جائزہ لیا۔ خوب چمک رہا

تھا امی اور ماہم نے مل کر بہت سی تبدیلیاں کی تھیں۔

نواد بھی ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ابو بھی بہت خوش اور

مطمئن نظر آرہے تھے۔ میرے دل کو عجیب سی بے کلی

نے آگھیرا۔ میں کھن میں چلی آئی۔ وہاں کا سماں ہی

الگ تھا گویا بہت بڑی دعوت کی تیاری ہو رہی ہو۔

”لگتا ہے کہ امی آج ہی ماہم کی شادی کر دیں

گی۔“ میں غصے سے بڑبڑائی۔

”کیا ہوا پٹا..... خوب سوئیں آج، ناشنا

ووں؟“ ہماری پرانی ملازمہ جنہیں ہم خالہ کہتے تھے

مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”بس مجھے چائے بنا دیں۔“ میں نے زور دے

لہجے میں کہا اور ٹی وی لاونچ میں آکر بیٹھ گئی جہاں ابو

بیٹھے ٹینس کا میچ دیکھ رہے تھے۔

”کیا ہوا بھئی، بڑی خاموش ہو، آسٹریلیا اور

فائل نہیں کر رہیں؟“ ابو نے خوش دلی سے پوچھا۔

ماہنامہ پاکیزہ 2016 نومبر 08

ہر طرف چین ہی چین لگتا تھا۔ اس وقت کوئی بھی کسی خصوصی جذبے سے آشنا نہ تھا۔

☆☆☆

”یار، یہ تمہارا کزن کتنا بڈ سم ہے۔“ ماریہ نے بے ساختہ کہا۔ ہم ان دنوں میٹرک میں تھے۔ ماریہ میری نئی دوست تھی۔
 میں نواد کی سالگرہ کی تصویریں اسکول لے کر گئی تھی۔
 ”کون؟ ازین..... ہاں اچھا ہے یہ میری پھوپھا بیٹا ہے۔“

”صرف اچھا.....“ ماریہ نے حیرت سے کہا۔
 ”دیکھو تو پورا ہیرولگ رہا ہے، کیا ارادہ ہے بھئی؟“ اس نے شرارت سے آنکھیں نجاتے ہوئے کہا۔
 ”کیا مطلب.....؟“ میں نے سادگی سے کہا
 کیونکہ سچ سچ ہم نے تو پورا بچپن بہن، بھائیوں کی طرح ہی گزارا تھا۔
 ”الو کہیں کی..... grow up now بچی نہ بنو۔“

میں نے یونہی الجھ کر ایک نگاہ تصویر پر ڈالی تو پہلی بار احساس ہوا کہ واقعی ازین تو..... اب وہ انٹر کر چکا تھا، اس کا قد اچانک ہی دراز ہو گیا تھا۔ چہرے سے بچپن رخصت ہو چکا تھا اور وہ ایک نہایت خوش شکل نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا۔
 وہ پہلی مرتبہ تھا جب میں نے اپنے دل میں دھیمی، دھیمی موسیقی محسوس کی..... یوں جیسے کوئی دور چاندنی رات میں داخلن، بج رہا ہو۔
 ”تم بھی ناں.....“ میں نے ماریہ کو جھاڑا۔
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں نے اس سے کہا۔“

”ایسی کوئی بات ہو جانے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

☆☆☆

”ہاں کیا حرج ہے؟“ میں نے گھرا کر خود کو آہٹے میں دیکھتے ہوئے سوچا۔ جس طرح میں نے

آج تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ سہری بالوں کے حلقے میں اس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا اور سب کی نظریں پھا کر جب ازین اسے دیکھتا تو ماہ و سال کی گردش میرے لیے رک جاتی تھی۔

سب کچھ کتنا مکمل تھا یہاں۔ ابو خوش تھے کہ بہن سے ان کا رشتہ مضبوط ہو رہا تھا۔ ای، خوش تھیں کہ وہ کتنی اچھی بھابی ثابت ہوئی تھیں۔ پھوپھو لاڈلی سبھی کو بہو بنانے کے خیال سے نہال تھیں اور پھوپھا..... ان کے ساتھ خوش..... نواد تو ویسے ہی ازین کا دیوانہ تھا۔ اس کا ٹیورٹ کزن..... اب اس کا بہنوئی بن رہا تھا۔

ماہم اور ازین کی تو بات ہی کچھ اور تھی وہ تو گویا زمان و مکان سے پرے کسی اور ہی دنیا کی سیر کر رہے تھے۔
 اور میں.....؟ میں چپکے سے باہر نکل آئی..... رات سرد تھی اور آسمان خاموش۔

”اللہ ماہم اور ازین کو خوش رکھے.....“ میں دل سے دعا گو تھی لیکن اسی دل کے کسی حصے میں ایک خلش، ایک کنک، ایک درد سا تھا۔
 ”مجھے ازین سے محبت تھی۔“

☆☆☆

ازین میری پھوپھا بیٹا تھا۔ وہ مجھ سے ڈیڑھ دو سال بڑا تھا۔ ماہم مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی اور اس سے پانچ سال چھوٹا نواد تھا۔ پھوپھی کے رواجی تعلقات کے برعکس ہمارے تعلقات ان کے ساتھ مثالی تھے۔ ابو اور پھوپھو دو ہی بہن بھائی تھے اور ایک دوسرے پر جان چمڑکتے تھے۔ ادھر ای اپنے والدین کی اکلوتی اولاد میں تو رشتے داری کے نام پر بس ہم دو گھرانے ہی تھے ایک دوسرے کے لیے سو دلوں گھرانوں میں بڑی محبت تھی بلکہ یہ ایک ہی گھرانہ محسوس ہوتا تھا۔ ازین، میں اور ماہم ایک ساتھ بڑھتے، جھگڑتے اور کھیلتے بڑے ہوئے..... ہمیں کہیں لانے، لے جانے کے لیے ابو، ای ہمیشہ ازین پر بھروسا کرتے تھے اور وہ بھی ہماری مدد کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتا۔ جب تک ہم بڑے نہیں ہو گئے راوی

”اچھا..... ماہم بے پروائی سے کہہ کر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یوں بھی وہ کھلنڈری سی تھی۔ زیادہ غور نہیں کرتی تھی کسی بات پر..... میں دل ہی دل میں ماریہ کو کوستی رہی جس نے میرے دل و دماغ کو کسی اور ہی راہ پر لگا دیا تھا۔

☆☆☆

اور آنے والے دنوں میں وقتاً فوقتاً ماریہ کو میرا کونسا جاری ہی رہا..... جب بھی ازین سامنے آتا میں کھوی جاتی۔ پھر یوں ہوا کہ اس کا ایڈمیشن میڈیکل میں ہو گیا۔ میڈیکل کالج تو شہر میں ہی تھا لیکن سخت پڑھائی کی وجہ سے اس کا آنا جانا نسبتاً کم ہو گیا۔ میں نے بھی پڑھائی میں دل لگالیا اور خود کو یہ بھی سمجھایا کہ ابھی ہماری عمر ان باتوں کی نہیں ہے۔

☆☆☆

سیکنڈ ایئر کے بعد ابو، امی کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔

”دانتیہ بیٹا تمہارے تو ماہر کس بھی اچھے ہیں اور ویسے بھی میرے خیال میں انٹری ٹیسٹ تمہارے لیے مسئلہ نہیں..... ازین بھی ہے، گائڈ کرنے کے لیے۔“

امی نے مجھے سمجھایا۔

لیکن میں امی کو سمجھا نہیں سکی کہ شاید ازین ہی کی وجہ سے میں میڈیکل سے اجتناب کر رہی ہوں میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم دونوں ایک ہی پروفیشن میں ہوں، گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ میرے دل میں یہ خیال پختہ ہو گیا تھا کہ مستقبل میں میری زندگی کا ساٹھی ازین ہی ہوگا۔ حالات و آسٹار بھی یہی تھے۔ ظاہر ہے پھوپھو کو ازین کی شادی کے لیے سب سے پہلے میرا ہی خیال آنا تھا۔ خود میری اور ازین کی بہت اچھی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ابو، امی کا وہ ویسے ہی لاڈلا تھا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہیں آنے والا تھا۔

”کوئی بات نہیں امی۔“ ماہم نے درمیان میں کہا کہ ”والتیہ جو پڑھنا چاہتی ہے اسے پڑھنے دیں۔“

ازین کو غور سے نہیں دیکھا تھا، اس طرح میں خود سے بھی انجان رہی تھی۔ آج خود کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ میرا قد لمبا ہو گیا تھا۔ چہرے پر نوجوانی کی سرخی تھی۔ سیاہ بال کندھوں سے نیچے تک آگئے تھے۔ میری اور ماہم کی شکل بہت ملتی تھی۔ بس میرے بال سیاہ تھے اور اس کے سنہرے۔

میرا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا۔

”کیا ہو گیا ہے۔“ ماہم نے کہا۔ ”آئینے کے سامنے سے ہٹ ہی نہیں رہیں تم۔“ میں بری طرح۔

”وہ..... وہ ماریہ کہہ رہی تھی کہ مجھے آئی بروز بنوانی چاہئیں۔“ میں نے بات بنائی۔ ”ہا نہیں ای اجازت دیں یا نہیں۔“

”بنوالو.....“ ماہم نے اپنی ازلی بے پروائی سے کہا۔ ”امی نے کب ہم پر بے جا پابندی لگائی ہے۔ زیادہ اور تو ہم ہوتے نہیں۔“

”ہاں.....“ میں نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔

شام میں ازین آیا تو میں اس سے پہلی سی بے تکلفی سے بات نہ کر سکی۔

”کیا ہوا ہے دانی..... ٹیسٹ میں نمبر کم آگئے ہیں؟“ اس نے حسبِ عادت میری ناک مرود ڈولی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو میں اسے جوابی گھونسا رسید کرتی لیکن اس دن ناک کے ساتھ میرا پورا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

”تم کیا ازین سے ناراض ہو؟“ رات کو ماہم نے پوچھا۔

”نہیں، نہیں تو کیوں بھلا؟“ میرا دل دھک، دھک کرنے لگا۔

”تم کمرے میں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔“

”وہ..... وہ میرا ٹیسٹ ہے ناں کل..... تو میری تیاری نہیں تھی۔“

کسسا پٹا بہانہ ڈھرایا۔

”پڑھائی سے کون منع کر رہا ہے۔“ امی نے کہا۔
میں حیران رہ گئی۔ امی اتنے آرام سے کیسے کہہ
سکتی ہیں مجھ سے..... کیا ان کی خواہش نہیں ہے کہ

ازین ان کا داماد بنے؟

میں عجیب کنکالش کا شکار تھی اسی الجھن میں پھپھو
کے گھر چلی آئی..... اتفاق سے ازین لان میں ہی مل
گیا۔ اس کے دوست شاید ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر
گئے تھے۔

”ارے، دانی کیا حال ہیں؟“ وہ ہمیشہ والی
خوش دلی سے بولا۔

میں وہیں بیٹھ گئی اور ہم دونوں باتیں کرنے
لگے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں؟
”میرے دوست کی شادی ہے، دیکھو تو پتا ہی
نہیں چلا..... ہم اتنے بڑے ہو گئے۔“ اس نے ہنس کر
کہا اور یہ بات کر کے اس نے میری مشکل آسان
کر دی۔

”پھر تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ میں نے فوراً
پوچھا۔

”ہم.....“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔
”سوچ رہا ہوں میں بھی.....“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے
کہنے لگا تو میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔
”اچھا.....“ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”کوئی لڑکی
ڈھونڈی؟“

”ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ لڑکی تو موجود ہے۔“

”یعنی یہ کہ تم لڑکی پسند کر چکے ہو اور ہمیں بتایا
تک نہیں۔“ میں نے خود اعتماد نظر آنے کی کوشش کی۔

”لڑکی تو میں برسوں سے پسند کر چکا ہوں۔“
اس نے انکشاف کیا۔ ”دیکھا.....“ میں نے دل میں

کہا۔ ”ازین بھی میری طرح ہی سوچتا ہے۔ شاید میری
طرح اس نے بھی سمجھی نہیں سوچا تھا کسی اور کی بھی

میڈیکل میں، میں چلی جاؤں گی۔“

”ارے میری بچی.....“ امی نے نہال ہو کر ماہم
کو گلے لگالیا اور میں بھی مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

ماہم کا ایڈمیشن میڈیکل میں ہو گیا۔ میں اپنے
شوق کے مطابق لٹریچر پڑھ رہی تھی۔ ازین اب
فائل ایئر میں تھا۔ ماہم کے ایڈمیشن کے بعد اکثر وہ
اسے کالج لے جانے یا ڈراپ کرنے کا فریضہ انجام
دیتا تھا۔ اگر سہولت ہوتی تو مجھے بھی ڈراپ کر دیتا
تھا۔ وہ شروع سے ہی ابو، امی کا بڑا بیٹا بن کر رہا تھا۔
اسی اپنائیت اور بے تکلفی کی وجہ سے کوئی یہ نہیں جان
پایا کہ میرے دل میں اس کے لیے کیا جذبات ہیں
اور نہ ہی کبھی میں نے اپنے جذبات اس تک
پہنچانے کی کوشش کی۔

ماہم سے بھی اس کی ایسی ہی بے تکلفی تھی۔ جیسی
مجھ سے یا فواد سے بلکہ ماہم کی اس سے زیادہ بنتی تھی
اور میں مسکرا کر سوچتی۔ ”ٹھیک ہے بھئی، ہونے والا
بہنوٹی ہے اس کا.....“

اس سارے چرسکون ماحول میں پہلے اس
وقت بچی جب امی کی دوست آنٹی مدیحہ اپنے بیٹے
کے لیے میرا پروپوزل لے کر آئیں۔ ان کا بیٹا فراز
بیردن ملک سے تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ اپنے ملک
اور باہر دونوں جگہ سیٹ ہونے کے آپشنز تھے اس
کے پاس۔ آنٹی مدیحہ امی کی بہت پرانی دوست تھیں
اور بے حد مہنسا اور شفیق خاتون تھیں۔ ابو، امی کو تو یہ
رشتہ بے حد پسند آیا جبکہ میں ششدر رہ گئی۔ ایک
کھل تصویر کے بیچ میں سے کوئی ایک کلزا اٹھالے تو
کیسا لگے گا یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟

”امی، یہ کس طرح ممکن ہے..... کیا انہیں علم نہیں
کہ.....“ میں رک گئی۔ کیسے کہہ دیتی۔ میں نے ہمیشہ
سے ایسا سوچا تھا کہ گویا میرا اور ازین کا رشتہ طے ہوا
اور سب کو معلوم ہوا۔

”امی ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں.....“ میں نے

کس قدر بے وقوف تھی میں..... میں نے سوچا کہ دونوں کو ایک پروفیشن میں نہیں ہونا چاہیے اور ان دونوں نے مل کر ایک ہی فیلڈ میں جانے کا فیصلہ کیا..... میں ان کی بے تکلفی کو جس رشتے کی نظر سے دیکھتی رہی، وہ رشتہ میرے اور ازین کے درمیان ہو رہا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے سب میرے خلاف سازش میں مصروف تھے۔

ای، آخر ماں تھیں، شاید میرے دل کی حالت سمجھ گئی جیسی وہ مجھے کچھ اور اس کی نظر آئیں۔

”دانیہ بیٹا! فراز بہت اچھا لڑکا ہے، مدیحہ نے مجھے بتایا کہ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے اور تمہارے ساتھ کا دلی خواہش مند ہے، جیسے ازین، ماہم میں شروع سے انٹرنسٹڈ ہے، ایسی شادی کامیاب رہتی ہے بیٹا۔“ انہوں نے ور پر وہ مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ای آپ نہیں منع کر دیں، مجھے نہیں کرنی شادی۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔

ای نے مجھے بے بسی سے دیکھا اور شاید مجھے وقت دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے آنٹی مدیحہ کو منع کر دیا۔ ابو سے کیا کہا میں نہیں جانتی۔ میں اپنی ذات کے بحران میں مبتلا تھی۔

☆☆☆

”تم نے فراز کے لیے کیوں منع کر دیا؟“ ازین نے مجھ سے پوچھا۔

”تمہیں کیوں اس سے اتنی ہمدردی ہے۔“ میں نے چڑ کر کہا۔

”ہمدردی تو نہیں..... میں ایک بار ملا تھا اس سے کافی عرصہ پہلے..... وہ تو باہر ہی رہتا ہے زیادہ..... لیکن اچھی فیملی ہے اتنا تو معلوم ہے مجھے۔“

”کیا یہ واقعی اتنا انجام ہے؟“ میں نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں نے فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ میں

ہو سکتی ہوں۔“ میں نے یہ موقیع مناسب جانا۔

”امی کی دوست ہیں ناں..... آنٹی مدیحہ وہ میرے لیے اپنے بیٹے کا پروپوزل لائی ہیں۔“

”اچھا..... کب؟ وہ فراز.....؟“ اس نے اتنی بے چینی سے پوچھا کہ میرے دل کو چین آ گیا اب میں مطمئن تھی۔ میں گھر آ کر اطمینان سے سو گئی کہ اب ازین خود ہی سب ٹھیک کر لے گا۔

☆☆☆

”ماہم..... ازین.....؟“ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خبر تھی یا دھماکا جس نے میرے وجود کے پرچے اڑا دیے تھے۔

”آپ نے کئی سال پہلے ہی مجھ سے بات کر لی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ جب تک بچے بڑے نہیں ہو جاتے یہ بات ظاہر نہ کریں۔“ ابو نے کہا۔

”میں نے بھی کہا تھا کہ دانیہ بڑی ہے، جب اس کا رشتہ طے ہوگا پھر ہی آپ لوگ بات کیجیے گا۔“ ای نے بتایا۔

”میں نے تو کم عمری میں ہی فیصلہ کیا تھا کہ ماہم سے شادی کروں گا۔“ ازین نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”مجھے بھی معلوم تھا۔“ ماہم نے شرما کر میرے سامنے اعتراف کیا۔

”تو کبھی بتایا کیوں نہیں۔“ کسی اور کے آگے تو نہیں لیکن ماہم کے آگے میں پھٹ پڑی۔

”تم اتنی چالاک ہو..... کبھی خبر نہیں ہونے دی۔“ میں غراکی۔

”ارے، ہم کون سا برقی پہاڑیوں پر گانے گاتے تھے۔“ ماہم کی وہی ازلی بے پردائی..... ”یا کبوتر کے ہاتھوں خط بھجواتے تھے یا چھپ چھپ کر ملتے تھے۔“ وہ کھلکھلائی۔

”یہ تو..... matter of fact قسم کی بات تھی۔ کیا بتاتی۔“ آخر میں اس نے اسی مصومیت سے آنکھیں پھٹائیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساری حقیقت کو دل سے تسلیم کر لینے کے باوجود ان کی محبت کے یہ مظاہرے میرے دل کو بجا کر رکھ دیتے تھے۔

☆☆☆

ماہم کو گئے تیسرا دن تھا۔ ابوٹی وی لاؤنج میں بیٹھے لی وی دیکھ رہے تھے۔ پیچھے ای اور میں ڈائننگ ٹیبل پر کراکری خشک کر رہے تھے۔ کچھ مہمان کھانے پر مدعو تھے۔ بریکنگ نیوز کے مخصوص میوزک پر ہم ذرا چونک سے گئے گوکہ اب پل، پل کی بریکنگ نیوز ان نیوز چینلوں کا ذمہ بن چکی ہیں۔ لیکن آج کے یہ الفاظ ہی ایسے تھے کہ سب کو چونکا کر رکھ دیا۔

”میڈیکل کالج کی طالبات کی گاڑی کو حادثہ ہو گیا۔“ ای کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی۔ میں نے جا کر انہیں سنبالا۔ ابھی کوئی تفصیل نہیں آئی تھی۔ میڈیکل کالج بہت سے ہوتے ہیں، لاتعداد گاڑیاں ہوتی ہیں اور ان گنت طالبات.....

ہم ایک دوسرے کو تسلی دینے کی کوشش کرتے رہے، فواد اظہر اظہر فون کر رہا تھا۔ پھوپھو، پھوپھا، ازین سب ہمارے گھر جمع ہو گئے تھے۔ دعائیں پڑھ، پڑھ کر ہمارے ہونٹ خشک ہو گئے۔ دل میں لاتعداد خدشات تھے۔ ایک دوسرے سے نظریں چراتے، چراتے بہت وقت گزر گیا۔ حتیٰ کہ اسلام آباد سے آنے والے ایک فون نے ہمارے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی۔

☆☆☆

ماہم کی تصویر آنکھوں سے لگا کر میں سک پڑی۔ چھ ماہ ہو گئے تھے لیکن ہمارے زخم ای طرح ہرے تھے۔ گویا آج ہی یہ قیامت ہم پر گزری ہو، وہ معصوم سی کھلنڈری سی لڑکی، لگتا تھا کہ گھر کی ساری رونق اسی کے دم سے تھی۔ اس کے جانے کے بعد گھر کے درو یوار خاموش ہو گئے تھے۔ ہر وقت، ہر طرف وحشت کا راج تھا۔ ابو کمرے سے دو، دو دن باہر نہ نکلتے، ای جائے نماز پر بیٹھی آنسو بہاتی رہتیں۔

نے آہستہ سے کہا۔ اور یوں ہی آہستہ، آہستہ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ میں کیوں سب سے بدگمان ہو رہی تھی۔ کسی نے میرے ساتھ دھوکا نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے ابو، امی زبردستی تو نہیں کر سکتے تھے کہ ماہم کو چھوڑ کر دانیہ کا رشتہ لے لیں..... پھر کیا اس صورت میں ازین مان جاتا.....؟ اور میں ماہم کو کیا منہ دکھاتی۔ ازین نے کبھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس کی بنیاد پر میں نے اپنے خوابوں کے عمل کھڑے کیے تھے۔ وہ سب میری اپنی اختراع تھی..... لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب خود کو اچھی طرح سمجھانے کے لیے مجھے وقت درکار تھا۔

☆☆☆

ماہم اپنے کالج کے ٹرپ پر مری، بھور بن وغیرہ جانے کے لیے بھد تھی جبکہ ای، ابو کچھ ہچکچا رہے تھے۔ ”کیا ہے..... ای، میری ساری کلاس فیلوز جارہی ہیں، آپ لوگ اتنے کنزرویٹو نہیں ہیں۔“ اس نے لاڈ سے کہا۔

”بیٹا یہ بات نہیں ہے۔ بس تم لوگوں کو کبھی اکیلے اتنی دور بھیجا نہیں اور حالات.....“ ابو نے پیار سے سمجھایا۔ ”اور اتنی بار تو گئے ہیں، مری، اسلام آباد وغیرہ.....“ ای نے ٹوکا۔

”ای، کلاس فیلوز کے ساتھ تو نہیں مٹی ناں..... ہر کمپنی کا اپنا ایک الگ مزہ ہوتا ہے، میلی کا الگ، فرینڈز کا الگ.....“ ماہم بولی۔

اور پھر حسب معمول ازین اس کی مدد کو آن پہنچا اور ازین کے پاس تو چادو کی چھڑی ہوتی تھی جسے گھماتے ہی ابو، امی موم ہو جایا کرتے تھے۔ ”تمہاری ضد کی خاطر مانا ہوں میں بھی۔“ ازین نے بعد میں اس سے کہا۔

”تھوڑا عرصہ صبر کرتیں پھر ساتھ چلتے ہم دونوں۔“ ازین نے ماہم کو چھیڑا تو وہ جھنجھکی۔

کی طرف ٹوٹتے گئے۔ میں گھر کے کاموں میں خالہ کے ساتھ مدد کرنے لگی۔ فواد اپنی پڑھائی میں..... ازین اپنی جاب پر جانے لگا۔

میری دوست ماریہ کی شادی تھی۔ وہی ماریہ جس نے پہلی بار میرے دل میں ازین کی محبت کا چراغ جلایا تھا لیکن بعد میں جب ماہم اور ازین کی منگنی ہوئی تو میں نے اس سے یہی کہا کہ مجھے ازین سے اس طرح کی کوئی دلچسپی نہیں ہے..... ماہم کی موت کے بعد ماریہ نے میرا بہت خیال رکھا تھا اور اس نے شادی پر نہایت اصرار سے بلایا تھا۔ اس نے ای سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مجھے اس کی شادی پر ضرور بھیجیں گی۔

”چلی جاؤ بیٹا! بہت اصرار کیا ہے اس نے۔“

ای نے مجھے سمجھایا۔

”میرا دل نہیں چاہتا ای۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”چلی جاؤ وانیہ..... کیا کر سکتے ہیں، اپنے غم کی وجہ سے کسی کی خوشی خراب نہیں کرتے، تمہارے بچپن کی دوست ہے، بہنوں جیسی ہے، میں نے ازین سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں بلے جائے گا۔“ ای نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔

میں نے کمرے میں آکر المازی کھولی اور بے دلی سے کپڑے دیکھنے لگی۔ ماہم کے جانے کے بعد سے میں نے کوئی شاپنگ نہیں کی تھی۔ یوں ہی بے خیالی میں، میں نے ماہم کے کپڑوں کی سائڈ کھول لی، ہم دونوں کے کپڑوں کا ایک ہی سائز تھا۔ ہم اکثر ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیا کرتے تھے۔ لیکن ماہم لاابالی تھی، وہ جنز، ٹراؤزر، لی شرتس وغیرہ زیادہ پہنتی تھی جب کبھی اسے کسی مکمل شلوار تھیں اور وہ بچنے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ مجھ سے ہی رجوع کرتی تھی۔ لیکن منگنی پر پھوٹنے سے کئی بے حد خوب صورت فینسی ڈریس دیے تھے۔ میں خیالوں میں کھوئی

اس کے کپڑوں پر ہاتھ پھیر، پھیر کر دیکھ رہی تھی۔ یہ سب بھی اس نے پہنے بھی نہیں تھے۔ میری آنکھوں

میں خاموش بیٹھی ماہم کی چیزوں کو جھانکتی رہتی۔ ہمارا کمرہ مشترک تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ابھی کبیل اچھا کر اٹھے گی، ابھی ہاتھ روم سے نکلے گی۔ ہر طرف اس کے کپڑے جوتے، کتابیں، مجھے ہر پہل اس کی یاد دلاتے رہتے اور میرا دل چاہتا کہ یہ سب یوں ہی رہے۔ میں وہاں سے کچھ بھی ہٹانے کو تیار نہیں تھی۔ فواد بچپن سے چھوٹا تھا، وہ ادھر سے ادھر پھرتا رہتا۔ ایک پرانی ملازمہ تھیں جو ہم سب کو زندہ رکھنے کی سعی میں ہلکان رہتیں۔ کبھی زبردستی دونوں لے کھلا دیتیں، کبھی چائے کبھی دودھ لیکن ازین کو دیکھ کر ان کا ضبط ختم ہو جاتا اور اسے لگے سے لگا کر آنسو بہانے لگ جاتیں۔

ازین کی تو حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ پتا نہیں کیسے وہ زندہ تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس دنیا میں ایک پہل نہ رہتا جہاں اس کی ماہم نہیں تھی۔

”ای، مجھے ماہم سے بڑی محبت تھی۔“ میں ای کے گلے لگ کر بلک، بلک کر رونے لگی۔ ای کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی چھڑی جاری ہو گئی۔

”ای، میں نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا۔ کبھی اسے بددعا نہیں دی۔“ میں نے آخر اس احساس جرم کا اعتراف کر لیا جو مجھے ہر وقت گھیرے رکھتا تھا۔ میں آدمی رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں نے ان دونوں کی خوشیوں کو نظر نگاہی۔ شاید میری آہ ان کو لگ گئی۔ پھر میں اپنے آپ کو ہی صفائیاں دینے لگ جاتی کہ میں نے کبھی ان کا برا نہیں چاہا تھا۔ جو حقیقت تھی اس کو تسلیم کر لیا تھا۔

”میں جانتی ہوں میری بچی.....“ ای نے میری پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”تم اپنے دل پر ایسا کوئی بوجھ نہ رکھو۔ کیا ماہم کی جدائی کا بوجھ کم ہے؟“ وہ پھر سے رونے لگیں۔ ہم دونوں گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگے۔

☆☆☆

ماہم کو جدا ہوئے ایک سال سے اوپر ہو گیا۔ دل میں ایک ایسی زخم لیے ہم سب بھی آہستہ آہستہ رہ گئی۔

ماہنامہ پاکیزہ 54 نومبر 2016ء

بہترین تحریریں، لاجواب رواد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
مگر گزشتہ کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
مگر گزشتہ

شمارہ نومبر 2016ء

کی جھلکیاں

اشک رواں

اردو ادب کے اس نامور ادیب کی سوانح
حیات جو ال جاہل بچپن پر مجبور ہوا،
غربت کے آسے کیسے کیسے کھد دینے

شہزادی گل

خاندان مغلیہ کی اس شہزادی کا تذکرہ جس
نے بلتستان کے برف پوش پہاڑوں میں
زندگی گزار دی۔ محبت کا دلچسپ شاخسانہ

بیمثال بی بی نوربتو

نبایت دلچسپ ستر کہانی، ان کے لیے رہنما
تحریر جو مغربی ممالک میں رہنے کو ترجیح
دیتے ہیں۔ ہر صفحہ ایک نئی کہانی

انجام

ایک ایسی سچ بیانی جسے آپ دل
کی گہرائی سے سراہیں گے

ماہنامہ

”سراب“ اور ”اس ماہ کی شخصیت“ کے ساتھ بہت
سی دلچسپ سچ بیانات، اثر رکھنے والے واقعات

www.paksociety.com

میں نئی آگئی۔

نہ جانے اس وقت کس جذبے سے مغلوب ہو کر
ماہم کا ایک ڈریس نکال کر پہن لیا۔ ازین مجھے دیکھ کر
بری طرح چونک گیا۔

”یہ.....“ الفاظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔

”اوہ.....“ مجھے شرمندگی نے آگھیرا۔ یقیناً

اس نے ماہم کے کپڑے پہچان لیے تھے۔ اسے ماہم
کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی یاد تھی۔ ہو سکتا ہے یہ
کپڑے اسی نے خریدے ہوں یا دونوں نے ساتھ
خریدے ہوں۔

مجھے بری طرح عفت محسوس ہوئی۔

”دراصل، میں نے کافی عرصے سے کوئی

شاپنگ نہیں کی۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔

”اٹس آل رائٹ.....“ مجھے لگا جیسے وہ ہلکا سا

مسکرایا تھا۔

شادی ہال پر اترتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

”تم اگر بال ڈائی کروالو تو بالکل ماہم لگو گی۔“

بڑی مدت کے بعد میرا دل اپنے پرانے انداز

میں دھڑکنے لگا۔

☆☆☆

”بیٹا دانیہ.....! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی

ہے۔“ شام کو میں ابو کے کمرے میں گئی چائے لے کر تو

انہوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بات شروع کی۔

”جی ابو.....“ میں نے ان کی طرف دیکھا اور

جب بھی ان کی طرف دیکھتی تھی میرا دل دکھ سے بھر

جاتا تھا۔ میرے اتنے زندہ دل ابو بالکل مرجھا کر رہ

گئے تھے۔

”بیٹا یہ بات تمہاری امی کے کرنے کی

ہے..... لیکن وہ جس جذباتی کرائس میں ہیں۔“ ابو

نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں سمجھتی ہوں ابو.....“ میں نے ان کا مفہوم

سمجھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا ماہم کی جدائی ہمارے لیے بہت بڑا صدمہ

جب امی کا چہرہ قدرے کھلا کھلا سا تھا۔ ان کی آنکھوں کی ویرانی میں بھی کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگا کہ امی کی خوشی کا سبب آٹلی مدیحہ ہیں، شاید امی کو لگتا تھا کہ اس بار میں ہاں کروں گی۔

”تمہارے ابو نے تم سے مدیحہ کے بیٹے والی بات کی ہوگی۔“ وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔
”اوہ..... تو گویا میں ٹھیک ہی سمجھی تھی۔“ میں نے سوچا۔

”انہوں نے یہ بات شاید تمہاری پھوپھو کو بھی بتادی۔“

”پھر.....؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ اب اس بات کا پھوپھو سے کیا تعلق تھا۔
”ارے.....“ امی بے ساختہ ہنس پڑیں۔

”تمہاری پھوپھو اور پھوپھا تو خفا ہی ہو گئے۔ فوراً دوڑے چلے آئے، ابھی ابھی تم گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دانیہ تو ہماری بیٹی ہے، ماہم کے بعد آپ لوگوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم دانیہ کو کہیں اور جانے دیں گے۔ انہوں نے ازین کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔“

میرے چہرے پر پھیلتے رنگ امی کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔

”تم تو جانتی ہو، ازین ہمیں کتنا عزیز ہے، ہم نے ہمیشہ اسے اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے، ماہم نہ رہی، اللہ کو یہی منظور تھا۔ ان کے لیے تم میں اور ماہم میں کوئی فرق نہیں۔“

”اور ازین.....؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔
”بھئی..... اس کی مرضی کے خلاف وہ اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتے ہیں بلکہ اسی نے کہا ہے۔“ مجھے لگا میرے کمرے میں کہکشاں اتر آئی ہے۔

یہ سب قدرت کی طرف سے تھا۔ میں نے کبھی ان کا برا نہیں سوچا، نہ درمیان میں آنے کی کوشش کی، نہ کوئی گھنیا چال چلی..... ماہم کا جانا مقدر میں تھا اور شاید ازین کا ساتھ میری تقدیر میں ہی لکھا تھا۔ اس میں کیا غلط تھا مجھے کسی نہ کسی سے شادی کرنی ہی تھی پھر

ہے، اس کی کمی ہماری زندگی میں ہمیشہ رہے گی لیکن.....“ ان کی آواز بھرا گئی۔ ”موت مدحت ہے ہم اسے جھٹلا نہیں سکتے۔“ انہوں نے چائے کے دو تین گھونٹ لیے۔

”شکر یہ دانیہ بہت اچھی چائے بنائی ہے۔“ انہوں نے اپنے چہرے پر بشارت لاتے ہوئے کہا۔
”تو بیٹا میں سمجھتا ہوں کہ اب موو آن کا وقت آ گیا ہے، ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔ اپنی، اپنی زندگیوں کی طرف..... خصوصاً تمہیں..... ازین کو..... فواد کو۔“ مجھے ہلکی سی کپکپی ہونے لگی۔

”ابو کیا کہنے والے ہیں..... کیا پھوپھو نے ان سے کچھ کہا ہے، اس موو آن کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا تعلق مجھ سے اور ازین سے ہے۔“

گزشتہ دنوں ازین ہمارے گھر پھر سے ریگولر آنے لگا تھا۔ امی، ابو کے ساتھ بیٹھتا، میرے اور فواد کے ساتھ وقت گزارتا۔ آنکھوں میں ایسی مستقل اداسی کے باوجود کبھی کبھی مسکراتے بھی لگا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں قدم، قدم پر ماہم کی یادیں بکھری تھیں۔

”بیٹا گزشتہ سال بھی بہن مدیحہ نے اپنے بیٹے کے رشتے کی بات کی تھی۔ اس وقت شاید آپ تیار نہیں تھیں اب انہوں نے دوبارہ بات کی ہے۔ ان کے بیٹے کی شادی نہیں ہوئی اب تک۔ وہ اب بھی ہمارے گھرانے میں ہی انٹرسٹڈ ہیں۔“

”اُف.....“ میں نہایت کوفت کا شکار ہوئی۔
”یہ آٹلی مدیحہ کہاں سے فیک پڑتی ہیں ہر بار؟“
”آپ دوبارہ اس پر سوچیں پھر اپنی امی کو جواب بتادیں گے۔“ ابو نے کہا۔
”جی ابو۔“ میں نے فرمانبرداری سے کہا۔

☆☆☆

”دانیہ.....“ امی نے میرے کمرے میں جھانکا۔ میں یوں ہی ایک کتاب لیے بیٹھی تھی لیکن میرا ذہن خالی تھا۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر امی کو دیکھا تو مجھے ان میں کچھ نیا پن محسوس ہوا۔ ماہم کے بعد یہ پہلا موقع تھا

”اگر تم بال ڈائی کروالو تو بالکل ماہم دکھو گئی۔“ ازین کی آواز میرے کانوں میں گونجی..... یعنی وہ مجھ میں ماہم کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کس کو دھوکا دیتا، مجھے یا خود کو..... میں نے اس رات ماہم کی الماری سے اس کے گفٹس، کارڈز سب نکال کر دیکھے، اس کے موبائل میسرز..... وہ جنون کی حد تک اس سے محبت کرتا تھا۔

اگر وہ مسلسل ماہم کی محبت میں مبتلا رہتا تو میری اپنی سگی بہن کے لیے محبت، رقابت اور پھر نفرت میں بدل جاتی۔

وہ مجھ سے محبت کرنے لگتا تو میں مٹھوک بھی رہتی یا شاید اس دکھ میں مبتلا ہو جاتی کہ مرد کی محبت کتنی ناپائدار ہے اس نے کیسے اتنے آرام سے ماہم کو بھلا دیا۔ وہی گھر، وہی فیملی، وہی ماحول، وہی سسرال..... ہم کبھی ماہم کے خیال سے دامن نہ بچا سکتے اور ایک دن ایسا آتا کہ میری اپنی سگی بہن اور ازین کی محبت ہمارے درمیان ایک تکلیف دہ موضوع اور وجہ تازع بن جاتی۔ فراز کی محبت نے میری ساری محرمیاں دور کر دیں۔ ازین بھی اپنی بیوی الوینہ کے ساتھ خوش نظر آتا تھا۔ اس کے نزدیک ماہم، ازین کی کزن تھی جو عین جوانی میں یہ دنیا چھوڑ گئی تھی۔

میں نے دیکھا، ماہم کی تصویر کے آگے میں اور ازین کھڑے تھے۔ فراز کو بچے ڈھونڈنے کی رونق دکھانے گھسیٹ لے گئے تھے۔ الوینہ بھی شاید اس ہلے گلے میں چلی گئی تھی۔

ہم دونوں نے تصویر کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

ازین کی آنکھوں میں جوئی تھی اس کے لیے اسے مجھے کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

میری آنکھ سے جو آنسو ٹپکا تھا وہ رقابت کا نہیں محبت کا تھا۔

وہ ازین کیوں نہیں اور ازین کو کسی نہ کسی سے شادی کرنی ہی تھی پھر وہ میں کیوں نہیں..... میرا دل مطمئن تھا۔ میں نے اپنا سر تکیے پر رکھا اور سنہری سپنوں کے سمندر میں خود کو بہہ جانے دیا۔

☆☆☆

آج دس سال بعد میں وطن واپس آئی تھی۔ گھر کے سامنے رک کر میں نے گھر کو دیکھا اور بچپن سے لے کر شادی تک کے واقعات میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔

میری فیملی کے اندر داخل ہوتے ہی خوشگوار پاپل بچ گئی۔ ہم دونوں اور ہمارے دو بچے..... ریان اور اپنی..... فواد کی شادی تھی اور ڈھونڈی رکھی جا چکی تھی۔ ہم دونوں لاڈلے میں گئے ماہم کے فل سائز.... پورٹریٹ کے آگے رک گئے۔

میں نے دیکھا دو اور لوگ بھی وہاں آ کر رک گئے تھے۔

”دانیہ اپنی بہن کو ایک لمحہ بھی نہیں بھولتی۔“ فراز نے کہا۔

”ازین بھی اپنی اس کزن کا بہت ذکر کرتے ہیں۔“ الوینہ نے کہا۔

میں نے اور ازین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جی ہاں، اس دس سال پہلے وہی رات کی صبح اٹھ کر میں نے فیصلہ فراز کے حق میں دیا تھا۔ ای، ابو سے میں نے یہ ہی کہا تھا کہ میں نے ازین کو ہمیشہ ماہم کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اسے کوئی اور حیثیت دینا میرے لیے مشکل ہے۔ اور یہ اس لیے کہا۔ کیونکہ

ازین کے لیے ماہم کے بعد کسی کو ”وہ“ حیثیت دینا ممکن نہ تھا۔

فرق یہ تھا کہ ازین کی بیوی کوئی اور عورت ہوتی تو وہ اس بات سے ناواقف رہتی لیکن میں یہ بات کیسے بھول جاتی؟ میں ان کی محبت کی پل، پل کی گواہ تھی۔

اس رات میں بہت خوش تھی۔ مجھے نیند نہ آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی اور خود کو آئینے میں دیکھا۔

اس رات میں بہت خوش تھی۔ مجھے نیند نہ آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی اور خود کو آئینے میں دیکھا۔

اس رات میں بہت خوش تھی۔ مجھے نیند نہ آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی اور خود کو آئینے میں دیکھا۔

اس رات میں بہت خوش تھی۔ مجھے نیند نہ آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی اور خود کو آئینے میں دیکھا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچس کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

مہرنگ جاننازما

محرر صاحب

میں قدم رکھنے کی غلطی نہیں کی..... آپ ہی ملاحظہ کریں
اس کے مزاج..... "عزیزین کا توں کو ہاتھ لگانے والے
انداز میں بولی تھیں۔
"روم فریج یقیناً خالی نہیں ہوگا جیسی راوی چین ہی

"کیسے مزاج ہیں اس پھولن دیوی کے؟"
رات کو کھانے کی میز پر ذوالفقار صاحب نے عزیزین
سے پوچھا تھا۔
"میں نے تو صبح کی جنگ کے بعد اس کی کچھار

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From
Paksociety.com

آنسوؤں سے بھرائی آوارہ پر ختم ہوا تھا اور وہ شوں شوں کرتی..... پاؤں پھٹی کرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔
”یہ کب نازل ہوئی؟“ ان دونوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں کے تاثرات ہی بچاگرگی میں بدل گئے تھے۔

کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا اس کا..... ایسا ڈیفالڈ نہیں تھی وہ..... اور پھر وہ دونوں گہری سانس بھر کر پھر سے کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے یہ تو روز کا معمول تھا..... اس کے لیے اب بھوکا تھوڑی رہا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

ان دونوں کی ہر بات جہازوں سے شروع ہو کر PAF پر ختم ہوتی تھی..... وہ جاگتی آنکھوں سے اس دن کا خواب دیکھا کرتے تھے کہ جس دن وہ PAF رسالہ پور میں ہوں گے۔

سعد مجیب عالم..... اسے آپ موی کی ایسیٹیشن سمجھیے..... بس یہ کہ وہ لڑکا تھا..... جنون وہ تھا کہ دیوانگی کی حدوں سے پار ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ موی کی طرح اسیج بناتا تھا..... نہ ہی ریویوٹ سے ایرو پلینز اڑاتا تھا۔

لڑکے پیدا ہونے کی ایسیٹیشن ہوتے ہیں..... سو سعد مجیب عالم بھی تھا۔ شروعات کاغذ کے جہازوں سے ہوئی تھی..... سعد کو بس کوئی نہ کوئی کاغذ چاہیے ہوتا تھا..... پرانے اخبار، پرانی ہوم ورک کی نوٹس بکس غرض ہر وہ کاغذی چیز جس کا جہاز بنایا جاسکے سعد مجیب عالم کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتی تھی..... اسکول سے آنے کے بعد جب گل ان دونوں کو سنانے کے لیے بھیجتی تھی کہ شام میں ان کے ٹیوٹر نے آنا ہوتا تھا..... تو سعد چپکے سے لان میں نکل کر آیا کرتا تھا اور بس پھر..... کاغذ ہوتے اور ان کے جہاز بنتے چلے جاتے۔

شروع، شروع میں اس کے کاغذی جہاز بھی دور تک اڑ نہیں پاتے..... نوک کے بل زمین پر گر جاتے تھے۔
”اوہ..... یہ بھی کریش ہو گیا.....“

وہ کہتا..... مگر اس کے کہنے میں افسوس کا عنصر

عین لکھ رہا ہے۔ وہ کھانا نکالتے ہوئے بولے تھے۔
عبرین بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔ یہ وہ ہی تھیں جنہوں نے اس کی بھوک ہڑتال کے زمانے میں بھی روم فریج کو خالی نہیں رہنے دیا تھا۔

”ویسے اسے یوں روتا دیکھ کر میں نے سوچا ہے کیوں نہ اسے ایک دفعہ اور موقع دیا جائے..... کیا ہے؟ اتنی لڑکیاں جوائن کر رہی ہیں اب آری.....“ عبرین نے ان کے سامنے رکھے ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال کر ان کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”بات ضد کی نہیں ہے عبرین..... بات یہ ہے کہ وہ نہیں کر سکتی..... وہ نہیں جانتی کہ وہ اس شوق کی اہل بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ اتنے نخروں اور نازکی سے پٹی ہے۔ سولہ سال کی عادتیں چند سالوں میں نہیں بدلتیں..... وہ بھاگ کر آجائے گی لکھو الوبجھ سے۔“
”بھاگ کر آنے کو ہی..... اسے یہ موقع تو دیں.....“ اب کہ وہ کھانے سے ہاتھ روک کر بولی تھیں۔
اس بات پر انہوں نے بھی رک کر بیوی کو دیکھا تھا۔
”رہ لوگی اس کے بغیر..... سچی بات ہے مجھ سے تو نہیں رہا جاتا۔“

”مگر وہ.....“

”چلو دیکھتے ہیں۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر بولے تھے۔

”ہا نہیں غصے کے معاملے میں یہ لڑکی کس پر چلی گئی ہے..... ہماری فیملی کا تو کہیں سے بھی اور کوئی بھی سلسلہ نسب پھولن ویوی سے جا کر نہیں ملتا.....“ وہ سر جھٹک کر ذرا سی خشکی سے کہہ رہی تھیں اور اس بات پر..... ذوالفقار صاحب نے بے اختیار قبہہ لگایا تھا..... وہ خود بھی مسکرا دی تھیں مگر..... مگر اگلے ہی لمحے ان کی مسکراہٹ ایک آواز سے فوراً غائب ہوئی تھی۔

”کر لیں..... کر لیں..... دونوں مل کر میری غیبتیں..... میرے ہی گناہ محاف ہوں گے۔ خود یہاں دونوں کتنے مزے سے کھانا کھا رہے ہیں اور میرا کوئی خیال ہی نہیں۔“ غصے سے بھرا لہجہ ہمیشہ کی طرح

اسٹک پھینکنے سے پہلے اس کے ذہن میں یک دم کوئی خیال آیا تھا..... اس نے اسٹک کو آنکھوں کے قریب لے جا کر دیکھا اور پھر ذرا دور لے جا کر..... اور پھر اس نے شہادت کی انگلی کو اسٹک کے آخری اوپری سرے سے ذرا نیچے رکھ کر دیکھا۔ انگلی ہٹائی..... پھر رکھی..... پھر ہٹائی اور ایک دفعہ پھر سے رکھی۔

”یا میرے خدا..... وہ تو جہاز جیسی دکھ رہی تھی۔“ اور بس..... اسی دن سے اس نے اسٹکس جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ کاغذ کے جہازوں کا دور ختم ہوا..... اسٹکس کے جہاز بننے لگے..... صلیب کے نشان جیسے جہاز..... دو آکس کریم اسٹکس کو جوڑ کر بنائے گئے جہاز.....

ذرا اور بڑا ہوا تو ویڈیو گیمز کا چمکا پڑ گیا..... اور اب وہ دوپہر کے ٹائم میں ویڈیو گیمز کھیلتا تھا، مگر سے چھب کر نہیں..... ان کے سامنے ہی..... ڈانٹ کھاتے ہوئے مگر یہ جو جنون ہوتا ہے نان..... یہ انسان کو نیم پاگل بنا ڈالتا ہے۔

”ڈانٹ“ اس جنون کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو جنون خون کے اندر روڑتا تھا اور سعد مجیب عالم کو اکساتا تھا۔

”ہاں، ہاں تمہیں جہاز اڑانا ہے۔“ مگر..... اس دن تک انتظار کون کرے..... کہ کب وہ دن آئے اور وہ PAF کا جنگجو جہاز اڑا سکے۔ اور جب پاکستان ڈے پریڈ ہو تو وہ شیر دل فارمیشن کا حصہ ہو۔ کون کرے اتنا لمبا انتظار..... وہ ویڈیو گیمز کھیلتا، جہاز اڑاتا اور اس حس کی تسکین کرتا جو کہ اسے جنونی بناتی تھی..... اس کے ہاتھ بے تاب تھے۔ F-16 کے اسٹیرنگ کو تھامنے کے لیے۔

☆☆☆

”ٹھک ٹھک ٹھک.....“ دروازے پر بہت ہلکی سی مگر متواتر دستک ہوئی۔

ہنیانے غصے سے بھری ایک تیز لیزر شعاعوں جیسی نظر دروازے پر ڈالی گئی۔ یوں جیسے اس کی نظر

ہرگز شامل نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات جیسے built in تھی کہ ایک دن وہ اس طرح کا کاغذ کا جہاز بنائے گا جو کہ ٹوک کے بل زمین پر نہیں گے گا۔ وہ ایک لمبی مستی بھری اڑان بھرتا ہوا بحفاظت لینڈ کرے گا۔ اور یہ جنون تھا کہ اسے ایسا کاغذی جہاز بنا کر اڑانا تھا جو کہ صحیح طرح سے اڑتا..... ایک مستی بھری اڑان بھرتا..... دوپہر کا سونے کا وقت ہوتا اور سعد کے جاگنے کا۔ دنیا بھر کے روی کے کاغذ ہوتے اور اس کے دو چھوٹے، چھوٹے ہاتھ..... کاغذ، جہاز بنتے، اڑتے کوئی اس کے عین قدموں کے پاس ہی گر جاتا..... کوئی ذرا سا آگے جا کر بے ڈول ہو کر گر پڑتا۔ کوئی دائیں، کوئی بائیں۔

ہاتھ نٹے سے نیا جہاز بناتے جاتے اور اڑاتے جاتے اور گھر کا لان کاغذی جہازوں سے بجا چلا جاتا۔ اور جب اسے معلوم ہوتا کہ اب مگر جگانے آئیں گی تو اس وقت سے ذرا سا پہلے وہ سارے کاغذی جہازوں کو لان سے اٹھاتا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیتا اور پھر خاموشی سے آکر اپنے بیڈ پر لیٹ جاتا۔

☆☆☆

پھر وہ دن بھی آیا جب ایک یونیورسٹی میں space week کا اعلان ہوا اور اس میں راول پنڈی اور اسلام آباد کے مختلف اسکول نے حصہ لیا۔ ایک اسکول نے paper plane competition میں حصہ لیا تھا۔ وہ مقابلہ ایک سات سالہ بچے نے جیتا تھا۔ اس کا جہاز دور تک اور ایک مستی بھری اڑان بھرتا ہوا اڑا تھا۔ وہ بچہ کوئی اور نہیں یقیناً سعد مجیب عالم ہی تھا۔

وہ ہی سعد مجیب عالم جو بچپن سے ہی دوپہر کے سونے کے ٹائم پر روی کاغذوں سے جہاز بنایا کرتا تھا۔ مزید یہ کہ ان دونوں بہن، بھائیوں کو کالونی کے لین میں آکس کریم بیچنے والے سے آکس کریم لے کر کھانے کی عادت تھی۔ موی آکس کریم اسٹکس بھینک دیتی تھی جبکہ سعد وہ تو تھا ہی پیدا ہی انجینئر..... ایک دن آکس کریم

لجہ..... مگر ابو ذرا بھی نہیں ہوئے۔

دروازے میں ضرور ہی سوراخ کرے گی اور ضرور ہی دوسری طرف موجود شخصیت کو ٹھاہ کر کے لگے گی۔

”تو جانی میں نے جو کیا سو کیا..... مانا میں نے مگر آپ کو بھی تو اپنی تیاری رکھنی چاہیے کھی ناں..... آپ کو تو معلوم تھا کہ میں نے بالآخر مان ہی جانا ہے۔ آج سے پہلے کون سی بات ٹالی ہے آپ کی۔“ اور بس وہ جو ان کی بات کے دوران بھرتی جا رہی تھی۔

اس کے گھر میں تیسری وہ تھی اور چوتھا اور کوئی نہیں..... وہ جانتی تھی کہ پہلی دو شخصیات میں سے ہی کوئی ایک باہر دروازے پر موجود ہے۔ ای کو پھر مار جن دے دیتی تھی وہ مگر ابو..... نہ جی آج کل سخت دشمنی کے دن تھے۔

”یعنی کہ آپ کہنا چاہتے ہیں کہ سارا قصور میرا ہے۔“ دروازہ کھول کر وہ پھٹ پڑی۔

دروازے پر ایک دفعہ پھر دستک ہوئی..... مدہم تو اتر کے ساتھ۔

”نہیں میرا ہے۔“ ابو نے بڑے جذب سے کہا۔ دروازہ کھلوانا تھا سو کھلا گیا تھا۔ اس نے پھر سے انہیں لیزر جیسی نظروں سے گھورا۔

ہنیانے ایک دفعہ پھر لال سرخ آنکھوں سے لیزر جیسی نظر ڈالی اور پھر ہینڈل آہستگی سے نیچے ہوا۔

”آآآ آپ.....“ ہمیشہ کی طرح آنسو.....

اس سے پہلے کہ دروازہ کھلتا..... وہ برق رفتاری بلکہ چپتا رفتاری سے ابھی اور بھاگ کر دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”اچھا..... بس کرو ناں جانی..... اب بس کرو..... سنو تو سہی میں کہنے کیا آیا ہوں۔“ بڑے دلار سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی جسے ہنیانے پشت کے بل زور لگا کر ناکام بنا دیا تھا۔ ایک دفعہ پھر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب کی تو ذرا پہلے سے زیادہ زور لگایا گیا۔ ایک دفعہ پھر سے..... ہنیانے اس سے اسے ناکام بنایا گیا مگر اب کہ اس نے نہایت غصے کے ساتھ کمر کو دروازے سے لگاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا تھا۔

اس نے بچوں کی طرح منہ بسورا۔

ذوالفقار صاحب چاہتے تو..... ہنیانے کا زور ان کے زور کے آگے ٹھنڈا پڑ جاتا..... مگر وہ تو صرف اسے بہلا رہے تھے۔

”اچھا بات تو سنو ناں بیٹا.....“ انہوں نے بچوں کی ہی طرح اسے بہلایا تھا۔ اور یوں ہی بہلاتے، پچکارتے اسے بیڈروم کے اندر لے آئے تھے۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔

ذوالفقار صاحب نے اپنا بازو اس کے شانوں کے گرد پھیلاتے ہوئے بڑے پیار سے اسے دیکھا تھا اور ہنیانے ایک لمبی سے شول کر کے آستین سے ناک صاف کرتے ہوئے۔ قدرے ناراضی سے انہیں دیکھا تھا۔

”بس بھی کرو ناں بیٹا.....“ ایک دفعہ پھر سے پچکارا گیا۔

”ہنیانے..... میرا بچہ، دروازہ کھولو ناں.....“ اب کما سے بری طرح سے پچکارا گیا۔

”نہیں ہوں میں آپ کا بچہ.....“ غصے سے مگر بھرائی آواز میں جواب دیا گیا۔

”آآآ..... ہنیانے..... ایسے بولتے ہیں ابو کے ساتھ؟“ عجیب شرمندگی کا احساس دلاتا ہوا لہجہ تھا۔ اور وہ ہو بھی گئی..... مگر ڈھیٹ بن گئی۔

وہ بات کرنے سے پہلے تمام تر ناراضی ختم کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ان کی بات کو سمجھ سکے۔ اتنے پچکارنے پہ اس نے منہ بنا کر نظر میں جھکالی تھیں یعنی۔ اب سنگل گرین تھا۔ بات کی جا سکتی تھی۔

”آآآ..... ابو..... ایسے کرتے ہیں اپنے بچے کے ساتھ؟“ ویسا ہی شرمندگی کا احساس دلاتا ہوا

ذوالفقار صاحب کو ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

ماہنامہ پاکیزہ 62 نومبر 2016ء

”چلو اگر تم کامیاب نہ ہو میں جو کہ تم نے ہونا کوئی نہیں..... تو تب میں تمہاری شادی کسی آری والے سے کروادوں گا۔“ انہوں نے جان بوجھ کر پھر سے پھیرا..... اور وہ چھڑ گئی تھی۔

”ابو.....“ وہ کھنکی (جیسے فوجی میرے دروازے کے باہر کھڑا ہے ناں اس نے ٹھنک کر سوچا۔)

”اس طرح بددعا میں دیں گے تو خاک کامیاب ہوں گی۔ دعا کیا کریں، نقلیں پڑھ کر میرے لیے۔“

”بس آری والے سے شادی کروادوں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ اسے سخت تپ چڑھی تھی۔

”ہا ہا ہا.....“ اور ذوالفقار صاحب ہنستے چلے

جا رہے تھے۔ بعض اوقات اچھی بھلی جوان اولاد دینا

یہی بچہ بن جاتی ہے جو آگ کو کھینے کی چیز سمجھ کر بار بار

اس کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ ماں جانتی ہے کہ یہ

آگ ہے، بچہ نہیں جانتا..... نہ سمجھتا ہے..... تو محض اس

کے جاننے کے واسطے ماں کو اس کا ہاتھ آگ کے قریب

لے جا کر بتانا پڑتا ہے کہ ”بیٹا یہ آگ ہے..... اور یہ

جلاتی ہے۔“ پھر وہ یہ سبق ساری عمر نہیں بھولتا۔ کہ وہ

آگ تھی اور اس نے جلایا بھی تھا۔

☆☆☆

حبیب عالم کی شادی تھی مہندی کا فنکشن تھا اور وہ

منہ بنائے تھی تھی۔ جہازوں کے بعد اگر مومنہ کو کوئی

شوق تھا تو وہ چوڑیوں کا تھا..... کالج کی چوڑیاں، ہر

لباس کے ساتھ میچنگ چوڑیاں..... چاہے وہ گھر میں

پہننا ہو یا کسی فنکشن میں، ماہن کے جانا ہو کچھ اور ہونہ

ہو..... میچنگ چوڑیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ اب بھی وہ

اورنج کلر کے لباس میں منہ بنائے بیٹھی تھی کہ..... اورنج

کلر کی چوڑیاں بازیاں نہیں ہو سکتی تھیں..... اس کے

چوڑیوں کے اسٹاک میں سے.....

”عین ٹائم پہ منہ بنا کر بیٹھنے کا قاعدہ..... پہلے

بتا دیتیں تو دلواوتی ناں میں..... اب میچنگ

چوڑیاں نہ ہونے کی وجہ سے کوئی تمہیں فنکشن سے

نکال باہر کرنے سے تو رہا.....“ کل آرام سے اسے

ماہنامہ پاکیزہ 63 نومبر 2016ء

چونا تھا اور ہینا نے لاڈ سے سران کے کندھے پر لٹکایا تھا۔ دونوں باپ بیٹی اپنی، اپنی بات منوانے کے چکروں میں تھے۔

”ہینا تم میری اکلوتی اولاد ہو۔“

”اور آپ میرے اکلوتے ماں باپ ہیں۔“ اس نے چڑ کر کہا۔ خواہ مخواہ میں بلیک میل نہیں ہوئی تھی وہ۔ ابو بے ساختہ ہنس پڑے۔

”اچھا ناں..... بی سیریس.....“ اس کے گھوننے

پر وہ بولے تھے۔ ”تم کیڈٹ کالج جانا چاہتی

ہو..... ٹھیک ہے جاؤ، ٹیسٹ کی تیاری کرو۔ پاس ہو اور

جوآن کرو۔ مگر ہینا اس سب سے پہلے میں تمہیں یہ

بتا دوں کہ تم اس کی اہل نہیں ہو، بات کو سمجھو بیٹا..... تم

میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔ جس طرح سے میں نے تم کو

پالا ہے اور جیسی تمہاری فطرت ہے، تم یہ نہیں کر پاؤ گی

بیٹے۔ بہت مشکل ہے سوچو اگر تم وہاں سے بھاگ کر

آئیں تو سارا خاندان کیا کہے گا

تمہیں؟ بھگوڑی.....“ ہینا خاموشی سے آنکھیں سنتی رہی۔

”ابو..... میں نازک مزاج ہوں، میں جانتی

ہوں..... مگر ابو..... یہ جو شوق ہوتا ہے ناں یہ بندے

میں سے ساری حیا نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔ بس پھر

”شوق“ ہی بچتا ہے..... مجھے جانے دیں..... ایک دفعہ

تو آزمانے دیں..... مجھے خود سے تجربہ کر کے دیکھنے

دیں کہ میں یہ کر سکتی ہوں کہ نہیں..... آپ نے ٹیسٹ کو

ہی ایٹو بنالیا.....“ اور پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

”آئی ایم سوری بیٹا.....“ ابو اس کا سر تھپکتے

ہوئے بولے تھے۔

”ڈونٹ بی۔“ (don't be) اسی بھرائی

آواز میں شوق شوق کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔

”گلطی میری بھی تو تھی۔ مجھے تیاری کرنی چاہیے تھی۔“

”یہ سال ضائع کر کے ایک اور گلطی کرو گی

تم..... لکھوالو۔“ وہ باز نہیں آئے تھے چھیڑنے سے۔

”کرنے دیں ہاں مجھے، میری زندگی، میرا

سال، آپ کو کیا ہے؟“ وہ خواہ مخواہ میں ہنسی ہوئی تھی۔

سنبھار رہی تھیں، مومنہ نے نظریں پھاڑ کر باپ کو دیکھا۔ ہاتھ پاؤں کھٹ میں تھا۔
 کہ وہ اس کی ”ہر امید“ تھی۔

وہ تصویر بے حد اچھی تھی..... دور سے ہی اپنی خوب صورتی بیان کرتی تھی۔

موی صبح شام..... کالج آتے جاتے اسے دیکھ، دیکھ کر جیتی یوں جیسے وہ تصویر آکسیجن فراہم کرنے کا کوئی منبع ہو..... اگر وہ صوفے پہ بیٹھی لی وی دیکھتے ہوئے کچھ کھاری ہے اور یک دم تصویر پہ نظر پڑ گئی ہے تو..... وہ اس تصویر کو ہی دیکھے جائے گی..... لیکن اور بے اختیار ہو کر..... وہ بھول جاتی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ لی وی دیکھ رہی تھی اور کچھ کھا رہی تھی۔

حسن وہاں تصویر میں تھا مگر جنون ان آنکھوں میں تھا جو کہ منہمک ہو کر اسے دیکھتی تھیں۔ وہ باپ تھا، وہ خواب بھی تھا، محبت صرف باپ سے ہی نہیں تھی۔ وہ اس لباس (ڈاگری) سے بھی تھی جو کہ اس کے باپ نے زیب تن کر رکھا تھا۔

وہ تصویر..... تصویر نہیں تھی، وہ عنوان تھی۔ مومنہ عجیب عالم کے خواب کا، مسجد کا اظہار موی کی طرح نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس تصویر کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔

”میں بھی بابا جیسا بنوں گا..... ایسے ہی کپڑے پہنوں گا اور یوں ہی گا گزر بہن کر تصویر کھنچواؤں گا۔ اور پھر وہ باپ کے سے پوز میں کھڑے ہو کر دکھاتا..... اکثر بچوں کو باپ جیسا بننے کا شوق ہوتا ہے مگر وہ دونوں بہن، بھائی..... شوق کا لفظ ان کے لیے کم تھا اور جنون کا لفظ ان دونوں پہ پورا اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔
 لفظ ذوق پرواز ہے زندگی!

☆☆☆

بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ گرج رہے تھے، بجلی کڑک رہی تھی۔ آندھی کے جھکڑ و رختوں کو ڈہرے ہو جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ طوفان تھا۔ گل سارے گھر کی گھڑکیاں، دروازے بند کر رہی تھیں اور جب وہ لاؤنج کا دروازہ بند کرنے آئیں تو موی کو یوں لان میں، مٹی پہ بے حس انداز میں بیٹھا دیکھ کر بری طرح چوکی سمجھیں۔

”چوڑیاں چاہئیں؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے موی نے ماں کو دیکھا تھا۔ ”لے جائیں..... ورنہ اس کا موڈ خراب ہی رہتا ہے۔“ گل کہتے ہوئے اٹھی تھیں۔ معصوم موی کے چہرے پر مسکراہٹ..... چمک کر پھیلی تھی۔ گولڈن اور اورنج کلر کا فینسی لباس، سادہ چہرہ..... شانوں پر پھیلا دو پٹا اور دونوں کلائیوں میں یہ بگڑ بگر اورنج اور گولڈن کلر کی چوڑیاں..... یہ بھی مومنہ عجیب عالم اور یہ تھی اس کی تیاری..... عجیب عالم اسے بازار لے کر گئے، چوڑیاں دلوائیں اور پھر وہ فنکشن کے لیے نکلے تھے۔

PAF اس کا جنون تھا۔ اور چوڑیاں اس کے لڑکی ہونے کا ثبوت..... بھلنے اور کوئی بات لڑکیوں والی ہونہ ہو..... یہ ضرور تھی۔ چوڑیاں رنگ برنگی..... زندگی کے رنگوں سے تھی چوڑیاں..... اور ان چوڑیوں سے تھی مومنہ عجیب عالم.....

☆☆☆

عجیب عالم نے اپنی ایک قد آدم فوٹو فریم کر والی تھی۔ وہ اسے لاؤنج میں لگانا چاہتے تھے مگر مومنہ بھند تھی کہ اسے اس کے کمرے میں لگایا جائے۔

”مومنہ! تمہارے کمرے کی کوئی زیوار خالی ہے جو اسے وہاں لگایا جائے؟“ گل چڑ کر بولی تھیں۔

”موی..... یہیں لگانے دو..... میرا خیال ہے یہیں اچھی لگے گی۔“ عجیب عالم نے کہا تھا۔

”لگادیں.....“ گو کہ وہ راضی نہیں تھی..... مگر مان گئی تھی۔ اس طرح سے وہ قد آور تصویر لاؤنج کا حصہ بن گئی تھی۔

جس میں عجیب عالم PAF کی مخصوص dangri پہنے بلیک گاگلز لگائے ہونٹوں پر ایک خوب صورت مسکراہٹ لیے..... C130 کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کا باپ ان باتھ C-130 کے اوپر تھا اور دوسرا

پھر کسی بدروح کی طرح چکڑ کاٹی تھی۔

”نہیں بننا مجھے پائلٹ..... پائلٹ، پائلٹ.....“ اور بدست تیز ہوا ان دو ساکت کھڑے وجودوں کے ساتھ سر بچختی تھی تو کیا اس نے خود کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا؟

☆☆☆

سال 2001ء موسم گرما۔ آج بارش کی پیش گوئی تھی۔ زندگی اپنے معمول پہ رواں دواں تھی۔ ایسے میں اوپر آسمان پر اک شور سا بلند ہوا۔ کاک پل کے آسمان کے اوپر وہاں کے باسی اس شور پر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے پر مجبور ہوئے تھے..... اور جب انہوں نے گردنیں اٹھا کر آسمان کی جانب نگاہ کی تو انہوں نے بھلا کیا دیکھا۔

وہ ایک طیارہ تھا کہ جس کا انجن بے حد شور کر رہا تھا اور طیارہ دائیں، بائیں جیسے ڈول رہا تھا۔ پوری فضا گڑ گڑا رہی تھی؛ لرز رہی تھی اور اسی پر شور گڑ گڑا ہٹنے وہاں کے باسیوں کو سر اٹھا کر اس آواز کی سمت دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔

”مگر آج تو بارش کی پیش گوئی تھی۔“

ایک طیارہ جو زمین کی طرف چنا آ رہا تھا اور اب زمینی سطح سے اتنے فٹ کی دوری پر تھا کہ طیارے کے vertical stabilizer پہ موجود سبز جھنڈے کو باسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ یہ منظر اگرچہ ان باسیوں کے لیے نیا نہیں تھا، وہ ایسے کئی مناظر دیکھنے کے عادی تھے۔ یوں تپتی پرواز کرتے ہوئے مختلف ائر لائنز کے طیارے، فوجی طیارے، ہیلی کاپٹرز۔

یہ اسلام آباد انٹر پورٹ کے قریب کا علاقہ تھا اور وہ ان تمام آوازوں اور ان آوازوں کے شور سے نا آشنا ہرگز نہیں تھے مگر اس طیارے کی حالت نے انہیں معمول سے ہٹ کر چونکا دیا تھا۔

طیارہ سیدھا زمین کی طرف آ رہا تھا اور اس کے انجن میں..... آگ بھڑک چکی تھی۔

وہ بے ڈول جیسے فری فال زمین کی طرف آ رہا تھا۔ فضا کی شوخی گڑ گڑا ہٹنے کے بعد جس چیز سے ٹوٹی

”مومی.....“ اب بے آواز رہے تھے اور دوسری نظر بے ساختہ اوپر کو اٹھی تھی۔ چند دنوں بعد اس کے فائٹل انجینز اترتے اور وہ یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھی؟ اسی اثنا میں بجلی بھر پور شدت سے کڑکی اور گل دہل کر رہ گئیں اور وہ مومی..... وہ اسی طرح سے اپنے آپ میں گن بیٹھی رہی..... ہوا کے تھپڑے ایسے تھے کہ وجود کو دھکیلتے تھے۔ گل ان تھپڑوں سے بچتی، بچاتی اس تک آئیں۔

”مومی! اٹھو بیٹا..... یہاں کیوں اس طرح بیٹھی ہو، دیکھتی نہیں کتنا طوفان ہے؟“ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے وہ بولی تھیں۔ مومی بلی تک نہیں تھی۔

”مومی.....! اٹھو نا.....“ اب کہ انہوں نے زور دے کر اسے اٹھایا..... انہیں حقیقت میں اس خراب موسم سے خوف محسوس ہو رہا تھا اور وہ..... وہ سارے خوف جانے کدھر رکھ آئی تھی۔ کدھر بھول آئی تھی۔

”مومی اٹھ جاؤ..... اور جاؤ جا کر انجینز کی تیاری کرو۔ کیوں یہاں بیٹھ کر ٹائم ویسٹ کرتی ہو؟“ گل نے اسے اب کی بری طرح ڈپٹا تھا۔ اس نے پلٹا تھا یا نہیں ان کی اس بات پر وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمبے ان کی آنکھوں میں عجیب سے انداز میں دیکھتی رہی تھی اور بجلی کڑکی تھی پھری ہو اور خستوں کی کمر پہ ضربیں لگاتی تھی۔ بادل زور، زور سے گرجتے تھے۔ اس نے ماں کو کندھوں سے پکڑا..... اپنا چہرہ ان کے منہ کے قریب لائی۔

”مجھے کوئی انجینز نہیں دینا..... سنا آپ نے۔“ وہ چیخی تھی گل کو بجلی کی کڑک بھول گئی۔ وہ شا کد ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”مومی تمہیں تو پائلٹ..... مری ہوئی آواز میں محض آدھا جملہ ہی منہ سے ادا ہو سکا تھا۔

”نہیں بننا مجھے پائلٹ..... اب وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر حلق پھاڑ کر بولی تھی اور..... اور بجلی عین اسی وقت اتنی شدت سے کڑکی کہ پہلے یوں کبھی نہ کڑکی تھی۔ اتنے شور کے باوجود وہاں سناٹا سا چھا گیا تھا..... گہرا سناٹا اور اس سناٹے میں ایک ہی آواز گونج

تھی وہ لوگوں کی جینیں تھیں۔ آوازیں، بے ہنگم شور..... شور..... آہ و بکا..... افراتفری کا عالم..... بھاگ دوڑیوں جیسے وہ لوگ آسمان کی دستوں اور زمین کی حدود سے نکل جانا چاہتے ہوں اور وہاں پناہ لینا چاہتے ہوں کہ جہاں سر پر کم از کم ایسا آسمان نہ ہو..... طیارہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آ رہا تھا اور..... اور لوگ مسلسل چیخ رہے تھے، بھاگ رہے تھے، پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ کششِ ثقل کے اصول کے مطابق طیارہ سیدھا زمین کی طرف چلا آ رہا تھا اور چند لمحوں بعد اسے زمین سے ٹکرا کر نیست و نابود ہو جانا تھا کہ یکا یک..... اچانک ایک غیر معمولی بات وقوع پزیر ہوئی نیچے بہت سی جانیں تھیں، رہائشی آبادی تھی اور اوپر، اوپر اس طیارے میں دو جانیں، دو لوگ اور بس..... مگر آج تو بارش کی پیش گوئی تھی، آگ کی نہیں پھر عجب ہوا مگر یہ عجب تو ہوتا ہی آیا ہے کہ جب، جب سامنے عوام ہوں تو اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر عوام کو بچانا ہی فوجی کا عزم ہوتا ہے۔ طیارہ جب عین آبادی کے اوپر تھا وہ فری فال کی پوزیشن سے نکلا، سنہنلا اس طرح کہ پھر بھی بے ڈول دکھتا تھا۔ پائلٹ اسے دوبارہ اوپر لے جانے کی کوششوں میں تھا یا پھر کہ آگ نفا میں ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے زمین پر گرنے نہیں دینا چاہتا تھا اور جیسے ہی طیارہ ذرا سا، تھوڑا سا اوپر ہوا محض چند فٹ اور اوپر تو..... تو ایک زبردست دھماکا..... ایک زوردار گونج کی سی آواز سے آگ کا منبع ایک دھماکے کے ساتھ دائرے کی صورت پھیلا سب کچھ ایک لمحے کے لیے حالت سکون میں آیا اور پھر..... طیارے کے پرزے..... آگ لگے پرزے بے شمار چھوٹے، چھوٹے بھی اور بڑے، بڑے بھی ذرات کی طرح بے توازن ہو کر..... تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگے..... فری فال یوں جیسے دوزخ کا منہ کھول کر اسے زمین والوں پر الٹ دیا گیا ہو۔ جیسے کسی بھڑ بھڑ جلتی لکڑیوں والے تندور کو پیندے سے پکڑ کر اونچا کر دیا گیا ہو اور جیسے، جیسے وہ آسمان، آسمان نہ رہا ہو۔ ایک دہکتا آلاؤ بن چکا ہو۔

آج، آج تو بارش نے برسنا تھا تو پھر کیا تھا جو برسنا تھا..... کیا تھا جو برسنا.....؟ اسی کوئی پیش گوئی تھی کیا؟ بھڑکتے، جلتے، دکھتے، شہاب ثاقب سے نکلنے تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آ رہے تھے اور زمین والے کہ جن کے سروں کے عین اوپر آگ اپنا رقص پیش کرتی تھی..... وہ عجب محبوبہ الحواسی اور نفسا نفسی کے عالم میں بھاگ دوڑ رہے تھے کہ دفعتاً وہ سب دکھتے، جلتے، بھڑکتے شہاب ثاقب سے نکلنے زمین کے ساتھ ایک گونج دار آواز سے آن نکلے تھے۔ کچھ کھلی زمین پر گرے، بچت ہوئی۔ کچھ فصلوں پر گرے پھر بھی بچت ہی تھی۔ کچھ نالہ لٹی میں گرے اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ کچھ نے بربادی کا تھوڑا سا سامان کیا اور وہ رہائشی آبادی کے مکانات پر جا گرے۔ شور ذرا اور برپا ہوا..... افراتفری آہ و بکا..... خچیں۔

آگ، آگ، آگ.....
 جلنے والی اور جلا دینے والی۔
 جلا کر بھسم، راکھ کر دینے والی۔
 وہ جلی اور اس نے جلا یا بھی اور پھر.....
 دھواں، دھواں سیاہ کالا دھواں.....
 فضا میں جلنے کی بو تھی، جو کبھی نہ ختم ہونے کے لیے رچ بس چکی تھی فضا میں مگر اس جلنے کی بو میں جسموں کے جلنے کی بو نہ تھی۔ اتنے سارے جمادات کے جلنے میں حیات کے جلنے کی بو کسے آتی تھی ہاں..... کسے آتی تھی؟ کیسے سونگھتا کوئی، اتنے کل پرزہ جات میں، جسم کے جلنے کی پڑاؤ..... مگر مگر سوال یہ کہ کیا ان کے جسم اس قابل رہے تھے کہ وہ جلتے..... اس دھماکے میں طیارہ..... ایلو منیم باڈی پرزے، پرزے ہو کر بکھرا تھا تو جسم.....؟؟ آگ کے نکلنے، چھوٹے، بڑے اب بھی گر رہے تھے، برس رہے تھے، لوگ چیخ رہے تھے، رور رہے تھے، پناہ مانگ رہے تھے، کچھ.....

سولینز زخمی ہوئے مگر جانی نقصان.....
 وہ زمین پر نہیں ہوا تھا، وہ تو اوپر ہی اوپر آسمان و زمین کے درمیان شاید بس ہو چکا تھا اب تو بس آگ برپا تھی، دھواں پھیل، پھیل جاتا تھا۔ مگر آج تو بارش

ان کے ہاتھ بے گڑھی گئے۔ وہ ہائے کہہ سکیں اور نہ ہی انہوں نے
 اظہار ہوسکا تھا۔ وہ PAF 1306 C طیارہ بتایا جا رہا
 تھا اور ان کا ایک منٹ میں 72 بار دھڑکنے والا دل اس
 ایک منٹ میں 172 بار دھڑک اٹھا تھا۔ ابھی تک
 پائلٹ کا نام اور عہدہ کتفہ نہیں کیا جا رہا تھا۔
 ”مومی.....!“ انہوں نے چیخ کر مگر کا پتی آواز
 کے ساتھ بیٹی کو پکارا..... اور مومی جو کہ کمرے میں بند ہو
 کر انٹر کے ایگزیزٹ کی تیار کر رہی تھی کہ اس کے
 ایگزیزٹس برتھے، وہ پری انجینئرنگ کی اسٹوڈنٹ تھی۔
 بل، بل کر پڑھتی ہوئی اوپچی، اوپچی آواز میں رٹے لگانی
 ہوئی۔ کیمسٹری کے موجد کو کتنی ہوئی۔ ”خود مر گئے۔
 ہمیں عذاب میں ڈال گئے۔“ جیسے طعنے دیتی ہوئی۔
 مومی ایک بل کو ساکت ہوئی، دوسرے ہی لمحے کتاب کو
 بند پر پھینکا، پاؤں نیچے کر کے چل پڑی اور سڑپ، سڑپ
 چلتی ہوئی اور پھر دھڑ دھڑ کر کے بیڑھیاں اتری تھی۔

نے برتا تھا مگر یہ کیا تھا جو پڑھا تھا۔
 ☆☆☆
 زندگی روانی سے جیتی تھی، ہر کوئی اپنے، اپنے روزمرہ
 ہسکے کاموں میں مصروف تھا۔ ایسے میں راک خبر
 بریکنگ نیوز کے طور پر دن 1.00 بجے چلی تھی۔ کچھ ملا
 جلا سا رد عمل آیا..... انہوں کا اظہار ہوا اور پاکستان کی
 اٹھارہ کروڑ عوام کی زندگی بنا کسی تعطل کے پھر سے چلنے لگی
 تھی مگر ٹھہریے..... ان اٹھارہ کروڑ عوام میں سے آپ
 تین نفوس نکال دیجیے..... ہاں باقی لوگوں کی زندگی چل
 رہی تھی، دوڑ رہی تھی یوں کہ جیسے اسے کبھی رکنا ہی نہیں
 اور وہ تین نفوس..... مسز مجیب عالم بھی لیکن میں تمہیں.....
 وہ بھی اپنے سعد کے لیے کھانا بنا رہی تھیں کہ وہ بھی ذرا
 بھوک کا کچا تھا۔ ان کے گھر کے لاؤنج میں بھی ٹی وی چل
 رہا تھا۔ وہ بھی انٹر کریش کی خبر سن کر بے اختیار لیکن سے نکلی
 تھیں۔ ہاتھ میں چیخ لیے ہوئے ذرا ٹھہر کر خبر سنی اور چیخ

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جازب نظر آئیں

بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ

ٹاسٹنگ کریم (ہربل)

جیونی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرنے کے لیے
 بریسٹ کی ترقی کو دور کر کے ختم لاتی ہے۔ بریسٹ کو مندول اور خوبصورت بناتی ہے۔
 30 سال سے آواز

گلیسیسی

یونانی کریم چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

اپنی PIC روانہ کریں
 watsap: 0311-5000057
 Email: bdhdeva@yahoo.com
 skype: dovapak
 کارنی ہوم لائیو 0322-2916250
 چٹنی لائیو 0300-2500026

اپنا نام SMS کر کے سب سے پہلے منگوا لیں
 051-5502903-5533528
 042-7666264
 021-32720328
 0333-5203553
 Website: www.devaherbal.com

”جی جی! ڈرا سا لگتا یا ہوا انداز کہ مئی کو تو عادت تھی یوں بات بے بات آوازیں دینے کی۔

”اڑ بیس کا نمبر ملاؤ..... جلدی.....“ مئی کے تو انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس غیر متوقع انداز و سوال پر وہ ہنسی اور ٹھٹک کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

”فون ملاؤ مومی.....“ گل کی آواز خراش زدہ تھی اور وہ ہاتھوں کی مٹھیاں کھول اور بند کر رہی تھیں۔ ان کی پریشانی ایک دم مومی پہ بھی حملہ آور ہوئی تھی اور اس نے ان سے وجہ پوچھنی چاہی مگر..... نیوز چینل پہ خبر ڈرا وقتے کے بعد اور اپ ڈیش کے ساتھ پھر سے چلنے لگی تھی اور اب مومی کا ایک منٹ میں 72 بار دھڑکنے والا دل اس ایک منٹ میں ایک بار بھی دھڑک نہ سکا تھا۔ وہ وہیں پہ مرنے والی ہو گئی تھی۔

”فون ملاؤ مومی.....“ مسز مجیب عالم نے قدرے بے چینی کے ساتھ اس کا کندھا ہلایا تھا، وہ ہوش میں آئی اور اس سے پہلے کہ وہ نمبر ملاتی فون خود بول اٹھا تھا۔ بتل کی آواز پورے گھر میں صویر اسرائیل کی طرح پھیلی تھی اور کیا ہی کر یہ آواز تھی۔ اس وقت اس سے بری آواز کوئی اور ہو سکتی تھی نہ ہی تھی۔

مومی نے ماں کو دیکھا اور ماں نے مومی کو..... سانس کا ہونا کیسے عذاب بن جاتا ہے۔ یہ کوئی ان دونوں سے پوچھتا۔ فون چیخ، چیخ کر خاموش ہوا۔ خوشی نے پھر سے پورے گھر کو حتیٰ کہ ان دو کھڑے ساکت وجودوں کو بھی اپنے مہیب سنانے میں لپیٹ لیا تھا..... آہ..... فون ایک دفعہ پھر سے بول اٹھا۔ خاموشی پھر سے چھ گئی۔ مومی نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ وہ اٹھا ہی نہیں سکی تھی۔

مسز مجیب عالم نے بے جان ہوتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا تھا۔

”آہ! کہ سرخ روشنائی سے لکھی گئی چشموں کا رواج اب ختم ہوا، ختم ہوا اب۔“

ادھر مسز مجیب عالم نے ریسیور اٹھالیا اور ادھر نیوز چینل والے مکمل اپ ڈیش کے ساتھ خبر دے رہے تھے۔ شہید ہونے والے پائلٹ اور کو پائلٹ کا نام اور

عہدہ کفرم کیا جا رہا تھا۔ مسز مجیب عالم نے کیا سنا اور کس کا فون تھا۔ مومی تو ادھر متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسکرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سرخ بیک گراؤنڈ کے اوپر کالے لکھے گئے حروف، سیاہ حروف..... اس پل ہاں ٹھیک اسی پل کہ جب مومی ٹی وی کی اسکرین یہ نظر آنے والے نام کو دیکھ کر اور اس کی ماں فون کو سن کر ساکت تھیں، اسی پل ہاں ٹھیک اسی پل میں کتنے ہی آن ڈیوٹی پائلٹس کی ماؤں، بہنوں، بیویوں، بھائیوں اور باپوں نے شکر کی ایک اطمینان بھری سانس لی ہوگی اور وہ سیاہ الفاظ، وہ سیاہ حروف کہ جن کی سیاہی اور ایسی سیاہی جو زندگی جیسی روشن چیز کو کھا گئی تھی تو یہ ان کی زندگی تھی جو کہ رک گئی تھی اور یہ ان کا غم تھا جو ڈھسے پڑا تھا اور اب وہ معمولات زندگی سر انجام دینے سے قاصر تھے۔ وہ تو تائب لگتا تھا کہ زندگی کو ہی انجام دینے سے قاصر تھے۔ تو جب کئی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بھائیوں اور باپوں نے مکمل کر سانس لی تھی تو کوئی ان دونوں سے پوچھتا وہ دونوں کہ جن میں سے ایک بیٹی تھی اور دوسری بیوی.....

کہ تم نے کبھی سانس بھی لی تھی یا نہیں..... کیا تم نے کبھی یہ لذت چکھی تھی بھی یا نہیں بولو ناں..... بتاؤ ناں، کیا تمہیں کبھی سانس آئی تھی؟ یا یہ کہ تم نے اب کبھی سانس لینی بھی ہے یا نہیں۔

”مجیب عالم اپنے معاون پائلٹ کے ساتھ حادثے کا شکار ہو کر شہادت کا رتبہ حاصل کر چکے تھے۔“

بابا کی لاڈلی ہنر رونا مت کہ بابا تکلیف محسوس کریں گے۔ ان کو سونے دینا..... وہ زندگی جینے کے لیے کہ جس کا شعور تم کو نہیں ہے بابا کی پیاری..... اپنے آنسوؤں کو تھام لیتا۔ گرنے نہ دینا، بہنے نہ دینا کہ بابا پریشان ہوں گے۔ تمہیں معلوم ہے ناں وہ تمہارے رونے سے پریشان ہو جاتے ہیں، وہ زندہ ہیں، بس تم کو شعور نہیں..... وہ آنکھیں نہیں ہیں تمہارے پاس کہ اب کے بعد جن سے تم ان کو دیکھ سکو..... نہ بابا کی مومی نہ..... خود کو مرنے مت دینا کہ بابا اب تمہارے ذریعے

خواسوں پر گرتا ہے تو انہیں چھین کر ہی دم لیتا ہے۔ اس نے پھر اس بین کرتی عورت کو دیکھا۔ پھر اپنے آپ کو دیکھا..... اور ہر گھر کے در و دیوار کو..... چیخنے کی آواز پھر سے آئی۔ وہ سرعت سے آواز کی طرف متوجہ ہوئی۔ گل اسی طرح زمین پر گرے ہوئے چیخ رہی تھیں، وہ آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے ان تک آئی اور گھٹنوں کے بل ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو بہانے سے زیادہ وہ چیخ رہی تھیں۔

آنکھوں کے بس گوشے نم سے تھے۔ موی نے ان کی زور سے پچی ہوئی آنکھوں کو دیکھا آنکھوں کے ان نم کناروں کو دیکھا.....

”نہیں.....“ مومنہ مجیب عالم اب اس کالے جادو کے زیر اثر تھی کہ جس کے بعد انسان پتھر کا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا..... کوئی ذریعہ، کوئی طریقہ کام نہیں آتا۔ اس کے جسم میں وہ برے اثرات والی سونیاں کھب چکی تھیں کہ جس کے بعد شہزادی سو سال تک کے لیے سو جاتی ہے۔ وہ بھی سونا چاہتی تھی..... وہ ماں کو بے خودی بلکہ بے بسی کے عالم میں گھور رہی تھی۔ وہ ایک دم خاموش ہوئیں اور آنکھیں کھول کر اسے اپنے بے حد قریب دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر خنکیں اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک دفعہ پھر سے بہ آواز روئی تھیں۔

”موی، بابا.....“ اور پھر روتے ہوئے کہہ کر انہوں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی دونوں بانہوں میں سمو لیا تھا..... اسے سینے سے لگائے وہ بلکہ، بلکہ کر رہ پڑی تھیں۔ موی ہر جذبے سے عاری..... اپنے لب سینے ان کے سینے میں دبی تھی۔ اور اس طرح سے خاموش تھی کہ بس آج کے بعد کچھ نہیں بولنے والی تھی وہ۔

☆☆☆

گل مجیب عالم بھلا کون تھی وہ ایک شہید کی بہن تھی۔ وہ ایک شہید کی بیٹی تھی۔

اور اب..... وہ ایک شہید کی بیوہ تھی۔ یہ تھا اس کا اصل تعلق..... وہ اس نسل سے تھی کہ جن نسل در نسل اپنے

سے زندہ ہوں گے۔ مت مرنے دینا خود کو، ہرگز نہیں، خود کو مرنے نہ دینا، دیکھو ایسا مت کرنا کہ تم اب بابا کے وجود کا حصہ نہیں ہو، تم اب سے مجیب عالم ہو۔

”اسکو ڈرن لیڈر مجیب عالم.....“

☆☆☆

فون کا ریسیور ان کے ہاتھ سے گرا..... اور گر کر جھولنے لگا۔ وہ بے دم ہو کر پشت کے بل دیوار سے ٹکرائیں اور لڑکھڑا کر گرنے والے انداز میں نیچے پڑتی چلی گئی تھیں۔ ان کے کانوں نے ایسا کیا سن لیا تھا۔ انہیں لگا سینے پر کوئی وار ہوا تھا۔ سانس نہیں اٹک گئی تھی۔ ٹانگیں اکٹھی کرتے ہوئے، گھٹنے موڑ کر پیٹ تک لے جاتے ہوئے اب کہ وہ دائیں رخ کے بل زمین پر گری تھیں۔

”مجیب.....“ ایک سسکی کی طرح نام ادا ہوا اور سسکی وہ جو کہ بین کرتی ہوئی لگتی تھی۔

”مجیب.....“ اب کہ کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ نام ادا ہوا۔ یوں جیسے اس نام کو ادا کر کے وہ خود کو زندہ رکھنے کی کوشش میں تھیں، زندگی کو محسوس کرنے کی کوشش میں ہاں..... اب انہیں ایسا ہی تو کرنا تھا۔

”مو..... جی جی جی جی.....“ اب کہ یہ سسکی نہ تھی شدت غم سے بولنے کی وجہ سے ان کے گلے میں خراشیں پڑی تھیں۔ اور اب وہ اونچا، اونچا اور رورہی تھیں۔ دائیں رخ زمین پر گری دونوں گھٹنوں کو شدت سے موڑے، ہاتھوں کی مٹھیاں سمیٹنے، وہ اس کرب سے روئی تھیں کہ لگتا تھا کہ اس کے بعد وہ مر ہی جائیں گی۔

موی جو ابھی تک آنکھیں پھاڑے لی وی کو دیکھے جا رہی تھی جس پر اب کوئی اشتہار چل رہا تھا۔ اس درد بھری چیخ نما پکار پر اس نے مڑ کر اس عورت کو دیکھا۔ وہ کون تھی بھلا.....؟ اور وہ کیوں اس طرح سے روئی تھی.....؟ اس نے پھر سے اس بلکتی عورت کو دیکھا۔

آنکھوں سے بصیرت کا تعلق ٹوٹا..... ذہن سے فہم الگ ہوا۔ کانوں نے بہرے ہو جانا چاہا اور زبان قوت گویائی سے محروم..... وہ کیا عالم تھا۔ وہ عالم بے خودی تھا۔ آہ کہ نہیں..... وہ اچانک ڈھسے بڑے ڈالائیم تھا جو کہ جب

باپ بھائی، بیٹے اور شوہر قربان کرتی آئی تھیں۔ وہ عام عورت نہیں تھی۔ یہی اصول تھا، یہی چلن تھا، یہی دتیرہ تھا۔ خوف، اضطراب، گھبراہٹ ان تینوں کو یکجا کر دتو مومنہ مجیب عالم بنتی تھی۔ گو کہ اس وقت سے اب تک اس نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا اور گو کہ وہ اب تک خاموش تھی مگر گھر میں آتے ہوئے لوگوں اور رشتے داروں کو دیکھ، دیکھ کر وہ سخت بے چین تھی۔ صوفے پر بیٹھی فکر بکھر سب کو دیکھتی..... اضطراب سے ہونٹ کاٹتی کبھی روتے ہوئے سعد کو دیکھنے لگتی اور کبھی گل کی پتیوں سے خوف زدہ ہو کر کانوں پر ہاتھ رکھ کر دونوں پاؤں اوپر کیے صوفے میں دبک جاتی۔

وہ ”عالم وحشت“ میں تھی یا خود ”وحشت“ کا منہبوم تھی..... سمجھنے سے بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ مجیب عالم آئے، اسے سینے میں سمجھ کر بلند آواز سے روئے تھے۔ اس نے چاچو کی شرٹ کو دونوں مٹھیوں میں سختی سے جکڑ لیا تھا۔ اور خوف زدہ انداز میں ان کے سینے میں دبک گئی تھی۔

ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو کیمسٹری کے موجد کو وہ کونس رہی تھی کہ اس کے ایگزامز ہونے والے تھے۔ اور محض چند ہی گھنٹوں کے بعد..... وہ اپنی اس چیز سے محروم ہو گئی تھی جسے ”مقتل“ کہا جاتا ہے۔

”مومی.....“ مجیب چاچو نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”بابا، بابا نہیں رہے۔“ انہوں نے اسے سناٹا چاہا..... اور اب کی بار اس نے سن لیا مگر کیا یہ الفاظ تھے؟ کیا وہ ایسی کوئی زہریلی گرم مائع نما چیز نہیں تھی جو کہ اس کے کانوں میں اٹھ لی گئی تھی۔ وہ زہریلی چیز جو کہ اس کے دل تک جا پہنچی تھی اور پھر سارے جسم میں آہ! کہ جسم اس زہر سے مر کیوں نہیں جاتا۔ مرنا..... اس تکلیف کی نسبت آسان تھا جو اس نے زندہ ہو کر محسوس کی تھی۔

”چاچو.....“ اس نے بے یقینی سے کہا اور پھر سختی سے ان کے دونوں ہاتھ جھٹکے تھے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی کہ بیل کی آواز گونجی تھی، ڈور بیل کی

آواز..... کہ کی اور حیرت نہیں ہوا تھا وہ بس مومی تھی کہ جس کی سماعتوں نے برق رفتاری سے رسپانس کیا تھا۔ چاچو سے اپنا آپ چمڑا کر وہ گیٹ کی طرف بھاگی تھی۔ دروازے پر PAF کے فوجی تھے۔ ایک تابوت۔ جس میں اس حادثے میں محفوظ رہ جانے والی مجیب عالم کی چیزیں تھیں۔ مومی پچڑے ہوئے چہرے کے ساتھ اس تابوت کو آتا دیکھتی رہی۔

اس کے گمان کے مطابق، تابوت نہیں، گیٹ سے مجسم مجیب عالم کو اندر آتا تھا مگر یہ کیا تھا؟ اس نے مڑ کر اندرونی سمت نگاہ کی۔ جہاں سے رونے کی آوازیں یک دم شدت اختیار کر گئی تھیں۔

اس نے اپنی ماں کو آہن واحد میں ڈھتے ہوئے دیکھا..... اس نے سعد کو ایک لمحے میں مرتے دیکھا۔ تو وہ کیسے اپنے پیروں پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی؟ کیسے.....؟ آخر کیسے؟ اس نے اندرونی سمت سے نگاہیں ہٹا کر پھر سے تابوت کو دیکھا۔

ایک فوجی تہہ شدہ پاکستانی سبز پرچم مجیب عالم کو دے رہا تھا کہ اس جھنڈے میں اب اس تابوت کو لپیٹا جاتا تھا۔ نہیں..... اسے ایسا کوئی منظر نہیں دیکھنا تھا۔ نہیں، وہ تیزی سے اس فوجی تک گئی تھی۔ ایک جھپٹا مار کر اس نے فوجی کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

”میرے بابا کہاں ہیں؟“ وہ چیختی تھی۔ فوجی نے ایک خاموش نظر سے اسے دیکھا۔

”وہ فلائٹ کے دوران حادثے کا شکار ہو کر شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے جہاز کے انجن میں اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔“ نگاہیں نیچی کر کے جواب فوجی نے دیا تھا۔ اس نے بے یقینی سے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس فوجی کا چہرہ دیکھا۔

”کیا کہا..... ان کا جہاز.....؟“

”مگر وہ تو ماہر ہوا باز تھے..... ایک بہترین پائلٹ تھے تو ایسا کیسے ہوا؟“ وہ بولتی نہیں تھی اس کی آنکھیں بولتی تھیں اور اس طرح سے سوال کرتی تھیں کہ

جوات ویسے والا اجزات کھڑا رہ گیا تھا۔

مگر سارے کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے زارو قطار رو رہے تھے۔

گل، سجد کو سینے میں بچھنے، اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے گھٹی، گھٹی آواز میں روئے جا رہی تھیں۔

عائکہ (موی کی چچی) خوفزدہ انداز میں دم سادھے ان سب کو دیکھ رہی تھیں۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ چلو..... اس کا سکتہ تو ٹوٹا مگر..... آہ..... سکتہ ضرور ٹوٹ گیا تھا مگر اب کیا تھا جو ہو رہا تھا اور ہونے والا تھا۔

موی کے ہاتھ جو آخری چیز تھی وہ وہی ڈرائنگ تھی جو اس کے بابا نے بنائی تھی..... اور اس نے لیبیل کی تھی اس نے اسے پھاڑنا چاہا اور اس کے ہاتھ گرے، دل کانپا اور لرزتے ہاتھوں سے وہ صفحہ اس کے ہاتھ سے بیچے گر گیا تھا اور پھر لرزش صرف ہاتھوں تک ہی نہیں رہی تھی وہ اس کے پورے پورے پھیل گئی تھی۔

اس کی رنگت، یک دم فق ہوئی تھی۔ زمین پہ وہ صفحہ نہیں گرا تھا..... وہ، وہ اس کی توانائی تھی کہ جس کے ساتھ وہ جھپتی تھی، اسی لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ وہ کمرے سے باہر آئی کہ یہ کچھ اس کے قابو سے باہر تھی اور غضب ہوا، غضب ہی تو ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں سیدھی

لاؤنج میں آویزاں اس قد آدم تصویر پر جا پڑی تھیں کہ جس میں اس کا باپ PAF کی dangri (مخصوص لباس) پہنے مسکراتا ہوا C-130 کے ساتھ اور وہ تصویر کہ جسے وہ مگن ہو کر گھنٹوں کا کرتی تھی مگر اب اس کے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھی تھی دوسرے ہی لمحے کوئی گرم تیز رو..... برق جیسی چیز اس کے پورے بدن میں پھیلی

تھی اشتعال پھر سے عود کر آیا تھا۔ طیش سے پڑ مگر بے دم..... وہ لڑکھڑاتی، گرتی پڑتی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کو یوں اس تصویر تک جاتے دیکھ کر گل کے رونے کی آواز بے اختیار اونچی ہوئی تھی۔ حبیب عالم نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی آواز کو اونچا ہونے سے روکا اور عائکہ..... بے ساختہ اس کے

منہ سے ہلکی سی چیخ نکالی تھی اور اس کے بعد.....

موی اس فوجی کے چہرے کو دیکھتی رہی اور پھر..... دکھ، بے یقینی اور جو تیسری چیز اس نے محسوس کی وہ شدید اشتعال کی لہر تھی جو اس کے اندر اٹھی تھی۔ غم نے اس پر اپنا الٹا اثر دکھایا تھا وہ وہ یوں ہو گئی جیسے کسی نے اس کو ننگے پاؤں دھکتے ہوئے انگاروں یہ لاکھڑا کیا تھا۔ اس نے ٹیش بھری نظروں کے ساتھ فوجی کو دیکھا..... اور پھر آگے بڑھ کر اس کی یونیفارم پر لگا PAF کا ونگ اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

یہ ری ایکشن سمجھ سے باہر تھا۔ سب اچھبے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس فوجی نے اسے روکا نہیں تھا۔ اس نے چاہا کہ موی کا aggression نکل جائے مگر یہ اب ایسے تھوڑا ہی ممکن تھا۔

اس کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے موی نے ایک دفعہ پھر سے اس کی یونیفارم کا ونگ اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

اب کہ حبیب عالم نے کندھوں سے پکڑ کر اسے پیچھے ہٹایا تھا مگر اس کا ایکریشن کم ہو کے نہیں وے رہا تھا۔ شدید طیش میں اس نے اپنے کندھے حبیب عالم سے چھروائے اور اندر کی طرف بھاگی تھی وہ اپنے کمرے کی طرف گئی تھی کس لیے گئی تھی؟ یہ تب سمجھ آیا جب اس کے کمرے سے کچھ چیز باہر آگری تھی۔ وہ

کچھ اور نہیں تھا ایک جہاز کا ماڈل تھا۔ اور وہ بس شروعات تھی اس کے بعد غیظ و غضب سے ر..... وہ ایک کے بعد ایک جہاز توڑتی چلی تھی، کھینچ، کھینچ کر الماری سے جہازوں کے ماڈلز اور کھلونے نکال، نکال کر زور، زور سے زمین پر پھینچی رہی..... ان کے اوپر

شدت سے، پوری طاقت سے پاؤں مار، مار کر انہیں تباہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ دیواروں سے پوسٹر اکھاڑ کر پرزہ، پرزہ کر کے پھینکے..... سی ڈیز اٹھا کر ہاتھوں سے دوکڑے کر کے گرائیں۔ بی بی کو ہاتھ مار کر گرایا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی..... صرف غیظ و

غضب اور جارحیت کا اظہار تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر اسے روکا نہیں کی تھی۔ حبیب عالم اس کے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

وہ اور جو کسی کے مکان میں نہیں تھا تصور تک نہیں تھا کہ ایسا ہوگا..... وہ اس صوفے پر چڑھی کہ جس کے عین اوپر تصویر تھی۔ موسیٰ نے پوری قوت سے پومی جان لگا کر دونوں ہاتھوں سے کئے شیشے پر دے مارے تھے۔ چند آوازیں ابھریں مگر وہ آوازیں زور دار چھنا کے کی آواز میں دب کر رہ گئی تھیں۔ اور پھر خاموشی، سکوت، سناٹا شیشہ چکنا چور تھا یا موسیٰ.....؟

”موسیٰ.....“ گل بے اختیار چیختی تھیں..... سہ ماں سے چمٹ کر خوفزدہ ہو کر اور اونچی آواز سے رونے لگا تھا۔ حبیب عالم بھاگے، عاتکہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اسے دیکھتے ہوئے وہیں بیٹھتی چلی گئی تھیں۔ اور وہ..... وہ کیا کر رہی تھی؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اس نے ایسا باپ کی تصویر کے لیے کیا؟ باپ کے لمسن کو پانے کو یا اس کے چہرے کو بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھنے کے واسطے..... کیوں کیا؟ اور وہ کیا کر رہی تھی؟ ایک جنون کا سا عالم تھا اور وہ تھی..... بے خودی یا مدہوشی یا کہ بے خبری..... نہیں..... وہ ”غم“ تھا بس غم ہی تو تھا۔ شاید جان لیوا غم..... منہ سے خر، خر کی آوازیں لاشعوری طور پر نکل رہی تھیں۔

وہ وہ دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے اس C-130 کی تصویر کو کمرچ رہی تھی دونوں ہاتھوں سے دیوانہ وار، پاگلوں کے سے انداز میں..... کانچ کی کڑیوں کی پروا کیے بغیر..... یوں جیسے اسے صلہ ہستی سے ملا دینا چاہتی ہو۔

”موسیٰ.....“ گل پھر سے چیخ کر اس کی طرف بھاگی تھیں بس مدہوشی سے جا گرا تھا وہ دیوانہ وار کمرچے چلی جا رہی تھی اور اس کے ہاتھوں سے بننے والا دیوان کے دل پر گر رہا تھا۔

”موسیٰ.....“ گل نے پیچھے سے آکر اسے کھینچا..... اور اب اس کے لہو سے حبیب عالم کا مسکراتا چہرہ رنگا جا رہا تھا۔
”موسیٰ.....“ گل نے پھر سے کھینچا۔ مگر ان کی طاقت ناکافی تھی۔

جنون ہو پوانگی اور غصہ.....
”موسیٰ.....“ گل نے اسے بازوؤں میں بھر کر پیچھے کھینچنا چاہا وہ لڑکھرائی..... مگر..... اپنا آپ پھر سے چمٹا کر کمرچنے لگی۔
حبیب عالم کا مسکراتا چہرہ خون میں بھیگ رہا تھا۔ خون کی بے ترتیب لکیریں اسے ڈھانپ رہی تھیں۔
”موسیٰ.....“ گل بے بس ہو کر اس کی پشت سے سرٹکا کر رونے لگیں۔ اور وہ کمرچتی رہی۔ ایک عالم وحشت تھا اور وہ تھی۔

”موسیٰ.....“ اب کہ حبیب عالم نے اسے کھینچا اور اس طرح کھینچا کہ صوفے سے نیچے اتار کر دونوں بازوؤں میں جکڑا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی پھر وہ چاچو کو مارنے لگی..... سینے کے اوپر خون بھرے ہاتھوں کے ساتھ..... خر، خر کی آوازیں نکالتے ہوئے۔

”اس نے مار دیا بابا کو..... مار دیا..... میرے بابا کو مار دیا۔“ جملے بولتے ہوئے وہ بے قابو تھی۔

”موسیٰ.....“ حبیب عالم نے اسے جھٹکا دیا..... تاکہ وہ ہوش میں آئے لیکن وہ ان کو مارے چلی جا رہی تھی۔
”موسیٰ ہوش کرو.....“ دکھ کی شدت سے ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔ اس کے شانوں سے پکڑ کر انہوں نے ایک زور دار جھٹکا دے دیا۔ وہ ہوش میں آئی؟ بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔

”مومنہ.....“ اب کی بار انہوں نے پوری قوت لگا کر زور سے کہتے ہوئے اس کے کندھوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تھا۔ اور مومنہ یک دم رک گئی۔ اس کے ہاتھ ساکت ہوئے، آنکھیں پتھرائیں اور اس کے بعد وہ بے دم ہو کر چاچو کے بازوؤں سے پھسلنے لگی تھی۔

”موسیٰ.....“ گل پوری قوت لگا کر چیخیں..... عاتکہ بے ساختہ ان کی طرف دوڑی تھی مگر وہ وہ مومنہ حبیب عالم..... بابا کی پیاری، حبیب عالم کی موسیٰ، وہ تو گرتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

تیاری..... ہاں جی..... ہو رہی تھی ٹیسٹ کی تیاری مگر وہ سپرٹس اس دن ہوئی کہ جس دن رول نمبر سلپ آئی تھی۔ گو کہ مورال ڈاؤن تھا۔ وہ اتنی کانفیڈنٹ بھی نہیں تھی۔ پچھلی ناکامی کی وجہ سے وہ کافی ڈاؤن ہو رہی تھی لیکن بہر حال..... ٹیسٹ اس نے کلیئر کر ہی لیا تھا۔
ذوالفقار صاحب کو اس کے پورے سال کی کارکردگی کی بنا پر یہ امید تو نہ تھی لیکن ان کی امید برت آئی۔ اور جب اس کا رزلٹ آیا تو..... تو اس کی خوشی ویدنی تھی۔

”مبارک ہو ابو..... آپ کی ساری سازشی عورتوں جیسی چالیں ناکام ہو گئیں۔ میں نے ٹیسٹ کلیئر کر لیا ہے۔“ ذرا چمک کر اور طنز سے اطلاع دی گئی تھی۔ وہ چمکتی تھی اور ای، ابو کے دل کو ہاتھ پڑا تھا..... اکلوتی اولاد..... ایٹ آباد..... ہاسٹل.....

وہ کیا کریں گے اس کے پیچھے؟ تو کیا وہ ایک دوسرے کی مشکلیں دیکھ، دیکھ کر ہی دل بھر لیا کریں گے؟ کیا وہ یوں اکیلے اکتانہ نہیں جایا کریں گے لیکن ذوالفقار صاحب وعدہ کر چکے تھے۔ بات مان کر اب مگر نہیں سکتے تھے..... دل پہ کتنی ہی بھاری سل رکھ کر اسے بھیجا تھا۔ کاش کہ وہ دیکھ پاتی۔

جب وہ اسے کیڈٹ کالج کے ہاسٹل چھوڑ کر آرہے تھے..... تو وہ تو خوشی، خوشی چلی گئی تھی اور غمگین..... وہ یوں رو پڑی تھیں جیسے کہ وہ کوئی چار سال کی بچی ہو.....

”فکر نہ کرو غمگین..... تم دیکھنا یہ چار دن کی چاندنی ثابت نہ ہوئی تو میرا نام بدل دیتا۔“ ذوالفقار صاحب نے بڑے وثوق سے کہا تھا اور کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

چلو چار دن کی نہ سہی..... چار ماہ کی ہی سہی..... چار ماہ میں ہی اس کا آری آفیسر بننے کا شوق ناک کے رستے باہر نکلا تھا۔ صبح، صبح اٹھ کر پی ٹی پھر کالج اور اوپر سے ہاسٹل کی سخت روٹین..... وہاں کے کھانے، اکیلا پن..... ای، ابو کے ساتھ، ساتھ ثنا بھی یاد آتی تھی۔ اور یاد بعد میں آتی تھی حسب توقع رونا پہلے مابنامہ پاکیزہ 73 نومبر 2016ء

وہ ایک وقت میں کئی کام شروع کرنے والی..... اور پھر کسی بھی کام کو مکمل نہ کرنے والی وہ..... وہ ہر کام بلا سوچے سمجھے شروع کرنے والی..... اور پھر سوچ، سوچ کر ہلکان ہونے والی کہہ ہائے..... میری عقل کہاں تھی کہ جب فلاں، فلاں کام کیا تھا..... ہاں..... بیچاری عقل تب ہی تو نہیں تھی جب وہ فلاں، فلاں کام کیا تھا۔

وہ، وہ ہنیا ذوالفقار..... اب ارادہ تھا کہ وہ کیڈٹ کالج کے ٹیسٹ کی تیاری کرے گی۔ ہاں ارادہ تھا..... مگر وہ مستقل مزاجی کہاں سے لاتی جو کہ اس کی فطرت کا حصہ ہی نہیں تھی۔ دن چڑھے تک سوتی رہتی..... رات گئے تک FB کھول کر چیٹنگ میں مصروف رہتی..... نیند تب ہی آتی تھی جب وہ کسی ٹیوٹر کی کتاب کو ہاتھ لگاتی تھی۔ یوں جیسے وہ کوئی نشہ آور دوا تھی۔ اور کتاب کو ہاتھ لگایا نہیں اور نیند کا حملہ ہوا کہ بس ہوا کو چنگ سینئر جوائن کر رکھا تھا۔ احسان تھا اس کا جو وہ وہاں لیے جانے والے ٹیسٹ کی تیاری کر لیا کرتی تھی۔

بیچارے کو چنگ سینئر والے بڑے ہی ممنون تھے کہ نہ صرف یہ کہ ہنیا صاحبہ نے وہاں داخلہ لے رکھا تھا..... بلکہ احسان اور احسان کہ وہ..... وہاں روزانہ جاتی بھی تھی اور ٹیسٹ بھی تیار کر ہی لیتی تھی اس طرح کہ نمبرزد کھانے والے نہیں ہوتے تھے۔ وہ نالائق نہیں تھی مگر ایک سال کا گپ اسے بور کر رہا تھا..... یوں جیسے وہ مرکز سے ہٹ گئی ہو۔ آری شوق تھا، جنون نہیں اور یہ جنون ہی ہوتا ہے جو آپ سے کچھ کروانا ہے، شوق پنا جنون کے کچھ نہیں..... حقیقت حال یہ تھی کہ فوج سے زیادہ فوجیوں میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ وقت کے ساتھ، ساتھ محور بدل چکا تھا۔ اس کا پہلا کرش فوجی تھے۔ خواہ..... کوئی بھی ہو..... بس وہ پاک آری کی وردی میں ہو دوسرا، تیسرا اور آخری کرش بھی فوجی ہی تھے۔ خواہ کوئی بھی ہو..... بس یہ کہ پاک آری کی وردی میں ہو خیر..... تو وہ کر رہی تھیں ٹیسٹ کی

حاضری لگوانا کرتا تھا۔ اس کی رنگت میں اضافہ ظہور پر
 جھلکتی پیلاہٹ دیکھی جاسکتی تھی۔ آنکھوں کے نیچے کی
 جلد سیاہ ہوتی محسوس کی جاسکتی تھی۔ دلی تو تھی ہی اب تو
 یوں لگتا تھا کہ وہ چند دن کی مہمان ہے اور بس..... اس
 نے کب یہ سب سہا اور گھر سے دوری برداشت کی تھی۔
 ماں ابھی تک نوالے منہ میں ڈالتی تھیں۔ جب کیڈٹ
 کالج آئی تو لگ پتا گیا کہ کس بھاؤ بکتی ہے۔
 تو پھر چار دن کی نہ سہی..... چار ماہ کی ہی
 سہی..... شوق پورا ہو چکا تھا۔
 وہ اسی کیڈٹ کالج کو چھوڑ کر لات مار کر واپس
 آئی تھی کہ جس کے لیے اس نے ایک محاذ کھڑا کر دیا
 تھا۔ ایک جنگ لڑی تھی اور پھر جیتی بھی تھی اور اب وہ
 اپنی مرضی سے ہار گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
 کالج چھوڑ کر آنے پر ابو کو محسوس ہوا تھا کہ اب کہ
 تو خاص طور پر ٹشو پیروالوں کو آرڈر کرنا پڑے گا
 احتیاطاً وہ کافی ڈبے لاکر رکھ بھی چکے تھے مگر وہاں تو
 الٹا ہی رسپانس تھا۔
 اسے چپ لگ گئی تھی..... اور اس طرح سے لگی
 تھی کہ لگتا تھا کہ اب کہہ کر ہی چھوڑے گی اسے۔
 اس کے امی، ابو دونوں خاموش تھے اور وہ
 چاہتے تھے کہ وہ سنبھلنے کے لیے وقت لے..... اور وہ
 نموشی سے اس کی خاموشی کو دیکھ رہے تھے۔ مگر اس کی یہ
 چپ اس کے رونے سے زیادہ خطرناک تھی۔
 وہ بولتی اچھی لگتی تھی..... طوفان اٹھاتی..... سب
 کچھ الٹ پلٹ کرتی ہوئی پیاری لگتی تھی۔ بس اب اسے
 یہ کون سمجھائے؟

☆ ☆ ☆
 اور ادھر اس نے کوشش کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔
 اسپیشل سروسز دوزخ ہے۔ وہ واقعی تھی۔ اس طرح کی
 ٹریننگ تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ انسانوں کو دمی جانے
 والی ٹریننگ ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگ جائے۔
 ہاں یہ اتنی ہی سخت ہوتی ہے۔ پچیس فیصد لوگ ہی
 کامیاب ہو پاتے ہیں اور جو نہیں ہو پاتے وہ ظاہر ہے
 ناکام ہوتے ہیں یا بھاگ جاتے ہیں اور پھر ساری عمر
 یہی کہتے رہتے ہیں۔
 ”اسپیشل سروسز دوزخ ہے و دوزخ.....“ تو ایک
 دفعہ اس کا بھی دل چاہا کہ وہ بھاگ جائے..... جب
 36 میل کی rugged terrain یاد کرنی پڑتی
 ہے۔ محض 9 گھنٹوں میں اور وہ بھی فل combat
 load کے ساتھ تو ہر ایک کا دل ایک دفعہ تو ضرور ہی
 چاہتا ہے..... وہ بھاگ جائے اس سے بھلی آرمی کی
 جنت..... جنت بھی وہ جو بظاہر جنت ہی نظر آتی ہے۔
 مگر ہر دفعہ بھاگنے سے پہلے اسے یاد آتا تھا وہ
 جملہ جو کہ اس کے باپ نے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆
 اسے کون بتائے جب وہ پٹر، پٹر بولتی ہے تو اتنی
 کیوٹ لگتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ ذرا اس کے گال پر
 ایک چٹل بھر کر تو دیکھیں۔
 وہ ایسے خاموش بہت بری لگتی ہے..... بہت ہی
 بری..... اتنی کہ ابو اور امی کہ دل کو تکلیف ہوتی ہے مگر.....
 اسے کون بتلائے.....؟ اسے کون سمجھائے.....؟

☆ ☆ ☆
 اسے کون بتلائے.....؟ اسے کون سمجھائے.....؟

☆ ☆ ☆
 اسے کون بتلائے.....؟ اسے کون سمجھائے.....؟

☆ ☆ ☆
 اسے کون بتلائے.....؟ اسے کون سمجھائے.....؟

اگر نے کا حق تھا کہ اس سر پر بیرون بیٹ رہی تھی اور یہ "ہا" سے کم تر تو نہ تھی۔ کسی بھی لحاظ سے کسی بھی طرح..... یہ "ہا" سے ہرگز، ہرگز کم تر نہیں تھی۔ اس کے سینے پر وہ wing آویزاں تھا جو کہ زندوں کا نشان حیدر تھا۔

اور اس کے بائیں بازو پر وہ چیخ سجا تھا کہ جو اسپیشل سروسز کے کمانڈوز کی پہچان تھا۔ اس کا حق تھا کہ اسے امتیازی سمجھا جائے۔

کیسے ہو سکتا تھا وہ عام آدمی.....؟ اور نہیں تھا وہ عام آدمی۔ وہ خاص تھا..... غیر معمولی..... کہ وہ ایک کمانڈو تھا۔ the few, the proud, the commandos

من جانبازم، من جانبازم، من جانبازم

☆☆☆

"ہنیا بچے کیا ہو گیا ہے، دنیا آرمی پر تو ختم نہیں ہوتی ناں....." وہ امی تھیں جو بڑے لاڈ سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہہ رہی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ ان کی گود میں منہ چھپا کر لپٹی تھی اور خوش تھی۔ ضرورت سے زیادہ ان کی اس بات پہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"امی، ابو ٹھیک کہتے تھے..... میں اس کی اہل ہی نہیں تھی..... میرے لیے مشکل کاموں میں سے ایک کپڑے دھونا اور دوسرا برتن مانجھنا ہے..... کتنا ٹھیک کہا تھا ابو نے ناں..... پتا نہیں کیوں ہم بچوں کو خود سے تجربہ کرنے کے بعد ہی سکون آتا ہے۔ اور یہ اچھا ہو گیا ناں امی..... میں اب کبھی آرمی کا نام ہی نہیں لے سکوں گی۔" وہ آزرہ تھی اور آزرہ کی اس بات کی زیادہ تھی کہ وہ اب کسی ملٹری مین کو نہیں دیکھ سکے گی۔

"تو کیا ہوا..... اور بھی تو فیلڈز ہیں ناں....." امی نے اس کے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

وہ افسردگی سے مسکرائی۔ اب کیا بتاتی امی

کون..... اپنے پہلے، دوسرے، تیسرے اور آخری کرش

اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کل کو وہ بھی ایسا ہی کوئی جملہ کسی ڈانگ ٹیبل پر بیٹھ کر اپنے بیٹے کو کہے..... وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ بھاگنے کی سزا اس سے بدتر تھی۔ وہ جان لڑا دینا چاہتا تھا اپنا بیٹا دینا چاہتا تھا اور اس نے لڑا دی جان اپنی..... اپنی تمام تر قوتوں کو آزما لیا۔ مگر اس کے باوجود سوائیول ٹریننگ نے اسے ناک کے بل گرایا تھا..... یہ اب تک کی سب سے مشکل ترین ٹریننگ تھی جو اس کے لیے بھی لوہے کے چنے ثابت ہوئی تھی۔ جو اسے دانٹوں تلے چبانے ہی تھے۔

یہ اب تک کی ٹریننگ کا سب سے مشکل حصہ ثابت ہوئی تھی کہ اس میں combatant مکمل طور پر unarmed ہوتا ہے۔ وہ، وہ بری طرح سے زخمی ہوا تھا۔ اسپتال میں بھی رہا تھا مگر ہمت نہیں ہاری تھی اس نے..... اور ہر کمانڈو بننے والے کا پہلا وصف یہی تو ہوتا ہے۔

"ہمت....." اسے بڑی شرم آتی تھی اس بات سے کہ۔ کل کو وہ بھی کہیں یہ کہتا ہوا نہ پایا جائے..... کہ ایلٹ فورسز دوزخ ہے دوزخ..... وہ مرد تھا اور "انا" ہی بڑا مسئلہ تھا اس کا..... اوپر سے ایک فوجی بہادر اور محبت وطن ہو۔

اور اس نے کر دکھایا بہادری کا کام..... اب کی بار وہ ہارا اور نہ زخمی ہوا..... اس نے کر دکھایا ٹریننگ کا سب سے مشکل مرحلہ اور انعام میں کیا ملا بھلا؟ Maroon beret کہ ساری دنیا میں کمانڈو اسی میرون بیٹ سے پہچانے جاتے ہیں یہ ان کے elite ہونے کی نشانی ہے۔ اس کی کہنی ضرار تھی جو کہ counter, terrorism کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا فخر تھا وہ wing جو کہ اس کے سینے پر آویزاں ہو گیا تھا۔ اگر وہ گردن اکڑاتا تھا تو ٹھیک اکڑاتا تھا۔ وہ اپنی ماں کا فخر تھا اور باپ کا مان..... کہ وہ عام انسان نہیں تھا۔ "وہ ایک کمانڈو تھا۔" وہ ایک قیمتی انسان تھا..... ہم اور آپ سے زیادہ قیمتی کہ وہ رکھوالا بنایا گیا تھا..... وہ اکڑاتا تھا تو ٹھیک اکڑاتا تھا کہ اسے

"میری امی کے ہونے والے داماد اگر تم فوجی نہ ہوئے تو اللہ کرے کہ تم ہو ہی نہ....."
 "زندگی کتنی حسین ہو، اگر اس میں ایک عدد فوجی ہو اور مزید یہ کہ وہ میرا شوہر ہو۔"

"آف، کوئی فوجی میرے اسٹیشنس پڑھ کر ہی مجھ پر عاشق ہو جائے۔" ایک اداس emoticon۔
 "کیا سارے فوجی محاذ پر چلے گئے جو مجھے کوئی ملا ہی نہیں....." پھر سے او اس شکل والا emoticon۔

"I love maroon berets"
 "man janbazam"
 "I wishq comondos"

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے.....
 جو کہلاتے ہیں ssg کے فرزند.....
 "یقین کرو اگر تم میری زندگی میں نہ ہوئے تو میری زندگی بھی کوئی زندگی ہوگی بھلا.....؟" تو یہ تھے چند جملے جو کہ ہنیا ذوالفقار کے f.b اسٹیشنس کی زینت بنے رہتے۔ فوجی سے شروع ہونے والی محبت آ کر ختم ہوتی تھی کمانڈرز کے عشق پر.....

چار سالوں میں بی ایس سی آنرز۔۔۔ تو ہوا سو ہوا..... مگر یہ بھی ضرور ہی ہوا تھا۔ اور اب یہ ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی کہ ہنیا کسی کمانڈر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اور پھر آخری سمسٹر آ گیا۔ اس کے آخری سمسٹر میں ٹیسس شامل تھا اور یہ ٹیسس اسے ناک رگڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اسے لیب میں ایک مخصوص قسم کی مٹی میں پودے اگانے تھے..... وہ ہی پودے جو کہ ایک عام کسان اپنے کھیتوں میں بڑے آرام سے بیج بو کر اگالیتا ہے۔ مگر اس کے پودے آگ کے ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ نہ جانے روز کیا کیا پڑھ، پڑھ کر ان پر پھونکتی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھلکے ہوئے مرجھائے ہوئے پودوں کے ساتھ، ساتھ ہنیا کا بھی ڈھلکا ہوا مرجھایا ہوا منہ..... اور ابک وہ تھا اس کا کمانڈر..... جو کہ مل کے ہی

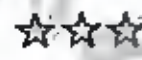
"تم کوئی اور اچھی سی فیلڈ جوائن کر لو....."
 "معلوم نہیں..... اب تو جو ابو کہیں گے وہ ہی کروں گی۔" وہ یوں بولی تھی جیسے آری نہیں تو کوئی بھی سہی..... کیا فرق پڑتا تھا۔

"یوں چپ نہ ہوا کر دہنیا..... اس گھر میں اور کون ہے بولنے والا؟ تم چپ ہوتی ہو تو دنیا اندھیری سی لگتی ہے۔ ایسے نہ کیا کر دیجئے....." امی کہہ رہی تھیں اور اس نے چونک کر امی کی آنکھوں دیکھا.....

اور بھلا کیا دیکھا؟ اس نے کس قدر غلط کیا تھا..... "آئی ایم سوری امی..... اور۔" اس نے دوبارہ منہ ان کی گود میں چھپایا۔

"تم افسردہ کیوں ہوتی ہو! آری نہ سہی..... ہم تمہاری شادی ہی کسی فوجی سے کرادیں گے۔" یہ خالص مذاق تھا۔ اور پہلے بھی ہوتا آیا تھا مگر اب ان حالات میں ایک معطر جھونکا ثابت ہوا تھا۔ آری نہیں تو نہ سہی..... فوجی تو بہر حال موجود ہی تھے ناں..... وہ کدھر بھاگے جا رہے تھے۔ وہ تو یہیں تھے ناں اس نے امی کی گردن میں وولوں بازو ڈال کر ان کے گال چومے تھے۔

"پاگل!" اس کے سر کو ہاتھ سے ٹھوکا دیتے ہوئے وہ بولی تھیں۔



اس نے پھر بی ایس سی آنرز.... میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ قائد اعظم یونیورسٹی میں انوائرمینٹل سائنسز (enviornmental sciences) کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اور ان چار سالوں میں مکمل طور پر اس کا عشق فوج سے فوجیوں تک منتقل ہو چکا تھا۔



کمانڈرز یا پاکستانی فوجیوں کے متعلق ہی تو تھے..... اور اس کے اسٹیشنس بھی کچھ اسی قسم کے ہوتے تھے..... مثلاً.....

"ہائے..... زندگی میں اور کچھ..... نہ ملے....."

نہیں دے رہا تھا۔ اور ایک یہ تھے۔ اس کے پودے جو کراگ کے نہیں دے رہے تھے۔

روزانہ وہ روٹی صورت بنائے پونہ سٹی سے آتی تھی۔
”چلو ہنیا..... تمہیں کسی کسان سے طو اتا ہوں..... اس سے پوچھ لو.....“ اس دن ابو نے پھر سے اس کی روٹی صورت دیکھ کر کہا تھا۔

”ابو.....“ وہ شا کڈھی تو رہ گئی تھی۔
”یہ پلانٹ اگر کسی زمین پر اگانا ہوتا تو ہر کوئی اگا سکتا ہے۔ یہ لیب میں اگانے ہیں..... اور وہ بھی loamy siltsoil میں..... جس کا آپ کو پتا بھی نہیں ہیں اینوار مینٹل سائنسز پڑھ رہی ہوں۔ کوئی کسانیات نہیں اور یہ کہ مجھے کسان نہیں بننا.....“ تاک چڑھا کر تپ کر اس نے کہا تھا۔ ای بے اختیار ہنسی تھیں۔

”آپ ہنس لیں..... جبکہ میری جان پہنچا ہوئی ہے۔“ وہ کھانا چھوڑ کر منہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔
”کیا اس سلسلے میں کماٹڈوز سے رابطہ نہ کیا جائے۔ سنا ہے وہ ہر طرح کے آپریشنز.....“ ذوالفقار صاحب نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ اور ابو کی اس بات پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں اس طرح دیکھا تھا کہ ...

”ہاں.....“ اور پھر نہایت ہی کا فیڈنس سے جواب آیا تھا۔
”تو یوں یوں ناں..... چہرا..... تمہیں مجھ سے زیادہ میری گاڑی کی لفٹ چاہیے۔“

”ہاں تو کیا..... دوست کس ہو تم بی..... یا..... رے..... والی۔“ اور ساتھ ہی اس نے ایک عدو بوسہ فون کو کیا تھا۔ جو کہ دوسری طرف سے سنا گیا تھا۔
”اچھا لے چلوں گی۔ کب جاتا ہے؟“ وہ ہلکے سے ہنس وی۔ اور پھر ثنا سے بتانے لگی تھی۔

سب کچھ طے کرنے کے بعد اس نے سل فون بند کر کے گہری سانس لی تھی۔ یہ انتہائی سڑے ہوئے دنوں میں کسی معطر جھوٹے جیسا تھا..... ثنا سے ملنا اور ایک پورا دن..... مستی بھرا دن..... گزارنا..... یہ نہایت خوش کن تھا..... دوستوں سے ملنا اور وہ بھی بے حد ... پرانے اور قریبی دوستوں سے ملنا..... یہ انسان کو اندر تک خوشگواریت سے بھر دیتا ہے۔

ہنیا بھی بھر گئی تھی..... خوشگواریت سے اور وہ بھی اندر تک.....

☆☆☆
مومنہ کانی بی شوٹ کر گیا تھا..... اتنا کہ وہ برین

بھرنے سے بال، بال، بال لگی تھی۔

ماہنامہ پاکیزہ 77 نومبر 2016ء

”یہ پلانٹ اگر کسی زمین پر اگانا ہوتا تو ہر کوئی اگا سکتا ہے۔ یہ لیب میں اگانے ہیں..... اور وہ بھی loamy siltsoil میں..... جس کا آپ کو پتا بھی نہیں ہیں اینوار مینٹل سائنسز پڑھ رہی ہوں۔ کوئی کسانیات نہیں اور یہ کہ مجھے کسان نہیں بننا.....“ تاک چڑھا کر تپ کر اس نے کہا تھا۔ ای بے اختیار ہنسی تھیں۔

”آپ ہنس لیں..... جبکہ میری جان پہنچا ہوئی ہے۔“ وہ کھانا چھوڑ کر منہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔
”کیا اس سلسلے میں کماٹڈوز سے رابطہ نہ کیا جائے۔ سنا ہے وہ ہر طرح کے آپریشنز.....“ ذوالفقار صاحب نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ اور ابو کی اس بات پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں اس طرح دیکھا تھا کہ ...

”ہاں.....“ انہیں بات ادھوری چھوڑ کر قہقہہ لگانا پڑا تھا۔

بس اب بھی کسر رہ گئی تھی کہ لوگ اسے ”کماٹڈوز“ کے حوالے سے چھیڑا کریں گے اور وہ بھی اس بات پر کہ اس بات پر کہ اس کے پودے نہیں آگ کے دے رہے تھے۔

اس کے ساتھ دوسرا ہونے والا حادثہ..... ثنا کی بالکل ہی مختلف فیلڈ جو ان کرنے کا تھا۔ ایک سال ضائع کرنے کی وجہ سے وہ ثنا سے بھی پیچھے رہ گئی تھی۔ ثنا اب CSS کی تیاری کر رہی تھی۔ ملاقات اب بھی ہوئی تھی مگر..... Fb پر زیادہ رو برو کم..... اس دن بالکل ہی غیر متوقع طور پر ثنا کی کال آئی تھی۔

”فری ہو.....؟“ چھوٹے ہی اس نے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نرس کو روکا تھا۔
 ”اسے اس کی بہن سے ملا لائیں پلیز.....“ گل نے
 اس پچارگی سے کہا کہ نرس کا دل دھک کر رہ گیا تھا۔
 اس نے ہلکے سے سر اثبات میں ہلایا اور مسکرا کر
 سعد کو دیکھا۔

”آؤ، اندر چلیں۔“ نرس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔
 ”تمہاری بہن سے ملیں گے۔“ اور بہن کا نام
 سن کر اس نے اپنا ہاتھ نرس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔
 اندر مومی نلکیوں میں جکڑی لیٹی تھی..... دونوں
 ہاتھ پیچوں میں بندھے اور بے ہوش تھی۔
 اسے دیکھ کر وہ خوفزدہ ہوا۔

”مومی مر جائیں گی؟“ اس نے منہ بسور کر
 پوچھا تھا۔
 ”نہیں تو..... مومی تو سو رہی ہے۔“ نرس نے
 ہلکی سی سرگوشی کی اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا
 کر کہا تھا۔

”وہ ایسے تو نہیں سوتیں۔“ اس نے مومی کی
 طرف اشارہ کر کے کہا۔

”وہ تھوڑی سی بیمار ہے۔ اس لیے ایسے سوئی
 ہے..... ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔“
 سعد نے بے یقینی سے نرس کو دیکھا۔

”ہو جائے گی..... پر اس.....“ اب کے نرس
 نے اس کا ہاتھ تمام کر پر اس کرتے ہوئے کہا تھا۔

”آؤ باہر چلتے ہیں۔“ اور پھر اس کا ہاتھ پکڑے
 ہوئے ہی اس نے باہر کی طرف کارخ کیا تھا۔ سعد اس کے
 ساتھ چلتے ہوئے بار، بار چہرہ موز کر مومی کو دیکھتا تھا کہ.....
 ”وہ ایسے تو نہیں سوتی تھیں۔“ باہر آتے ہی اس
 کی نظر ماں پر پڑی تھی کہ جو دیوار سے سر ٹکائے کھڑی
 ایک خاموش مرثیہ لگتی تھیں۔

نرس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چوکیں۔
 اس نے سعد کی انگلی گل کو پکڑائی تھی۔

”وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ اور پھر تسلی دیتے
 ہوئے کہا تھا۔ گل نے آہستگی سے سر ہلایا اور پھر سر

وہ بے ہوش تھی اور ICU میں تھی۔
 اس کے باپ کی نماز جنازہ بھی ہو چکی تھی اور
 علامتی قبر بھی PAF کے قبرستان میں بن چکی تھی۔
 مگر وہ بے ہوش تھی..... اور ICU میں تھی۔

کیا تھی اب اس کی زندگی..... بابا کے
 بغیر..... اس کے ہونٹ اب بابا کہنے کو ترسا کریں
 گے۔ اس کی بانہیں اس لس کو ڈھونڈا کریں گی۔ وہ کس
 کے سینے پر سر رکھے گی اب؟ اور کس کو مان بھری
 آنکھوں سے دیکھے گی اور کون اسے چوڑیاں دلوانے
 لے جائے گا۔

”کیا اب بھی وہ ایسی ہی فرمائشیں کرے گی؟“
 ”اب کس کو وہ اس کا بچا بنا کر دکھائے گی.....
 ہاں کس کو.....؟“ گل ICU آ کے باہر..... اس
 حالت میں تھیں کہ کس کو روکیں۔ عجیب عالم کو..... یا
 مومی کو.....

مومی کی حالت ہی ایسی تھی کہ دل کرتا تھا کہ سر
 پہ ہاتھ مار، مار کر رو یا جائے۔

سعد..... بار، بار پوچھتا تھا۔ ”مومی کو کیا ہوا ہے
 مئی.....؟“

”مئی..... کیا ”مومی“ بھی بابا کی طرح چلی
 جائے گی؟“

”مئی..... کیا مومی..... بھی اب نظر نہیں آئیں
 گی؟“ وہ نویں سال میں تھا اور سرے کے مطلب سے
 آشنا ہوا تھا۔ متنی و مفہوم کے ساتھ نہ سہی..... مگر اتنا تو
 جان ہی گیا تھا اب کہ جو مر جاتے ہیں وہ واپس نہیں
 آتے، نظر نہیں آتے..... تو وہ سوال کرتا تھا اور خوفزدہ
 تھا کہ کہیں مومی بھی بابا کی طرح.....

اور وہ تو بچہ تھا..... معصومیت سے سوال کرتا
 تھا مگر ایسا کرتے ہوئے نہیں جانتا تھا ماں کے دل پہ کیا
 گزرتی تھی؟

”مئی.....“ اب کی بار اس نے گل کی کالی چادر کا
 کونا کھینچ کر منہ بسورا تھا۔

گل نے تھک کر اسے دیکھا..... اور اندر جاتی
 مابنامہ پاکیزہ 78 نومبر 2016ء

تھیں اور بیڈ کی گراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھی۔
اس شوٹی پر انہیں اور رونا آیا۔
ڈر کے مارے اس سے کوئی بابا کا ذکر نہیں کر رہا
تھا کہ کہیں پھر سے وہ..... اور نہ ہی یہ سوال کیا کہ
”ڈرپ کیوں اتاری۔“

”کچھ لاؤں کھانے کو۔“ آنسوؤں کو پیتے
ہوئے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
گل مڑنے لگیں کہ اچانک ان کی نظر اس کے
ہاتھ پہ جا پڑی۔

”موی.....“ ان کے اوسان خطا ہوئے..... اور
انہوں نے جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے وہ چیز چھیننی
چاہی تھی۔

”مجھے مرنے کی ضرورت نہیں رہی مہی..... یہ نیند
کی گولیاں ہیں۔“ ماں کو دیکھتے ہوئے اور بی والہ ہاتھ
ان کے سامنے کھولتے ہوئے وہ بولی تھی۔

گل کے ہونٹ کپکپائے اور انہوں نے اس
کپکپاہٹ کو روکنے کے لیے ہاتھ ہونٹوں پر رکھا..... مگر
ہاتھ..... وہ بھی اس لرزش کو روکنے میں ناکام رہا۔

”کچھ کھانے کو دے دیں..... تاکہ میں یہ
کھا سکوں.....“ اس نے پھر ہاتھ کی ہتھیلی کو ان کے
سامنے کیا تھا۔

اس کا چہرہ بے تاثر اور اتنا سپاٹ تھا کہ گل کو
حیرانی ہوئی۔
وہ حیران ہی تو کرتی آرہی تھی۔

اور پھر یک دم انہیں اور اک ہوا کہ اس کا
سوجانا ہی بہتر تھا۔ ہاں کم از کم ابھی اس وقت اس کا
سونا ہی ٹھیک تھا۔ کبھی، کبھی انسان کے پاس کچھ نہیں
بچتا..... کچھ بھی تو نہیں..... ماسوائے راہ فرار کے.....

☆☆☆

گاڑی کے ٹائر اچانک اور غیر متوقع طور پر.....
چرچرائے تھے۔ ”یہاں کیوں روک رہی ہو، ادھر نہیں
ہے، آگے ہے لاہریری۔“ ٹانے ایک دھپ اس کے
کنڈے پر لگاتے ہوئے کہا مگر وہ اور اس کے انداز
ماہنامہ پاکیزہ 83 نومبر 2016ء

ویوار کے ساتھ لگا لیا۔ سردیوں کی ٹانگوں کے ساتھ
چلتے ہوئے دونوں بازو اس کے وجود کے گرد لپیٹتے
ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔ اور وہ خاموش کھڑی تھیں۔

وہ روم میں آئیں تو وہ بیڈ پر نہیں تھی۔ کل رات
ہی اسے ICU سے روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اسے
بیڈ سے غائب دیکھ کر ان کے دل کو دھچکا لگا تھا۔

”موی.....“ وہ بے طرح سے بوکھلائی تھیں۔
بوکھلاہٹ اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اسے تو ڈرپ لگی
ہوئی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کسی خدشے کے تحت

ڈرپ کی پن کو دیکھا۔ اور ان کا خدشہ درست نکلا تھا۔
ڈرپ کی سوئی پہ بلڈ لگا ہوا تھا۔ یقیناً اسے کھینچ کر
نکالا گیا تھا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ

مڑی تھیں اور سامنے سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل
ہوئی تھی۔ ایک لمحے کا سکون اور پھر سے سکون
غارت..... ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلی مرتبہ ان
دونوں کا ٹاکرا ہوا تھا۔

اور آج عجیب عالم کی شہادت کو چوتھا دن تھا۔ گل
کا دل چاہا کہ وہ اس دکھ پہ مل کر اکتے رد میں مگر وہ
دونوں اپنی، اپنی جگہ پہ ساکت تھیں۔

گل کے ہونٹ پھڑ پھڑائے..... اور آنکھوں
سے پانی پھسل، پھسل کر بہنے لگا..... وہ خاموش، پیلا
زدہ چہرہ لیے کھڑی رہی..... اور پھر آگے بڑھ کر ان

کے پاس سے ہو کر بیڈ پر آ بیٹھی تھی۔
اس کی بائیں آستین ابھی تک فولڈ کی ہوئی تھی
اور وہاں سے کھینچ کر ڈرپ کی سوئی نکالنے کی وجہ سے

خون نکلنے کے بعد جم سا گیا تھا۔ دونوں ہاتھ ٹیٹوں میں
بندھے ہونے کے باوجود سوجے ہوئے لگتے تھے۔

”کدھر گئی تھیں؟“ اپنے آنسو صاف کر کے
لڑتی آواز میں انہوں نے پوچھا۔
جواب..... خاموشی.....

اتنی اور ایسی خاموشی کہ گل کو پلٹ کر دیکھنا پڑا۔ وہ
دونوں ہاتھ گود میں رکھے مٹھی میں کچھ دبائے خاموش
نظر میں جھانکتی تھی۔ اس نے ٹانگیں سیدھی کر رکھی

بے پروائی اس نے گاڑی کو ٹیکہ کیا اور پھر فٹ پاتھ کے ساتھ لاکڑا کیا تھا۔

شا اس کی کارروائیوں پہ ہی حیران تھی۔

”کیا تماشا ہے بھی۔“ اس نے شا کی تمام تر گھوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیک ویو مرراپنے اوپر سیٹ کیا۔ پرس سے لب گلوں نکالا..... اس کی ایک عدد تہہ ہونٹوں پر بھائی ہونٹ سکیڑ کر پہلے دائیں رخ سے اپنا جائزہ لیا اور پھر بائیں رخ سے۔

دو پٹا جو کہ گلے میں تھا پہلا کر شانوں پر کیا اور پھر نہایت سلیقے سے اس کو آدھے سر پر جمالیا تھا۔ ایسے سلیقے سے کہ انتہائی سلیقہ مند خواتین دانتوں تلے انگلی چبانے پر مجبور ہو جائیں۔

سن گانگڑ ڈیش بورڈ سے اٹھا کر آنکھوں پر لگائے، سیٹ سے پرس اٹھا کر اس کے اسٹریپ کو کندھے پر ڈالا اور پھر نہایت ہی احتیاط کے ساتھ پاؤں باہر نکالا تھا گاڑی سے۔

”یہ ہو کیا رہا ہے؟“ شا کی حیرت تھی کہ بس مزید سے مزید تر ہوتی جا رہی تھی۔

گاڑی سے باہر نکل کر اس نے اپنے کپڑے ٹھیک کیئے، وہ گھٹنوں تک آتی شرٹ اور گھیر دار شلوار میں ملبوس تھی۔ آہستہ، آہستہ نازکی سے بے پروا سی چال چلتی ہوئی بظاہر بے حد کانفیڈنٹ مگر اندر سے دھک، دھک کرتے دل کے ساتھ وہ اس طرف جا رہی تھی۔

”آخروہ کس طرف جا رہی تھی؟“ شانہ کھولے اسے اس طرف جاتے دیکھ رہی تھی اور پھر جیسے ہی اس کی سمت کچھ واضح ہوئی تو شا کا دل چاہا کہ وہ رکھ کر کسی توپ کا گولہ اس پر دے مارے۔ وہ ایک عدد فوجی کی طرف جا رہی تھی۔

”ایکسکوز می.....!“ اس نے بڑے ہی انداز سے گن پکڑے سختی کا سا تاثر لیے لانگ بوٹ پہنے ڈیوٹی پر مستعد کھڑے اس فوجی سے کہا تھا۔

”السلام علیکم.....!“ اس کے ایکسکوز می کا

جواب آیا تھا۔ وہ سہانگی..... اور ذرا سی ہڑبٹائی..... ”وعلیکم السلام..... وہ..... وہ یہاں لائبریری.....“

اور پھر ہٹکائی۔ اس نے سلام کیوں نہ کیا۔

”میڈم یہ لائبریری کا بیک گیٹ ہے، یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے، آپ وہ جو CSD کا گیٹ نظر آرہا ہے نا اس سے اندر داخل ہو کر سیدھا چلے جائیں اور آگے جا کر رائٹ ٹرن لیجیے گا۔ وہاں ہے لائبریری کا مین گیٹ آپ کو نظر آجائے گا۔ گاڑی اندر لے جائیں آپ۔“ وہ اپنی پوری کوشش کے ساتھ اسے سمجھا رہا تھا۔ اور وہ..... وہ.....

☆☆☆

”ہائے اللہ، کوئی تو پکڑو اسے..... کہیں لڑکی بیچاری جان سے ہی نہ جائے۔“ کہ کس قدر تمیز سے میڈم، میڈم کہہ کر وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ مگر پھر ہوا کیا کہ یہ شا کہاں سے آگئی تھی اس کے پیچھے۔

”بہت شکر یہ بھائی فوجی..... نہایت تم بھی شکر یہ ادا کروناں فوجی بھائی کا۔“

براہو اس شا کی بچی کا..... عین وقت پر نہایت ہی غلط ٹائم پر آگئی تھی۔ اس نے دانت پیس کر ایک جھٹکے سے مڑ کر اسے دیکھا جواب دانت نکوسے اسے دیکھ رہی تھی۔

”شکر یہ.....“

اور پھر پتھر دے مارنے والے انداز میں ہنکزیہ ادا کرتی وہ کھٹ، کھٹ کرتی گاڑی کی طرف مڑی تھی۔ قسم سے شا کو کچا چبا جانے کو دل کر رہا تھا۔ شا اپنی ہنسی روکتے ہوئے اس کے پیچھے، پیچھے آئی تھی اور گاڑی میں بیٹھتے ہی یہ بڑا سا قہقہہ اس نے لگایا تھا۔ اور پھر ہنستی، ہی جا رہی تھی، ہنستی ہی جا رہی تھی۔

”منہ بند کرو اپنا در نہ میں.....“ گانگڑ ڈیش بورڈ پر پھینکتے ہوئے اس نے نہایت تنگ کر لے دھمکی دی تھی اور دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی کہ شا کو ابھی لائبریری جانا تھا۔ بے حد برے موڈ کے ساتھ وہ گاڑی اندر لے کر گئی تھی۔

قسمت سے آج ایک موقع ملا تھا مگر وہ بھی شا کی بچی نے بھائی کہہ کر غارت کر دیا تھا۔

ہاں ہوتے ہوں گے فوجی جوان ساری مخلوق کے بھائی لیکن نہیں تھے تو بس ہنیا ذوالفقار کے نہیں تھے۔

”خبردار جو کسی نے بھائی کہا۔ ہاں..... اور جس نے بولنا ہے وہ اپنا منہ سنبھال کر آئے (شا کے علاوہ) سلاست نہیں رہے گا۔“ گاڑی کو پارک کر کے وہ مین گیٹ پہ ID کارڈ نکال کر اندر آئیں تو اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ وہاں ایک عدد توپ رکھی ہوئی تھی اور بھی دوسرے ایسے ماڈلز تھے جو کہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہ جگہ فوجیوں کے زیر تسلط ہے۔

”ٹھانیہ کون سی لائبریری ہے؟“ بے دھیانی میں اس نے ٹھانیہ پوچھا۔ ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے۔

”ہنیا نہیں، مجھے تو انکل سردر نے کارڈ دیا تھا اپنا کہ یہاں سے دیکھ لوں بکس اور بتایا تھا کہ CSD کے پاس ہے۔ لوگ یہاں CSS کی تیاری کرنے آتے ہیں۔“ وہ بھی سحر زدہ سی ارد گرد دیکھتے ہوئے چلتے ہوئے بول رہی تھی۔

”ہنیا بولو.....“ ہنیا جو کہ ارد گرد کے نظاروں میں مصروف تھی ڈرا سی بے پردائی سے بولی تھی۔

”لے بھئی بیٹا تیری تو لائبریری نکل آئی۔“ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر ٹھانیہ نے کہا تھا۔

ہنیا نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر اس کی انگلی جو کہ کارڈ کے اوپر لکھے گئے الفاظ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

انکل سردر اس کے تایا تھے اور سول سردنٹ تھے۔ ان کی سفارش پہ ٹھانیہ کو خصوصی اجازت ملی تھی۔

”دکھاؤ ذرا کارڈ.....“ اور وہ لائبریری کے انٹرنس گیٹ پر رک کر بیک سے کارڈ نکالنے لگی تھی۔

اور جب اس نے کارڈ نکال کر دیکھا تو

”ہنیا.....“

”Army public library“ ہنیا نے نیومی ایک نظر ڈالی اور پھر جیسے کرنٹ لگا تھا اسے۔

”آ..... آر..... آری۔“ وہ بے طرح سے بکلائی۔ اور اس کی سانس اکٹھی۔

باذوق پاکیزہ قارئین کے لیے خوشخبری

زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو نہایت مہارت سے پراثر الفاظ کا جامہ پہناتی ہے شمار یادگار تحریروں کی خالق

شیریں حیدر

کی ایک اور دلکش و دلربا سلسلے وار تحریر

امرت

انشاء اللہ یہی پاکیزہ صفحات کی رونق دوہلا کرنے جارہی ہے.....

”صحیح منہٹ مارنا..... صحیح نکتہ مارنا پلیز“ اس نے یو کھلا کر دونوں ہاتھوں سے اسے کول ڈاؤن کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس کے گریے بند کیا گیا تھا۔
 ”مومی.....“ اسے دیکھ کر وہ یک دم دروازے پر ہی رک گیا تھا۔ وہ جوش میں اس سے لپٹ جانا چاہتا تھا مگر اس کا انداز دیکھ کر وہ رک گیا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے۔۔۔ بے تاثیر سی سامنے والی دیوار کو دیکھے جا رہی تھی۔

”آری، آری۔“ جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
 ”ہاں، ہاں حوصلہ، حوصلہ.....“ ثناء نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

”مومی.....!“ اب کہ اس نے مومنہ کے پاس جا کر اس کا بازو ہلایا۔ اس نے چونکے بتا رخ بدل کر سعد کو دیکھا۔

”اندر فوجی ہوں گے۔“ بے حد اشتیاق سے پوچھا گیا۔
 ”ہاں مگر سول کپڑوں میں۔“ ثناء نے اس کے جوش پر رکھ کر شہنشاہ پانی بہا دیا تھا۔
 اس نے منہ بنا کر ثنا کو دیکھا اور پھر گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی آنکھوں کو اس طرف جانے سے روک نہیں پائی تھی..... باوجود اس کے کہ اس نے اجنبائی کوشش کی تھی کہ وہ اس طرف نہ دیکھے مگر..... دیوار خالی تھی۔

”آپ کو کیا ہوا تھا؟“ اور پھر اس کے دونوں بازوؤں پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اس نے پوچھا تھا۔
 مومی نے اس سے نظریں پھیر کر اپنے بازوؤں پہ دھرے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ اس نے چاہا کہ سعد کے کس سے اسے ویسی ہی حرارت ملے جیسے کہ بابا..... آہ..... کہ وہ محروم ہو چکی تھی۔

اس نے سختی سے دانت پر دانت جمائے۔ مضبوطی سے بیروں کو زمین پر جمائے رکھا..... اور سر جھکا لیا..... آنکھیں بند کر کے کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ گلے سے کچھ نیچے اتارا پھر گلے سے بازو چھڑوا کر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ وہ عائلہ اور مومی اس وقت ڈاؤنچ کے داخلی دروازے پر کھڑی تھیں۔ گل نے بے حد بیچارگی سے عائلہ کو دیکھا۔

”سعد.....“ اس نے سعد کے دونوں ہاتھ اپنے ٹیپوں میں بندھے ہاتھوں میں لیے۔
 ”تم نے بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟“ اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ سعد ہم گیا تھا۔

”یہ پروتی کیوں نہیں ہے؟ اس طرح کرے گی تو مرجائے گی۔“ عائلہ نم لہجے میں بولی گئیں۔
 گل خموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں کہ کچھ غموں کا علاج آسمانوں سے ہی اترتا ہے جو انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ سعد بھاگتا ہوا عائلہ کے پاس آیا تھا۔

”پائلٹ.....“ سہم کر ہی کہی مگر جواب دے دیا تھا اس نے۔ اور اس نے ایسی نظروں سے سعد کو دیکھا کہ وہ خوفزدہ ہوا تھا۔
 ”تم نے پائلٹ بننا ہے، ہاں تم نے پائلٹ ہی تو بننا ہے۔“ اس کا لہجہ بھی عجیب تھا۔ وہ ہسٹریک ہو رہی تھی۔ سعد نے منہ بسورا تھا۔

”عائلہ آئی..... مومی کدھر ہیں؟“
 ”کمرے میں گئی ہے۔“ وہ اسی طرح بھاگتا ہوا

”مومی بابا کہتے تھے ناں اور آپ نے بھی پائلٹ بننا ہے۔“ اسی بسورتے ہوئے منہ کے ساتھ اس نے کہا تھا۔ ”ہاں تمہیں PAF کو ہی جوائن کرنا ہے اور پھر مرجانا ہے۔ چھوڑ جاؤ گے تم بھی ناں تم بھی چھوڑ جاؤ گے ناں؟“ وہ سعد سے پوچھ رہی تھی اور اس کی آواز کپکپائی نہ ہی آنکھیں نم ہوئی تھیں..... وہ اینٹریل سی دکھتی تھی۔ اتنی کہ سعد کو وہ اپنی مومی محسوس نہ ہوئی۔ وہ کوئی اور تھی..... کوئی اور پھر سیر نے اپنے

مومی کی ڈزیز تک تھیل پر جا پڑی تھی۔ اور ان کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ چوڑیوں کا اسٹینڈ خالی پڑا تھا۔ یوں جیسے کہ چوڑیاں کبھی اس میں رکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ وہ بے آواز روتی رہی تھیں۔ اور پھر ڈھیر سارا رونے کے بعد اور خود کو ہلکا کرنے کے بعد وہ گل کے پاس آئی تھیں۔

”وہ یوں ہی نیند کی ووا کھاتی رہی تو ایڈ کٹ ہو جائے گی بھائی۔“ نارمل آواز میں کہتے ہوئے وہ ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ ان دیورانی، جیٹھانی کا رشتہ بہنوں سے بڑھ کر تھا۔ یہ سب آپس میں کزنز تھیں۔ گل نے عائکہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ کتنی نارمل تھی یہ اس کا چہرہ بتا رہا تھا۔

”میں اور کیا کروں عائکہ..... اس کے بی بی کا مسئلہ ہی نہیں حل ہو رہا ہے نارمل ہی نہیں ہوتا۔“ گل نے پیارگی سے جواب دیا۔ ایسی پیارگی کے عائکہ کو پھر سے ہونٹوں کو بھیج کر گلے سے کچھ نیچے اتارنا پڑا تھا۔ یہ پانی کا ذخیرہ آخر یہ کب خشک ہوگا..... آخر کب.....؟

☆☆☆

اس کے گلے میں کچھ چھجا.....
 ”مومی.....“ اور ایک سرگوشی کرتی ہوئی آواز..... اس کے ہونٹ خشک پڑنے لگے۔
 ”مومی.....“ پھر سے سرگوشی ابھری۔ وہ نیند ہی میں کسمائی۔ زبان پھیر کر خشک ہونٹوں کو تر کرنا چاہا۔
 ”مومی.....“ اور وہ سرگوشی کرتی ہوئی آواز..... پھر یہ ہوا کہ زبان بھی خشک ہو چکی تھی۔

”مومی.....“ اب کی بار ہونے والی سرگوشی کے بعد اس نے چاہا کہ اسے اپنے گالوں پر پھر سے وہ ہی لمس محسوس ہو سکے لیکن ایک دم اس کی آنکھ کھلی تھی، سانسیں رکیں۔ وہ چت لٹی تھی اور نظر کی گرفت میں سب سے پہلے آنے والی چیز تیز چلتا ہوا پٹکھا تھا۔ ایک لمحہ لگا اور اس پہ بدترین انکشاف ہوا..... اس لمس کو اب وہ خواب میں بھی محسوس کرنے سے قاصر تھی۔ وہ سانس لیتی تھی گلے میں پھر سے کچھ چھجا۔ اور اس شدت

ہاتھ اس سے چھڑائے اور روتے ہوئے کمرے سے باہر بھاگ گیا۔ مومنہ نے قہر آلود نظروں سے اسے روتے دیکھا تھا۔ اور ہونٹ کاٹ، کاٹ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی مگر..... اور پھر اس نے پٹی میں بندھا ہاتھ مار کر سائنڈ ٹھیل پر پڑا پانی کا جگ گرا دیا تھا۔

☆☆☆

مجیب عالم کی طرح حبیب عالم پائلٹ نہیں تھے لیکن وہ بھی PAF کے ہی ملازم تھے۔ مجیب عالم کی شہادت کو ایک ماہ گزر چکا تھا۔ کسی نے بھی مومی سے ایگزاحر کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اس سے یہ بات کی جاتی؟ سب خاموشی سے اس وقت کے انتظار میں تھے کہ جب وہ نارمل ہو کر اس دکھ کو اپنانے پر راضی ہو جائے۔ سعد باقاعدگی سے اسکول جا رہا تھا۔ اور مومی..... وہ..... کبھی اونچی آواز میں میوزک سنتی رہتی یا پھر گھنٹوں سوئی رہتی..... نیند کی دوا کے زیر اثر..... کوئی اس سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔

اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کی حالت اسے کچھ کہنے سے روکتی تھی۔ منع کرتی تھی اور یہ کہتی تھی کہ اسے وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا جائے۔ اب بھی وہ کافی دیر سے نظر نہیں آتی تھی۔
 ”مومی..... مومی کہاں ہے؟“ گل نے یک دم بری طرح چونک کر پوچھا تھا اور لاڈلج میں موجود عائکہ نے ذہن پر زور دیا کہ آخری بار اس نے مومی کو کہاں دیکھا اور کب.....

”کمرے میں ہوگی، میں دیکھ کر آتی ہوں۔“ اور پھر عائکہ نے اسے بیڈ پر آڑھتا چھالینا دیکھا وہ سو رہی تھی۔ ایک سکون بھری سانس ان کے اندر تک اترتی تھی مگر اس سکون میں بھی بے چینی تھی ہاں مومی کے لیے شدید بے چینی..... وہ کافی دیر کٹری مومی کو دیکھتی رہی تھیں جو شدید گرمی میں بھی بند پٹکے میں بے سدھ سو رہی تھی۔ نیند کی دواؤں کا اثر تھا انہوں نے مڑ کر دوبارہ مومی کو دیکھا اور پھر نظر پلٹتے، پلٹتے سے ارادہ

ہو کر لگی تھی اور کمرے تک نہیں جا پائی تھی۔
وہ چند قدم چل کر وہیں زمین پر سر کو دونوں
ہاتھوں سے تھامے بیٹھتی چلی گئی تھی۔
”آہ.....“ بے ساختہ وہ کر رہی تھی۔

”مومی.....“ حبیب اور عائکہ اس کی طرف بھاگے۔
”بی بی ہائی ہو گیا ہے اس کا.....“ عائکہ نے گھبرا
کر کہا۔ حبیب عالم تیزی سے آپریشن لینے بڑھے۔

”مومی..... اٹھو، یہاں صوفے پر آؤ۔“ عائکہ نے
اسے اٹھانا چاہا۔ اس نے بازو چھڑوایا اور کھڑی ہو گئی مگر
لڑکھڑا گئی تھی۔ عائکہ نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر کھینچ
کر اسے صوفے پر بٹھایا تھا وہ ابھی تک سر کو دونوں
ہاتھوں سے تھامے ہوئی تھی۔ وہاں بہت سی سرگوشیاں
تھیں جو اس کے اندر ابھر، ابھر کر ڈوب رہی تھیں۔
”مومی.....“ آوازوں کی جھینساہٹ تھی۔

”جہیں چوڑیاں لینی ہیں؟“
”میری بیٹی جینٹلس ہے جینٹلس.....“

”ہاں تم پائلٹ بنو گی PAF کی پائلٹ.....“
”مومی.....“ وہ سرگوشیاں نہیں احساس تھا، بس
تھا جو کہ مار رہا تھا۔ کاٹ رہا تھا۔ زندگی جیسی چیز کو بدن
سے رفتہ، رفتہ، آہستہ، آہستہ کھینچ رہا تھا۔ اس کے نفس
کی رفتار تیز ہوئی۔

”مومی.....“ عائکہ گھبرا کر اس کی پشت سہلانے لگی۔
”حبیب!“ پھر انہوں نے گھبراہٹ میں آواز دی۔

”تمہارے بابا یہ اڑاتے ہیں۔“ اور وہاں جملے
بازگشت کی طرح اس کے ذہن میں آتے پرزوں کے
مانند ہو گھومتے تھے۔ اس نے اپنے سر کے بالوں
کو مٹیوں میں جکڑ لیا تھا..... اس کے چہرے پر تکلیف
اپنی پوری شدت سے نمودار ہوئی تھی۔

”مومی.....“ عائکہ نے گھبرا کر اس کا چہرہ
تھپتھپایا اور مومی یک دم آگے جھکی تھی۔ اسے تے آئی
تھی اور.....

”حبیب.....“ عائکہ نے اب کہ چیخ کر پکارا تھا۔
(باقی آئندہ)

سے چبھا کہ اسے پانی کی طلب محسوس ہوئی تھی۔ بیڈ
سے پاؤں نیچے لٹکا کر چھلیں پہننے بنا وہ کمرے سے باہر
نکل گئی۔ اور اسے اتنا تک محسوس نہیں ہوا کہ سعد کا بیڈ
خالی تھا۔ وہ باپ کی شہادت کے بعد سے ماں کے پاس
سورہا تھا اور یہ مومی کے علم میں نہیں تھا۔ فریج میں سے
پانی کی بوتل نکال کر اس نے وہیں کھڑے، کھڑے ہی
بوتل منہ سے لگائی تھی۔ حالانکہ حبیب عالم منع کرتے تھے
یوں پانی پینے سے مگر آج..... پانی پیتے، پیتے وہ مڑ کر
بچن سے باہر آئی اور..... اور..... بوتل اس کے ہاتھ
سے چھوٹ کر پیندے کے بل زمین سے نکل آئی اور پانی
چھلکا اور پھر بوتل لڑھک کر بننے لگی۔ وہاں، وہاں حبیب
عالم تھے..... وہ تھے..... باخدا وہی تو تھے..... لاؤنج
کا داخلی دروازہ اور بچن کا دروازہ آسنے سامنے تھا اور وہ
وہ لاؤنج کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئے
تھے۔ وہ ڈانگری (مخصوص یونیفارم) پہنے ہوئے تھے۔
”مومی کونہ جگایا جائے..... اللہ کے واسطے اسے
نہ جگایا جائے۔“ وہ سانس کو بھی اجازت نہیں دیتی کہ
وہ اس کے جسم میں گردش کرتی۔

حبیب عالم لاؤنج کے دروازے سے اندر داخل
ہوئے اور ان کے پیچھے عائکہ تھی..... جس نے لاؤنج کا
دروازہ بند کیا تھا۔ وہ ابھی ابھی آئے تھے۔ مگر مومی کو
یوں کھڑا دیکھ کر پہلے وہ پریشان ہوئے اور پھر اسی
پریشانی کے عالم میں اس تک آئے تھے۔

”مومی۔“ انہوں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلکا سا
جھٹکا دیا۔ ”جگایا تھا نا اسے۔“

وہ چونکی..... سکتے ٹوٹا..... اور پھر سب بکھر گیا۔
کسی دھویں کی طرح تحلیل ہوتا گیا۔ اس نے چاچو کا
چہرہ دیکھا..... اور پھر اس دروازے کو..... سب اس
dangri کا تصور تھا۔

”آپ یہ پہن کر میرے سامنے مت آیا کریں.....
یہ پہننا ہے تو یہاں سے چلے جائیں۔“ وہ قدم پیچھے ہٹ
کر اس نے بدتمیزی سے بہت بری طرح شاورٹ کیا تھا۔
حبیب عالم شاکر ہوئے۔ تیزی سے وہ ان کے پہلو سے

عزت دارا

قسط نمبر ۸۹

اماوس کی کالی راتوں میں سے یہ بھی ایک کالی
رات تھی۔ ہولناک سناٹا چاروں جانب پھیل چکا تھا۔
تاریکی نے اپنی چادر ہر سو پھیلا رکھی تھی..... اس بیت
ناک سناٹے کو کبھی کبھار مینڈکوں کے ٹرٹرانے یا جھینگر
کی آواز ختم کرتی۔

نور پور سے گزرنے والی ریلوے پٹری سے...
بہ مشکل ستائیس اٹھائیس قدموں کے فاصلے پر پہنچی
واسوں کی خیمہ بستی آباد تھی۔ انہی تاریک راتوں میں

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ پاکیزہ 89 نومبر 2016ء

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ان جھکیوں اور جھکیوں میں کسی نہ کسی فرد کا اضافہ ہوتا..... لائٹیں، چارجنگ بیٹری اور موبائل کی اسکرین کے ذریعے روشنی کا کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور ہوتا..... آبادی میں اضافہ ایک توفیرت کی طرف سے نئی روح دنیا میں بھیجنے کے طریقہ سے ہوتا یا پھر کسی نہ کسی خیمے میں کوئی لڑکا کسی لڑکی کو بھگا کر لاتا یا پھر لڑکی خود بھاگ کر آجاتی..... ارد گرد کی آباد بستوں اور کالونیوں کے لیے یہ جرم ہوگا لیکن ان کبھی واسوں کے لیے یہ ایک عام سی بات تھی۔ شاید ہی کوئی چاند ایسا غروب یا طلوع ہوا ہو جب تاریک رات کا یہ کھیل ان جھکیوں کا مقدر نہ بنا ہو۔

ایسی ہی ایک تاریک رات تھی جب دھماکے کی آواز سے سارے ہڑبڑا کر اٹھے۔ دھماکے کی آواز اس قدر شدید تھی کہ بچے تو سہم کے چپ رہے مگر عورتوں نے بے آواز بلند رونا شروع کر دیا۔ پھر جھکی اور خیمے سے ایک، ایک کر کے مرد نکلے اور دھماکے کی آواز کی سمت میں اندھا دھند بھاگے جا رہے تھے۔ دھماکے کی شدت سے جھکیوں کی ہر شے اور بلند ہو کر نیچے گری ریلوے پٹری تک پہنچنے، پہنچنے انسانی جھکیں، شور کی آوازیں غالب آگئیں۔ یہ آوازیں اتنی بھیا تک تھیں کہ ارد گرد کے گاؤں کے لوگ بھی اٹھ بیٹھے..... چند لمحوں کی دیر میں ایسیو لیس کی آوازیں شروع ہو گئیں۔

”اوائے میں مر جاواں یہ تو گڈیوں کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“ مائی جینا نے گلے پیٹے۔

”وے غوث توں وی اٹھ..... جا دیکھ کوئی مر مرا تو نہیں گیا۔“ غوث کی ماں جینا نے غوث کو اٹھانے کی کوشش کی جو نیشوں کی طرح سورا تھا۔ وہ پھر بولی۔

”اوائے وہ دیکھ کر یما..... نادر، مختار سب جا رہے ہیں..... اٹھتا ہے کہ نہیں۔“ پر غوث بے سدھ سویا رہا۔

جھکی سے نکلے، نکلے غوث کے باپ دلدار نے نظر ڈالی۔ سارے ہی گہر و جوان بیٹری کی طرف بھاگتے والوں میں موجود تھے سوائے غوث کے..... بھاگتے

دوڑتے اس نے موٹی سی گالی غوث کی طرف

ماہنامہ پاکیزہ 90 نومبر 2016ء

لڑھکی..... ہونہ ادھی راتی منگ کو سنا تا رہا ہوگا..... اب کہاں اٹھے گا۔“ اس کے ساتھ جانے والے نادر نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”ہاں بھرا..... عزت دار گھرانے کی منگ ہے ناں.....“ غوث کے باپ کو اندازہ نہ ہوا کہ وہ طنز کر رہا ہے یا عام سی بات..... بہر حال دھماکا جتنا شدید تھا نقصان اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا۔ کچھ مسافر زخمی ضرور ہوئے تھے مگر بچت ہو گئی..... ایک، ایک کر کے سارے پکھی واپس آنا شروع ہو گئے۔ واپسی کے سفر میں نادر نے پھر سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”ویسے بھرا جو کام بغیر دام کے ہو سکتا ہو اس پر دام لگانا کہاں کی ٹھکندی ہے پر شاوا بھی شاوا، آج کل کی پود کا ہر کام ہی دکھرا..... جھلے کہیں کے۔“

غوث کا باپ شرمندہ سا ہو گیا بات تو سولہ آنے صحیح کی تھی نادر نے..... پروہ کیا کرتا..... چٹا بھی رب نے ایک دیا وہ بھی راج کے بے وقوف..... بچپن کی منگ سے چٹا نکاز کر کے ضد پکڑنی دیا یہ کرنا ہے مامے کی دھی نوری سے..... اس کا پو کویت جا کے راج مردوری کیا کرنے لگا سارے طور طریقے ہی بدل ڈالے۔ غریب آباد میں تین مرلے کا پلاٹ لے کر تین منزلہ مکان بنایا..... شہری لوگوں والے سارے نخرے بھی ساتھ ہی آگئے..... غوث کے باپ دلدار نے بیٹے کو پہلے تیوریاں ڈال کر دکھائیں پھر طے تشیع سے کام لیا۔ ہاتھا پائی، خرچہ پانی بند کرنے کی دھمکی بھی دے ڈالی مگر وہ بہت ہی ڈھیٹ ہڈی کا بیٹا ہوا تھا۔ ہر بات کا ایک ہی جواب۔

”جیتے جاہ اوتھے راہ.....“ سارے رشتے داروں نے مل کر کلیجا چھلٹی کر دیا۔ بھانت، بھانت کی بولیاں..... ”اوائے بے غیر تافر میٹھ سنی ہے اپنے مامے کی۔ ویاہ کرنا ہے تو چار بندے لے کر آؤ ساتھ میں بری کے دو جوڑے، جوتے، ہار سنگھار بھی ہو، سونے کی مندری بھی ضرور ہو..... پھر ویاہ کے اگلے دن پوری براوری کی روٹی بھی کرو.....“

دوسری آواز آئی۔ ”بے ڈب کے مر جا غوث،

کی بستی تھی دوسری طرف غریب آباد کے مکانات دو سے پانچ مرلے کے مکانات انہی میں سے ایک سرہنگ مکان غوثے کے ماے کا تھا جس کی وہی لوری عرف رانی کو وہ ول وے بیٹھا تھا۔

ماں، باپ نے نام نوری رکھا تھا تو سوچ کے ہی رکھا ہوگا ول کا نور آنکھوں کا سرور اور اگر اسے لوری کے ساتھ ماں، مای، رانی کہتے تھے تو وہ تھی رانی..... مہارانی..... صراحی دار گردن، سنہری دمکا رنگ، سرخ سب جیسے گال، بڑی، بڑی آنکھیں جیسے جمیل..... کالے سیاہ بالوں کی ناگن کی طرح پیٹا ہاندھ کے چلتی تو غوثے کے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی۔

غوثا تھا بھی بڑا شدت پسند..... جولا..... رانی کو مچ نہ دیکھ لیتا تو مچ ہی نہیں ہوتی۔ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھوتا، ماں سے چائے کا پیالہ خوا کر سڑک کر چائے پیتا، پائے کھاتا اور منہ پونچھتا ماے کے گھر روانہ ہو جاتا۔ بغیر کچھ کہے بغیر کچھ بولے ایک نظر رانی پر ڈالتا اور دروازے سے باہر نکل آتا..... زندگی کی طرف لوٹ آتا اس کا خیال تھا جس دن وہ رانی کو دیکھے بغیر روزی، روٹی کے لیے نکلتا اس دن ضرور کھانا کام ہو جاتا ہے، کسی سے جھگڑا، نقصان یا کچھ اور..... زندگی کی صراحی میں دن رات ایک، ایک کر کے گر رہے تھے۔ غوثے کی ماں اکثر اسے لے کر بیٹھ جاتی۔

”پتر میرا میکا بڑا نور اور عزت والا ہے کوئی ایسا کم نہ کر بیٹھنا کہ میری بھتر یہہ (بھتی) کی عزت پر حرف آئے۔ اسے لانا بڑا سوکھا ہے، وی بھتی (بیس، پچیس) ہزار ہی لگیں گے مگر رکھنا بڑا اوکھا ہے۔ میرے بھرا کے گھر میں روز ہانڈی پکتی ہے، روز کپڑے دھلتے ہیں، بول اگر اتنا خرچہ برداشت کرے گا تو پکا کم کروں ورنہ ایک توے اور تھالی کے بدلے اپنے چاچے، پھوپھی کی وہی سے رشتہ جوڑے۔“

ماں کی بات سن کر غوث نے اپنے ڈولوں والے بازاروں کی طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی باڈی بلڈر دیکھتا ہے اور بولا۔

آج تک ایسے نہیں ہوا۔ جب بھی ویاہ کرتے ہیں اپنے سے نیچوں میں کریں یا اوپر..... بس ایک تھالی ایک توہ اور جھگی کا خیمہ دیتے ہیں، یہ بڑے لوہا زادے آگے۔ ہونہ روٹی وی کرو، کٹے کے گوشت کا سالن اور دیگ بھر کے مٹھے چاولوں کی پکاؤ.....“ حقارت کی وجہ سے کہنے والے نے بائیں طرف تھوکا۔ غوثا ہنستا رہا..... وہ جانتا تھا انکو رکھے ہیں، راک واری اس کی منگ، اس کے مای کی وہی لوری کو دیکھ کر سب کا جی چاہتا ہے اپنی زانی بنانے کو..... یہ تو کھیڈ مقدران دی ہے۔ رب نے غوثے کی مرا و پوری کی..... بستی کے مردوں نے تو جو لجن ظن کی سوکی اس کی دادی سب سے زیادہ بھڑک اٹھی۔

”وے غوث، لکھ لعنت تیرے چاہتے تیرے ویاہتے، ایک نہ دو پورے سولہاں متراں ہزار کا خرچہ کر کے ویاہ کرے گا..... ایک لوری رہ گئی ہے وہ بھی بنانے کو دفع دور.....“ غصے سے وہ منہ پھیر لیتی۔ ”پہلے پتر نے اپنے پیو کی نہ سنی اب اس پیو کی پتر نہ سنے گا..... شادا بھتی شادا.....“ غوثا ماں کی طرف دیکھ کے چپ ہو گیا۔ اس کی ماں کی اپنی ساس سے کبھی نہ بنی تھی، اب ماں کے علاوہ اس کی سگی بیٹی آکر اس بڑھیا کے سینے پر کیا، کیا سوگ نہ دلے گی..... کوئی دکھ سادکھا غوث کی داوی کو.....

”آئے ہائے.....“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے لوہیوں کی گنتی کرتی، شاداں فرحانہ، زرینہ، رضیہ، گلزاراں..... کبھی سولہاں جھلے کا ول بدل وے وہ اپنے مانوں کی وہی لوری سے آنکھیں پھیر لے اس کی لوہی پر دل تک جائے..... بس اک توہ، اک تھالی، تیسری تو کوئی چیز بھی نہ مانگنا پڑے۔

کیا دادی، کیا چاچا، کیا تاپا سب سمجھا کے تھک گئے مگر غوث کی ہاں نہ میں نہ بدلی..... رانجھا اور پنوں بھی اس دوڑ میں نہیں پیچھے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆
ریل کی بڑی کے ایک طرف غوثے کی جھگیوں

بنے گی۔ میری کمائی اپنے اوپر خرچ کرنا حرام ہے۔“
باپ کی کمائی سے دو ایک سوٹ سلواتا اور آرام سے
پورا سال گزار لیتا۔

اس کا حوصلہ جوان تھا اچانک منزل اس کے
سامنے آگئی۔ جھک کر اس کے قدموں تلے آگئی.....
اخبارات کی ردی میں سے نئے نوٹے کڑکڑاتے دس
بارہ نیلے نوٹ نیچے گرے..... آئی لکشمی کو کون ٹھکراتا
ہے..... بازار گیا اپنی رقم ملائی سونے کی مندری، چاول
چینی، گوشت لے کر گھر پہنچا۔

باجوں گاجوں کے ساتھ بارات رانی کے
دروازے پر تھی۔

غوثے کی بانٹھیں کھلی جا رہی تھیں۔
لکشمی داسوں کے لیے یہ انہونی چیز تھی۔
”اے اتنا خرچہ..... تین جگمگیاں نئی بن جائیں
اتنی رقم میں۔“ دادی نے کس کر کہا۔

رانی سرخ جھیلے سوٹ، ہتھ، ٹیکے اور پھولوں کے
زیور میں نئی نگر جھلی میں داخل ہوئی۔ یہ جھلی اس نے
تختے کے طور پر بنا کر دی تھی۔ جھلی میں اس کا بری اور
جہیز کا سامان اس کی سانس نے بڑے سلیٹے سے سیٹ کیا
ہوا تھا۔ جھلی میں داخل ہو کر اس نے پڑی کے پار میٹے
پر نظر ڈالی چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک
رہا تھا اپنا نوران پر نچاؤ کر رہا تھا..... اس کے پیچھے ہی
غوثا اندر داخل ہوا.....

”دیکھو کیسے مستیاں کر رہا ہے، چودھویں کا
جن.....“ اس نے رانی کو مخاطب کیا۔

ساری رات دونوں کی باتیں بھی ختم نہ ہوئیں
یہاں تک کہ کھیا کا مرغا بانگ پہ بانگ دینے لگا۔

غوث نے اگلے دن مامے کے گھر سے زیادہ
اچھا کھانا دیا۔

میٹھے چاولوں کی دیگ..... کٹے کا شوربے والا
گوشت، تندور کی روٹیاں اور مولی، گاجر کا
سلاڈ..... مامے کے خاندان کے لیے تو اس نے تلکیوں
سے پیتے والی بوتلیں بھی منگوائی ہوتی تھیں۔ اپنی برادری

”انان..... یہ بازو رب نے کما کے کھانے اور
کھلانے کے لیے دیے ہیں، بتا مجھے ہے کسی کامیرے
جیسا کاروبار..... مجھے بھی روز کا پورا سو روپیہ دیتا
ہوں، خود اپنا بھی خرچہ پانی رکھتا ہوں ابے کو بھی ضرورت
.... پڑتی ہے تو مجھ سے ہی مانگتا ہے، کیا اپنی زبانی کو
بھوکا ماروں گا؟“

ماں چپ ہو گئی..... ”کہتا تو ٹھیک ہے..... رب
نے بڑا آسرا بتایا ہے۔“ وہ صبح بھر سویرے پلاسٹک کی
بوتلیں، چھان پورا، اخبارات کی ردی کے لیے لکھا۔
رات کو واپس آتا تو جیب پیسوں سے بھری
ہوتی..... گلی گلی، کونے، کونے میں جانا، دن میں دو دفعہ
پھیرا لگاتا..... پورے علاقے میں چکر لگا، لگا کر وجود
تھک جاتا مگر ذہن تروتازہ ہی رہتا۔ اسے اپنے کام
سے عشق تھا، اخبار کے انہیں صفحات، باسی روٹیوں کے
انہی لکڑوں اور بوتلوں میں رب نے اس کا رزق رکھا تھا
اور ای رزق کے بدلے میں رانی اس کے دل میں جگہ
بنانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ خالی پیٹ تو پیار محبت کی
باتوں کا مول بھی خر بوزے کے چھلکے کی طرح ہوتا ہے۔
دو لہجوں کی خوشبو کے بعد بسا نہ ہی بسا نہ اس کے بس
میں ہو تو سونے کی مندری کی رانی پوری کو ہی سونے
میں توں دیتا مگر سونے کا ربٹ بھی تو آسمان کی طرف
چھٹائیں مار رہا تھا۔ دل کا وہ معنی تھا، بھج جتھا کرنے والا
ہوتا تو سونے کی مندری بھی بنا ہی لیتا۔ خیر جنونیوں کی
طرح عید، شب برات پر بھی وہ ایک پھیرا لگا کر دوچار
سو کما ہی لیتا تھا..... اس کا دل پسند کام شام کے وقت
دس، دس کے دن پیر کے نوٹوں کو جمع کرنا، گنا اور شادی
کے لیے مطلوب رقم کا حساب لگانا گیا تھا۔

رانی اس کا تصور تھی، خیال تھی۔ منبر و محراب تھی۔
اس کی حیاتی تھی۔ جب وہ گلیوں میں چھان پورے کی
صدائے لگاتا، رانی کی آواز اس کے کانوں میں رس گھولتی،
چلتے، چلتے تھکنے لگتا تو پوری چھب سے اس کے سامنے
آگھڑی ہوتی۔

”جب تک رانی میرے دل کی مہارانی نہیں

ہوتا..... تو نکار گئی گھوج سے سلسلہ شروع ہوتا اور مار پیٹ تک نوبت آجاتی..... لاقوں سے مارتا، گھونسلوں سے مارتا..... بچاؤ کی کوشش میں اکثر رانی کا ہونٹ پھٹ جاتا۔ کپڑے خونم خون ہو جاتے۔ منہ پر سو جن آجاتی لیکن ملی کی طرح پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی، غرائی، چنچنی، اس کے شوق کو کونسنے دیتی۔

”اوائے بد بختے میرے شوق کو کچھ نہ کہا کر میرے اسی شوق نے تجھے میری محبوبہ بنایا ہے۔“ غوث د ہاڑتا۔
”ہونہہ..... محبوبہ.....“ وہ نفرت سے تھوکتی۔

”زہر لگتا ہے یہ تیرا ڈبا۔“ وہ کلس کر کہتی۔

”اے سوچ کر بات کر زانی ہے میری تو زانی بن..... میرا شوق تجھے زہر لگتا ہے، تو میں کیسا لگتا ہوں، بتا..... بول.....؟“ وہ اس کی طرف بڑھتا۔

رانی ٹھنڈی پڑ جاتی..... سسکیاں بھرنے لگتی۔
اسے سسکیاں لیتے دیکھ کر وہ بھی ٹھنڈا پڑ جاتا..... اسے بہلاتا، معافی مانگتا۔

”دیکھ جب میں ایٹھوریا کو دکھاتا ہوں، کترینہ کو دیکھتا ہوں تو، تو مجھے بھی ویسے ہی لگنے لگتی ہے۔“

”آیا بڑا..... مجھے اس کتی..... رینہ کے ساتھ ملانے والا، میں نے ایک دفعہ کہہ دیا سو دفعہ کہہ دیا۔ مجھے یہ تاج گانے والی واہیات فلمیں نہیں پسند..... یا مجھے پسند کر لویا ان فلمی ستاروں کو.....“ وہ وارننگ دیتی۔

”ہا ہا ہا.....“ وہ قہقہہ لگا کر ہنستا۔ ”تو میرا دل ہے وہ میرے دل کی دھڑکن۔“

”ہونہہ بڑا ڈائیلاگ مارا ہے۔“ وہ جلمے بھنے لہجے میں کہتی۔

خیر رات کے وقت تک دونوں میں صلح ہو جاتی۔ لڑائی کی آواز سب تک اگر پہنچتی تھی تو کیا ہوا۔ صلح کی جلیبیاں بھی تو سب کے گھروں میں پہنچ جاتیں۔ صلح سے اگلے دن وہ دھلا جوڑا پہنتی، پھولوں کے گجرے ہاتھوں میں پہنتی..... سرخی لگاتی، ارد گرد کی ساری رشتے دار کھی کھی کر کے ہستیں..... ”دونوں ہی رنج کے نکلے ہیں پہلے لڑتے مارتے ہیں پھر صلح کر کے ہیر د

کو اس لیے جگلیوں کے سامنے دری بچھا کر کھانا کھلایا جبکہ باپ کے گھر والوں کے لیے اس نے کرائے کی میز کرسیاں منگوائیں۔ سوڈے واٹر کی بوتلیں اپنے ہاتھوں سے کھول کر انہیں پیش کیں..... اس کا انگ، انگ خوش تھا۔ آخر کو عزت دار لوگ ہیں پورے شہر میں ان کی عزت ہے..... اس کا ماما عبدالکریم کو یتیم شہور تھا۔ وہ کیسے مامے کی آج اتنی عزت نہ کرتا۔

ویسے کے بعد بہت عزت سے وہ ان کو پٹری تک رخصت کرنے گیا۔ ہر آنے والا دن رانی سے اس کی محبت میں اضافہ کر رہا تھا۔ کچھ اس کی محبت اور کچھ زلیور..... سرخی پاؤ ڈرنے سے زمانے بھر کی حسینہ بنا دیا تھا۔ اس کا باپ دلدار اکثر ہنکارا بھرتا۔

”شدائی نہ ہو تو ریزھی پہ ساتھ بٹھا کر لے جایا کرو..... ہونہہ.....“ غوثا ترنت جواب دیتا۔

”ہاں گریہ کبھی واسوں کی ہوتی۔“ جلمے بھنے والی دادی بھی مر مر گئی۔ چاچے، تائے کی بیٹیاں بھی اپنے گھروں کی ہو گئیں..... رب نے اس کے آنگن کو بھی اوپر تلے کی تین بیٹیوں سے آباد کر دیا۔ سندری، خالدہ اور زیتون، رانی اب اسے زیتون کے ابا کہا کرتی۔ غوثا بھی رانی، میری رانی، سندری کی ماں کہہ کر بلاتا..... سردیاں ہوتی تو گرم پکوڑے یا جلیبیاں لاتا، گرمیاں ہوتی تو کھنی، آکس کزیم، قالودہ.....

تین بیٹیوں کے بعد بھی اسے رانی سے پہلے دن جیسا پیار تھا۔ ہر کسی سے بے نیاز ہو کر اس کی گود میں سر رکھتا، ناز نخرے اٹھواتا، دونوں ایک دوسرے پر مرتے اور ایک دوسرے کے لیے جیتے۔

ہاں بس ایک چیز دونوں کے درمیان رقیب تھی..... نند نہ ساس، دیورانی نہ جیشانی پھر بھی ایسی ظالم چیز کہ دونوں کی لڑائی اسی کی وجہ سے ہوتی..... شادوی کے ان سات سالوں میں جب بھی لڑائی کا طوفان آیا اسی منحوس کی وجہ سے..... ایک کو اس سے جتنا عشق تھا دوسری کو اتنی ہی کراہت..... درمیانہ راستہ کبھی نہ نکل سکا۔ رانی ہتھیار ڈالتی نہ غوثا پیچھے

ہیرون بن جاتے ہیں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی رانی کو اس کے اس شوق کا پتا چل گیا تھا۔ ایک آدھ فلم شدید حکم میں اس کے لیے وہی کام دیتی جو چائے کی پیالی دیتی ہے۔

سال چھ مہینے رانی چپ چاپ دیکھتی رہی..... منہ پہ تالا لگائے اس کا شوق برداشت کرتی رہی۔ پہلی بچی دو تین ماہ کی تھی جب غوث نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اپنی چار پائی پہ بٹھایا۔ ”لے بھی تو وی آ جا..... اپنی آنکھیں مٹھادی کر..... جہا مانتی کی پرانی فلم ہے بڑی گھڑی، سا، اے مسالوں سے بھری.....“

رانی منہ پھلائے کام کرتی رہی، جونہی بازو سے پکڑ کر اسے پاس بٹھایا وہ کرنٹ کھا کے چلنی..... ”باز آئی میں تیرے اس شوق سے، خود ہی دکھ بے غیرت کہیں کا۔“

”کیا مطلب ہے تیرا؟“ وہ حیران سا اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

”کہہ تو دیا ہے لے جا اپنی ہوتیوں سوتیوں کو کہیں اور میرا کھینچا جلانے کو آئے دن دیکھتے بیٹھ جاتا ہے۔“ وہ پھٹ پڑی۔

”..... تو ان کو کہہ رہی ہے میری فلموں کو؟“ وہ ہنوز حیران تھا۔

”ہاں تو اور کیا، میرے بس میں ہو تو آگ لگا دوں تمہارے اس ٹی وی کو اور کیسٹوں کو.....“ وہ تنفر سے بولی۔

”اے، میں نے کہا، باز آ جا باز..... خبردار جو تو نے ان کے متعلق ایک لفظ کہا اور تیرے ساتھ پیار کے جتنے بول بولتا ہوں انہی سے تو سیکھتا ہوں۔“ وہ گل سے بولا۔

”آگ لگے ان محبت بھرے بولوں کو.....“ اس نے حقارت سے چار پائی کے دوسری طرف تھوکا۔

”ایک فلم میں کسی کی رن (بیوی) بنی ہیں تو دوسری میں کسی اور کی..... میں بھی زنانی ہوں، مجھے نہیں پسند یہ بات..... آج کے بعد تو یہ (موتی سی گالی) لگانا تو سہی.....“ اس نے دھمکی دی۔

”لگاؤں گا، مگر دفعہ لگاؤں گا، تو روک کے تو“

دیکھ، تیری جبرائت..... غوث نے لکارا، رانی نے ہنگ لکالا اور تار جھکی سے باہر پھینکی..... ٹی وی کو ٹھڈا مار کر دل کی بھڑاس نکالی..... غوث کی آنکھوں میں خون اتر آیا..... اس نے اٹھنے کا جھانپڑا اس کے نرم و نازک وجود پر دے مارا..... وہ چکرا کر نیچے گرے۔

یہ پہلی لڑائی تھی سات سال اور دو ماہ قبل کی..... اس کے بعد ایسی لڑائیاں ہر دو تین ماہ کے بعد ہوتیں..... دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے، غوثا رکانہ رانی پیچھے ہٹی..... اسی لڑائی، مار کٹائی اور پیار محبت سے صلح میں ان کا بیٹا بھی دنیا میں آ گیا۔ محمد بشیر..... رانی کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، جب تک بیٹا نہیں ہوا تھا اس کے دل میں کانٹے کی چھین سی تھی، بیٹے کی پیدائش نے غوث کے دل میں اس کا مقام اور بڑھا دیا۔ جس دن محمد بشیر کا ختنہ ہوا..... سب کو اس نے لڈو بھجوائے، خوشیاں منائیں اور دیکھنے کے لیے درجن بھر فلمیں بھی..... کئی مہینوں کے بعد آج اسے قلمیں دیکھنے کا دورہ پڑا تھا۔ رانی نے پہلو بدل کر روکا..... غوث نے سنی ان سنی کر دی۔

”اے بشیرے کے ابا میں نے کہا بند کرو یہ بجرے.....“ وہ نرمی سے بولی۔

”چپ کر جا، کروٹ بدل کر سو جا..... میں تو ساری رات جاگ کر یہ بجرے ہی دیکھوں گا۔“ غوث نے بھی تھل سے جواب دیا۔

دو چار منٹ خاموشی سے گزر گئے۔ بیٹا دنیا میں لانے کا تیا، تیا نشہ تھا اس نے پھر ٹوکا..... ”رکتے ہو یا بند کرواؤں..... اے زیتون، سندری آ کے بند کرو یہ.....“ اس نے پھر گالی دی۔

”اور اگر نہ بند کروں تو پھر.....؟“ خدا جانے غوث کو کیا ہوا۔

”کرنا پڑے گا۔“ ساتھ ہی رانی نے اٹھ کر سی ڈی پلیئر کو دھکا دیا۔ لکڑی کی ناقص سی میز سے سی ڈی پلیئر نیچے گرا۔

غوث نے ایک دو تین پھنڈاں کے پھرے پر مارے۔

دولوں نے بغیر کسی ارادے کے مولوی کو سنا شروع کر دیا۔

”ناظرین و حاضرین میرے محبوبہ خدا کی حدیث ہے کہ قیامت سے پہلے میری امت میں شادی شدہ لوگ زنا کی زندگی گزاریں گے آئیں اب اس کی مختلف صورتیں دیکھتے ہیں کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو شادی شدہ زندگی کو زنا کی زندگی بناتی ہیں۔ نمبر ایک طلاق نکاح کے مسائل کا علم نہ ہونا..... جہالت کی حد یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی کہتے ہیں غصے میں طلاق نہیں ہوتی، مذاق میں طلاق نہیں ہوتی، ماہواری میں طلاق نہیں ہوتی..... حمل میں طلاق نہیں ہوتی، طلاق ان حالات میں دینی نہیں چاہیے میرے بھائیوں میں بار بار کہتا ہوں طلاق ان حالات میں دینی نہیں چاہیے مگر طلاق ہو جاتی ہے، کیا سمجھے آپ.....؟ طلاق۔“

رانی اور غوث ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ دونوں کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا..... خدا جانے کب ڈاکٹر آیا کب گیا، کیا کہا اور کیا نہ کہا..... دونوں کے قدم ایک ساتھ اٹھ رہے تھے مگر جھگی میں دونوں ہی داخل نہ ہوئے..... رانی آہستہ چال چل رہی تھی۔ غوث اس کے انتظار میں جھگی کے باہر کھڑا تھا۔ رانی کبھی مگر اندر داخل نہیں ہوئی۔ غوث نے کہا۔ ”اندر کیوں نہیں جاتیں.....؟ اندر جا میں دوائی لے آؤں۔“

”اندر میں جاؤں گی یا تو جائے گا.....“ رانی کا چہرہ ساٹ اور لہجہ اندوہ ناک تھا۔

”اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے، غلطی بندہ بشر ہے ہی ہوتی ہے۔“ غوث نے ہنس سے لہجے میں کہا۔

رانی شیرینی کی طرح غراتی ہوئی اندر آئی۔

”وڈا آیا بندہ بشر..... اوئے معافی غلطی کی ہوتی ہے، بخشش گناہ کی ہوتی ہے یہ تو حرام کام ہوا..... زنا کا کام ہوا..... اخ تھو.....“ کراہیت سے رانی نے

تھوکا۔ ”پہلے میں تیری زنائی ضرور تھی زنائی نہیں..... اکل جا یہاں سے یا نیسے جانے دے..... میں

”دفع ہو جا..... طلاق دی میں نے تجھے..... طلاق، طلاق..... لے جا اپنا کاغذ..... (طلاق کا کاغذ) اور دفع ہو جا۔“

”ہائے یہ کیا بول بولے۔“ رانی حیرانی سے بولی۔ ”طلاق، کاغذ۔“ سارا دن سر پر دوپٹا لپیٹے وہ چارپائی پہ روتی رہی..... رات گئے غوث آیا وہی جلیبیاں، گرم پکوڑے اور ہوٹل کی کڑک چائے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

”بشیر کے ابا تو نے مجھے کاغذ دے دیا..... میں تیری زنائی نہیں رہی اب۔“ اتنا علم تو رانی کو بھی سن سنا کے مل گیا تھا۔

”اے جھلی، غصے میں طلاق ہوتی ہے نہ مذاق میں۔“ رات گئی بات گئی..... محمد بشیر کے تین ماہ کی عمر ہو بنے تک یہ ڈرانا تین چار دفعہ چلا..... ہر بار طلاق کے الفاظ بدوقت سے فائرنگ کی طرح نکلتے، ہر بار رانی کی روح چھلنی ہوتی اور ہر بار غصے میں طلاق نہیں ہوتی کہہ کر دونوں مطمئن ہو جاتے۔ تاہم بیٹے کی ماں بن کر رانی میں وقتی طور پر جنگ ہونے کا جو احساس پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔ غوث نے بھی ٹی وی اپنے بہنوئی کو دے دیا۔

”لے جا بھرا یہ منحوس ڈبا..... دیکھنے کو جی چاہا تو تمہارے ہاں آ جاؤں گا..... روز، روز لڑنے کا بھی حوصلہ نہیں رہا۔“

رانی نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا..... بیٹے کا بیڈا گرم لگا تو ہاتھ لگا کے محسوس کیا۔ کئی گھنٹوں سے وہ مسلسل رو رہا تھا۔ صبح روشنی میں سے اس کے جسم پر سرخ دھبے پڑے نظر آئے..... دونوں میاں بیوی پاگلوں کی طرح لے کر بھاگے۔ اتوار کا دن تھا سرکاری اسپتال بند تھا، بچوں کا ایک ڈاکٹر شہر کے پرلے سرے پر بیٹھتا تھا وہاں پہنچے ابھی دس نہیں بجے تھے ڈاکٹر دس بجے کے بعد آتا تھا۔ دونوں بچے کو لے کر انتظار گاہ میں بیٹھ گئے اور دیوار پر لگے ایل ای ڈی پر کوئی مولوی طلاق و نکاح کے مسائل بیان کر رہا تھا۔

”اب کوئی رستہ نہیں، یہ شہ پر حرام ہے، تیری
زانی نہیں رہی..... ہاں عدت پوری کر کے جس کی
مرضی زانی بن جائے تو روکنے والا کون؟“ بھراریاض
غصے میں تھا۔

”کسی اور کی زانی.....؟“ غوث کی آنکھوں
میں خون اتر آیا۔

”آرام سے بھرا، آرام سے، جب تیری زانی
نہیں رہی تو جہاں مرضی جائے۔“

غوثا اونچی آواز سے رونے لگا..... اس کے رونے
سے ارد گرد کی جھکیوں سے بھی لوگ باگ آ گئے۔

رانی کی آنکھیں دنیا کے سب سے بڑے صحرا کی
طرح ویران اور خشک تھیں..... وہ جلدی، جلدی سامان
سمیٹنے لگی۔

”بھراریاض، میں تیری منت کرتا ہوں اسے کہہ
یہ یہیں رہ لے، کہیں نہ جائے..... میں چلا جاتا ہوں،

میں کراچی چلا جاتا ہوں، تیرے ساتھ سعودی عرب چلا
جاتا ہوں، میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں جب تک میری

حیاتی ہے اسے خرچہ سمجھوں گا۔ بچوں کے پڑھنے کا سارا
بندوبست کروں گا۔ میں خود حور و نگروں کی طرح محنت

کروں گا، قصور میرا ہے، گناہ میرا ہے، یہ کیوں در بدر
بھٹکے۔ سزا بھی میں ہی لون گا..... رب کے قنون

(قانون) سے کھینٹنے کا کفارہ بھی میں ہی دوں گا۔“ سفید
لٹھے جیسا چہرہ لیے دوپٹروں میں ہی وہ جھگی سے رخصت

ہو گیا۔ ریل کی پٹری کے ساتھ چلتے ہوئے کئی بار دل
چاہا رانی..... دل کی مہارانی پر ایک نظر ڈال لے..... مگر

رانی تو منہ پر کپڑا ڈالے جھگی سے اوٹ کیے بال بچوں
کے لیے کھانا بنانے میں مصروف تھی..... اس کے اندر

حوصلہ ہی نہیں تھا کہ وہ جانے والے پر ایک نظر
ڈالے..... وہ اس کی نظروں میں کہاں سا سکتا تھا۔ جھگی

سے نکلتے ہوئے رانی نے آخری نظر اس پر ڈالی تھی۔
اسے غوث کا قد قطب مینار سے بھی لمبا لگا..... اونچا اور

اونچا آسمانوں تک پہنچا ہوا..... اصل عزت وار تو وہ تھا۔

نہیں رہ سکتی یہاں..... نہیں سمجھ آتا تو کسی مرلوی سے
مسئلہ پوچھ لے۔ بھراریاض سعودی عرب کے شہر مدینہ
میں دس سال رہ کے آیا ہے اس سے ہی پوچھ لے۔“
رانی نے غوث کے تالی زاو بھائی کا نام لیا..... جو اتفاقاً
ان دنوں پاکستان آیا ہوا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے تو یہیں پر رک میں اسے لے کر
آتا ہوں۔“ غوث کے قدم من، من بھر کے ہو رہے تھے

اس کا روال، روال پکار رہا تھا اللہ کرے بھراریاض کہے
کوئی بات ہی نہیں۔ چند منٹوں میں سفید و ہلا سوٹ پہنے

سر پر ٹوپی اور مھے بھراریاض ان کی جھگی میں بیٹھا تھا۔
”بھراریاض قسم کھا کے بتا اگر مرد اپنی زانی کو

دن میں کئی، کئی وار طلاق بول دے تو تو طلاق پڑ جاتی
ہے ناں؟“ رانی و بنگ ہو کر بوئی۔

بھراریاض حق و دن ان کا منہ دیکھ رہا تھا۔ معاملے
کی کچھ، کچھ سمجھ تو اسے آ ہی گئی تھی مگر چپ ہی

بھٹی..... وہ خاموش رہا۔
”بھراریاض بتا ہی اب۔“ غوث کا سانس رک رہا تھا۔

”کہنے کو میں کہہ دوں مگر سوہنے نبی کے شہر میں
بارہ سال رہ کے آیا ہوں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ طلاق تو

پڑ گئی۔“ غوث نے تھوک نکلتے ہوئے بات مکمل کی۔
”خواہ غصے میں دی ہو۔“ غوث نے پوچھا۔

”بالکل بھرا غوث، بے شک مذاق میں دی ہو یا
غصے میں.....“ ریاض نے کہا۔

”اللہ معاف نہیں کر دے گا؟“ غوث نے منت
بھرے لہجے میں پوچھا۔

”اللہ نال مذاق ہے یہ..... وہ کیسے اس کو
معاف کر دے۔ اس نے اپنی پاک کتاب

میں طلاق کا سارا طریقہ بتا دیا ہے ویسے ہی دینی
چاہیے اگر ویسے نہیں دو گے تو اس کی نافرمانی نہیں

اس کے کلام کا مذاق..... تو بہ استغفار.....“ بھرا
ریاض نے کلمے پئے۔

”کوئی صورت؟“ غوثا زندگی موت کے بیچ اراک
راستہ ڈالوٹ رہا تھا۔

پڑھ کر لیں کہ
بیانیہ بیجو

ہا بیگ



الارم کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔
”بند کرو یہ شور..... آخر کب تک سوتی رہو گی۔“
عامر نے غصے سے بیوی کو جھنجھوڑا۔
”سوری، سوری بس اٹھو گی۔ ابھی تو فجر کی نماز ہوئی وہ پاورچی خانے میں آئی۔ ساتھ ساتھ کھلے پڑھ کر لیں تھی۔“ عمران نے کسمسا کر گھڑی دیکھی۔
”میرے خدا چھ بیج گئے! بچوں جلدی سے اٹھو تیار ہو، اسکول کی بس نہ نکل جائے۔“ بچوں کو آواز دیتی ہوئی وہ پاورچی خانے میں آئی۔ ساتھ ساتھ کھلے

نے کہا۔
 ”اللہ کرے آج میڈم ویر سے اسکول آئیں۔“
 دل ہی دل میں وہ دعا مانگتے ہوئے جیسے ہی اسکول میں
 داخل ہوئی، سامنے ہی مسز ریحانہ سعید اسکول کی اونر
 اپنی گاڑی سے اتر رہی تھیں۔

”عمرانہ یہ وقت ہے آپ کے آنے کا۔۔۔ بریک
 میں آکر مجھ سے مل لیجئے گا۔“

رشتے میں تو وہ عمرانہ کی پھوپھی لگتی تھی اور عمرانہ
 کے والد نے ہی ایک زمانے میں ان کے اور ان کے
 بچوں کے تعلیمی اخراجات اٹھائے تھے مگر وہ خاصی۔۔
 بد لحاظ واقع ہوئی تھیں۔

ان کا غصہ دیکھ کر عمرانہ کی تو گویا جان ہی نکل
 گئی۔ گلا خشک ہو گیا۔ وہ خاصی گرم مزاج واقع ہوئی
 تھیں۔ شادو و ناور ہی مسکراتی تھیں۔ شادی کے کئی
 سال بعد ان کے حالات بدلنے شروع ہوئے تو
 دولت مندی کا غرور سر جڑھ کر بولنے لگا۔ کچھ انسان
 پتھر جیسے ہوتے ہیں اور کچھ اتنے پیارے، نرم و
 نازک کہ اچھی نگاہ جیسے ہی ان پر پڑے محبت اور
 خلوص کا پیغام دے جاتے ہیں۔ دل کو اطمینان سے
 بھر جاتے ہیں اور کچھ ایسے کہ انہیں دیکھتے ہی سکون و
 خوشی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ میڈم
 ریحانہ بھی کچھ ایسی ہی تھیں۔

”اب کیا ہوگا..... ضرور آوے ون کی تنخواہ
 کاٹ لیں گی۔ صرف دس منٹ ویر ہوئی ہے، باتیں بھی
 سنائیں گی۔“ جل تو جلال تو رو کر رہے ہوئے وہ اپنی
 کلاس کی طرف چل دی۔ سامنے سے کمپیوٹر کے ٹیچر
 آرہے تھے۔ اگرچہ خاصی عمر کے تھے مگر ہر خاتون کو
 لائن مارنے سے باز نہیں آتے تھے۔ عمرانہ کو انہوں نے
 مخصوص مسکراہٹ سے نوازا۔

”آج تو آپ بہت فریش لگ رہی ہیں، صبح
 سے آپ کو دیکھا نہیں تھا تو ہر چیز پھمکی، پھمکی سی لگ رہی
 تھی، خیریت تو ہے ویر کیوں ہوئی؟“ انہوں نے معنی
 خیز مسکراہٹ کے ساتھ عابسانہ ستے جملے بولے۔

بالوں کو لپیٹے ہوئے جوڑا بنالیا تھا۔ ایک چولہے پر
 چائے کا پانی رکھا، دوسرے پر دووہ رکھا اور فرنیج سے
 اٹھ لے ٹکالے ٹوسٹر میں ٹوس ڈالے۔ وہ جلدی، جلدی
 کر رہی تھی۔ دس سالہ عنبرین نے باورچی خانے
 میں آکر ماں کی مدد کرنا شروع کر دی۔ اٹھ لے تلے جا
 چکے تھے۔ جلدی، جلدی تو س پہ مکھن اور جام لگایا اور
 کپ میں چائے نکال کر بہن اور پانچ سالہ بھائی کو
 دی، ساتھ ساتھ اپنا بھی ناشتا کر لیا۔ اتنی ویر میں عمرانہ
 نے بچوں کے لٹچ باکس تیار کر کے بیک میں رکھ دیے
 تھے۔ پوینفارم تو رات کو ہی استری کر کے بیگر پر
 لٹکا دیتی تھی۔ بچوں کے جوتے، موزے بھی تیار کر کے
 ہوتے تھے۔ ابھی وہ ناشتے کے آخری مراحل میں تھے
 کہ بس کا ہارن بج گیا۔ بھاگتے ہوئے تینوں بچوں نے
 ماں کو اللہ حافظ کہا اور اسکول روانہ ہو گئے۔ بچوں کو
 رخصت کر کے اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور عامر
 کے لیے پرائیوٹ کا آٹا گوندھنے لگی۔ ایک طرف پرائیوٹ
 اور دوسری طرف اس کے لیے آلیٹ فرائی کر لیا۔
 گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے سات بج چکے
 تھے۔ اب اتنا ٹائم نہیں تھا کہ وہ ناشتا کرتی یا برتن
 دھوتی۔ الماری سے ایک جوڑا نکال کر بغیر استری کیے
 ہی پہن کر اس نے عامر پر ایک نظر ڈالی آج وہ اپنے
 کپڑے پر بس نہیں کر پائی تھی۔ عامر تو مزے سے سو رہا
 تھا۔ ایک آہ بھر کر وہ... تیزی سے گھبرا کر کے بس
 اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔

”روز بروز رش بڑھتا ہی جا رہا ہے، یا اللہ آج
 پھر اسکول ویر سے پہنچنے پر پریسل سے ڈانٹ پڑے گی،
 کیا کروں کیا نہ کروں.....“ عمرانہ دل ہی دل میں خود کو
 برا بھلا کہتے ہوئے بس کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔
 خوش قسمتی سے اس کے روٹ کی بس جلدی آگئی اور وہ
 دھکے کھاتی اور دھکے دیتی بس میں سوار ہو گئی۔

”خالہ، باجی، اماں اب کرایہ!“ کنڈیکٹر نے
 آواز لگائی۔

”ارے سانس تو لینے دو بھیا۔“ ٹائیک خاتون

ان کا کیا عمل دخل..... اس کی طبیعت سخت مکدر ہوئی۔ وہ سر جھٹک کر میڈم کے روم میں ہلکی سی دستک دے کر داخل ہو گئی۔

میڈم ٹیلیفون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھیں۔ انہوں نے نہ تو عمرانہ کے سلام کا جواب دیا نہ ہی اسے بیٹھنے کو کہا، وہ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑی رہی۔ فون بند کر کے وہ اپنے سامنے رکھے فیشن میگزین کی ورق گردانی کرنے لگیں۔ عمرانہ نے کھٹکھار کر اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

”عمرانہ آپ کام سنجیدگی سے نہیں کر رہیں، آپ کی کئی شکایتیں مجھے ملی ہیں۔ روز لیٹ ہو جاتی ہیں، بچوں کے ہوم ورک اور کلاس ورک کی کا پیاں وقت پر چیک نہیں کرتیں، رپورٹ کارڈز بھی آپ نے لیٹ کر دیے تھے۔ اور یہ کپڑے جو آپ پہنتی ہیں نہ جانے کس زمانے کے ہیں، نئے فیشن کا اگر نہیں ہے تو کم از کم ان کو استری تو کر لیا کریں، والدین سب سے پہلے نمبر کا گیٹ اپ دیکھتے ہیں، آپ کی کلاس کی ہجی کے والد بھی آپ کی شکایت کر رہے تھے کہ آپ نے ان سے اچھی طرح بات نہیں کی۔“

”آئی ایم سوری میڈم، آج مجھے دیر ہو گئی۔“ اس نے ہمت مجتمع کی اور کہا۔ ”میرا سارا کام وقت پر ہوتا ہے، اسکول میں پیری کلاس کا رزلٹ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ ٹاپ کرتے ہیں میرے شاگرد..... رہے میرے کپڑے تو میں سمجھتی ہوں کہ ایک استاد کو ساوگی اختیار کرنی چاہیے، وہ بچوں کا آئیڈیل ہوتا ہے، میرے نزدیک جن ویلیوز کی آپ بات کر رہی ہیں وہ ظاہری ہیں، ان میں پائیداری نہیں ہوتی۔ حقیقی ویلیو تو بنتی ہیں آپ کے رویے اور اخلاق سے۔ یہی باتیں اور یہی تربیت ہمیں آنے والی نسل کو سکھانی ہے۔ اور رہی بات اس ہجی کے والد کی تو میڈم وہ مجھ سے باہر ملاقات کرنا چاہ رہے تھے، میرے منع کرنے پر ناراض ہو کر آپ سے شکایت کر دی۔“

”بہت اچھی تقریر کر رہی ہو..... تمہاری کلاس

”جی سر کلین سب خیریت ہے، رش بہت تھا، اب آپ مجھے راستہ دیں، پہلے ہی لیٹ ہو گئی ہوں میڈم غصے میں ہیں ابھی راولپنڈی پر آرہی ہیں۔“ عمرانہ نے چڑچڑا کر جواب دیا۔ ”آپ بھی ہوشیار ہو جائیں۔“

کلاس میں بچوں کو سلام کا جواب دے کر وہ پڑھانے میں مصروف ہو گئی۔ ہوش اس وقت آیا جب بریک کی گھنٹی بجی۔ اس کے ساتھ ہی بھوک کا احساس ہوا، منج سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

”اوہ، میڈم نے بریک میں بلایا تھا۔“ ان کی ناراضی کا خیال آتے ہی جیسے ہر احساس پر خوف حاوی ہو گیا، اگر انہوں نے نوکری سے نکال دیا تو کیا ہوگا؟ باہر نکلتے ہی فزکس کے سرمد مل گئے۔

”ارے عمرانہ کہاں ہوتی ہیں آپ؟ ہم تو آپ کی ایک جھٹک دیکھنے کے لیے ترس گئے۔ کبھی تو ہمارے لیے بھی وقت نکالا کریں۔ ایک ہی جگہ رہتے ہوئے ملاقات نہیں ہوتی کسی دن لہج پر ایک ساتھ چلتے ہیں۔“ انہوں نے حریصانہ نظروں سے عمرانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی بات سن کر عمرانہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

”آپ کی بیگم اور بچے خیریت سے ہیں؟ بڑی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے ناں آپ کی۔“ صمد صاحب میں اپنے شوہر اور بچوں کے علاوہ کسی کے ساتھ باہر نہیں جاتی۔ جہاں تک ملاقات کا تعلق ہے تو ہم سب یہاں نوکری کرنے آتے ہیں، شغل میلہ کرنے نہیں۔ اور ہمارے کندھوں پر بہت بڑی ذمے داری ہے بچوں کی تعلیم و تربیت کی..... اگر ہم ایسی ویسی حرکتیں کریں گے تو ان پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ کیا سکھیں گے، اخلاقی ذمے داریاں بھی کچھ ہوتی ہیں۔“ وہ شدید تلملا کر بولی۔

عمرانہ، سرمد کو اچھا انسان سمجھتی تھی لیکن آج اسے احساس ہوا کہ اچھے لوگ اور ان کی اچھی باتیں صرف خوابوں اور خیالوں میں ہی ہوتی ہیں۔ عملی زندگی میں

نہیں ہے، مجھے ویلو سیکھانے کی کوشش نہ کرو، آخری چانس دے رہی ہوں، آئندہ گیٹ آؤٹ کروں گی۔ آٹھ ہزار روپے کمانے والی، لنڈے بازار کے کپڑے پہننے والی اب مجھے ویلو سیکھائے گی۔“

اپنی بے عزتی پر عمرانہ کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ مگر ان آنسوؤں کو اس نے پلکوں تک نہیں آنے دیا۔ وہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو کمزور نہیں ثابت کرنا چاہتی تھی۔ دل تو چاہا تو کوری چھوڑ کر چلی جائے مگر وہ جذبات میں آکر غلط فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا کے سامنے ہارنا نہیں چاہتی تھی اسے اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنا تھا جو اس کے شوہر کی تنخواہ اور شاہ خرچی کے سامنے ناممکن تھا۔ کوئی سمجھدار کب آسانی سے خوابوں سے ہاتھ دھونا پسند کرتا ہے جبکہ اسے جیتنا تھا، اس کے سامنے ایک واضح مقصد حیات تھا۔ وہ اپنی ساری زندگی انہی خوابوں کو دیکھنے اور سنوارنے میں لگا رہی تھی۔

ایک کپ چائے ہی مل جاتی تو کتنا اچھا تھا۔ مگر ایک ختم ہونے میں کچھ ہی دیر تھی اور آج مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ اگر آج تنخواہ نہیں ملی تو گزارہ مشکل ہو جائے گا، واپسی کا بس کا کرایہ بھی بہ مشکل لگے گا۔ کولر سے دو گلاس پانی پی کر وہ کلاس کی طرف چل دی۔

☆☆☆

”آج تنخواہ مل رہی ہے، بس عمرانہ چھٹی کے بعد میرے آفس میں آکر رقم لے لیجیے گا۔“ آفس کلرک نے چپکے سے عمرانہ کے پاس آکر کہا۔ وہ اپنے مسائل میں گم تھی کہ اچانک کلرک کی آواز سن کر اچھل پڑی۔

”حد کرتے ہیں آپ بھی، ڈرا دیا مجھے۔“ عمرانہ نے غصے سے کہا۔

”موقع تو دیں آپ کو خوش بھی کر دیں گے۔“ عامیانا انداز میں کلرک صاحب بولے۔

بغیر جواب دیے عمرانہ اپنے راستے پر چل پڑی۔ تنخواہ ملنے کی خبر سن کر سارے دن کی بد مزگی ذہن سے محو ہوتی گئی۔

تنخواہ دیتے ہوئے کلرک صاحب نے اس کے ہاتھ کو چھونے کی کوشش کی۔ عمرانہ نے خشکیوں سے انہیں گھورا اور باہر نکل آئی۔ وودن لیٹ آنے پر میڈم نے اس کی تنخواہ کاٹ لی تھی۔ وہ ایک شہڈی سائس بھر کر رہ گئی۔ سب تلخ باتیں بھلا کر وہ پروگرام بنانے لگی کہ اس مہینے وہ بچوں کے لیے ضرورت کی کون، کون سی چیز لے سکے گی۔

گھر پہنچ کر اس نے حسب معمول آلو اٹلنے چولھے پر رکھے۔ پکانے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ آلو کے پرائٹھے چائے کے ساتھ چل جائیں گے۔ تنھوڑی دیر میں اس کے جگر گوشے اسکول سے آگئے۔ عمرانہ کے چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ سب کو باری، باری سینے سے لگا کر پیار کیا۔ پڑھائی کے بارے میں پوچھا۔ تینوں بچے اپنی، اپنی رو داؤ ستانے لگے۔

”اب اچھے بچوں کی طرح کپڑے بدلو، یونیفارم ڈیگر میں صحیح طرح لٹکاؤ۔“ حرے کے آلو پرائٹھے بنے ہیں، اچار کے ساتھ کھائیں گے۔“ وہ روز انہیں یونیفارم اور جوتوں کے متعلق ہدایات دیتی کھانے کے لیے بلائی تھی۔

”ای آپ روزانہ یہی پکاتی ہیں یا وال، چاول کوئی نئی ڈش بھی تو بنا یا کریں۔ میرے دوست کی ای روز نئی، نئی ڈش بناتی ہیں اور اسکول کے لیے بھی روز نئی ڈشز اور پیسے بھی دیتی ہیں۔“ بیٹے نے ماں سے شکایتی انداز میں کہا۔ لڑکیاں تو بچپن سے ہی صابر اور سمجھدار ہوتی ہیں مگر یہ لڑکے اکلوتے لاڈلے منتوں، مرادوں سے پیدا ہونے والے بیٹے کی بات سن کر عمرانہ کا دل کلڑے، کلڑے ہو گیا۔ اس نے اپنے آنسو کا میا پی سے چھپاتے ہوئے بیٹے کو گود میں اٹھا کر ماتھے پر پیار کیا۔

”سوری ہینڈسم بوائے اب میں اپنے بیٹے کے لیے روز ہی نئی ڈش بناؤں گی۔ اسکول سے واپس آکر کھانے کو ہوتا ہے ناں۔“ عمرانہ نے الزام اپنے ہی سر

ڈیوٹی

جان!
مجھے بہت افسوس سے
تم سے ملنے شاید اس ہفتے بھی نہ آ
سکوں گا

بڑی اہم مجبوری ہے!
جان! تمہاری مجبوری کو
اب تو میں بھی سمجھنے لگی ہوں
شاید اس ہفتے بھی
تمہارے چیف کی بیوی تنہا ہوگی
انتخاب: خوشبو، از پروین شاہ کر
مرسلہ: رفعت بسین رنی۔ یو ایس اے

صرف پیا

سنہری شام کا منظر
ہماری آنکھ کو
کسی کا
منظر بتاتا ہے
تمہاری یاد سے دل کو
جلاتا ہے
سنہری شام کے ہر منظر میں
تم کو اپنے ساتھ رکھنے کی
میں عاوی ہو چکی ہوں اب
مراد دل تمہارے قدموں تلے
آنے والی کلیوں میں
بسکتا ہے
تمہارے بن میری سانس
سینے میں اکتی ہے

شاعرہ: شہزادی کائنات پونس۔ کراچی

لے لیا۔

کھانے کے دوران بچے ہنسی مذاق کرتے رہے
اور وہ سوچتی رہی کہ تنخواہ سے وہ اس دفعہ اور کچھ نہیں
کرتے گی بس بچوں کو اچھے، اچھے کھانے پکا کر کھلائے
گی۔ وہ تنخواہ جو اسے لوگوں کی حریص نظریں برواشت
کرنے اور ذلیل ہونے کے عوض ملی تھی۔ ٹیلیفون کی
گھنٹی نے اس کو خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا
میں پہنچا دیا۔

”سوئٹ ہارٹ اب اٹھ جائیں شام ہو گئی ہے،
کتناسوئٹیں گی۔“ دوسری طرف عامر تھا۔ سوئٹ ہارٹ
کا لفظ سن کر عمرانہ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔
”عامر میں سوئٹیں رہی تھی کام کر رہی تھی۔ بچوں
کو اسکول کا کام دے کر سارے برتن دھوئے، جھاڑو
پوچھا کیا، اب کپڑے دھونے شروع کیے ہیں۔“
عمرانہ نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔
”بیگم آپ کچھ زیادہ ہی کام کارونا نہیں روئے
لگی ہیں۔ یار کام سب کرتے ہیں، میں بھی آنس
میں کام ہی کر رہا ہوں، یہ بتاؤ تنخواہ ملی؟“

”تو اس لیے۔“ سوئٹ ہارٹ اُجھلی مٹی گئی ہے،
”آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“
”ایسا کرو شاہا بش، بھاگ کر قریب والی مارکیٹ
سے چار مرغیوں کے نکلے بنوا لو اور کبابوں کے لیے قیر
بھی لے آؤ اور رات کے لیے زیر دست سا کھانا تیار
کر لو۔ میرے کچھ دوست آرہے ہیں۔“ حکم نامہ صادر
ہو گیا۔

عمرانہ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ شوہر کے ساتھ
وکھ اور سکھ دونوں مواقع پر اظہار کے لیے الفاظ ہمیشہ
ہی مختلف، بہتر اور خاص ہونے چاہئیں اور جب ایسا
شوہر ہو جسے نہ سننے کی عادت ہی نہ ہو۔

”دیکھیں عامر، آج آپ کے دوستوں کے
کھانے پر میری ساری تنخواہ خرچ ہو جائے گی۔ باقی
پورا نہیں کیسے گزارے گا..... میں نے بچوں سے
وعدے کیے ہیں..... سروایاں شروع ہونے والی ہیں،“

ان کے لیے گرم کپڑے لینے ہیں۔" عمرانہ نے دسبے، دسبے لہجے میں احتجاج کیا۔

"بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ میرا گھر ہے اور یہ تمہاری کمائی پر نہیں چل رہا ہے جو اس کی دھونس جمار ہی ہو، بجائے اس کے کہ شام کو تین چار ٹیوشن کر لو، کل سے گھر پر بیٹھو کوئی ضرورت نہیں نوکری کرنے کی اور ہاں رات کی دعوت کے بارے میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔"

"مگر عامر آپ نے ہی تو مجھے نوکری کے لیے زبردستی بھیجا تھا۔ مجھے کوئی شوق نہیں تھا گھر سے نکلنے کا۔" عمرانہ منمنائی۔

"ہاں، ہاں سارا تصور میرا ہی ہے۔ آج کل ساری عورتیں نوکریاں کر کے اپنا گھر چلاتی ہیں تم کوئی انوکھا کام نہیں کر رہی ہو۔" یہ کہہ کر عامر نے فون بند کر دیا۔

جب جیون ساتھی کا رویہ اس طرح کا ہو تو یہی خراب رویے اور برتاؤ زندگی کو دھوپ کے رخ پر لٹکے ہوئے پردے جیسے بے رنگ اور کمزور کر دیتے ہیں ایسے میں بحث اور گفتگو کا کوئی جواب ہوتا ہے نہ حل۔

چارو ناچار وہ بچوں کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر گیٹ پر تالا لگا کر بازار کی طرف پیدل چل پڑی۔ اپنی خون پسے کی کمائی یوں خرچ کرتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ گھر آ کر اس نے دعوت کی تیاری شروع کر دی۔

"ارے ای آپ تو آج ہی ارے، ارے کے کھانے بنا رہی ہیں۔" اسے یوں مصروف دیکھ کر بیٹا خوشی سے بولا۔

"بیٹا جی آج ابو کے دوست ڈنر کے لیے آرہے ہیں ان کے لیے پکا رہی ہوں۔" عمرانہ نے چمکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ صبحے لیے پکائیں گی۔" بچی تو تھا۔

"آپ کو بھی ملے گا مگر پہلے ابو اپنے دوستوں کے ساتھ کھائیں پھر آپ کو دوں گی کہیں کھانا مہمانوں کے سامنے کم نہ پڑ جائے۔"

عامر اور اس کے دوستوں کی تاش کی محفل رات گیارہ بجے تک ختم نہیں ہوئی تھی کہ کھانے کی باری آئی۔ عمرانہ نے بچوں کے سامنے تھوڑا سا کھانا رکھا، مبر سے انہوں نے کھانا کھایا اور سونے چلے گئے۔ بارہ بجے عامر آیا تو عمرانہ کو اپنا منظر پایا، وہ اپنے اسٹوڈنٹس کا رزلٹ تیار کر رہی تھی۔ اپنے رویے پر اسے ذرا سی شرمندگی نہیں تھی، نہ ہی اس بات کا احساس تھا کہ صبح کی تھکی ہاری بیوی اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

"ایسا کرو میز پر سارا کھانا رکھ دو ہم کو جب بھوک لگے گی تو کھائیں گے تم جا کر لیٹ جاؤ۔ ہاں بس تھوڑی دیر بعد..... میرے پاس کو سلام کرنے آ جانا۔"

تھکن اور شوہر کی بے حسی نے اس کی بھوک پیاس ختم کر دی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور مارے غصے کے اس نے پاس کو سلام کرنے کو ضروری ہی نہیں سمجھا تھا..... وہ سمجھتی تھی کہ وہ سلام کے جواب میں اس کے سر پر کس طرح ہاتھ پھیرا کرتے ہیں۔ شوہر کی اس عادت سے اسے سخت نفرت تھی جب وہ دوستوں کے سامنے بلاتا۔ وہ کس مشکل سے یہ حکم بجالاتی تھی یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ طوعاً و کرہاً اپنی کمر سہلاتی وہ اٹھ گئی تھی۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ بے حس پڑا سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ اور اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اب اس کی بیٹی بڑی ہو گئی ہے اور اسے ایسی دعوتیں اپنے گھر میں ہرگز نہیں کرنی چاہئیں۔

مگر وہ صرف سوچ کر اور کڑھ کر ہی رہ گئی تھی کہ جب وہ بے خبر سو رہی تھی تو اسے لات مار کر جاگروہ اسے اپنے پاس کو سلام کروانے کے لیے ہی لے گیا تھا۔

دو چار زچسٹراشا کر سنبھال دیتی۔ میرا جو سارا دماغ کسی نکتے پر مرکوز ہوا ہوتا مل کر رہ جاتا۔ میں اکثر اس کے بارے میں سوچتی آخر یہ کیا چیز ہے؟

رات کو کبھی صبح کے کونے میں بنے بیت الخلا میں جانے کی ضرورت ہوتی تو وہ کسی نہ کسی کو جگا کر جاتی۔ شاید ڈرتی تھی اور نیند میں بستر سے زیادہ کسی کو کوئی

مجھے اس سے چڑھتی اور بہت چڑھتی۔ میں یہاں کوئی چیز رکھ کر جاتی وہاں غائب ہو جاتی۔ غسل خانے میں جاتے وقت دوپٹا باہر رکھ کر جاتی اور جب نکلتی تو بقول اس کے سنبھال دیا گیا ہوتا۔ میں کتابوں کو اپنے ارد گرد پھیلا کر پڑھنے کی عادی ہوں۔ یہاں کتابیں پھیلائے بیٹھی ہوتی اور دو گھونٹ پانی پینے کیا اٹھتی، وہ

نائلہ بی بی

سریم چانگیر



پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،

جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

دوسری چیز عزیز نہیں ہو سکتی لیکن وہ تو وہاں اتنی، اتنی دیر لگا دیتی کہ کمرے سے خود ای کو باہر ہم میں سے کسی کو جا کر دیکھنا پڑتا۔ کہیں وہاں سوئی نہیں گئی لیکن وہ سوئی کہاں ہوتی وہ تو صحن میں بے ترتیب پڑے جوتوں کو ترتیب سے رکھنے میں لگ جاتی تو کبھی تار پر پھیلے کپڑے سینٹے لگتی، ہم میں سے جا کر کوئی اسے یاد کروانا کہ وہ کئی کس کام کے لیے اور دوسرے کی غیند بھی خراب کر ڈالی لیکن اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔ خیر بات ہو رہی تھی چڑ کی تو مجھے اس سے واقعی بہت حیرت تھی۔

وہ جہاں ہوتی محفل کی جان بن جاتی۔ بچے اس کا نام لیتے نہ تھکتے، بڑے اس کی اچھائیوں کے گن گاتے۔ میں غور سے دیکھتی رہتی، سمجھنے کی کوشش کرتی کہ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے لیکن مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آتا۔ جائے نماز پر اتنا عرصہ بیٹھی رہتی کہ وہ اپنے پاؤں پر بڑے نشانات چھپانے لگ جاتی۔ مجھے لگتا کہ ضرور سب کو تسخیر کرنے کے وظائف پڑھتی ہے، میں نے بھی رسالوں سے اسم اعظم کی تلاش شروع کر دی لیکن جو بات اس میں تھی، وہ مجھ میں پیدا نہ ہو سکی۔

میں لامحالہ، شعوری اور لاشعوری طور پر اس سے تقابل کرنے لگ جاتی۔ اس کی کسی کام میں تعریف ہوتی تو میں اس کے نیچے کام کو غور سے دیکھتی، سیکھتی اور سمجھتی لیکن کچھ پلے نہ پڑتا یوں بہتر سے بہترین کی طرف کی ووڑ میں، میں بھاگتی رہی پر وہ میرے آگے ہی رہی تھی۔

ایک دن بڑے ابو نے مجھے کہا کہ تمہارے میٹرک میں نمبر نائلہ سے زیادہ آنے چاہیں مجھے تم سے امید ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تم لے سکتی ہو۔ مجھے ای کا وہ گرم بوسہ پاؤ آ گیا جو انہوں نے نائلہ کے ماتھے پر اتنے اچھے نمبروں کی خوشی میں ثبت کیا تھا۔ میرے وظائف لے لے اور دعائیں تیز تر ہو گئیں کہ اللہ جی بس اس سے اچھے نمبر آجائیں۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی لیکن وہی ڈھاک کے تین پات میں سب کچھ کر کے بھی اس سے پیچھے ہی رہی۔ میرے اس سے دس نمبر کم آئے، مجھے پشیمانی ہوئی۔

اس سے زیادہ نہ مانگی، بہترین مانگی تو کیا چاہا اس سے بہتر آئی جاتے۔ اب ایف ایس ی کے امتحانات ہونے والے تھے۔ ریاضی کے پڑچنے کے لیے بہت محنت کی لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ جب میں اڑنا سیکھ رہی تھی۔ اسکول کے بعد کالج کا ماحول انسان کو بڑی جلدی بندی اور سمندر میں فرق سمجھا دیتا ہے، ہم نصابی سرگرمیوں میں میرا نام ڈکنے کی چوٹ پر لیا جاتا۔ مجھ سے مقابلہ کرنے کے لوگ فخر محسوس کرتے لیکن میرا مقابلہ تو گھر میں چل رہا تھا۔ اس نے حیاتیات پڑھی تھی اور میں ریاضی پڑھ رہی تھی۔ میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ اب تو اس سے زیادہ نمبر لے کر دکھاؤں گی۔ اس کی وراڈ کو خاموشی سے آدھی رات میں کھولتی، اس کی مارک شیٹ لے کر اسٹور میں گئی اور ہر مضمون کے نمبر نکال کر دیکھ کر اپنے رجسٹر کے آخری صفحے پر لکھتی گئی۔ ہر نمبر میرا ہدف تھے اس بار یقیناً اسے مات دینی تھی۔ ریاضی کا پیپر دینے بیٹھی تو امتحان والے دن لگتا وماغ بالکل خالی ہو گیا۔ ایک سوال بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ میری ذہانت اور میرے حافظے پر میرا حلقہ احباب ہمیشہ سے واو دیتا آیا ہے، میں گھر آئی اور چاندنی رات میں چھت کے فرش پر ننگے پیر چل کر افسانوں کی ہیروئن کی طرح خوب غم منایا لیکن شدت پسند طبیعت کو سکون نہ ملا۔ نیچے آئی دو اونچوں والی ٹوکری اٹھائی اور مٹھی بھر دو انیس منہ میں ڈال ہی لیتی کہ اس سے قبل ہی اس نے مجھے ایک تھپڑ مارا میں نے جواباً بدتمیزی کی۔

”مجھے کھانے دو، تم کون ہونی ہو۔“ اس نے پٹاخ ایک اور تھپڑ لگایا۔ میں اس کی شکل دیکھ رہی تھی اور ای پاس کھڑی تماشا..... شاید تین یا چار اور تھپڑ لگائے ہوں گے لیکن بہر حال اس نے اپنی کسر نکالی۔ میرے اندر روشنی جذبے شدت سے اٹھ آئے۔ یا تو یہ مجھ سے حسد کرتی ہے کہ اس میں مجھ جیسی شدت پسندی نہیں ہے لیکن پھر وماغ نے کہا اس بے وقوفانہ عمل پر حسد کیا یا دوسری بات میرے لیے بڑی پریشان کن تھی یا وہ میری ماں بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب وہ بل بل میں ٹولا، بل میں ماشہ ہونے لگ

غزل

منہ اپنی روایات سے کبھی پھیرا نہیں کرتے
دشمن کو اچانک کبھی گھیرا نہیں کرتے

دیوار کے پیچھے کوئی رہزن نہ چھپا ہو
اس واسطے ہم گھر میں اندھیرا نہیں کرتے

جس بیڑ کی چھاؤں بھی لگے دھوپ کی صورت
اس بیڑ پہ ننھی بھی بھیرا نہیں کرتے

آنکھوں سے نہ پڑھ لے کوئی چہرے کی اداسی
اس ڈر سے کبھی ذکر وہ میرا نہیں کرتے

ہم سینچے ہیں کشتِ سحر اپنے لہو سے
مانگے ہوئے سورج سے سویرا نہیں کرتے

شاعرہ: کوثر خالد۔ جڑانوالہ

کرم جھکیوں والی جیسی لگتی ہو۔ قصہ اس کی خوب صورتی
کا چھڑا تھا۔ ہم خریداری کے لیے موٹی بازار گئے۔ برقع
پوش دو خواتین میری ای کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔

”آپ نے اس کا رشتہ کہیں وے رکھا
ہے؟ آپ ہمیں اس کا رشتہ وے دیں۔“ ایک دکان
سے کئی کترا کر نکلے تو وہ بچے جھاڑ کر ہمارے پیچھے ہی پڑ
گئیں۔ خریداری گئی بھاڑ میں، ہم آفت کی پرکالہ کو
لے کر گھر واپس آ گئے۔

دھوپ چھاؤں مزاج میں جب چھاؤں آتی تو
اتنی گھنیری ہوتی کہ مجھے اپنا آپ اور اس کا اصل ڈھونڈنا
مشکل ہو جاتا۔ مجھے ہم نصابی سرگرمیوں میں تجھے
تحائف ملتے تو وہ بڑی خوشی مناتی۔ اپنی یونیورسٹی کی
دوستوں کو میری شاعری پڑھواتی، مجھے ان سے ملوانی،
واہ، واہ کروانی۔ کسی بھی سالگرہ پر بارہ بج کر ایک منٹ
سے پہلے یا بعد میں دعا میں دیکھنے کی ضرورت نہیں

ماہنامہ پاکیزہ 105 نومبر 2016ء

جاتی۔ رات اپنی کالی چادر پھیلاتی تو ہم کہیں آہیں
میں دکھ سکھ بانٹنے لگ جاتیں۔ ارم آپنی کو جلدی نیند
آجاتی لیکن وہ میری لن ترانیاں سنتی رہتی۔ میری
دوستوں کے بارے میں نجومیوں کی طرح پیش گوئی
کرتی جو بالکل ٹھیک ثابت ہوتی۔ ایسے موقعوں پر میرا
دل چاہتا کہ اسے کالی زبان والی کہوں لیکن یہ تو وہ خود
مجھے کہہ کر بلاتی تھی۔ میں اس کی نقل بھلا کیسے کرتی۔ کبھی
مجھے سبق پڑھاتی، کبھی مجھے آئینہ دکھاتی، مجھے بہت غصہ
بھی آتا، غصہ کیوں نہ آتا، آخر کو مجھے اس سے چڑ جوتھی۔
مجھے اس سے تب سے چڑ تھی جب وہ میری تصویر
کو سلائی مشین میں رکھ کر میری ناک سینے کی کوشش
کرتی۔ ساتھ ساتھ کبھی جاتی اس کی ناک بہت موٹی
ہے، جب میں بہت بچپن کی تصویریں دیکھتی اور اس
میں اس نے میرا منہ دیکھا ہوتا، جب میں کسی سگلی کے
گھر جانے کی اجازت مانگتی اور وہ ای کے کان بھرنے
لگ جاتی۔ جب وہ تانگے پر بیٹھ کر اسکول جاتے
ہوئے پہلے اتر جاتی یا پہلے چڑھ جاتی اور اپنا ہاتھ میرے
آگے ایسے کرتی جیسے احسان چڑھا رہی ہو۔

پھر ایک دن مجھے پتا چلا وہ بہت خوب صورت
ہے، شاید پھوپکی شادی تھی اور اس نے گہرے سبز رنگ
کے کپڑے پہنے تھے۔ علاقائی طرز کے لباس کے ساتھ
اس نے سر پر ٹوپی بھی سجا رکھی تھی۔ گھر والے بال یہاں
وہاں لہرائی وہ اڑتی پھر رہی تھی اور میں دوسری منزل کی
جالیوں سے لگی گھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

”پتا نہیں منہ پر کیا لگا لیا ہے اتنی پیاری لگ رہی
ہے۔“ میرے اس علم کی تصدیق گزرتے وقت نے کی۔
جو دیکھتا تعریف ضرور کرتا..... ذہانت سے چمکتی آنکھیں
اور ستواں ناک..... وہ میری ناک کو ٹھیک ہی مونا کہتی
تھی اس کی صحیح معنوں میں ستواں ناک تھی۔ نازک
تراشے ہوئے ہونٹ اسے ہزار دفعہ کہا کہ منہ کھول کر ہنسا
کر وہ اس سے تصویر اچھی آتی ہے لیکن پھر بھی وہ شرمائی،
شرمائی سی ہنسی ہنسی دیتی۔ البتہ ایک بات پر میں اسے
یقین دلانے میں کامیاب ہوئی تھی کہ کال یا سر نہ لگا

کلائی میں چوڑیاں چھوٹی اور خود کو کھل میں چھپالیا۔ اس نے پھپھر لگا کر ساتھ لے جانے پر راضی کیا اگلے دن اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جس سے اس نے مجھے مارا تھا۔ اب میں مار کھانے کی شائق رہتی، میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ میرے لیے کہاں تک کیا کیا کر سکتی ہے۔

سیدھی ساوی سی لڑکی چودہ فروری کو چپکے سے ہمارے سر ہانے کے نیچے کارڈ اور پھول (بھئی بھالو کبھی کبھ اور) رکھ دیتی۔ بارہ بج کر تھی، اپنی ڈائری برائلی ذوق کی نمائندہ شاعری لکھتی، مجھے میری ایک سا لگہرہ پر خود سے لظم لکھ کر دی۔ میں بس اسے دیکھتی اور سوچتی اس لڑکی کی کتنی سمیتیں ہیں، میں اس سے بہت باتیں کرنا چاہتی تھی۔ بیانا چاہتی تھی کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں لیکن اب وہ چھٹنے لگی تھی۔ وہ بہت جلدی سو جاتی۔ اس کی تمکاوٹ دیکھ کر امی نے فیصلہ کیا کہ اب اس کے ساتھ وہی ہونا چاہیے جو لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اگر کبھی میں اپنی کسی دوست کے رویے سے پریشان ہو کر روئی تو اس نے مجھے سمجھایا کہ ہماری ماں نے ہماری تربیت ایسی نہیں کی کہ کسی کے پیچھے بھاگیں بلکہ ہماری تو ایسی تربیت ہے کہ لوگوں کو ہمارے پیچھے بھاگنا چاہیے۔ ہمیں اپنے چلن کو دوسروں سے ممتاز کرنا ہے اور پھر یہ مشوروں کی پٹاری پیدا لیں سدھارنے لگی۔ اسے اپنے والدین کے لیے بیٹا چاہیے تھا۔ اس کی ایک ہی فرمائش تھی کہ اسے آسمان سے اترنا شہزادہ نہیں چاہیے بلکہ کوئی ایسا ہو کہ اس کی سب بہنیں ہاں کہہ دیں تو وہ بھی رضامند ہو جائے گی۔ مجھے پہلی ملاقات میں ہی بھائی جان کی شخصیت اچھی لگی۔ لیکن نائلہ کے لیے تو پرستان سے شہزادہ گلغام بھی آجاتا تو میں ہاں نہ کہتی..... میں کیسے کسی کو اس کے لیے ٹھیک سمجھتی، مجھے خود اس کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ خیر باتوں کی ہاں میری بھی ہاں کبھی گئی اور اس کا رشتہ طے ہو گیا۔

وہ اور چھوٹی ہر وقت روتے رہتے، اٹھتے بیٹھتے

پڑی۔ وہ جاگ رہی ہوتی، بچپن میں تو سنتے ہی نچے نچے طریقے اپناتی، کاغذ پر انگریزی میں سا لگہرہ مبارک لکھتی اور ڈھیروں کا پیاں کر کے یو یو فارم ہاتھ برش، جوتوں، بیگ، کٹنگھی سب کے ساتھ رکھ دیتی۔ مجھے سونے کا تمغہ ملا تو مزہ نہیں آیا اس نے ہم نصابی میدان میں اپنی صلاحیت کے جوہر نہیں دکھائے تھے ورنہ میں اس سے اس میدان میں بھی ہار ہی جاتی۔ میری اس جیت کا اسے بہت مزہ آیا۔ مجھے کارڈز پر ”مجھے تم پر فخر ہے۔“ لکھا ملنے لگا۔ میری اندر کی بچی خوش ہوتی لیکن اس کے دھوپ مزاج سے خائف ہی رہتی۔

اس نے مجھے بتایا کہ بڑوں کو بہت سوچ سمجھ کر چلنا پڑتا ہے، کسی بھی راہ کا تعین کرتے وقت دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ واقعی اس نے کتنا دھیان رکھا جو چیز اس کے ہاتھ میں تھی اس نے اسے جانے دیا۔ صرف اس چیز کو پکڑا جو ہم لوگوں کے لیے مشکل راہ بنتی..... اس نے پڑھانا شروع کر دیا صرف مجھے جب تک پڑھاتی تھی اچھی لگتی تھی حالانکہ میں اسے پڑھانے کے قابل نہیں گردانتی تھی۔ اب میرے اور اس کے درمیان اتنے ڈھیر سارے شاگرد تھے، میں جانتی تھی کہ اب فاصلے سمیٹنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ تم جو ہو جیسی ہو مجھے اپنے لیے چاہیے ہو۔ مجھے تم صرف میرے لیے چاہیے ہو لیکن بہت ہی مجبوریاں دائرہ سے لپٹی گئیں۔ وہ فرمانبردار بیٹی تھی تو مثالی استاد بنی۔

☆☆☆

ایک دن اس کی ایک شاگردہ کے ساتھ میری کسی بات پر ٹھن گئی تو اس نے کھینچ کر مجھے تھپڑ مار دیا۔ مجھے بہت شدید غصہ آیا۔ تیسری منزل اور چھت میں کتنا فاصلہ تھا۔ میں چھت پر جا پہنچی کہ میں تو کود جاؤں گی۔ وہ میرے پیچھے آگئی اور اس کے اندر کی ماں جاگ گئی۔ میں مار کھا کر اچھے بچوں کی طرح واپس نیچے آگئی۔

ایک شادی میں جانا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان پھر تو تو نہیں، میں ہو گئی۔ اس نے اپنی ساری

انگلے گھر چلی گئی ہے۔ میرے کپڑے سنبھالنے والا کوئی نہیں، میری کتابیں اس کے ہاتھوں کالس پانے کو..... بے چین رہتی ہیں، میری منصوبہ بندی ان راتوں کو ڈھونڈتی ہے جب وہ اور میں ساتھ ہوتے تھے۔ زندگی کتنی آگے بڑھ آئی ہے، میں کتنی مصروف ہوئی ہوں، وہ گھر آ کر ڈبل بیڈ پر لیٹی ہے تو اس کے بچے ساتھ اور چھوٹی بچی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ تو میں بھلا اس کمرے میں کیسے سو سکتی ہوں لیکن اب میں واقعی اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں اس سے بہت کچھ سیکھنا چاہتی ہوں لیکن ڈر ہے کہ وہ مجھے سکھاتے، سکھاتے میری ماں ہی نہ بن جائے۔ وہ مجھ سے پیار سے آرام سے بات کرے، مجھے یہ نہ کہے کہ وہ بہت لاجواب ہے۔ مجھے اس کے لاجواب ہونے پر کوئی شک نہیں ہے۔ میں اسے تسلیم کرتی ہوں پورے دل سے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اب بھی اس سے بچ ہے، جیسی بچہ شروع سے تھی۔ لیکن اب کئی برسوں بعد کہ جب میں خود بقول اس کے سمجھدار ہو گئی ہوں تو اپنی بچہ جاننے والی حالت پر غور کرنے لگی ہوں کہ اصل میں مجھے اس سے بچہ تھی یا میں رفتہ رفتہ اس کی اسی طبیعت کی عادی ہو چلی تھی کیونکہ اس کی شادی سے سب سے بڑا نقصان میرا ہی ہوا۔ اس کی شادی کے بعد میری زندگی میں کچھ بھی دیا نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔ بہت تبدیلیاں آئیں کچھ بھی برانہ ہوتا اگر وہ پہلے کی طرح ساتھ ہوتی اور میں اسے اپنی ساری مشکلیں بتا دیتی۔ میرے بچنے کے باوجود اس نے میرا کبھی برا نہیں چاہا اس لیے کہ وہ تو مجھ سے نہیں بڑتی تھی ناں... بڑتی تو بس میں تھی اس سے۔ لیکن اب وہ ایسی پادیس سدھاری کہ اس سے بڑی کوئی مجنوں کی لیلیٰ کہیں نہیں ہوگی، کوئی نہیں ہوگی کیونکہ بھائی جان کے بغیر اس کی سانس بند ہو جاتی ہے۔ وہ ان کے ساتھ ہی آتی ہے اور ان کے ساتھ ہی واپس چلی جاتی ہے اور میرے بچنے کی ایک ٹھوس وجہ اور ہو گئی ہے تو آپ ہی بتائیں کہ میرا بچنا تو بنتا ہے ناں!.....!

جائے، سوتے ان کا رونا ہی نہ ختم ہوتا۔ میرے اندر کہیں سی خوشی بیدار ہو جاتی۔ اب میں بڑی ہوں گی کیونکہ ہم دونوں کے درمیان والی تو بھینکی ملی ہے، ان کے رونے سے مجھے لگتا تھا گھر بھر پر نحوست سی طاری ہو گئی ہے۔ یہ الگ بات کہ جائے نماز پر کھڑے ہو کر میں اس کے بغیر گھر کا تصور کرتی تو میری جان ہی نکل جاتی۔ میں ان کے رونے کا مذاق اڑاتی لیکن رات کو میرا تکیہ بھیگ جاتا۔ میں اٹھ کر آدھی رات میں اسے دیکھتی..... وہ تہجد کے وقت ماتھا ٹیکے بیٹھی ہوتی..... شادی خوشی کا نام ہے اور اس نے پرانے زمانے کی ہیروئنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بارات کے دن میں نے جانے کیسے اس کے رونے پر اتنے زور کا ڈانٹا کہ اس بیچاری کا منہ بن گیا۔ سب نے پوچھا کیوں رو رہی ہو، وہ بولی دل کر رہا ہے اور جب پھٹتی تو بولی میں ہمیشہ سب کی باتیں برداشت کرتی ہوں لیکن ہر وقت مجھے ہی سننا پڑتا ہے پر میں اس سے کہنا چاہتی کہ اس ہمیشہ میں وہ ٹھپڑ کس کھاتے میں جاتے ہیں لیکن نہ کہہ سکی کیونکہ اس بات پر اسے مزید رونا آ جاتا۔

وہ جب بھی کسی ٹی وی ڈرامے میں کوئی ڈراما لڑکی کو دیکھتی تو کہتی کہ یہ مریم ہے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ اگر ڈرامے میں کوئی ”قلم جیسی لڑکی“ آئے تو میں بھی کہہ سکوں کہ یہ نائلہ ہے۔ لیکن وہ تو قلم ہے ناں، وہ ڈرامے میں کیسے سما سکتی تھی۔

زندگی کے نشیب و فراز سے ہم قدم ہوتے ہوئے اسے کچھ وقت لگا لیکن زندگی اس نے ویسے ہی گزاری جیسی وہ گزارتی تھی۔ جیسی وہ پڑھتی تھی جیسی وہ چاہتی تھی۔ اپنے اصلی ہیرو کے ساتھ اللہ کے گھر سے ہو کر آئی تو خوشیوں کی نوید ساتھ لے کر آئی۔ اللہ نے اس پیاری سی لڑکی کو ماں بنا دیا۔ اب عبدالرحمن کو گو میں لیے جب وہ بیمار کرتی ہے تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے کہ یہ تو خود چھوٹی سی بچی تھی اتنی بڑی کیسے ہو گئی۔

میں اس سے ہمیشہ سے بڑتی تھی سو اب بھی بڑتی ہوں اور کیسے بڑتی ہوں میری ماں میں خراب کر کے وہ

..... یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالے، بوند، بورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
 دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں ...
 سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے ...
 دل کو رو بجاتا ہے، جگر کو پٹا جاتا ہے ...
 کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یارباں ٹوٹ جاتی ہیں۔
 الزام تراشیوں کا ایک طوفان بد تمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
 دل سے دل کوراہ بھی ہوتی ہے ...
 آج کا انسان یہ راہ سٹیلانٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دل اور سونے کا بچھڑا ...

عبادات، معاملات ...

جنتِ گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی ...

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
 جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
 غم اگر چہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
 غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
 ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قطعہ 4

اس نے سیٹی بجاتے ہوئے بڑی ترنگ میں بانیک کو یوٹرن دیا جیسے سرکس کے موت کے کنویں میں گھوم رہا ہو۔ حس لطف پھڑک پھڑک کر گدگدیاں سی کر رہی تھی۔

تیز رفتار بانیک کو عین زارا کے سامنے پہنچ کر بریک لگائے۔ زارا اور گارڈ دونوں اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

بانیک کھڑی کر کے اس نے چاق و چوبند سپاہی کی طرح سیلوٹ کیا..... گارڈ بڑے اچنبھے سے زارا کی طرف دیکھنے لگا۔

”تت..... تم اس خوفناک بانیک پر مجھے لینے آئے ہو.....؟“ زارا اتنی طور پر اپنی پریشانی بھول کر بانیک کی



طرف غصے اور حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
 ”چلتی کا نام گاڑی ہوتا ہے میم..... تھینک گاڈ..... یہ ابھی چلنے کے موڈ میں ہے۔“ ساحل نے بہت پیار بھری نظر سے اپنی بائیک کی طرف دیکھا۔ جیسے نئی، نئی دام میں آنے والی محبوبہ پر گاہے، گاہے نگاہ کی جاتی ہے۔

”مگر میں نے فون پر کہا تھا کہ گاڑی لے کر آنا.....“ زارا کی حالت خیر ہونے لگی۔ کتنا روح فرسا تصور تھا کہ اسے اس بے ہنگم سواری پر سفر کرنا ہے۔

”میم..... یہ گاڑی نئی ہے..... انجن پر ہی چلتی ہے.....“ ساحل نے بے پروائی سے جواب دیا۔
 ”تم میرے لیے کوئی ٹیکسی روکو..... میں اس پر نہیں بیٹھوں گی۔“ زارا کے انداز میں قطعیت تھی۔

گاڑی بڑی حیرت سے بار، بار دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا..... اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ بائیک کیوں موضوع بحث بنی ہوئی ہے؟

”بائی داوے..... آپ کی کار کو کیا ہوا؟ اور آپ یہاں تک کیسے آئی ہیں؟“ ساحل کے ذہن میں کلبلا نے والا سوال بالآخر زبان سے پھسل ہی گیا۔

”میری کار چھن گئی ہے۔“ زارا نے رونے والے انداز میں کہا..... ساحل کے لیے یہ دھماکا تھا..... اس نے بے اختیار یونیفارم میں ملبوس گاڑی کی طرف دیکھا..... اور بہت توجہ سے دیکھا..... وہ تو گاڑی کو زارا کے حوالے سے ہی دیکھ رہا تھا البتہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ آخر آج گاڑی کو ساتھ لے کر کیوں گھوم رہی ہے۔

”تمہارے پاس 100 روپے ہیں؟“ اب زارا کو دھیان آیا کہ گاڑی کو اس نے خواہ مخواہ کھرا کیا ہوا ہے..... اور خود کو مزید متاثر بنا رہی ہے۔

”اوہ..... شیور..... لیکن.....“ ساحل جھڑکی پاگٹ سے اپنا والٹ کھینچتے ہوئے کچھ کہتے، کہتے رکا..... کار چھیننے کا سن کر وہ خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”لیکن لیکن کچھ نہیں..... اس کو پیسے دے دو..... تمہیں مگر جا کر واپس مل جائیں گے، میں نے اس کے موبائل سے ہی فون کیا تھا۔“ زارا نے کوفت و پریشانی کی کیفیت میں وضاحت کی۔

”کوئی بات نہیں میڈم..... پانچ دس روپے کا بات ہے، ابھی آپ اپنے گھر جاؤ، امارے کو خالی دعا دو۔“ گاڑی نے بہت بڑے پن کا مظاہرہ کیا بلکہ سو روپے کا سن کر خاصا شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔

”یہ لٹ جانے کے بعد پھر یاد رکھا ساتھ..... بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔“ ساحل نے والٹ سے سو کا نوٹ نکالتے ہوئے مگر حیرت سے گاڑی کی طرف دیکھا۔

”یہ سامنے سے آیا ہے، اس نے دیکھ لیا تھا جب وہ مجھ سے کار چھین کر لے جا رہے تھے..... یہ سامنے والے بیچلے پڑی ہوئی دے رہا تھا۔“ زارا کو چارونا چارو وضاحت کرنا پڑی۔

گاڑی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر سو روپے لینے سے انکار کر رہا تھا۔
 ”بہت مہربانی..... ام پریشان لوگوں سے اتنا سزا دینے کس واسطے لے گا..... پانچ دس روپے کا خرچہ

ہے..... اللہ آپ کو دے آپ اپنی بیگم کو لے کر سیدھا تھانے جاؤ..... پرچہ کٹاؤ..... ابھی یہ ضروری کام ہے۔ پرچہ کٹانا بہت ضروری ہے..... چھتا ہوا گاڑی واردات میں استعمال ہوگا تو بڑا پریشانی آئے

گا..... سلام..... اب تم..... یہ کہہ کر گاڑی بیچلے کی طرف ہٹا..... سو کا نوٹ ساحل کی اگلی ٹاسک میں پھینک دیا۔
 مہینہ پھر..... (170) فون.....

Downloaded From Paksociety.com



تھا۔ کھلی جگہ کی ہوا میں بہت زور تھا۔
”بیگم.....“ ساحل کی حس لطیف پھڑکی..... زارا جڑی سی نظر آرہی تھی بلکہ نظر چہ ارہی تھی۔
”سیدھا سادہ دیہاتی بندہ ہے، معاف کر دیں۔ حالانکہ اچھی خاصی بدتمیزی کر کے گیا ہے..... روڈ پر کھڑے
ہو کر کسی کو بھی میاں، بیوی بنا دینا بہت غلط بات ہے اور آپ کی تو اچھی خاصی انسلٹ کر گیا وہ..... کس قدر عقل سے
پیدل انسان ہے..... اتنا تو سوچ لیتا..... جس لڑکی کے پاس اتنی شاندار کار ہو اس کے شوہر کے پاس اتنی پچھل
بانگ کیوں ہوگی۔“ ساحل کی نظر میں اس کی پُر جھوم تمناؤں کے رنگ اترے ہوئے تھے..... دل سے گارڈ کے لیے
دعا نکلی..... ایک ارب جی لڑکی کو اس کی بیگم سمجھ کر بڑی تعویب پہنچائی تھی اس نے۔ یقیناً..... اس کی بھی کوئی پر سنائی
ہے..... وہ کسی مال دار لڑکی کا شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔

”اب تم اس احمق کی اسٹوڈیسی بات پر غور کرتے رہو گے جلدی سے سوچو کیا کرنا ہے..... وہ ٹھیک کہہ رہا ہے
ہمیں پہلے پولیس اسٹیشن جانا چاہیے۔ اور یاد رہے کار میری نہیں سفینہ کی ہے..... میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج اچھی سی
کارڈرائیو کروں..... اس کی کار آٹو ٹیک ہے..... میری کار کالج بہت ہارڈ ہو رہا ہے..... لنگ ڈرائیو کرتے ہوئے
پاؤں میں اور وہ جاتا ہے۔“ زارا آف موڈ میں ساحل کے دماغ میں دھماکے کرنے لگی۔

”بیگم سفینہ کی کار..... اور..... تو بہت expansive کار ہے..... ہم نے لاسٹ امیران کی

برتھ ڈے پر گفٹ کی تھی۔ ساحل کو اب صبح معنوں میں بڑا زور دار جھٹکا لگا تھا..... اسے تاجور کے گھر کے پورچ میں کھڑی تمام گاڑیوں کے بارے میں معلومات تھیں..... کیونکہ گاڑیوں کے ٹیکس جمع کرانا بھی انہی کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔

”میرے ہینڈ بیک میں میری کار کی کاڈ نثر فائل تھی..... سفینہ کی کاڈ نثر فائل تو گھر میں ہی ہے۔“ زارا کو اب بہت شدت سے رونا آرہا تھا۔ بہت مشکل سے خود کو کنٹرول کر رہی تھی۔

”ہینڈ بیک بھی گیا.....؟ اوہ..... گاڈ.....!“ ساحل کے منہ سے تاسف بھرے کلمات نکلے۔

”ظاہر ہے، تب ہی تو گاڑی کے سیل سے فون کیا تھا۔“ زارا جھلائی۔

”اوہ مائی گاڈ..... آپ کا آئی فون بھی گیا۔“ ساحل کو ایک اور دھچکا لگا..... اب زارا نے خون آشام نظروں سے ساحل کی طرف دیکھا۔

”اب یہاں کھڑے، کھڑے فاتحہ پڑھتے رہو گے..... کوئی ٹیکسی روکو..... یا اپنے سیل سے فون کر کے..... انکمپ بلاؤ.....“ وہ پھاڑکھانے کو دوڑی۔

”سوری میم..... یہ میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔ آپ کو ای بایک پر بیٹھنا ہوگا۔ سوری ٹو سے“ میں آپ کی کہنی میں ملازم ہوں ہوم سرونٹ نہیں ہوں۔ میں آپ کی مدد کو انفارم کر دیتا ہوں بس یہی میری ڈیوٹی ہے۔“ ساحل نے اچانک پینٹر ابدل کر بڑی انا کا مظاہرہ کیا تھا۔

”مگر یہ تمہاری اخلاقی ذمہ داری بھی تو ہے نا۔“ زارا اس کے بدلے ہوئے انداز پر حیرت و غصے کی کیفیت میں ریوئل کر رہی تھی۔

”ظاہر ہے اس کے لیے یہ بایک حاضر ہے..... آپ کو نہ کندھے پر اٹھا رہا ہوں نہ پیدل لے جا رہا ہوں۔“ اس نے بدستور ای انداز میں کہا۔

”میرا خیال ہے میم کو فون پر انفارم کرنا ٹھیک نہیں۔ ان کی بہت اہمورنٹ میٹنگ چل رہی تھی۔“

”چلیں پہلے درخشاں چلتے ہیں۔“ اس نے نزدیکی پولیس اسٹیشن کے حوالے سے کہا۔

”کیوں فضول باتیں کر رہے ہو..... ہم درخشاں کیوں جائیں؟“ زارا ہندیانی کیفیت میں جھلا ہو چکی تھی..... بے سوچے سمجھے ہی پھٹ پڑی۔

”میں پولیس اسٹیشن جانے کی بات کر رہا ہوں..... یہ علاقہ غالباً درخشاں پولیس اسٹیشن کی حدود میں آتا ہے، چلیں میڈم۔“ ساحل شام کی مائل بہ رخصت نرم دھوپ میں چمکتے زارا کے چہرے کی طرف جی بھر کر دیکھ رہا تھا..... یہ لمحات بہت من چاہے تھے، کوئی اس کے ”دیکھنے“ کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

کار چھن جانے کی خبر سنا کر گھر کی طرف توجہ نہیں تھا۔ اتنے رئیس لوگوں کی قیمتی کار کا جانا تو اس کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسے بہتے سمندر سے ایک بالٹی پانی بھر کر کوئی چلتا بنے..... پریشان چہرے کی گلابیاں، تیز روشنی کی وجہ سے مندی، مندی آنکھیں، اڑتے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتی..... جی چاہا رہا تھا کہ اس کی فوراً کچھ تصویریں اتار لے اور فرصت کے لمحات میں کسی دلنواز شاعری کی طرح پڑھا کرے۔

”اب کیا میری شکل دیکھتے رہو گے..... بایک اشارت کرو.....“ زارا کا اب قدرے پرسکون ہونے کے بعد دل کھول کر رونے کا جی چاہ رہا تھا۔ تاجور کی متوجع جھاڑ جھپاڑ تیشی کار سے محرومی کا احساس سفینہ کے سامنے

شرمندگی کا مرحلہ..... اور پھر اس پر مسز او سائل کی اس بائیک پر سفر کرنے کا تصور جس کا ایک دن پہلے وہ جی بھر کر مذاق اڑا چکی تھی۔ سائل نے روانگی کا عندیہ پاتے ہی بائیک کو لگا لگانا شروع کر دی۔ دو تین گگ سے اشارت ہونے کا تو سوال ہی پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ زارا نے سائل کی طرف سے یوں پشت کر لی جیسے وہ کسی اسٹاپ پر کھڑی وقت سے آنے والی بس کا انتظار کر رہی ہو۔

اللہ، اللہ کر کے بائیک اشارت ہوئی۔ سائل فوراً بیٹھ گیا اور زارا کو متوجہ کرنے کے لیے ہارن دیا۔ ہارن کی آواز بھی اتنی نازک تھی جیسے کوئی شرمیلی دلہن دو لہا کے اصرار کے بعد لب کشائی کرے۔ زارا نے چونک کر دیکھا پھر طوعاً و کرہاً قدم بڑھائے..... اپنا جدید تراش کا کھلا ڈھلا لباس سنبھالا..... بیٹھتے ہی اڑتے بالوں کو قابو کرنے لگی تو گرتے، گرتے پئی۔ دھب سے دونوں ہاتھ سائل کے کندھوں پر جا پڑے۔

بائیک انجن پر دوڑ رہی تھی مگر سائل ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اُف کیسی جانفزا روح پرور اور شخیل پرفیوم کی مہک تھی جو اس نے کسی tester سے بھی نہیں سونگھی تھی۔

زارا نے گھبرا کر اپنے ہاتھ ہٹائے تو تھے مگراڑتے بال اتنا تنگ کر رہے تھے کہ مجبوراً اسے ایک ہاتھ سائل کے کندھے پر مستقل رکھنا پڑا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ بال سنبھال رہی تھی۔

سائل جان بوجھ کر اس انداز میں بیٹھا تھا کہ زارا کے حصے میں بہت کم جگہ آئی تھی۔ لامحالہ وہ سائل کے ساتھ چپکی نظر آ رہی تھی۔ سائل سوچ رہا تھا کہ کار loss سے اتنے قیمتی لمحات ملتے ہیں تو کبھی، کبھی ایسے نقصانات ہو جانے چاہئیں۔

”آہستہ چلاؤ میں گرجاؤں گی.....“ بڑھتی اسپید سے زارا بری طرح گھبرائی۔

”نشہ پلا کے گرانا تو سب کی آتا ہے

حزہ تو یہ ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی“

سائل نے بلند آواز سے شعر پڑھا تھا جو اچھا خاصا تو ہوا کے زور پر اڑ گیا اور زارا کے سر سے گزر گیا۔

”زور سے پکڑ لیں مجھے ہی..... جیسے وارد ہے کو پکڑتے ہیں کہ جانے نہ پائے۔“ سائل اس وقت درحقیقت نشے میں تھا..... وہ جسے دور، دور سے دیکھ کر تمنائیں بھل جاتی تھیں آج اس سے چپکی بیٹھی تھی۔

”تمہیں کیوں پکڑوں؟ تم اسپید آہستہ نہیں کر سکتے؟“ وہ بائیک کے شور کی وجہ سے چلا کر بولی۔

”تو پھر گر کر دکھائیں..... میں آپ کو اٹھا کر دکھاتا ہوں۔“ سائل نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔

”ویکھنا..... میں اماں کو بتاؤں گی..... تم بہت اوور ایکٹنگ کر رہے ہو۔“ زارا نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔

”کیا، کیا بتائیں گی اماں کو..... میرا خیال ہے پہلے تو وہ آپ کو اچھی طرح بتائیں گی..... شور بچانے کے بجائے وعائیں کریں کہ گاڑی اچھی کنڈیشن میں بازیاب ہو جائے۔“ اس نے پھر بلند آواز میں مشورے سے نوازا تھا۔

زارا.... غصے کی شدت سے توازن کھونے لگی۔ اس سے پیشتر پھسل پڑتی اس نے بے اختیار کیفیت میں سائل کی کمر کے گرد بازو کا گھیرا ڈال دیا..... قربت حد سے بڑھی تو سائل پر سچ سچ شعرا ترنے لگے۔ جوان لڑکی کے وجود کی گرمی نے جذبے اور عمر دونوں میں اضافہ کر دیا۔ ہونٹوں پر بڑی شریسی مسکراہٹ تھی۔

زارا کی آنکھوں میں بے بسی کی کیفیت نے آنسو بھر دیے تھے۔

”اسے تو میں بہت اچھی طرح بتاؤں گی۔“ زارا اس بائیک سے اتر جاؤں۔“ بدلہ لینے کے جذبے نے اس

☆☆☆

”زارا کو لینے گیا ہے.....؟ کہاں سے لینے گیا ہے؟ اس کے پاس تو اپنی گاڑی ہوتی ہے۔“ تاجور حیران پریشان سیتا کی طرف گھورتے ہوئے سوالات کرنے لگیں۔

”مجھے نہیں معلوم میم..... مس زارا کی کال آئی تھی۔ وہ بہت زیادہ ڈسٹر بڈ لگ رہی تھیں۔ کار اور ڈائیور بیجے کا بول رہی تھیں۔“ لفظ ڈسٹر بڈ سن کر تو تاجور اذہد پریشان ہو گئیں۔ جلدی سے اپنا سیل فون اٹھایا اور زارا کا نمبر ملانے لگیں۔ سیل کان سے لگایا تو پتا چلا وہ پاور آف ہے..... پریشانی مزید بڑھ گئی جلدی سے ساحل کا نمبر ملانے لگیں۔ سیتا بغور دیکھ رہی تھی اور اسے گلے حکم کی خطر تھی۔

”زارا کا سیل آف ہے، ساحل کال نہیں لے رہا..... کیا مصیبت ہے؟“ انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے سیل بچھنے کے انداز میں ٹیبل پر رکھ دیا۔

”تم جا کر اپنا کام کرو..... میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ ٹرائی کرتی ہوں۔“ انہوں نے سر پر مسلط سیتا کو توبھلایا۔ سیتا سر جھکا کر روم سے باہر چلی گئی۔

”کوئی ڈھنگ کا رشتہ مل جائے تو میں سفینہ سے پہلے اس کی شادی کروں..... ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ اتنا بڑا بزنس سیٹ اپ سنبھالوں..... یا اس لڑکی کو.....؟“ وہ پریشانی و غصے کی کیفیت میں خود کلامی کر رہی تھیں۔

☆☆☆

”اللہ سائیں نے جب اتنا نوازا ہے تب ہی تو آپ نے اپنی بیوی کو اتنی قیمتی کار لے کر دی ہے۔ ایک ڈرائیور کیوں نہیں رکھ لیتے ان کے لیے؟“ ایس ایچ او پلکیں جھپکائے بغیر دونوں کو یوں گھور رہا تھا جیسے اس نے وارداتیوں کو رنگے ہاتھوں خود پکڑا ہو۔

پولیس ڈیپارٹمنٹ کے دیکھنے کا انداز عام لوگوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نظری نظر میں ہمہ مقابل کی روح کا ایک سرے نکال رہے ہوتے ہیں۔ ٹھکی نظریں بڑی پھرتی سے طواف کر رہی ہوتی ہیں۔

ساحل کی جیب سے کیا گیا تھا وہ تو بہت ہلکا پھلکا تھا..... زندگی میں آنے والے ان قیمتی لمحات سے پورا، پورا حظ اٹھا رہا تھا۔

ایس ایچ او کا مکالمہ سن کر پہلے تو زارا قدرے گھبرائی پھر فوراً غصے میں آگئی۔

”ایکسکیوز می آفسیر.....!“ اس نے وضاحت کرنا چاہی۔ ساحل نے اپنا پاؤں آہستہ سے زارا کے پاؤں پر رکھ کر اسے بولنے سے باز رکھا۔ زارا نے چونک کر ساحل کی طرف دیکھا۔

”میں تو کب سے کہہ رہا ہوں کہ ڈرائیور رکھ لیں..... ان روڈوں پر ڈرائیور کرتے ہوئے مردوں کے میٹر گھوم جاتے ہیں..... عورت تو پھر صنف نازک ہے یہ وہی یا امریکا کے روڈ تھوڑا ہی ہیں۔ بیوی دیکھ کر، کار، سائیکل، گدھا گاڑی سب ایک ہی روڈ پر دوڑتے ہیں پورے دو سو سال پیچھے ہیں ہم ایڈوانس دنیا سے..... انجن کے سامنے گدھا چل رہا ہوتا ہے۔ گدھے کی ٹرمز اینڈ کنڈیشنز پر ڈرائیور کرنا پڑ جاتی ہے۔“ ساحل کی بات پر ایس ایچ او کو خود پر اختیار نہ رہا۔ بڑا زبردست قہقہہ فضا میں ابھرا تھا۔

”گڈ..... ماشاء اللہ..... بہت زبردست لائف پارٹنر ملا ہے آپ کو میم..... ایسے لوگ تو پور نہیں ہونے دیتے۔ بہت دلچسپ گفتگو کرتے ہیں۔“ اس سے پیشتر کہ زارا غصے میں الٹ بڑنی..... ساحل فوراً بول پڑا۔

”ٹھیک یودیزی سچ سر ہے۔“
 ”پولیس اپنی ہی پوری کوشش کرے گی..... ویسے جب اتنی قیمتی کار رکھتے ہیں تو تھوڑا سا خرچہ سیفٹی کے لیے بھی کر لیتے ہیں۔ کار چھن بھی جائے تو شہر سے باہر نہیں جاسکتی۔“ ایس ایچ او نے پھر مفت مشورے سے نوازا۔
 ”اکیچھ کلی سربات یہ ہے۔“ زار نے لب کشائی کی تو ساحل پھر ٹل ہوا۔
 ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ کی محنت و کوشش سے کار مل جائے تو سب سے پہلا کام یہی کریں گے..... انشاء اللہ۔“

اب زار نے تھلا کر ساحل کی طرف دیکھا تھا۔
 ایس ایچ او جانے کیا سمجھا اس نے فوراً گھنٹی بجا کر سپاہی کو طلب کیا..... سپاہی جن کی طرح پلک جھپکتے ہیں حاضر ہو گیا اور جم کر سیلوٹ کیا۔
 ”لال خان بخر کے ساتھ نکلا ہوا تھا..... دیکھو وہاں آیا یا نہیں.....؟“ آرڈروے کر ایس ایچ او پھر دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”ہمارا ہیڈ مقرر باہر نکلا ہوا ہے..... آتا ہوگا وہ آپ کی ایف آئی آر کاٹے گا..... آپ لوگ چائے لین گے یا شہنشاہ۔“ ایک حسین، خوش لباس، مال دار مہکتی ہوئی دو شیرہ سامنے ہو تو بہت سے مرد زندگی میں پہلی بار بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ زار کا موڈ از حد خراب ہو چکا تھا۔
 ایک غریب سانچے جس کی پچھری بائیک پر بیٹھنا کسی جرم کی سخت ترین سزا کے برابر تھا اس ایس ایچ او کی آئی سیٹ اتنی کمزور تھی کہ وہ ایک رئیس زادی اور عام سے ملازم میں فرق بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے دو شتر وہ انکار کرتی ساحل پھر بول پڑا۔

”سر چائے پلو ادیں..... سر میں درو کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ ابھی تو پتا نہیں کتنی خوری ہوگی۔“
 ساحل نے نام کو بھی تکلف نہیں فرمایا تھا۔ پولیس اسٹیشن میں اس وقت مفت طے والی چائے کی پیالی کی بھی بہت اہمیت تھی۔ باہر نکل کر کوئی ہوٹل سے بھی پیتا تو جیب سے پندرہ روپے تو دودھ پتی کے دینا ہی پڑتے۔
 زار کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کونے میں پڑی 1857ء ماڈل کی کرسی اٹھا کر ساحل کے سر پر دے مارے۔

☆☆☆

”سینکڈ ورلڈ وار میں برطانیہ کا بہت بڑا حصہ ہے..... دنیا بھر پر سارا لمبہ ڈالتی رہی ہے، اسے جنگ کا ذمے دار قرار دیا جاتا رہا ہے۔“ لیڈی صوفیہ ایک دفعہ پھر ماضی کنگال رہی تھیں۔
 ”مگر ہسٹری میں یہ بات نقش ہو چکی ہے مائی سن وہ بھی پتھر پر پڑے نشانوں کی طرح کہ برطانیہ نے 1919-20ء امن معاہدے کے بعد یورپی معاملات سے نظریں چرائیں..... امن کے قیام میں اپنا حصہ نہیں ڈالا پھر میں اس سر زمین سے کیوں محبت کرتی.....؟ جنگ سے بچنے کے لیے کچھ نہیں کیا جب جنگ مسلط ہو گئی تو معصوم لوگوں کو آرام وہ گھروں سے نکال کر لڑنے مرنے کے لیے محاذوں پر بھیج دیا اور جنگ کے بعد راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ کر امن کی باتیں ہونے لگیں۔ بس پھر میں اپنے بچوں کو لے کر پاکستان آ گئی۔ مسٹر جناح کی پرسنالٹی غضب کی گئی..... لگتا تھا کہ جناح زمین پر کوئی جنت بنا رہا ہے..... پاکستان آ کر لگا جیسے دوزخ سے نجات پا کر جنت میں آ گئی ہوں۔“ یرنس کچھ در قبل سوئنگ سے فارغ ہو کر لان میں فزڈٹ کا کٹیل کھانے میں مصروف تھا۔ لیڈی صوفیہ زمین آسٹن کا ٹاول ہاتھ میں لیے بولتی ہوئی اس کے سر پر آئیں۔

چند فورم کے قاصدے پر نوکر مستعد کٹر پرنس کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔
 ”گرینڈ مام..... پلیز.....“ پرنس نے کاک ٹیل باؤل لیڈی صوفیہ کی طرف سرکایا۔

”تو تھینکس..... میں نے عصر کی نماز کے بعد فریش جوس لے لیا تھا۔“ انہوں نے بد مزہ ہو کر معذرت کی وہ کچھ خاص باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں مگر پرنس ان کے ماضی کے درپچوں کو بڑی سمجھداری سے بند کرتے ہوئے انہیں کھانے پینے کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

”آج تم بہت مصروف رہے..... میں تمہیں ایک گڈ نیوز سنانے کے لیے بے چین ہوں.....“ لیڈی صوفیہ نے ناول میں نشان لگا کر پرنس کی طرف دیکھا اور ناول ٹیبل پر رکھ دیا۔

”گڈ نیوز..... جلدی سے سناؤ گریڈ مام..... بہت دن ہو گئے کوئی گڈ نیوز ہی نہیں سنی۔“ پرنس نے ڈبے سے ٹشو کھینچتے ہوئے بڑی دلچسپی ظاہر کی۔

”میں نے تمہارے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔“ انہوں نے بہت فخریہ انداز میں دھماکا کیا..... پرنس کے لیے تو یہ دھماکا ہی تھا۔

”کیا یہ مذاق ہے.....؟“ پرنس نے بے یقینی کی کیفیت میں مسکرا کر دیکھا۔

”میں سنجیدہ ہوں..... اور تم میری بات غور سے سنو۔“ لیڈی صوفیہ نے قدرے برا منانے کے انداز میں جواب دیا۔

”آج میں اتفاق سے اپنی مرحومہ دوست کے گھر چلی گئی۔ اس کی تینوں پوتیاں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں، تینوں کے ملا کر دس بارہ بچے ہیں..... وہاں میں نے ایک لڑکی پسند کر لی ہے وہ ان تینوں میں سے کسی کی بیٹی نہیں بلکہ ایڈاپنڈ ہے۔ پرشین ہے۔ بے حد حسین جیسے اسے تمہارے برش نے تخلیق کیا ہے۔“ لیڈی صوفیہ کسی گہرے خیال میں ڈوب کر بولتی جا رہی تھیں..... پرنس حیرت سے لب بستہ بس انہیں دیکھنے پر اکتفا کر رہا تھا۔

”اس بچی کا ایک گراؤنڈ بہت اسٹرونگ ہے، یقیناً اس کے DNA میں مستقبل کی بہت شاندار..... بہت گریٹ تصویریں چھپی ہوں گی۔“

”مام..... جسٹ اے منٹ.....“ پرنس نے انہیں درمیان میں ٹوک کر اپنی بات کرنے کی کوشش کی۔

”پہلے میری بات کھل ہونے دو.....“ لیڈی صوفیہ کو دھارے میں روک لگانے سے روحانی تکلیف

ہوئی..... پیشانی پر ناگواری کی لکیں کھینچ گئیں۔ ”میں آنے والے دنوں میں اپنی نسل کو پھلتا پھولتا دیکھ رہی

ہوں..... میں چاہتی ہوں تم بہت سے عظیم انسانوں کے باپ کہلاؤ۔“

”تھینک یو مام..... مگر..... آپ تو میری شادی کسی غریب لڑکی سے کرنا چاہتی تھیں..... اچانک پروگرام بدل

گیا؟“ پرنس نے اپنی بات پہنچانے کا موقع بڑی صفائی سے نکال ہی لیا تھا۔

”وہ اڈاپنڈ چائلڈ ہے۔ جس کے ماں باپ بچپن ہی میں مرجائیں، اس سے زیادہ غریب کون ہو سکتا ہے؟“

لیڈی صوفیہ نے برہم ہو کر سوال کیا تھا..... اور فوک سے ایک پائن اپل کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ غصے میں بھول

گئیں کہ کچھ دیر قبل فردٹ کاک ٹیل کھانے کی آفر ٹھکرا چکی تھیں۔

”تو پھر میں بھی بہت غریب ہوں مام..... کیونکہ میرے پرنس بھی اس دنیا سے بہت جلدی چلے گئے تھے۔“

پرنس نے دھڑے سے مسکرا کر کہا۔ یہ سنتے ہی لیڈی صوفیہ غصے سے تھر تھر کاہنے لگیں..... اور اپنی جگہ سے کھڑی

”میں تمہاری سگی پرواوی ملیں، ملی تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے شاندار خاندان کا اثاثہ ہوں، نشانی ہوں، تمہارا اسٹیٹس سبیل ہوں۔ تم کیسے خود کو غریب سمجھ سکتے ہو؟“ وہ عجیب انداز سے بولیں۔ ”اس وقت تم نے مجھے بری طرح ہرٹ کیا ہے پرنس..... میں اکیلی، تنہا ہی تمہارا بہت بڑا خاندان ہوں۔“ لیڈی صوفیہ کو خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

پرنس بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”سوری گرینڈ مام..... مائی گرینڈ مام..... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا میں تو آپ سے جواب لے کر اپنا کنفیوژن دور کرنا چاہ رہا تھا۔“

”اوکے، اوکے.....“ لیڈی صوفیہ کی تمنا بہت زور آور اور شدید تھی انہوں نے بڑی سرعت سے پوتے کی معذرت قبول کر لی کیونکہ وہ مزید کچھ بتانے کے لیے بے تاب تھیں۔

دو پارہ نشست سنبھالی اور چند گہری، گہری سانسیں لیں۔ اس دوران پرنس کو اپنی بات کرنے کا سنہری موقع مل گیا۔

”لیکن میں نے تو اس لڑکی کو دیکھا ہی نہیں..... اس ٹاپک پر آپ سے کیسے برابر ڈسکس کر سکتا ہوں۔“

”میرا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ بے حد حسین ہے، اسے کوئی ریجیکٹ ہی نہیں کر سکتا۔ مرو کو دل بہلانے کے لیے اس کی پسند کی بہت سی عورتیں مل سکتی ہیں مگر شاوی خاندان بنانے اور شاندار نسل کی تیاری کے لیے کی جاتی ہے۔ میں تمہیں عشق کی آگ سے بچانے کا تہیہ کر چکی ہوں۔“ ان کا لہجہ حسی تھا۔

”میں اپنے خاندان کے اکلوتے اثاثے کو دکھوں کی دلدل میں نہیں دھکیل سکتی۔ دکھ اور محرومیاں عمر کی طرح سبز کرتے ہیں، خون میں اتر جاتے ہیں..... آنے والی نسلوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے..... تم اسے دیکھ کر بے پناہ خوشی محسوس کر دو گے، وہ تمہیں پا کر اپنی قسمت پر ناز کرے گی۔“ وہ اب اپنی طرف سے اسے خوشیوں کی ضمانت دے رہی تھیں۔

”صحت مند دماغ، مثبت رویے، انسانیت، عظمت..... دیکھو میں آنے والی صدیوں کو پلان کر رہی ہوں..... میرے بیٹے مجھے اپنے بچوں کو عشق کی دوزخ سے بچانا ہے۔ انسانی عقل کی حفاظت کرنی ہے۔“

”مام، اگر میں کسی کے عشق میں جتنا نہ ہوں لیکن کوئی مجھ سے عشق کرے، میرے عشق میں پاگل ہو..... اور مجھے پانے کے لیے جان دینے کے لیے بھی تیار ہو جائے؟ تو آپ کو اس عشق پر تو اعتراض نہیں ہو گا نا..... صرف اور صرف مجھے سوچنے والی، مجھے چاہنے والی..... ہاتھ اٹھا کر دعاؤں میں صرف مجھے مانگنے والی؟“ وہ سوالیہ نظریں سے ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”امپا سبل!“ لیڈی صوفیہ نے بڑی طراری سے قطع کلائی کی۔

”یہ خوبیاں تو صرف تمہاری گرینڈ مام میں ہی ملیں گی..... آج کے دور میں لڑکیوں کو یہ عظیم سعادت نہیں مل سکتی۔“ لیڈی صوفیہ کے انکار میں بڑی شدت اور اعتماد تھا۔

”اگر ایسی لڑکی کو آپ کے سامنے لا کھڑا کروں تو؟“ پرنس، وادی کی ”منتخب حسینہ“ سے نجات پانے کے لیے میدان کارزار میں ہتھیار تیز کر کے آخر کار اتر ہی گیا تھا۔

لیڈی صوفیہ خانزادہ کے لیے بڑا روح فرسا انکشاف تھا۔ چہرے پر پلکیں جھپکائے بغیر وہ مہوت سی پرنس کی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

www.paksociety.com
 طرف دیکھتی رہیں۔ بھاری کے آخری عشرے میں قدیم رگھو پتی عورت کے اعصاب بھی ولادہ کی تھکاوڑ سے
 اور ارادے کے باوجود فطرت کو ٹھکست دینے پر قادر نہیں تھی۔

اعصاب کی زندگی قائم رکھنے والا رقیق مادہ، خواب ٹوٹنے کے عمل سے بے انتہاست رفتاری سے بہاؤ کا عمل
 پر قرار رکھ پارہا تھا۔ اطلاعی نظام میں حد درجہ خلل واقع ہوا تو الفاظ گم ہو گئے۔۔۔۔۔ یادداشت کے کھڑکی، دروازوں پر
 دنگلیں دینے کی اہلیت جواب دے گئی۔ پرنس کو پردادی کا ایک ٹک ویکنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ان کے ردعمل کا
 بہت سکون سے انتظار کر رہا تھا۔

عام حالات میں تو وہ اپنی دھن میں رہتی تھیں بہت توجہ سے اس کی طرف بہت ہی کم دیکھتی تھیں۔۔۔۔۔ پرنس کے
 پردادانے پرنس پردہ جا کر بھی ان کی ذات کو اپنی مکمل گرفت میں لیا ہوا تھا۔
 وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔۔۔۔۔ بالآخر ان کی مغموم آواز ماحول میں مرتعش ہوئی۔

”آخر کسی نے جال ڈال کر تمہیں پھنسا ہی لیا۔“ وہ شدید صدمے کی کیفیت میں بہت بے ترتیب سانس لے
 رہی تھیں۔

”گرینڈ نام۔۔۔۔۔ آپ کی فیورٹ رائٹر Charlotte Bronte نے اپنی ایک اسٹوری میں بڑے
 کمال کا جملہ کہا ہے۔۔۔۔۔ اتفاق سے مجھے یاد آ رہا ہے۔۔۔۔۔“

”اولیں۔۔۔۔۔ وہ تو میری پیدائش سے بہت پہلے کی رائٹر ہے۔۔۔۔۔ mid nineteenth century
 میں تو اس کی ڈچھ بھی ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ البتہ اس کا کلاسک لٹریچر ہمارے گھر کی لائبریری میں ہمیشہ رہا۔“ لیڈی صوفیہ
 نے پرنس کا جملہ قطع کر کے نئی یادداشت کے روزن سے جھانکنا شروع کر دیا۔

”آپ وہ خوب صورت جملہ تو سنیں جو مجھے یاد آ رہا ہے۔“ پرنس کو ہر صورت ان کی پسندیدہ منتخب لڑکی سے
 شادی کرنے سے اپنا بچاؤ کرنا تھا وہ اٹھنے سے پہلے یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر دینا چاہتا تھا۔
 ”او کے۔۔۔۔۔ او کے۔۔۔۔۔“ گویا اجازت مل گئی۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی پرنس کی طرف بغور دیکھنے لگیں۔

”I am not a bird, and no net ensnares me. I am a free human
 being with an independend will“

ترجمہ: (میں کوئی پرندہ نہیں ہوں جو کوئی جال میں کر مجھے پھنسالے، میں ایک آزاد انسان ہوں، اپنے آزاد
 اختیارات کے ساتھ)

”تم Bronte کے خیالات کا پرچار اکیسویں صدی میں نہیں کر سکتے۔“ لیڈی صوفیہ تڑپ کر گویا ہوئیں۔
 ”معاف کیجیے گا گرینڈ نام۔۔۔۔۔ اکیسویں صدی کو دیکھ کر کہنے والے ایک بین کو آپ بیسویں صدی میں قید
 نہیں کر سکتیں۔“

پرنس کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔۔۔۔۔ آخر اس نے پردادی ہی کے فراہم کردہ ہتھیار سے جنگ جیتنے کی کوشش کی
 تھی۔ مناسب ہتھیار کا بروقت استعمال بہت موثر ثابت ہوا۔۔۔۔۔ لیڈی صوفیہ نے چند ثانیے کے سکوت کے بعد
 گہری سانس لی۔

”کون ہے وہ؟ آخر تمہیں کیسے یقین آیا کہ وہ تم سے عشق کرتی ہے اور یہ کہ تم اس کی زندگی میں آنے والے
 پہلے مرد ہو؟“ وہ سوچ، سوچ کر سوال پر سوال کرنے لگیں۔

”وہ بہت کم عمر ہے۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں کسی بچے جیسی سبے سناٹگی ہے، اس کی ہنس میں آبشاروں کی

دل ہے

میلوڈی ہے..... اس کی مسکراہٹ میں اولین صبح کے اچالے ہیں..... اس کی ذات میں سیما کی سی.....
 بلقاری ہے..... سچی بات ہے میں اگر اسے زنجیر سے باندھ کر نہ بٹھاؤں تو اسے پینٹ نہیں کر سکتا اس کا روف
 اسے نہیں بنا سکتا۔“ پرنس کو خود نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کچھ بولتا چلا گیا..... الفاظ کہاں سے اتر رہے تھے..... وہ کس
 کو بیان کر رہا تھا۔

لیڈی صوفیہ بہوت بیٹھی اس کی شکل تک رہی تھیں۔

”اوہ گاڈ، کیا عمر ہوگی اس کی..... یہ ضرور بتاؤ، اس لیے کہ بیس سال کا لگنے اور بیس سال کا ہونے میں بہت

فرق ہوتا ہے۔“

”ابھی ٹوکنٹی کی کہاں..... اندر ناٹکین ہے ابھی۔“ پرنس اپنی طبیعت کے برخلاف اتنے فرائے سے جھوٹ

بول رہا تھا جس پر اسے کوفت بھی تھی اور حیرت بھی..... لیکن اسے ایک adopted اور بیچاری سی لڑکی سے پیچھا
 چھڑانا تھا..... پردادی کو اس طرف سے حتمی طور پر مایوس کرنا تھا۔ ایک ایسی بیچاری سی لڑکی کبھی اس کا آئیڈیل
 نہیں ہو سکتی تھی۔

”اوہ گڈ.....“ لیڈی صوفیہ کی اب آنکھیں چمکنے لگیں۔

”اگر وہ سوئٹ سٹیشن کی ہوتی تو میرے لیے زندگی کی بہت بڑی خوش خبری ہوتی..... اس عمر میں لڑکی ذرا

modest (شرعی) ہوتی ہے آسانی سے خود پر کسی کو (حکومت) rule کرنے کی اجازت نہیں

دیتی..... بہر حال میں اس سے ملنا چاہوں گی..... وہ بھی جلد سے جلد تو پھر کب ملا رہے ہو؟“ لیڈی صوفیہ انتہائی

بوڑھی اور کمزور اعصاب کی عورت تھیں، بل میں بہت جذباتی ہو گئیں۔

نومبر 2016ء کا خوبصورت شمارہ ایک نظر میں



بے اعتنا

رشتوں کی ابھی دور کی سمجھنا یا اس دور کی بے اعتنائی جہاں منامہ پرستیاں
 عروج پر ہیں..... آذوقہ صفحات پر نشور ہادی کا خوبصورت تختہ

غلام بادشاہ

بلا کو خان کے عہد کا ایک ایسا باب جس کی گہرائی اور بکشی براسے
 جب تاریخ کا پر وہ دتیر سے دتیر سے بنا تو ایک الگ ہی دنیا کا
 احساس ہوا..... **الیاس سینا پوری** کا دلربا انداز

شیش محل

باپ اور بیٹی کے درمیان سرد جنگ کا دلچسپ احوال.....
اسما قادری کے قلم سے شیش محل کے رستوں کی جولیت کے ستر کا نظریہ

ماروی

حیرت انگیز واقعات اور کشمکش حالات سے مقابلہ کرتے مراد اور
 مانی کا جارحانہ انداز..... **محمی الدین نواب** کا شاہکار

منظر امام رضا کٹر شیر شاہ سید ضیا تنہا بلنگرامی

www.paksociety.com

اب پرنس کو نیا کام پڑ گیا..... برائل جواب نہ سوجھا تو کھڑا ہوا پھر نکلنے لگا۔ لیڈی صوفیہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”میں اس کا بہت تفصیلی انٹرویو لوں گی..... آخر میری نئی نسل کے فیوچر کا سوال ہے۔ کوئی معمولی بات نہیں۔“
اب وہ سر جھکا کر خود کلامی کرنے لگیں..... اس دوران پرنس کو جواب مرتب کرنے کا موقع مل گیا تھا۔
”ویسے اگر وہ ویل آف ہے اور تم سے عشق کرتی ہے تو نوٹس لینا پڑے گا۔ کیونکہ غریب لڑکی تمہاری دولت کے عشق میں جتلا ہو کر تمہیں پھنسانے کی کوشش کر سکتی ہے..... اس شہر میں بہت سی غریب لڑکیاں ہوں گی جو شارٹ کٹ سے ہائی جینٹری میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس لیے کہ مڈل کلاس لڑکے اگر لائق فائق ہوں تو ان کے پاس برائنٹ فیوچر ضرور ہوتا ہے..... پرنس نہیں۔“

”میں ابھی آپ سے کوئی پراس نہیں کر سکتا کہ آپ کو اس سے کتنی جلدی طواؤں گا مگر ایک دن آپ اس سے ملیں گی ضرور.....“ پرنس اتنی طویل بحث سے اکتا چکا تھا۔ مزید جھوٹ بولنے کا جذبہ بھی نہیں تھا۔ سو جان چھڑانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے، میں انتظار کر لوں گی لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میرا مطمئن ہونا بہت ضروری ہے..... اوپن ہارٹ سرجری ایک بار ہوتی ہے، میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اس نے اتنی طویل زندگی دی ہے تھوڑی سی اور چاہیے تاکہ میں اپنی بہو کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار سکوں۔“

”شیو رو پیسے بھی آپ کو ناراض کر کے خوشی منانا میرے نزدیک تو کرائم ہے۔“ پرنس نے پروا دی
کو اٹھتے ہوئے دیکھا تو لہجہ آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھ کر اظہارِ محبت کرنا ضروری خیال کیا۔

”God bless you“ دادی نے لرزتا ہوا ہاتھ پرنس کے سر پر رکھ دیا۔ ”اگر وہ سچ سچ تم سے عشق کرتی ہے تو تمہیں اسی سے شادی کرنی چاہیے..... ورنہ کسی اور کی بیوی بن کر اسے ساری زندگی دھوکا دیتی رہے گی..... اور تم اس کے پانچ چھ بچوں کے روحانی باپ بھی بن سکتے ہو۔ یہ بہت بڑا moral crime ہے اگر کوئی سمجھے۔“ انہوں نے جبریوں کی چار دیواری میں قید اپنی شرمگین نگاہیں پرنس کے چہرے پر جما کر قدرے لطیف انداز میں مسکرا کر کہا۔

پرنس دھیرے سے ہنس دیا۔

”مائی گریٹ مام.....“ اس نے اپنا سر لیڈی صوفیہ کے سینے سے ٹکا کر بے ساختہ کہا تھا۔

☆☆☆

”تم کس کی اجازت سے نئی کار روڈ پر لے کر گئی تھیں؟“ تاجور کا جاپان کا ٹور سر بر آن کھڑا ہوا تھا..... جس کے لیے انہیں بہت سارا ہوم ورک کرنا تھا..... اب یہ ایک نئی ٹینشن سامنے آگئی تھی۔ زارا جرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

”جسے تم بولڈ نہیں سمجھتی ہو، یہ اعلیٰ درجہ کی حماقتیں ہیں..... سب کچھ تمہارا ہی ہے..... میرا مطلب ہے تم دونوں بہنوں کا..... لیکن شغڈا کر کے کھانا چاہیے۔“ وہ نہایت برہم تھیں۔

”سفینہ نے پوزیشن لی تھی تو میں نے اسے نئی کار دلانے کا پراس کیا تھا..... تمہارے پاس تو پھر بھی اپنی کار ہے..... سفینہ تو کمر میں کھڑی پرانی سی کار سے بھی کام چلاتی رہی ہے، اسے اپنی اسٹوری کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک

سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

نہیں..... میرے کہنے پر اس نے بے شمار کاروں میں سے سلیکشن کیا تھا۔ تاجور کا بس نہیں چل رہا تھا سامنے کھڑی زارا کے ساتھ کیا کریں یا اپنا سردیوار پردے ماریں۔

”سوری اماں..... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔“ زارا کے حلق سے یہ مشکل آواز نکلی۔

”اتنا برا تو کوئی سوچنا بھی نہیں چاہتا۔“ تاجور شدید ذہنی تناؤ کا شکار ہو رہی تھیں۔ ”ستم بالائے ستم..... اس چھوکرے کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر آرہی ہو، ڈرائیور کو فون کرتیں تو وہ کوئی بھی گاڑی لے کر پہنچ جاتا۔“ یہ تو انہیں سیتانے بتایا تھا کہ ساحل اپنی بائیک لے کر زارا کو لینے گیا ہے۔

”اماں میں آپ کو ٹرائی کر رہی تھی..... مگر سیتانے بتایا آپ بہت اہم میٹنگ میں ہیں، فارغز آئے ہوئے ہیں۔“ زارا نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”لیکن تم سیتا کو بتا سکتی تھیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے..... وہ اتنی critical situation میں مجھ سے ڈائریکٹ بات کر سکتی ہے یا مجھ سے تمہاری بات کر سکتی تھی۔“ وہ جیسے کسی صورت زارا کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

”اماں..... ایف آئی آر کٹ گئی ہے..... انشاء اللہ کار جلدی مل جائے گی.....“ زارا نے بڑی سادگی سے تاجور کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”وہ جن کی دن سال پہلے کاریں چھن گئی تھیں یا چوری ہو گئی تھیں..... انہیں پولیس آج بھی تسلیاں دے رہی ہے۔ تم ڈرائیور کے ساتھ گھر جاؤ..... مجھے ابھی یہاں بہت کام ہیں۔“ تاجور نے اسی طرح خراب موڈ میں اسے وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ انٹرکام پر سیتا کو حکم دیا کہ وہ ساحل کو ان کے پاس بھیجے۔ زارا چپ چاپ جانے کے لیے پلٹ گئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آئی تو سامنے سے ساحل آتا دکھائی دیا۔ زارا نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا خون پی جائے گی۔

پولیس اسٹیشن میں جس طرح وہ اس کا شوہر بن کر بڑی ایفنی شنسی جھاڑ رہا تھا وہ کسی صورت معاف نہیں کر سکتی تھی۔ واپسی میں اس کی بائیک کی پھٹ پھٹ کے دوران پھٹ پڑنا مناسب نہیں لگا پھر سیتا کا بھی نون آگیا تھا وہ ساحل کو جلد آفس پہنچنے کی تاکید کر رہی تھی کہ میم تاجور دونوں کا انتظار کر رہی ہیں۔

ساحل اب اس چار دیواری کے اندر تھا جو زارا کی سلطنت تھی اور اسے اس کی اوقات کی یاد دہانی کر رہی تھی..... دوسرے باس نے طلب کیا تھا جب سخت گیر باس طلب کرتا ہے تو اللہ سے لو لگائی جاتی ہے۔ وہ طرح دے کر تیزی سے گزر گیا۔

پلٹ کر دیکھنا زارا کی شان کے خلاف تھا..... وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی مگر یوں جیسے آنکھیں پچھے چپک گئی ہوں اور وہ ساحل کی گردن دبوچنے کے لیے زاویہ طے کر رہی ہو..... موقع کی تاک میں ہو۔

”اگر اماں کو اس کی حرکتیں بتاؤں تو ابھی ایسے جا ب سے فارغ کر دیں۔“ وہ بدلہ لینے کے جذبے سے ادھ موٹی ہوئی جاتی تھی۔

☆☆☆

”تمہارا آئی کیو لیول بہت محدود ہے..... سوشل ایٹی کیٹس کا تمہیں نہیں پتا..... کتابیں چاٹ کر ڈگری لے لی..... چاہ مل گئی تو آنکھوں پر پٹی باندھ کر گلوٹو کے نزل کی طرح کام کرنے لگے..... تم یہاں سے کوئی بھی گاڑی

لے جاسکتے تھے..... ہمارے گھر کے کسی نوکر کے پاس یہ کنوینینس ہڈی کی بانیک نہیں ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زارا کا سوشل اسٹیٹس کیا ہے؟ اس نے کبھی ایمر جنسی میں بھی آٹو استعمال نہیں کیا..... تم کار میں بیٹھو گے تو ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھو گے۔ بیک سیٹ پر مالکان کے ساتھ نہیں بیٹھو گے۔“ تاجور صبح فجر سے متحرک تھیں، آفس میں تین اہم میٹنگز بھگتائی تھیں۔ لُج کرنے کا نام نہیں ملا تھا۔ سوچا تھا کہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد کچھ کھالیں گی مگر میٹنگ ختم ہوتے ہی سیتانے یہ ساری کھانا سادی۔

بائیس لاکھ کا نقصان، اتنی بڑی خبر خالی پیٹ اور تھکن سے چور حالت میں۔ انسانی فطرت کی بہت سی کمزوریاں ہیں..... ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے سے کمزور پرچی بھر کر دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے، کسی تکلف سے کام نہیں لیتا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں ضمیر کی لعن طعن پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو۔ شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے انسان بڑے، بڑے مرحلے بھی آسانی سے طے کر جاتا ہے..... دست درازی کر سکتا ہے، گالیاں دے سکتا ہے..... خودکشی تک کر کے دکھا سکتا ہے۔

”سوری میم..... میں جان بوجھ کر بانیک لے کر گیا تھا..... ایسا نہیں ہے کہ میں جلدی میں نکل گیا تھا۔“ ساحل اپنی اناؤ خودداری کے سفاکانہ فعل کے بعد بہت تحمل سے گویا ہوا۔

”جان بوجھ کر.....؟ مجھے سمجھ نہیں آئی۔“ تاجور نے بری طرح چونک کر دیکھا تھا۔
 ”میں کار ڈرائیور کر سکتا ہوں..... مگر میں کسی کی قیمتی کار چلانے کا رسک نہیں لے سکتا..... اتنی قیمتی کار کسی نے ہٹ کر دی یا میری اپنی غلطی کی وجہ سے ہٹ ہو گئی تو سوری..... میری پوری سیلری پلینٹی میں لگ جائے گی۔“ ساحل نے اب بہت اعتماد سے جواب دے کر جان چھڑانے کی کوشش کی۔

”تم ڈرائیور کو بھی لے جاسکتے تھے..... اسے مجھے چھوڑنے کے بعد اور کام ہی کیا ہوتا ہے؟“ تاجور نے اس کی معذرت کو غیر اہم و نامناسب قرار دے دیا۔

”آپ بھول رہی ہیں میم..... شفیق صبح سے فارم ہاؤس گیا ہوا تھا۔“ تاجور جیسی سادہ مزاج، صاف گو عورت ساحل جیسے ہوشیار، چوب زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔
 یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ واقعی شفیق فارم ہاؤس گیا ہوا تھا۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔

”ادکے..... بہر حال تم کسی بھی ایمر جنسی پموشن میں باہر کھڑی گاڑیوں میں سے کوئی بھی گاڑی استعمال کر سکتے ہو۔ آج سے تمہیں اجازت دے رہی ہوں۔“ اتنا گرم ہونے کے بعد ٹھٹھ مٹانے کی نیت سے اب انہیں کچھ تو اچھا سا کہنا تھا۔

”سوری میم..... am postgraduate اور ڈرائیور نہیں ہوں۔ کسی بھی ایمر جنسی پموشن میں، میں اپنی بانیک ہی استعمال کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے والٹ جیب سے نکالا اور ایک ایف آئی آر کی سلپ تاجور کے سامنے رکھ دی۔

”میم، ایف آئی آر کی کاپی ہے، اسے سنبھال کر رکھیے گا، آفس کے نمبرز اور آپ کا سیل نمبر پولیس ریکارڈ میں ہے.....“ تاجور نے گلاسز آنکھوں پر چڑھا کر اس ایف آئی آر کا متن پڑھنا چاہا۔ مگر یوں لگا صدقین نے ڈاکٹر اقبال کا کوئی خوب صورت شعر فنکارانہ انداز میں کیونوں پر نقش کیا ہوا۔ عجیب و غریب مگر صاف خوش عطا اندازِ تحریر..... ہر تیسرا چوتھا حرف طرف سے باہر کی طرف چھلکتا نظر آتا تھا۔

اس پر مسٹر اوڈی نذیر احمد کے مضامین والی اردو انہوں نے کار کا نمبر اور تاریخ پڑھنے پر اکتفا کیا اور سلپ

اپنے بیگ میں رکھ دی۔ پانچ لاکھ کے نقصان کو ہضم کرنے کے لیے کوشش شروع کر دی تھی۔ اس دوران ساحل سر جھکائے، مٹووب، خاموش کھڑا تھا۔ تاجور نے اس پر ایک سرسری نگاہ کی۔

”تمہاری ٹیبل پر بہت سی فائلز پہنچ گئی ہوں گی..... آج ہی سسٹم میں ڈال دو تو بہتر ہے۔ ورنہ کل کام بہت زیادہ ہوگا۔“ کام کی بات شروع کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اب آپ جا میں اور اپنا کام کریں عزت نفس کی کرچیاں وونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اس نے باہر کی راہ لی۔

”شاید لڑکوں میں اکڑ ہوتی ہی ہے۔“ تاجور اس کی پشت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

سیٹا جانے کی تیاریوں میں لگ چکی تھی، وقفے وقفے سے کھناک پٹاک کی آوازیں ابھرتی تھیں۔ لاکرز میں فائلیں اور ضروری چیزیں رکھ کر لاکڈ کرتی جاتی تھی۔

ساحل تیز رفتار بلکہ ورنہ اندر داخل ہوا، اپنی ٹیبل پر پہنچ کر زور سے ٹیبل کی سطح پر ہاتھ مارا۔ سیٹا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”یاران لوگوں کو ایسپلائی اور slave (غلام) میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔“ وہ اب کرسی دھکیل کر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

”آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں مسٹر ساحل.....؟“ سیٹا فکر مند ہو کر اپنا کام ہی بھول بیٹھی۔

”تو جنت کی بات تو کرنے سے رہا..... انہی لوگوں کی بات کروں گا جن کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔“ ساحل نے ہمتا کر جواب دیا تھا۔

”ہے بھگوان.....“ سیٹا مزید پریشان ہو گئی۔

”برے وقت میں ساتھ دینے والے کا احسان ماننا چاہیے کہ نہیں.....“ اب وہ سیٹا سے سوال کر رہا تھا۔

”آف کورس.....“ سیٹا نے بھی جواب دینے میں ویر نہیں لگائی۔

”ٹٹی پٹی لڑکی روڈ پر کھڑی تھی..... اسے ساتھ خیریت کے منزل پر پہنچایا ایف آئی آر کٹوائی..... ایک سانس میں تین ہزار جھوٹ بولے..... یہ کوئی آسان کام ہے۔“ ساحل نے بھڑاس نکال کر پھر سوال کر دیا۔

”ویری ڈیفیٹ کلڈ۔“ سیٹا نے کسی لگے لگے کے انداز میں ہمدردی کی، گھر میں مسئلے مسائل چھوڑ کر دفتر آنے والی عورت جو غائب دماغی کی وجہ سے دن بھر میں درجن بھر غلطیاں کرتی تھی اور سیکڑوں مرتبہ تباہی چاتی تھی۔

بار، بار اپنی عزت نفس کی چادر زنگ آلود سوئی سے رفو کرتی تھی۔ اس کو تو ظالم سرمایہ داروں کے خلاف رد عمل ظاہر کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کی تو تمام تر ہمدردیاں ساحل کے ساتھ تھیں۔

”چھ جگہ اپلائی کیا ہوا ہے..... ایک جگہ سے بھی کال آگئی تو شکل نہیں دکھاؤں گا ان لوگوں کو ہمارا خون پی، پی کر بزنس ٹائیگن بنتے ہیں..... صرف تیس دن کی دو وقت کی روٹی کے پیسے بھی پورے وے ویں تو کام کرنے والوں کا حق ادا کر دیں..... ہونہ.....“ وہ جی کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

”کیا سیلری ہوتی ہے بھلا..... وس ون پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے۔ لاجک کیا دیتے ہیں جو مال خرچ کرتا ہے اس کی مرضی چلتی ہے۔ مال خرچ کرتے ہیں تو مال بڑھاتے ہی تو ہیں..... اور مال کیسے بڑھتا ہے..... ہم جیسے ضرورت مندوں کا خون پی، پی کر..... وہ بولتے،

”پلیز کام ڈاؤن۔“ سیتا کی آنکھوں میں مارے ہمدردی کے نمی اترنے لگی۔

”تمہیں پتا ہے سیتا..... دنیا میں خونی انقلابات آنے کی کیا وجوہات تھیں؟“ اس نے پھر سیتا کو کمرہائے

امتحان میں بٹھا دیا۔

”میں نے لٹریچر پڑھا ہے، سوری ہسٹری نہیں پڑھی۔“ سیتا مارے شرمندگی کے ادھ موٹی ہونے لگی۔ اپنی

نااہلیت کا روح فرسا انکشاف جو ہوا تھا۔

”خون پینے، خون کا آخری قطرہ چوسنے کی وجہ سے۔ سرمایہ دارانہ سسٹم کی وجہ سے..... جس میں امیر، امیر

تر..... اور غریب، غریب تر ہوتا جاتا ہے۔“

”اب بھگوان.....“ سیتا بس اتنا ہی بول پائی..... اسے سائل پر بہت ترس آرہا تھا۔

وہ تصور کر رہی تھی کہ میم کے بند کمرے میں سائل کو شدید مینٹل ٹارچر سے گزرنا پڑا ہے۔

”پلیز سائل..... ریلیکس کریں.....“ وہ یہی کہہ سکتی تھی۔

”میرا خون کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔“ سائل نے وراژ کھینچ کر اپنی نوٹ بک نکالی..... جس میں وہ گاہے،

گاہے دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔ سیتا اب کھوج بھری نظروں سے سائل کو دیکھنے لگی تھی۔

سائل تیز، تیز لکیریں کھینچنے کے انداز میں قلم چلا رہا تھا۔

”resignation (استغاثی) لکھ رہے ہیں؟“ سیتا نے مصومیت سے سوال کیا۔ سائل سنی ان سنی کر کے قلم

چلاتا رہا۔ پھر سیتا کو شولڈر پر یک اٹھاتے دیکھ کر ایک دم بول پڑا۔

”جسٹ اے منٹ سیتا..... ایک ثواب کا کام کرنی جاؤ۔“ سیتا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پلکیں

جمپکائیں۔

”واٹ.....“ وہ قدم بڑھا کر اس کے قریب آکھڑی ہوئی اور نوٹ بک کی طرف دیکھنے لگی۔

سائل نے نوٹ بک اٹھا کر سینے سے لگائی۔

”اوں..... جوں..... ایسے نہیں..... میں سنا رہا ہوں۔ آپ سکون سے سنیں.....“

”اوکے.....“ سیتا اب کچھ، کچھ سمجھ رہی تھی کہ یقیناً وہ اشعار سنانے جا رہا ہے۔

”اے سلیمان کے ہد ہد

جا کسی ملکہ سبا کی خبر لا

پھر اس کا تخت اٹھوا کے لا

میرا اس سے نکاح پڑھوا

مجھے ذہنی تشدد سے نجات ولا

میرے خواب کو حقیقت بناوے مولا

ظالم کو ٹھکانے لگا میرے مولا“

اشعار پڑھ کر اس نے نوٹ بک میز پر زور سے بیخ دی..... سیتا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

”مسٹر سائل..... ذہنی تشدد کیا ہوتا ہے؟“

”چلو اب روانہ ہو جاؤ اپنے رام کے پاس..... میری طبیعت شعرا گل کر قدرے بہتر ہو گئی ہے۔“ اس نے چنگی بجا کر سینا کو اذن رخصت دیا..... وہ بھی اشارے کی منتظر تھی..... فوراً کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔ ساحل نے کہیاں ٹیبل پر نکا کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

☆☆☆

سفینہ اور ماہین کی مشترکہ لاہوری دوست انوشہ چوہدری کی انگیج منٹ تھی۔ دونوں نے انوشہ کو دکھا کر پریشان بھی لے لی تھی مگر سفینہ کو عین وقت پر یاد آیا کہ اس کے پاس تو روزانہ کے استعمال ہونے والے عام سے ڈریسز ہیں..... انگیج منٹ کے حساب سے تو کوئی ڈریس ہی نہیں..... ابھی تک کسی تقریب میں شریک ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

”افوہ..... سیدھی سی بات کو ایسا بٹا رہی ہو.....“ ماہین کو اس کا مسئلہ بتا چلا تو یوں گویا ہوئی جیسے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ”ابھی نکلیں گے تو راستے میں ایک بوتیک پڑتا ہے وہ ریٹ پر بھی ڈریسز دیتے ہیں..... بڑی بڑی celebrities ادھر آتی ہیں۔“

”ادہ.....“ ماہین نے تو واقعی مسئلے کا حل چنگی بجا کر نکال لیا تھا۔

”دوہن شرابی روم میں چھینچ کر لیٹا، اپنا ڈریس امانت کے طور پر وہیں سیل گرل کے پاس رکھوا دیتا۔“ ماہین کو یوں بھی بہت زیادہ ہلکا پھلکا رہنے کی عادت تھی..... کھٹ سے ہر پررنگی کٹھری زمین پر وے مارتی تھی۔ سفینہ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھ کر گویا شکر یہ ادا کیا تھا۔ اور پھر بڑی پھرتی سے بیڈ سے اتر گئی تھی۔

”بس اب تو مجھے کچھ نہیں کرنا انہی کپڑوں میں نکلتی ہوں۔“ اس نے مرر میں خود کو دیکھتے ہوئے ماہین سے تکلف کے ضمن میں رائے لی۔

”ہاں بابا..... اب نکل پڑو..... بوتیک میں بھی ایک گھنٹا الگ جائے گا۔“ سفینہ جلدی، جلدی ضروری چیزیں اپنے شوڈز بیک میں رکھنے لگی۔ ماہین بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ وہ مکمل تیار تھی۔ اس کے وارڈروب میں ایک ڈھنگ کا ڈریس لکل آیا تھا اس لیے اسے بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑی تھی۔

سفینہ نے بیک زپ اپ کیا کندھے پر لٹکایا اور قدم بڑھا دیے مگر ایک دم رک گئی۔

ماہین اسے آگے بڑھتا دیکھ کر اس سے پہلے کرے سے نکل چکی تھی۔ سفینہ آہستگی سے واپس مڑی..... اور بیک اس انداز میں ٹیبل پر رکھا گویا کرشل سنبھال رہی ہو۔

پھر آہستہ آہستہ چلتی بیڈ کے کنارے پرنگ گئی۔

ماہین کو بہت آگے جا کر اندازہ ہوا کہ سفینہ نے ابھی تک اسے فالو نہیں کیا۔ بھناتی ہوئی روم میں داخل ہوئی۔ سفینہ کو اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر غصے پر حیرت کی شدت غالب آ گئی۔

”ہیں، کیا ہوا.....؟ تم پھر بیٹھ گئیں۔“

”میں نہیں جا رہی.....“ دو ٹوک فیصلہ آ گیا۔

”آخر ہوا کیا.....؟ کیا پرنس کی کال آ گئی..... منع کر رہا ہے تمہیں؟“ ماہین تو جیسے غصے سے تاج ناچ گئی۔

اتنے اہتمام سے کیا گیا میک اپ پسینے سے خراب ہو رہا تھا۔

”میں کسی کی اترن کیوں پہنوں.....؟ وہاں کراچی میں کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔“

”اس ڈھیر کو پڑا ہے دو.....“ ماہین دانت میں رہی تھی۔

”ابنڈے بچے نکلیں گے اس ڈھیر سے۔ پھر ان کا بھی ایک ڈھیر بنا دیتا۔“ ماہین دھپ سے بیٹھ گئی۔

تم جاؤ..... میری وجہ سے اپنا پروگرام کیوں خراب کر رہی ہو؟“ سفینہ پر ماہین کی جھکی کا مطلق اثر نہیں تھا۔

”یہاں قریب میں براؤنڈ ڈور سز ملنا مشکل ہے اس لیے یہ مشورہ دیا تھا..... تا تم جو نہیں ہے۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے۔“ اس نے ماہین کی بات کاٹ دی۔

”کیا ٹھیک ہے؟“ ماہین ہونقوں کی طرح گھورنے لگی۔

”یہی کہ تم چلی جاؤ۔“ سفینہ اب آڑھی ترچھی بیڈ پر دراز ہو گئی۔

”میں تو نہیں جا رہی اکیلی۔“ ماہین نے پاؤں سے سینڈل اچھالے۔

”کم آن ماہین، کیوں اپنی شام خراب کر رہی ہو، اتنی اچھی تیار ہوئی ہو۔“ اس نے بچوں کی طرح چکارا۔

”آسٹریلیا بھی تو اکیلی جاؤ گی آخر.....“ اس نے بڑی مضبوط دلیل دی۔

”اکیلی کیوں جاؤ گی؟ اپنے ہز بیڈ کے ساتھ جاؤ گی۔“ ترکی یہ ترکی جواب آیا۔

جواب سن کر سفینہ اب خاموش ہو گئی جیسے لا حاصل بحث کو یہیں ختم کرنا چاہتی ہو۔

”اترن..... بڑی عجیب بات کر رہی ہو..... آج کل تو سب پہن رہے ہیں، شووز میں تو یہ روٹین کی بات

ہے۔“ ماہین خراب موڈ میں اپنی ہلکی، پھلکی جیولری اتارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”بس..... اپنی، اپنی نچر ہے..... مجھے used چیزیں پسند نہیں.....“

”اٹس اوکے..... تمہیں کس شے کی کمی ہے؟“ ماہین اپنا خراب موڈ سنبھالنے کی سعی بھی ساتھ،

ساتھ کر رہی تھی۔

”ویسے یار..... کچھ لڑکیاں شادی شدہ مردوں کو آئیڈیالائز کرتی ہیں، حالانکہ انہیں زیر میٹرنگ مین پروپوز

کرنا چاہتے ہیں۔“ سفینہ درمیان میں بول پڑی۔

”کوئی سائیکولوجیکل پرابلم ہوتی ہوگی..... مجھے تو دل بھی وہ چاہیے جو بالکل plain and blank

paper کی طرح ہو..... صاف شفاف..... نیٹ اینڈ کلین نہ دکھا ہوا..... نہ ستایا ہوا۔“ یہ کہہ کر سفینہ نے زور سے قہقہہ

لگایا تھا۔ ماہین کی شکل پر جو بد مزگی و بیزاری تھی وہ عجیب سی گد گدیاں کر رہی تھی۔

”موڈ ٹھیک کرو..... میں تمہاری پسند کا جنک فوڈ آرڈر کر رہی ہوں..... جتنا رینٹ ڈریس کا دینا پڑتا..... اس

سے آدھے میں ہم شاعر آرڈر کر سکتے ہیں۔“

”میں کھانے کی بھوکی نہیں ہوں..... ماسٹڈیو.....“ ماہین وارڈروب کی طرف جاتے، جاتے پلٹ کر کھانے کو

دوڑی۔

”میں تو اچھا سائنکشن انجوائے کرنا چاہتی تھی..... مگر تم نے سارے پروگرام کا بیڑا غرق کر دیا.....“ ماہین

کوفت بھرے لہجے میں بڑبڑائی۔

”ہاں تو..... اب بھی لیٹ نہیں ہوئیں..... تیار بھی ہو..... چلی جاؤ۔“ سفینہ اب ٹھیک سے لیٹ گئی تھی اور

آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو میں تمہارے بغیر کوئی گید رنگ انجوائے نہیں کر سکتی۔“ ماہین تیزی سے قریب آئی اور

سفینہ کا بازو بزدل بازو آنکھوں سے ہٹا دیا۔

”اپنے پیار کا اتنا احسان نہ جتاؤ..... آسٹریلیا جانچنے کی دیر ہے، دو تین بچوں کی ماما بن گئیں تو یاد دلانے پر یاد

آیا کرو گی..... سفینہ نے شرر مکرراہٹ کے ساتھ اسے گھورا۔

”جب کی تب دیکھی جائے گی..... ابھی تو تمہارے ساتھ ہی گزارہ کرتا ہے۔ اچھا چلو جلدی سے large pizza..... lazania ریشین سیلڈ، اٹالین سیلڈ..... کوئلہ کڑا ہی ووروغنی نان آرڈر کرو..... دو گھنٹے میں ڈلیور ہوگا..... مجھے تھوڑی دیر بعد بھوک لگنا شروع ہو جائے گی۔“ ماہین وارڈروب میں سرگھسائے مینو بتا رہی تھی۔

”یہ تم کتنے دن کاراشن منگوا رہی ہو؟“ سفینہ نے آنکھیں پھاڑ کر سوال کیا۔
”تمہیں معلوم ہے مجھے غصے میں بے تحاشا بھوک لگتی ہے..... یہ فائن تو تمہیں بھرنا پڑے گا۔“ ماہین نے قلعیت سے کہا تھا۔

”میری پاکٹ منی میں اتنی عیاشی کی گنجائش نہیں ہے..... ون ڈس بتاؤ۔“ سفینہ نے بھی فیصلہ سنا دیا۔
”بہن تو تمہاری پانچ ہزار کے لوٹ پر آٹو گراف لیتی ہے..... تم اپنی پیاری دوست پر ڈھائی ہزار خرچ نہیں کر سکتیں۔“ ماہین نے غیرت جگانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کی کوشش کی۔

”ہاں..... جب اماں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہوگی..... اور سنے گی بے حساب..... تو اسے رو، روہ کر اپنا 5000 کالوٹ یاد آئے گا..... اب تو اس کی ویلیو عید مبارک کے لوٹ والی ہے..... پتا چلے گا اسے۔“ سفینہ اب اوندھی ہو کر ماہین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنیوں کے بل پر آدھا جسم اٹھایا ہوا تھا۔ بالوں کا عارضی جوڑا کھل چکا تھا۔ بال بکھر کر دائیں، بائیں گرے ہوئے تھے۔ ذہانت سے چمکتی آنکھوں میں لطافت کے سنہری رنگ تھے۔ بھینچے ہوئے بھرے، بھرے ہونٹ، مسکراہٹ آنکھوں میں تھی۔ ماہین نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا..... پھر ایک ٹک دیکھنے لگی۔

”یہ تم کہہ رہی ہو؟ کس دل سے کہہ رہی ہو؟“
”وہ پانچ ہزار کالوٹ شاید کچھ عرصے بعد زارا کے لیے واقعی عید مبارک کالوٹ بن جائے۔“ سفینہ بولی۔
”مگر تمہارے لیے تو کوہ لور ہے۔“ ماہین اپنا ٹائٹ ڈریس بازو پر لٹکا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”بولتی رہو..... بولتی رہو..... یونہی نکلے لگاتی، لگاتی آسٹریلیا چلی جاتا۔“ سفینہ نے نظر چرا کر کہا اور سر نیچے میں گھسا دیا۔

”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ میری جان..... تم سے کہہ رہی ہوں۔“ ماہین نے قریب آ کر اس کے بال بکھیر دیے۔
مگر سفینہ نے سر نہ اٹھایا۔

”تم میرے سامنے دو مرتبہ پرنس سے ملی ہو اور پھر اس ملن کے بعد جو کچھ میں نے نوٹ کیا ہے وہ تمہارے فرشتوں نے بھی ضرور نوٹ کیا ہوگا۔ مگر جو میں سمجھ چکی ہوں وہ ابھی اس پر غور و فکر کر رہے ہوں گے۔“ اب ماہین دھپ سے اس کے قریب چپک کر بیٹھ گئی اور شریہ انداز میں اسے دھکیلنے لگی۔

”جاؤ تم اپنا کام کرو..... میں آرڈر کر رہی ہوں۔ جتنی فضول باتیں تم نے ابھی کی ہیں اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی اپنپرا منٹ ہے کمال کا۔“ سفینہ اسی طرح نیچے میں سرگھسائے گھسائے بول رہی تھی۔

”تمہارا ٹیمپرا منٹ کمال ہے۔ تمہارا سلیکشن بھی کمال ہے۔ اس کے پاس سیل فون نہیں ہوتا..... پاپا سے لینڈ لائن نمبر لے کر دوں؟“ سفینہ سیدھی ہو گئی اور سیل ریسٹورنٹ کا نمبر سرچ کرنے لگی۔ یوں جیسے بہری ہو آواز ہی نہ آرہی ہو۔ حالانکہ دل نے پھڑک کر کہا تھا..... دید نہ سہی شنید سہی..... چلو بات کرو کہ اس کی آنکھوں میں،

☆☆☆

پرنس شب خوابی کا ملبوس زیب تن کرنے کے ارادے سے ڈریسنگ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازے پر جانی بچانی دستک ہوئی..... اس نے وال کلاک پر نگاہ کی۔

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

”گرینڈ مام ابھی جاگ رہی ہیں؟“ اسے قدرے تشویش ہوئی کیونکہ وہ ڈز کے ایک گھنٹے بعد سو جاتی تھیں..... طبیعت کی خرابی کی صورت میں ان کے شیڈول پر اثر آتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

لیڈی صوفیہ اپنے شب خوابی کے آسمانی رنگ کے ملبوس میں بالکل چوکس اور تازہ دم کھڑی تھیں۔

”تھینک گاڈ..... تم ابھی جاگ پتے ہو؟“ وہ بہت غور سے پرنس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”پلیز کم ان.....“ پرنس کی آنکھوں میں بھی تجسس کے تاثرات تھے۔

”نہیں..... تم میرے ساتھ اسٹوڈیو چلو۔“ پرنس کے حساب سے بڑی انوکھی فرمائش تھی۔

”اسٹوڈیو.....؟ اس وقت، وہاں آپ کچھ بھول آئی تھیں؟“ وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

”نو، نو پلیز..... جسٹ کم..... ہری اپ.....“ وہ یہ کہہ کر پلٹ گئیں..... حتیٰ اور قطعی انداز کی وجہ سے پرنس کو

ان کے پیچھے جانا پڑا۔

گھر کے لاؤنج سے نکل کر سرخ بجزی کے کارپٹ پر چلتے ہوئے بڑے سے لان کے بائیں طرف پرنس کا

اسٹوڈیو قائم تھا وہاں پہنچتا تھا..... لیڈی صوفیہ اپنی چھڑی نکاتی خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ مگر پرنس

نے چند سیکنڈ میں انہیں جالیا..... اور ان کے پہلو میں چلنے لگا۔

وہ حیران تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے گرینڈ مام تین سو گز کا راستہ طے کرنے کے لیے تیار

ہوئیں۔

اسٹوڈیو میں ان کی خاص ساگوان کی لکڑی کی اونچی پشت والی کرسی کے علاوہ ذاتی استعمال میں آنے والی کوئی

شے نہیں تھی۔

”ابھی میں نے کوئی نئی اسکیپنگ یا پینٹنگ شروع نہیں کی گرینڈ مام..... آج کل میں مڈ ٹریسا کے کہے ہوئے

ایک خوب صورت موسٹ پیوٹی فل جملے پر غور کر رہا ہوں۔ ان کے اس حسین خیال کو رنگوں کی زبان میں پھیلا نا

چاہتا ہوں مدد کرتی ہیں۔

I am a little pencil in the hand of a writing God, who is

sending love letter to this world (میں تو لکھنے والے خدا کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پینسل

ہوں جو اس دنیا میں محبت نامے بھیج رہا ہے)

لیڈی صوفیہ نے کوئی رد عمل نہیں دیا..... ان کے انداز سے لگتا تھا وہ نیند میں چل رہی ہیں..... اور خود کو اکیلا

فرض کر رہی ہیں۔ پرنس کے لیے یہ گہری خاموشی چونکا دینے والی تھی کسی طوفان بلاخیز کی تمہید تھی۔

وہ پروادی کی رفتار کا پابند ہو کر قدم اٹھا رہا تھا..... حالانکہ وہ تیز چلنا چاہتا تھا کہ کسی طور، جلد از جلد مقصود تو

کھلے..... اسٹوڈیو کے منتظر چوبی دروازے پر پہنچ کر پرنس نے آہستگی سے ہنڈل متحرک کیا اندر داخل ہوتے ہی

ایک بہن سے درجن گہری برقی گتے روشن کر دیے..... پھر مزید روشنی بڑھائی..... وسیع و عریض اسٹوڈیو روشن ہوا تو

یہ کہیاں ہیں کہ دل ہے اس نے پلٹ کر اپنی پردادی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔ ان کی محسوس نظر سے جانے کیا کھوج رہی تھیں۔

”یہاں تو تمہارا abstract art پھیلا ہوا ہے..... وہ تم سے عشق کرتی ہے..... کمال ہے تم نے اس کا کوئی اسکاچ بھی نہیں بنایا۔“

”Oh, good God“ ایک حساب سے پرنس نے گویا سر ہی پیٹ لیا تھا۔
 ”گرینڈمام..... میں بھلا اسے کیوں اسکاچ کرتا..... وہ مجھ سے عشق کرتی ہے۔ میری اپنی تو کوئی خاص فیلنگو ہی نہیں ہیں۔“

”لیکن تم اسے اپنا ماننا تسلیم کر تو کر چکے ہو..... شادی لائف کا بہت بڑا فیصلہ ہوتا ہے۔ تم نے اسے یاد رکھا۔ مجھ سے شیئر کیا، اس کے عشق کو محسوس کیا۔ تم اس کا ٹوٹس لے رہے ہو۔ یہ گڈ فیلنگو ہی تو ہیں۔ معاملات بہت critical ہو چکے ہیں۔“ انہوں نے رک کر گہری سانس لی۔ ”میں بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔ صبح کا انتظار نہیں کر سکتی۔ ہر رات میرا سوٹا ایسا ہے جیسے میں موت کی نیند سونے جا رہی ہوں۔ تم ابھی..... اسے رف اسکاچ کرو..... میں دیکھنا چاہتی ہوں..... چونکہ پاسیبل نہیں ہے، ورنہ میں تمہیں کہتی میں آج سونے سے پہلے اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“ لیڈی صوفیہ خاصی جذباتی نظر آ رہی تھیں۔ خاصا وقت تنہائی میں گزارنے کی وجہ سے اچانک ان پر خواہش اور خوف نے غلبہ کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا جب سے پرنس نے ہوائی اڑائی تھی وہ تب سے صرف اسی ایک سکتے پر غور و فکر کرتی رہی تھیں۔

”کم آن گرینڈمام..... پلیز آپ ریٹ کریں..... آپ کا شیڈول ڈسٹرب ہو جاتا ہے تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے..... آپ کئی دن suffer کرتی ہیں۔“ پرنس انہیں بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرے پیارے بیٹے..... تم میرا مکمل خاندان ہو..... total asset (کل اثاثہ) میرا concern (تعلق) بنتا ہے وہ محض لڑکی نہیں ہے..... آنے والے دنوں میں اس خاندان کی بہتری بنانے کی..... وہ تم سے عشق کرتی ہے..... اوکے..... وہ غریب نہیں ہے..... correct لیکن اس کی شکل بھی بہت اچھی ہونی چاہیے۔ میں آج رات اس کا چہرہ آنکھوں میں بسا کر سونا چاہتی ہوں۔ تم تو پانچ منٹ میں کسی کا بھی رف اسکاچ بنا سکتے ہو۔ میں جانتی ہوں اچھی طرح سے۔“

پرنس آگے بڑھا..... اور پنسل انتخاب کرنے لگا..... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پردادی اپنی خواہش پوری کیے بغیر بستر پر نہیں جائیں گی۔ آج یہ سب کچھ غیر معمولی تھا۔

ہونے والی بہو کے تصورات کا اتنا شدید غلبہ تھا کہ انہوں نے کھانے کے بعد مرحوم دادا سے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ پرنس نے پرتولے..... تیاری پکڑی تو لیڈی صوفیہ مطمئن ہو کر اپنی کرسی خاص پر فردوس ہو گئیں۔ پرنس نے اسکاچنگ شروع کی۔

پرنس کی پشت لیڈی صوفیہ کی طرف تھی۔ وہ چھوٹے سے بچے کی طرح آنکھیں بند کیے ٹیک لگائے آرام وہ حالت میں بیٹھی تھیں۔

پرنس نے کسی دھیان سے چونک کر پلٹ کر پردادی کی طرف دیکھا وہ بہت پرسکون حالت میں جیسے کچھ بہت اچھا دیکھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ پرنس بے آواز ایک طرف بڑھا اور سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔

ماحول میں بانسری کی آواز سن کر ایک بہت پرانا گیت اپنے اثرات ڈالنے لگا۔ گانگیکہ کی آواز کے بجائے بانسری

www.paksociety.com
 کے ذریعے گیت کی دھن تیار کی گئی تھی۔ سُر بکھرتے ہی لیڈی صوفیہ نے ہل بھر کے لیے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں اور دوبارہ موند لی تھیں۔ لہا کے مشہور گیت کی دھن نے فضا بہت سحر انگیز بنا دی تھی۔

من ڈولے میر اتن ڈولے

میرے دل کا گیا قرار

کون بجائے بانسریا

بانسری کے سُردوں کے زور پر پرنس نے موڈ بنانے کی کوشش کی تھی مگر دل کی بانسری سے سُر پھوٹ کر نہیں دے رہے تھے۔ وہ معذرت کر کے پیاری پردادی کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی دادی کو صحت مند دیکھنے اور خوش رکھنے کے لیے وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ وہ تو اتنا حلیم و صابر شاید اسی مشق کی وجہ سے نظر آتا تھا۔ اس لازوال و فطری محبت کے رشتے نے تو اس کو نکھارا، سنوارا تھا۔ وہ اپنی عمر سے چالیس سال بڑا تھا۔

ایک دانشور عورت کے قیمتی تجربات نے اسے دنیا کی نگاہ میں بہت شاندار اور عظیم بنا دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انسان کی روحانی اذیت..... دوسری جنگ عظیم کے بعد جنگ کا لفظ لغت سے نکال پھینکنے کی تڑپ اسے اسی قیمتی رفاقت سے میر آئی تھی۔

وہ اپنی شعوری غلطی کی وجہ سے دادی کو اداس کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس نے محتاط انداز میں پنسل کیوس پر چلانا شروع کر دی..... پھر ایک کیفیت میں اتر کر اگلیوں میں دبی پنسل کو تیزی سے حرکت دینے لگا، دو سے ڈھائی منٹ کے اندر زارا کارف اس کے سامنے تھا جسے دیکھ کر وہ خود ہی چونک پڑا..... پلٹ کر دادی کی طرف دیکھا وہ ہنوز آنکھیں بند کیے لب بستہ منتظر بیٹھی تھیں۔ پرنس نے آہستگی سے شیٹ کیوس سے اتاری اور ایک طرف رکھ کر دوسری شیٹ کیوس پر لگادی..... اور پھر

گہری سوچ میں کھو گیا۔ ایک شوخ و چٹکل الزما ڈران، خود اعتماد، کم عمر و شیرازہ کو بلا ارادہ ہی بہت توجہ سے دیکھا تھا..... جو کھڑے، کھڑے پانچ ہزار کی قربانی دے رہی تھی۔ بہت کم عمر نظر آتی ہے۔ گریٹڈر کے آئیڈیل سے بہت ہی قریب..... سارا مسئلہ ہی یہی تھا۔

age factor بہت میٹر کر رہا تھا۔ آرٹ گیلری میں پرجوش سی لڑکی از سر نو متحرک نظر آئی..... رف اس کے منٹوں میں بن گیا۔

”آپ اسے دیکھ سکتی ہیں میم.....“ اس نے پلٹ کر بے خودی لیڈی صوفیہ کو متوجہ کیا۔ اعصابی کمزوری کی وجہ سے وہ اشارے میں غنودگی میں چلی گئی تھیں۔ پرنس کی آواز فضا میں جیٹ طیارے کے شور کے مصداق محسوس ہوئی۔ پہلے تو پلکیں جھٹک، جھٹک کر نیند کا تاثر خلط ملط کرنے کی کوشش کی پھر اپنا سفید نرم ہاتھ جس میں معمولی سی لرزش تھی پرنس کی طرف بڑھا دیا۔

پرنس نے شیٹ اتار کر ان کے ہاتھ میں تھما دی جسے لیڈی صوفیہ نے شیٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کے طرف پُرشوق نظروں سے دیکھا۔ زارا کی مسکراہٹ محسوس کر کے وہ خود بھی مسکرانے لگیں۔

(جاری ہے) WWW.PAKSOCIETY.COM
 ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 130 ﴾ نومبر 2016ء

آوازِ چال سوزی

تسلیمن منیر علوی

Downloaded From
Paksociety.com

”بابا جلدی اندر آئیں بارش ہونے والی ہے،
گھٹائیں گھر گھر کر آچکی ہیں۔“ ٹپ، ٹپ بوندوں کا
جلترنگ شروع ہوا۔ فضا میں سوندھی مٹی کی خوشبو
اڑی۔ میری آواز پر بابا نے تیزی سے اپنی کرسی اور
کتاب لے کر اندر کی طرف دوڑ لگائی، میں بھی مدد
کے لیے ساتھ ہی لپکی..... اور اب بادل ٹوٹ کے
برس پڑے۔ بابا نے ٹیرس کے شیڈ میں آکر ایک بلندو
پائپ لگا دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ پاکیزہ 131 نومبر 2016ء

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



”ارے شہانہ کہاں ہو، آج تو تہہ پڑی جی۔“
موسیات کو گلست سے دو چار کر دیا۔“ میں نے بابا کو
اندر لاؤنج میں لا کر سہارے سے بٹھایا۔ کپڑوں پر
پڑی بوندوں کو جھاڑا۔

”بابا آپ اس بات پر حیران نہ ہوں۔“ اب
میں قالین پر آلتی پالتی مار کر ان کے گھٹنوں سے لگی
بیٹھی تھی۔

”قصہ کچھ یوں ہے کہ جب ہم چھوٹے ہو
کرتے تھے تو ہماری نانی ای جب کبھی نیلے آسمان پر
بہت دور، دور اونچائی پر چیلین اڑتے دیکھتیں اور جس
بھی بہت ہوتا تو ہاتھ سے اشارہ کرتیں۔ دیکھو مٹی آج
بارش ہوگی تو ہم بھی آپ کی طرح حیرت کا اظہار کرتے
تھے مگر ایک گھنٹے کے اندر اندر میرا چھا جاتا، بادل برس
پڑتے اور وہ جھل جھل مچتی اور سارے بچے نظیر اکبر
آبادی کی کورس میں پڑھی نظم ”کیا کیا بچی ہے یاروں
برسات کی بہاریں، لہک، لہک کر گانے لگتے۔ آف
خدا یا بابا ایک تو بارش کی گرج چمک پھر ہم سب کا شور
کان: پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ چھپا چھپ چھلانگیں
مارتے چھوٹے بچے، کاغذ کی ناؤ بنا کر پانی میں چھوڑ
دیتے کوئی کہتا میری کشتی پہلے پار کر گئی میں جیت گیا۔
اسی چیخ و پکار میں بارش تو ختم جاتی مگر پر نالے شور
چماتے رہتے۔“

بچپن کی امیری نہ جانے کہاں کھو گئی دوست
جب بارش کے پانی میں میرے بھی جہاز چلا کرتے تھے
تو بابا آج نانی ای کا گر آزما یا اور وہ کامیاب
ثابت ہوا۔“ ابھی میں سانس لینے کو رکھی ہی تھی کہ بابا
نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے مگر برسات کی اصل بہار
اور اس کے لوازمات کہاں ہیں، برسات تو اس کے بغیر
ادھوری ہے۔“ پھر میری طرف شوخی سے دیکھا۔

”اوہ ہاں..... ٹھیک تو ہے بابا۔“ اور میں اندر
سر پٹ بھاگی..... کہ امی سے ٹکراتے، ٹکراتے بچی۔

”ذرا دیکھ کے کیا بولائی، بولائی پھر رہی ہو۔“ اب

جو سامنے نظر پڑی تو امی ٹرائی میں پکڑے، سموئے، پھٹی
سجائے (نازک سی ٹی کوڑی سے ڈھکی کپتلی جو نفاست سے
کشیدہ کاری سے آراستہ تھی) خراماں، خراماں چلی آ رہی
تھیں اُدھانی چڑی میں ان کا اترا اترا سا رنگ حسن سوگوار کا
سماں پیش کر رہا تھا۔

”آپ بابا کے پاس بیٹھیں، میں ٹرائی لے کر آتی
ہوں۔“ میں نے اپنے نمبر بڑھانے کی ایک ادنی سی
کوشش کی۔

”کوئی ضرورت نہیں اپنا حلیہ دیکھا ہے..... جا
کے کپڑے بدل لو، کیلے کپڑوں میں پھر رہی ہو، چھوٹی موٹی
تو ہو۔ ابھی چھینکیں مار رہی ہوگی۔“ میں نے نہ جانتے
ہوئے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ اور پیشانی پر آئی گلی
لٹ کو جھٹکے سے پیچھے کیا۔ چند بوندیں اڑ کر میرے
چہرے سے ٹکرائیں۔

”اونہہ جانے امی کیسے بابا کے دل کے بھید جان
لیتی ہیں اور میرے بھی دل کا چور فوراً بھانپ لیا۔ آف
ایک تو یہ یائیں..... ابھی ہم سوچ رہے ہوتے ہیں اور
وہ گر گزرتی ہیں۔“ اور میں اچھا کہتی ہوئی ہلٹی..... اور
وہ جی ورتا اپنی بیماری کے باوجود مجازی خدا کی خدمت
میں جا پہنچیں۔

مگر میں اپنا درد چھپانے پائی..... بال بناؤں کس
کے لیے..... ایک شخص جو مجھے چھوڑ گیا۔

وہ مارچ کا ایک عام سا دن تھا، زرد پتوں کا ڈھیر
آمد بہار کا ہتادے رہا تھا۔ ٹہنیوں پر نئے شگوفے سر
نکالے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ ایسے میں کاظم کی میری
زندگی میں انگری ہوتی ہے۔ امی کی کوئی پرانی دوست
کینیڈا سے آئیں تو ہمارے گھر کاظم (اپنے بیٹے) کے
ہمراہ آئیں..... اور مجھے فتح کر گئیں۔ انہوں نے تو
کمال یہ کیا اسی وقت پیار سے مجھے سمیٹ لیا۔

”ارے فیصو یہ تو آج سے میری بیٹی بن گئی۔“
میں نے سامنے بیٹھے ایک خوش شکل و خوش جمال
نوجوان کو دیکھا سو برقیں اور تک سک سے سجا میرے
دل کے آئین میں جا گیا۔ جلد ہی مجھے کاظم کے نام سے

..... آف خدایا..... اور زور سے ریسیور کر بیڈل پر دے مارا۔ میں دوڑ کر قریب پہنچی دونوں کی حالت دیکھ کر میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جب ذرا بابا کے حواس بحال ہوئے تو وہ میری زندگی کا الم ناک لمحہ تھا۔ جب میرے گناہ گار کانوں نے سنا کہ کاظم اب ہم میں نہیں رہے..... پھر تو فون کاٹ کر موبائل میسج کا تانا باندا بندھ گیا۔ بعد کو یہ معلوم ہوا کہ واش روم میں سلب ہو کر گرنے سے دماغ میں چوٹ آئی، بے ہوش ہو گئے فوری امداد نہ ملنے کی وجہ سے آکسیجن ختم ہو گئی۔ شام کو ساتھی نے دروازہ توڑا، پولیس آئی مگر میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ امی اس سانحے کے بعد دل کو روگ لگا بیٹھیں۔ میں نے یہ حالات دیکھ کر اپنے کو سنبھالا اور امی، بابا کی خاطر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ مگر لگتا تھا کہ ہم لوگ اندر سے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں..... امی اب ہارٹ ایک کے بعد بہت کمزور ہو گئی تھیں مگر بابا میری خاطر خود کو سنبھال رہے تھے۔ اور آج جب برسات میں مجھے یوں اجاڑ صورت دیکھا تو امی کہے بغیر نہیں رہ سکیں۔ اور میں تو امی کو بابا سے اتنا ٹوٹ کر پیار کرتے دیکھ کر اس سوچ میں تھی کہ ہم نے بھی تو ایسا ہی سوچا تھا کہ کاظم اور میں محبت کا تاج محل ایسے ہی تعمیر کریں گے۔ میرے والدین ایک مثالی جوڑا تھے خاندان، دوست احباب اور تمام جاننے والے حلقوں میں ان دونوں کو ہنسوں کے جوڑے کا خطاب ملا ہوا تھا۔

مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

(ہم کس خیال میں ہیں اور آسمان کیا سوچ رہا ہے)

آج صبح سے دل کی دھڑکنوں پر کنٹرول نہیں، میں نے اور امی نے تو بابا کی خاطر دوبارہ خود کو مصروف کر لیا۔ کئی جگہ جاب کے لیے انٹرویو دے چکی ہوں۔

اس نے آوارہ مزاجی کو نیا موڑ دیا

پا بہ زنجیر کیا اور مجھے چھوڑ دیا

اس نے آنچل سے نکالی میری گم گشتہ بیاض

اور چمکے سے محبت کا ورق موڑ دیا

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 133 ﴾ نومبر 2016ء

وابستہ کر دیا گیا۔ وہ ایم ایس کرنے امریکا جا رہا تھا اس لیے اصرار ہوا کہ جلد از جلد نکاح کے بندھن میں باندھ دیا جائے تاکہ کاظم دو سال میں پیپر تیار کر کے ساتھ دلہن لے جائے۔ بڑوں کی رضامندی سے یہ فرض بھی ادا ہوا۔ اب ہمارا تعلق اسکائیپ اور موبائل تک محدود ہو کر رہ گیا۔ دوریاں یوں قربتوں میں بدل گئی تھیں مگر آپ سوچ سکتے ہیں نکاح کے فوراً بعد کھینچنے اور سمجھانے کے دور سے دور ٹائم تو گزر جاتا کبھی وہ کہتا کہ ایک سال دیکھو گزر گیا۔ دوسرا بھی گزر جائے گا اب تم کاؤنٹ ڈاؤن شروع کرو کیلیڈر پر نشان لگا کر ہم کا آغاز کرو۔ ہم کیسے کہتے کہ کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس طرح رو دھو کر ہم نے سال گزارا بقول کسی کے رونا بھی ایک طرز گفتگو ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک آنسو ساری کہانی کہہ جاتا ہے۔ مگر کاظم سے ہم اٹھلا کر کہتے ”ہم کیوں اپنا خوب صورت کیلیڈر برباد کریں“ اور کن آنکھوں سے دیکھتے کہ جنوری گزرنے پر سرخ مار کر سے کر اس کا نشان ہم لگا چکے تھے۔ ”اچھا موبائل سے تصویر کھینچ کر کیلیڈر کی زیارت کراؤ.....“ اور ہم بے اختیار آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگے۔

کس مسافت کے بعد پہنچا

تیرے رخسار پر تیرا آنسو

کاظم نے ایک دن میری سوگوار آواز پر یہ شعر پڑھا تو بے اختیار میرا ہاتھ اپنے گالوں پر جا پہنچا۔

اب دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ دونوں

گھرانے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ستمبر

کا مہینہ بقول لوگوں کے سنگم بن کر نازل ہوا۔ امی اور بابا

باہر لان میں بیٹھے تھے گرمی شدید تھی پھر شاید گرمی

نا قابل برداشت ہو گئی تو دونوں اندر آ گئے۔ جب ہی

فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں راہداری سے گزری تو بابا

پریشانی کے عالم میں ایک ہاتھ سے گرتی ہوئی امی کو

سنبھال رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ریسیور تھا سے

کسی سے سوال و جواب کر رہے تھے۔

”وہ..... اچھا..... نہیں ایسا کیسے ہو سکتا“

طرح کھمکے تھے۔ کبھی گھنٹوں گہری سوچ میں غرق رہتے..... کبھی امی کی وارڈ روم کھول کر کھڑے ہو جاتے۔ مجھے لگتا کہ اب ان کو خود سے باتیں کرنا شاید اچھا لگتا ہے۔ پہروں خود کلائی کرتے، دیواروں کو حسرت سے گھورا کرتے۔ راتوں کو اٹھ کر امی کو آوازیں دیتے "شبانہ..... شبانہ۔" پھر چیخ پڑتے میں دوڑ کر آتی، ان کو پانی پلاتی سکون آور دوا دیتی..... تو ذرا دیر کو سو جاتے۔ میں جو تم بالائے تم کے بعد زندگی کو گھسیٹ رہی تھی مجبور ہوئی کہ بابا کو سنبھالنا ہے ورنہ تو وہ غم سے حواس کھو بیٹھیں گے۔ میری مددگار فورس اب فرح ہی تھی اس سے اصرار کیا۔

"ابھی تمہارا ہاؤس جا ب شروع نہیں ہوا تم کچھ دن میرے پاس آ جاؤ میں نے آنس سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔" بابا کی حالت بہت خراب ہو گئی میرے ہیڈ سم اور دکشن بابا کمزور اور لاغر ہوتے جا رہے تھے دو مہینے سے خوراک مختصر ہو کر برائے نام رہ گئی۔ وہ بیچاری دوڑی چلی آئی..... اب ہم دونوں نے بھاؤ سنبھال لیا۔ کبھی وہ بہانے، بہانے سے پھل کھلاتی اور ایک دن تو خوشہ انگور کو ایسے کمال سے ایک، ایک دانہ گھما، گھما کر کھلایا، یہ دیکھیں انکل..... یہ دانا بہت میٹھا ہے۔ اور پھر دو تین دانے اٹھا کر منہ میں ڈالتی کہ یہ اس سے بھی زیادہ سیلا ہے۔ اسی طرح سے وہ روز کسی نہ کسی بہانے سے غذا کھلاتی رہی۔ پانچویں دن تک بابا بہت بہتری کی طرف آ گئے۔ فرح کی شوخی کیا بتاؤں کہ ایک پہاڑی دو شیزہ کی طرح محصوم اور الحزب ہے بس صرف بغل میں ایک بکری کے بچے کی کسرباق تھی۔ میڈیکل کالج میں سنا ہے کئی لڑکے ماٹل بہ کرم تھے..... مگر اظہار مدعا سے ڈرتے تھے..... یہ جب مزے، مزے لے کر ان ناکام عاشقوں کے قصے سناتی تو ہنستے، ہنستے مل پڑ جاتے۔ سنا ہے ایک عاشق نامراد چندرہ دن مسلسل صبح کالج جانے سے پہلے گیٹ پر ایک پھولوں کا گلدستہ رکھ جاتے تھے وہ تو خیر ہوتی فرح کی ہدایت پر کارڈ نے ایک دن کھل کر مرمت کر دی جب جا کر سلسلہ

آنس جو ان کر کے ناظم کافی پاس ہو جاتا۔ شام کو بابا اور امی کے پاس بیٹھ کر واپس اپنے کمرے میں جا گھستی۔ فرح میری سہیلی آج کل اپنے فائل ایگزام میں مصروف ہے، اس کا میڈیکل کا آخری سال ہے تو اس کی شکل کو ترس گئی ہوں۔ اس کے بعد اس کی شادی ہے۔ جب بات کر رہی تھی اب تم بھی اپنی زندگی کے بارے میں سوچو، تمہاری امی بہت فکر مند ہیں جب سے ان کے دل کا معاملہ ہوا ہے مجھ سے کہتی رہتی ہیں۔ مٹی کو سمجھاؤ کسی کی یاد کے سہارے زندگی نہیں گزارا جاسکتی..... اور میں سوائے اس کو جھڑکنے کے کچھ نہیں کر سکتی..... میں تو ہجر کے الاؤ میں دہک کر انگارہ بن گئی ہوں۔ فرح تو اپنے ایک ہیڈ سم کزن کا بہت پہلے بھی ذکر کرتی رہتی تھی اور اب کاظم کے بعد تو باقاعدہ مہم چلائی ہوئی ہے مگر میں مسلسل انکار کرتی آرہی ہوں۔ ٹھیک ہے کسی کے جانے سے زندگی نہیں بدلتی مگر یہ بھی غلط نہیں کہ جینے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ ابھی قدرت کو میرے کچھ امتحان اور درکار تھے امی جو سانس کی مریضہ تھیں اب دل کے دورے کے بعد بہت کمزور ہو گئی تھیں پھر کاظم کا یوں اچانک چلے جانا اس روز پھر انہیں سانس کا بہت زبردست ایک ہوا تھا۔ انہیں بھی یوز کرادیا مگر پھر بھی سانس دھونکتی کی طرح چل رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر ان کا سر مانہ اونچا کیا۔ آف چہرے کا رنگ نیلا پڑ رہا تھا۔ شاید آکسیجن کی ضرورت ہے بابا آج اپنے بزنس کے سلسلے میں بڑی تھے۔ میں نے بابا کو موبائل پر کال کی تیل جاتی رہی اچانک دیکھا تو قریب تھیکے کے پاس ان کا فون آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ اوہ مائی گاڈ..... فون کے پاس ایمر جنسی نمبر چیک کیے شکر ہے ایڈمی ایسویٹنس کا نمبر مل گیا۔

ڈاکٹر نے جب مایوسی سے گردن ہلائی تو میری جان ہی نکل گئی..... بقول ان کے اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے..... میری متاع عزیز، میری ماں میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

بابا تو امی کے بعد تنگ خزان رسیدہ بننے کی

”اب کیا کروں گا بی کرکس کے لیے کماؤں..... تم اپنا کماتی ہو..... مکان کا کرایہ آتا ہے۔ بینک میں تمہاری شاوی کے خرچ کے علاوہ بھی اتنا ہے کہ زندگی بسر ہو ہی جائے گی..... باقی منجر دیکھ تو رہے ہیں.....“ بڑے پشمرده لہجے میں وہ بولے۔ ”واو بیچے کہ ہم جی رہے ہیں۔“ اور آنسو ان کے تلخ چہرے سے لڑھکنے لگے۔

”سنا ہے حشر میں ویدار ہوگا
تماشا کیا سر بازار ہوگا“
”بابا..... آپ کو میرا خیال نہیں؟“ میں نے تاسف سے آہ بھری۔ ”آپ کی خاطر جا ب چھوڑ دیتی ہوں۔“

”اوہو بھئی ایسا میں نے کب کہا..... تم کیوں میرے لیے قید رہو تمہاری بھی کوئی زندگی ہے۔“ رات بستر پر لیٹے، لیٹے جانے کتنے لمبے بیت گئے۔ نیند کو سوں وور تھی۔ آنکھوں کی جھلملاتی قدیلیں مجھ چکی تھیں۔ گھڑیاں نے تین بجے کا اعلان کیا..... وور کہیں کتے زور، زور سے بھونک رہے تھے۔ دل کا غم بڑھ کر آنکھوں سے بہ نکلا۔ پہلے میرا چاہنے والا تھا چھوڑ گیا۔ پھر میری غم گسار ماں تنہا کر گئی..... میں تو خاک بسر ہو گئی۔ اب مجھے الٹا بابا کو زندگی کی طرف لانا ہے۔ اتنے ستم اٹھاؤ گے کہ غم ہی بھول جاؤ گے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال ہے.....

آج آفس سے واپسی پر گاڑی دغا دے گئی۔ بڑی مشکل سے راہ گیر نے دھکا لگا کر اسٹارٹ کی..... میری زندگی کی طرح گھر پہنچی تو ٹنڈھا حال ہو چکی تھی۔ شام کی تاجھ ہوا کو کیا معلوم کہ کوزہ گر چاک پر اپنی مرضی نہیں چلا سکتے۔ جب تک اس کا ہاتھ گرون پر نہ ہو..... کوئی بھی سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ اب چاک کا پہیا جدھر گھوم رہا ہے ہم اوھر گھوم رہے ہیں، لان میں کھلے رنگ برنگے پھولوں نے بھی رنج گزیدہ ہی رکھا..... شکر ہے بابا واک سے میرے فوراً بوردائل ہوئے۔

رکا فرج اپنے کزن سے مسخوب تھی اور ہاؤس جا ب کے بعد شاوی تھی۔ میں اکثر مذاق کرتی.....
”توپ وخنجر لیے پھرتی ہو خودکش بمبار حسینہ کے قریب آنے کی کس جیالے کی ہمت ہے.....“ تو وہ کہتی۔

”یار پھونک، پھونک کر قدم رکھنا وہاں ہی سے سیکھا..... احتیاط لازم ہے۔ لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں۔“ میں تو اس کی شاعری سے عاجز ہوں۔ جانے کیسے شاعرانہ مزاج لڑکی میڈیکل جیسے شعبے میں جا تھی۔ پھر یہ چپکے سے آنے والی بہار جانتی اپنا جلوہ دکھا کر اپنے گھر سدھاری اور میں اپنے آفس کی طرف۔

بابا کے لیے پرانا خانساں موجود تھا۔ صبح اٹھ کر ناشتا میں خود کرا کر ایک راؤنڈ لان کا لگواتی پھر پھل پاس رکھ کر کچھ اخبار اور میگزین قریب سجاتی اور آفس کے لیے نکل جاتی..... اب بابا کو بھی اپنے بزنس کی طرف مائل کرنا تھا جو یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ مگر اس طرح تو بابا بیمار ہو جائیں گے..... مجھے گہری تشویش تھی۔ آج جب میں آفس سے واپس آئی تو شام ڈھل کر رات کی چاور اوڑھ رہی تھی۔ میں سیدھی بابا کی خوب گاہ میں پہنچی، اوہ ہو..... یہ ہی خواب گاہ..... جو آفٹرشیلوشن اور تپتی مسکور کن خوشبو یات سے مہکا کرتی تھی۔ فرج جو گلڈن بجا گئی تھی اس کے پاسی پھولوں کی باس کمرے میں عجیب سا تاثر چھوڑ رہی تھی۔

”بابا..... بابا.....“ میں نے آواز دی بے ولی سے آنکھیں کھولیں۔ ”آپ آج ابھی تک اٹھے نہیں.....“ بڑی متاسفانہ آہ بھری۔

”بس دل نہیں چاہا..... کیا کرتا اٹھ کر تم بھی تو نہیں تھیں..... کس کے لیے اٹھوں.....“ میں نے جلدی سے پردے کھسکائے..... اسر فریشنز کا چمڑکاؤ کیا..... اور ان کو کمرے سے باہر لائی..... انہوں نے ماحول سے بالکل لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ بزنس چھوڑ کر صرف گھر کے ہور ہے تھے۔

جوشی سے ملے۔ عبداللہ بھائی ایک ادھیڑ عمر بزنس میں تھے۔ ان کے ساتھ ایک طلاق شدہ بڑی طرح وار بیٹی بھی ہمراہ تھی۔ کا کا بھائی شیشے والا، بھی اپنے دوستوں کے ساتھ موجود تھے۔ یعنی بڑے، بڑے بزنس میںوں کا جھنگھا موجود تھا۔ میرا بھی تعارف ہوا۔

”گیم ابھی شروع کرتے ہیں۔“ عبداللہ انکل اپنی ٹونڈ کو کیلس میں پھنسائے آگے بڑھے۔ بابا کا ہاتھ پکڑا۔

”یار میں نے تو مہینوں سے اسٹک نہیں تھای۔“ مگر وہ ان کو گھسیٹتے ہوئے ایک گرین سے دوسرے گرین لیے پھرے۔ ایک کیڈی ساتھ، ساتھ ریگ بیگ اٹھائے پھر رہا تھا۔ بال ہول میں جاتے ہی کیڈی لپک کر ہیلپ کرتا..... میں جب تک ان میک اپ زوہ خواتین کے ساتھ بیٹھنے پر مجبور ہوئی..... عجیب بیہودہ لباس، لمبے، لمبے ناخن، گہرے، گہرے چپ رنگوں سے لبریز بڑے، بڑے ٹگینوں والی انگوٹھیوں کو گھما، گھما کر اسٹائل دکھاتیں یہ ناڈرن حسینا میں جانے کیا جتا رہی تھیں..... اور کیوں.....؟ وہ تو کہیے بابا نے جلدی واپسی کی ہائی بھرنی..... راستے بھران دولت مندوں کا تمسخر اڑاتے رہے۔ مگر میں نے یہ غنیمت جانا کہ صبح کی واک اور پختے کی شام گولف سے بابا کی صحت پر اچھا اثر پڑا..... گریس فل تو وہ تھے ہی اب میں نے ان کے پرانے سیلون لے جا کر بال کلر کرا دیے تو مزید کھرمگئے۔ ای کے سامنے تو مجال نہیں کبھی ایک چاندی سی چمک بھی بالوں میں نظر آئے فوراً وہ ڈائی کے لیے اصرار کرتیں..... اب وہ تک سک سے تیار ہو کر زندگی کے ساتھ چلنے پر تیار ہو چکے تھے..... اکثر برج کی پارٹیاں بھی اینڈ کر لیتے..... جب وہ گھر سے گولف کے لیے نکلتے، میں جلدی سے سر پر ہیٹ جما دیتی..... تو بالکل جنینکسین نکلتے..... آج کل جانے پھر بابا کو کیا ہو گیا تھا..... موڈ بدلا ہوا

آج بابا نے پرانی ہی ڈی لگا دی۔ اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا جانے کیوں آج ترے نام پہ رونا آیا ای کو یہ غزل بہت پسند تھی۔ زندگی میں چراغاں رکھنے والے جتنی تیزی سے زندگی میں داخل ہوتے ہیں اتنی ہی خاموشی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ میں دغ و گلاس کے ساتھ گال لگا کر ٹھنڈا احساس اندر اتارنا چاہ رہی تھی۔ پھر جانے کیوں بے بسی سے سامنے پڑے کشن کو دیوار پر دے مارا۔ برق رفتار غصہ رن وے پر جہاز کی رفتار کی طرح دوڑ رہا تھا کہ ای کی دیوار پر لگی تصویر کشن لگنے سے جھول پڑی..... پھر جیسے ہولے سے مسکرائی۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ”کیا ایسے جیتے ہیں..... تم نے تو غم کو گلے سے لگالیا۔ ابھی زندگی ختم نہیں ہوئی۔ تم اور تمہارے بابا میری محبت کی نشانی تمہارے پاس ہے دونوں..... یہ کیا کر رہے ہو اپنی زندگیوں کے ساتھ.....“ میں پلٹ کر بابا کے پاس لپکی..... دیکھا رنگ چیمز پر تصویر بتاں لیے..... ان کو تاک رہے ہیں۔ ای کی تمام پرانی تصویریں مونا لیزا جیسی ملکوٹی مسکراہٹ بکھیرتی یادیں.....

ہم شہر جاں میں آخری نغمہ سنا چکے سمجھو کہ اب ہمارا تماشا تمام شد زندگی کرنے کے لیے ہم دونوں کو ہی حوصلے کی ضرورت تھی بقول فرح۔ ”تم شادی کرو اور اوپر والے پورشن میں رہو..... کرایہ دار رخصت کرو، دیکھنا انکل کیسے ٹھیک ہوتے ہیں۔ فی الحال انہیں ان کے گولف کے پرانے دوستوں کے پاس لے جاؤ کچھ روٹین بن جائے تو پھر تمہاری شادی کا معاملہ اٹھاتے ہیں۔ اسے سرد خانے میں تو پڑا نہیں رہنے دے سکتے ناں.....“ وہ بالکل بڑے بوڑھوں کی طرح بات کر رہی تھی۔ فرح نے بات تو سنے کی تھی۔ سٹرڈے شام میں بابا کو گولف کورٹ لے گئی۔ وہاں پر پرانے گولف کے ساتھیوں سے مل کر بابا میں خوشگوار تبدیلی محسوس کی، سب سے گرم

بابا اپنے گولف کے لائیٹس کے لیے کئی دنوں سے یادہ کا کام کے عمر رسیدہ کے ساتھ میرا..... آف خدایا یہ سوچ کر مجھے جھرجھری آگئی..... میں نے آگے بڑھ کر پانی کی بوتل نکالی اور غٹا غٹ پانی حلق میں اٹھیل دیا..... اب مجھے پھر فرح کی مدد درکار تھی۔

”فرح تم فوراً کارروائی کرو..... کل تک اپنے کزن کو لے کر پہنچو ورنہ کوئی بھی طوفان آ کر بہت بڑی تباہی سے مجھے دوچار کر سکتا ہے۔“ بابا کے اس خود غرضانہ انداز نے مجھے غصہ تو بہت دلایا اور سوچا کہ مجھے بابا کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔ میں تو to be, not to be میں الجھ کر رہ گئی، غصہ اور ترس کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہو کر رہ گئی۔ جب وہ سرد موسم کی برسات میں گاڑی لے کر نکل گئے۔ تو تنہائی میں، میں نے زندگی کا ایک بہت بڑا فیصلہ کر لیا اور آرام سے ٹی وی کھول کر لیفلٹ ڈیپاک کی شہرہ آفاق فلم the birds دیکھنے لگی..... جانے فلم دیکھتے دیکھتے اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مجھ پر کسی ناپیدہ قوت نے حملہ کر دیا..... میں ریموٹ پھینک کر بھاگی۔ سامنے سے آتے بابا سے ٹکراتے، ٹکراتے پگی..... پھر مجھے ایسا لگا کہ بابا کچھ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پایا۔

”مشی جلدی آؤ، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ بابا کی بات میں نے سنی ان سنی کر دی..... اور فون کی بیل کی طرف لپکی جو شاید کافی دیر سے بج رہی تھی۔ دوسری طرف فرح ہی تھی۔

”اب سب سیٹ کر دیا ہے، تم موبائل بھی نہیں چیک کر رہی ہو..... چلو تم کو موٹے ٹونڈ والے بیوپاری اور عمر رسیدہ کیڈی سے بچانے کا پورا انتظام مکمل ہے۔ کل گھر پر رہنا۔ بلکی سی تیاری بھی کر لینا آخر وہ سالوں بعد تمہیں دیکھے گا۔ پھر آ کر معاملات سنبھالتی ہوں..... میرے ساتھ حماد اور ان کی ایک عدد آنٹی بھی ہوں گی۔ میں عاطف کے ساتھ موجود ہوں گی.....“

میں روکے..... لیکن تم بابا کو گھر لے آؤ..... میں روکے.....

تھا..... پانچ دن گھر میں رہنے تو بولائے، بولائے پھرتے..... آج یوں بھی موسم سرد تھا۔ پردے کھسکا کر باہر جھانکا۔

”اوہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ بجلیاں، چمکنے اور لپکنے کو تڑپ رہی، میں..... شاید اب وقت آ گیا ہے کہ فرح کی بات مان لی جائے۔“ بابا عجیب و غریب تماشا کر رہے تھے میں تو ان کی خاطر زندگی داؤ پر لگا بیٹھی اب جا ب بھی چھوڑ کر ان کے ساتھ، ساتھ تھی۔

”آج تم نے یہ کیوں پکایا..... میں تو کبھی یہ نہیں کھا سکتا۔“ پھر پلیٹ زور سے کھسکی۔ ”تم ہی کھاؤ..... یہ ہاف فرائی اٹھائے تم نے کیسے بنائے ہیں زروی توڑ دی، نہیں کھا سکتا۔“ پھر مجھے دیکھتے..... ”کہیں کی تیاری ہو رہی ہے جب ہی جلدی میں سارا ناشتا خراب کر دیا.....“ بڑا ڈرامائی انداز آج انہوں نے اپنایا ہوا تھا..... پھر اپنے ریشمی گاؤن کی ڈوریاں کھولنے لگتے۔

”چلو میں بھی تمہارے ہمراہ ہی چلوں گا.....“ سپاٹ سالجہ..... میں شاکڈ رہ گئی۔

”بابا آج آپ کو کیا ہوا ہے..... روز ایسا ہی بریک فاسٹ کرتے ہیں..... اور سیس میں کہیں بھی نہیں جا رہی، آپ کو کہیں جانا ہو تو جائیں مگر پلیز میرے ساتھ تو ایسا روکھا روئیہ نہ اپنائیں۔“ میں نے تو بات دسانیت سے کی..... مگر اس پر تو ان کو ہالیائی غصہ آچکا تھا۔

”ہاں تو تم یہ ہی چاہتی ہو کہ میں گھر چھوڑ دوں۔ تم کو آزادی سے گھومنے، دوستیاں کرنے اور موبائل پر گل چہرے اڑانے کا موقع مل جائے..... مگر ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے کچھ انتظام کرنا پڑے گا۔“ پھر کرسی کو زور سے دھکا دیا اور پھر بیٹھے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں حیرت زدہ کھڑی آنکھیں جھپکا رہی تھی، آنسوؤں کے گولے گلے میں پھنس رہے تھے۔

اچانک بہت سے خوف ڈھن میں ٹوٹ آئے.....

”بابا..... یہ سب کیا ہے، مجھے تو آپ نے کچھ نہیں بتایا..... پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کا ارادہ کیا مگر..... بابا کی آواز میرے کانوں سے نکل گئی۔

”تم میرے لیے بہت فکر مند رہتی تھیں ناں..... تو آج تمہارے لیے ایک خوب صورت سر پرانہ گفت ہے..... جی قاضی اسد اللہ صاحب.... بسم اللہ.....“ میرے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ پھر کانوں میں سیسہ ملی آواز گونجی.....

”تھلقتہ خاتون آپ کو ہاشم فاروقی بعوض پانچ لاکھ سکے رائج الوقت نکاح..... قبول، قبول، قبول.....“ اور میں شاید آگے کچھ سن نہ سکی۔ یقیناً ہوش میں نہ رہی تھی..... جب ہوش میں آئی تو فرح مجھے جھنجھوڑ رہی تھی..... اور میں پھٹی، پھٹی آنکھوں سے..... سامنے بظاہر پریشان حال بابا اور ان کے قریب ان کی نئی نوٹی وہن کھڑی مجھے حیرت سے تنک رہی تھیں۔ جانے بساط دل نے میرے ساتھ کیا چال چلی..... کہ فرح جیسی عمل کل رکھنے والی بھی نہ سمجھ سکی کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

”بابا بس آپ امی کو صرف اتنا ہی چاہتے تھے۔ چراغ وفا جلانہ سکے..... بابا، آپ کو تو ٹھیک طرح سے آدابِ جاں سوزی بھی بھانا نہ آیا۔“ میں نے بڑھال ہو کر آنکھیں موند لیں۔ بابا کو میری نہیں، اپنی نگرانی پریشان رکھا..... اور ہم سب یہ سمجھتے رہے کہ وہ میرے لیے پریشان ہیں۔ شاید ہم ہی غافل ہو گئے تھے داستان کہتے، کہتے..... زندگی کی طرف تو انہیں میں ہی لائی، وہ تو یادوں کو دل سے لگا بیٹھے تھے..... یہ میں ہی تھی جو جاں سوزی میں جل رہی تھی ورنہ کوئی رشتہ بھی اپنی زندگی کے آگے بچھ ہوتا ہے..... میری سوچوں کا دھارا بدیل رہا تھا..... اور..... اور میں ڈوب، ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

رکھنا..... ادا کے..... اور ہاں چہرے پر ہوائیاں نہ اڑ رہی ہوں..... ذرا پارلر کا ایک چکر لگالینا۔“

شام ڈھل رہی تھی میں پارلر میں رش ہونے کی وجہ سے تھوڑی لیٹ ہو گئی..... فرح نے تو مجھ بچے کہا تھا۔ سب آدھا گھنٹے پہلے ہی آگئے..... کیونکہ گھر سے باہر دو تین گاڑیاں کھڑی میرا منہ چڑا رہی تھیں۔ حماد اور فرح کتنے افراد کے ساتھ حملہ آور ہو گئے کیا آج ہی نکاح پڑھوانے کا ارادہ ہے میں حواس باختہ سی اندر داخل ہوئی۔

”اوہ نو.....“ یہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی..... سات آٹھ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بیانیے ٹیبل پر فریش پھولوں کے ڈیسر ماحول کو خواب آگین بنا رہے تھے۔ ڈارنگ روم کی نینگوں فضا میں تازہ پھولوں کی باس بسی تھی۔ بابا یوسکی کے شلووار سوٹ میں شاندار لگ رہے تھے۔ کا کا انکل، لطیف چاچا اور بابا کے بھائی کا کا کی طلاق یافتہ بہن شانی زیر لب شرمگین مسکراہٹ سجائے آراستہ و پیراستہ پھولوں کے گہنے سجائے بیٹھی تھیں۔ خود کو کسی پرستان کی شہزادی کی طرح سمجھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بابا اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آؤ، آؤ تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تم موبائل یہاں ہی چھوڑ کر جانے کہاں چلی گئیں، رات بھی جلدی سو گئیں۔“ اور مجھے کندھے سے پکڑ کر کا کا کے قریب والی نشست پر بٹھا دیا۔ میں اطراف کا ماحول دیکھ کر بہم گئی۔ مجھے دور، دور تک حماد یا فرح کی ٹیلی نظر نہیں آ رہی تھی..... پھر سامنے بیٹھے مولوی صاحب سے کہا۔

”ہاں..... قاضی صاحب شروع کریں.....“

بسم اللہ.....

”اے خدایا یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے..... اس وقت لمحہ موجود میں کوئی شخص بھی میرے لیے باپ کے برابر تو ضرور لگ رہے تھے مگر ان میں سے کوئی میرا شریکِ سفر نہیں ہو سکتا تھا۔“ میں نے بہم کر اپنی تمام قوتوں کو جمع کیا اور مٹی، مٹی سی آواز حلق سے



وہ پوچھنے کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا، سمجھا تھا کہ اس کی بیوی مونا ہوگی، اسے کیا منہ دکھاتا، وہیں اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ ”بہرہ ہو گیا ہے کیا؟“ قیص کے کار سے پکڑ کر اسے اٹھا کر گھسیٹ کر سیدھا کھڑا کیا گیا تھا، وہ

”ملاقات آئی ہے بے تیری!“ کرنت آواز میں کہا گیا جملہ..... وہ اپنی جگہ سے ہلاتک نہیں۔ ”سنا نہیں تو نے؟“ آہنی دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ ”چل اٹھ!“

میری ماں

شیریں حیدر



بے بسی سے بچا..... اسی سلاخوں کے اس بازو ہونا نہیں بلکہ اس کی ماں گئی، اس نے حقارت سے اسے دیکھا اور اپنے غصے کے اظہار کے لیے منہ پھیر لیا۔
 ”کیا لینے آئی ہو یہاں..... چلی جاؤ اور چھوڑ دو مجھے یہاں مرنے کے لیے۔“ جواب میں ایک سسکی کی آواز آئی۔

سلاخوں کے پار وہ اپنے اکلوتے بیٹے عمر کو دیکھ رہی تھی، اس کمرے کا فرش گندگی سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں موجود لوگ غالباً بول و براز وہیں کرتے تھے..... بیٹے کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، چند ہفتوں میں ہی وہ کتنا کمزور لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشدد کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ کس طرح اس سپاہی نے اسے کالر سے پکڑ کر، حقارت سے گھسیٹ کر... فرش سے اٹھایا تھا، اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔
 ”کیسے ہو میرے لال؟“ اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میرا کیا آپ کا لال!“ اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”ایسا بھی کوئی کرتا ہے اپنی اولاد کے ساتھ؟“
 ”ماں ہوں تمہاری بیٹا، میزبان جان!“
 ”اسی ہوتی ہیں کیا مائیں؟“ اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی چمک ابھری تھی۔ ”آپ کو تو مجھ سے پیار ہی نہیں، ثابت کر دیا آپ نے۔“
 ”کاش ساری مائیں ایسی ہی ہو جائیں میرے بیٹے تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔“

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے کہ میں یہاں سڑ رہا ہوں، میری بیوی اور تین بچے کس تکلیف میں ہیں، آپ سوچ سکتی ہیں کہ انہیں کن مشکلات کا سامنا ہے؟ انہیں تو ایسے حالات کی عادت بھی نہ ہوگی، ایک رات وہ میرے بغیر نہیں گزار سکتے..... یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے، آپ نے ان کے بارے میں بھی نہیں سوچا، آپ کو مجھ سے پیار ہی نہیں ہے اب ان آپ مجھے

اپنی دشمن لگتی ہیں، آپ میرے سامنے نہ آیا کریں، آپ کو دیکھ کر میرے دل کے زخم کھلنے لگے ہیں۔“
 ”چلو اماں جی، ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے.....“ اس نے اتنے مہذب لہجے میں آ کر اس سے کہا کہ عمر کو بھی اپنی سماعت پر شک ہوا، اس نے تو ان لوگوں کو کبھی نری سے بات کرتے ہوئے نہ سنا تھا۔
 ”میں تمہاری دشمن نہیں ہوں بیٹا!“ وہ گھکیا کی۔
 ”جو کچھ بھی کیا وہ تمہارے بھلے کے لیے تھا۔“

”آپ کو میری ہی قسم ہے اماں کہ مجھے اس کے بعد ملنے مت آئیے گا، اگر آپ دوبار یہاں آئیں تو میں خود کو کچھ کر لوں گا..... یہاں سے اگر زندہ نکل آیا تو پھر دیکھوں گا کہ آپ سے ملنا ہے یا نہیں۔“ اس نے غصے سے کہا، صالحہ کے سینے میں درد کے جوار بھانٹے اٹھنے لگے، اس کے لیے عمر کی طرف سے دی گئی وہ قسم بہت بڑی قسم تھی، کتنا مشکل تھا کہ وہ اسے ملے بغیر رہ لیتی..... وہ اپنی کاسفر کرب کا سفر تھا، تانگے پر بچکولے کھاتا اس کا پورا وجود لرز رہا تھا، وہ اسی تانگے میں بیٹھے، بیٹھے ماضی کے کئی سالوں کا سفر طے کر گئی تھی۔

☆☆☆

بچپن کا سن بھی کیا عمر ہوتی ہے بھلا اور وہ اس جوان عمری میں ایک پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ بیوہ ہوئی تھی، سب نے مشورہ دیا کہ اسے دوسری شادی کر لینی چاہیے..... اس کی پہلی شادی خود سے تقریباً گنی عمر کے مرد سے ہوئی مگر وہ بہت نیک انسان تھے اور یہ تو نام کی بھی صالحہ..... اپنے باپ کے کیے گئے فیصلے کی لاج نبھانا تھی۔ عمر کے ابا کی پہلی بیوی نے انہیں شادی کے بعد کوئی سکھ نہ دیا تھا، نہ اولاد کا نہ سکون کا، اسی لیے وہ بھی شادی کے نام سے بدکتے تھے۔ صالحہ کے ابا کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا، تقریباً ہر روز شام کو وہ ان کی بیٹھک میں ابا کے پاس آتے، حالات حاضرہ پر باتیں ہوتیں اور دونوں کا اچھا وقت کٹ جاتا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بیوی کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں کو اپنے بیوی بچوں سے فرصت نہیں ملتی تھی، جو وہ بھی کسی وقت

لیا کریں گے کیونکہ اس شادی کو انہیں اپنی پہلی بیوی سے چھپا کر رکھنا تھا۔ جن کے اپنے چھ، چھ بیٹے بھی تھے اور انہیں پالنے کے لیے ایک گھروالی چاہیے تھی وہ اس کا ایک بیٹا بھی ساتھ رکھنے کو تیار نہ تھے، اس نمائی کی توکل پونجی ہی عمر علی تھا، وہ اس کے پنازندگی کا کیا تصور کرتی؟

باپ کے گھر پر وہ کر اس نے گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے ہر وہ کام کیا جو محنت کے زمرے میں آتا ہے، اب مسئلہ صرف پیٹ بھرنے یا اس کی ضروریات کا نہ تھا، اسے اپنے بیٹے کو بڑا انسان بنانا تھا۔ سلائی، کڑھائی، کروشیہ، بنائی، جھیزا بری کے جوڑوں کی نکائی کا کام کیا، پکوڑے، سموسے، کباب، آلو نکلیاں، بڑیاں، اچار، مرے اور چٹنیاں بنا، بنا کر بیچیں اور اپنے ہنر اور محنت سے کمائی کر کے کمیشیاں ڈالیں تاکہ اس کا بیٹا کسی قابل بن سکے۔ ابا جان کی وفات نے اسے اور بھی کھلے آسمان تلے لاکڑا کیا تھا مگر مشکل کے چند سال بھائیوں کی خالی منہ زبانی تسلیوں کے ساتھ گزار کر اب اس کا بیٹا اس کے قد کو پہنچ گیا تھا۔

ابا جان کے مکان پر ان کی وفات کے بعد اس کے بھائیوں کی نظر تھی، انہیں اس کو بیچ کر باٹنا تھا، وہ زمانہ شناس تھی، ان کی نظروں کے اشارے سمجھ گئی اور علی احمد کے اس مکان کو خالی کروانے کا نوٹس دے دیا جہاں کرائے وار رہتے تھے اور وہ کرایہ اس کی اضافی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اب وہ ذریعہ آمدنی چھوٹ جانا تھا اس لیے اس نے سوچ سمجھ کر بھائیوں سے ابا جان کے مکان کی فروخت سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا، اس میں کوئی غلط یا غیر شرعی بات نہ تھی مگر ایسا ہوا کہ اس سے اس کے بھائیوں اور ان کے اہل خانہ سے رہے رہے تعلقات بھی ختم ہو گئے۔

اسے اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا، اس نے اس ایک مشمت طنے والی رقم سے ایک دو ضروری مشینیں خریدیں اور گھر پر سلائی کا کام کرنے لگی۔ اس کی مشین کا بیٹا گھومتا رہا اور اس کے بیٹے کا سلسلہ تعلیم اور گھر کا

انہیں میسر نہ جاتے تو جانے ان کی بیٹی کہاں اور پھر ہوتی، اسی لیے انہوں نے بیٹی کا باپ ہوتے ہوئے بھی علی احمد سے خود اس کے لیے بات کی اور علی احمد اچکچا گئے، کہاں ان کی عمر کا ڈھلتا ہوا سورج اور کہاں ان کی انیس، بیس سالہ بیٹی۔ انہوں نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا مگر اس کی بابت اپنے دوست کو پریشان ضرور دیکھا تھا..... ان کے اصرار پر علی احمد کو انکار کی تاب نہ ہوئی۔

صالحہ کم سن اور خوب صورت تھی، ان کی زندگی میں سکھ کا ساون بن کر برسی اور گھر کے کھانے، سکون اور خوشی کے علاوہ اولاد کی نعمت بھی انہیں صالحہ کے توسط سے ملی۔ سوچتے تھے کہ اچھا ہی ہوا جو پہلی بیوی سے اولاد نہ ہوئی اور ان پر ایسی ذمے داری نہ پڑی کہ جو نہ صرف انہیں ایک ناخوشگوار زندگی گزارنے پر مجبور کرتی بلکہ اس اولاد کے باعث انہیں دوسری شادی کے لیے کوئی اپنی بیٹی بھی نہ دیتا۔ صالحہ بھی اپنی زندگی سے مطمئن تھی۔ اسے ہر طرح کا آرام تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پر کوئی پابندی اور روک ٹوک نہ تھی۔ علی احمد خود بھی نمازی اور پرہیزگار تھے اور انہوں نے صالحہ کو بھی ہیرے کی طرح تراش دیا تھا، برائی سے دور رہنے اور نیکی کا چراغ بننے کا گھر سکھایا، وہ ایک قناعت پسند اور صابر عورت تھی۔

علی احمد کی اچانک وفات نے اسے آسمان کی بلند یوں سے زمین پر لاپتہ، جسے گھر سے باہر کی فکر تک نہ ہوتی تھی اسے دنیا اندھیر لگنے لگی، کس طرح زندگی گزرے گی..... اسی سوچ کے باعث وہ چپ سی ہو گئی تھی۔ سب نے مشورہ دیا کہ دوسری شادی کر لے مگر اس کی سوچیں اور فکریں اور طرح کی تھیں۔ اسے کوئی پانچ سال کے بیٹے سمیت کیوں قبول! اپنے ابا جان کے اصرار پر اس نے ہای بھری مگر اس دوران جو رشتے آئے وہ ایسے لوگوں کے تھے جن کی عمریں اس کے ابا جان کی عمر سے بھی زیادہ تھیں، رنڈوے، دو ہا جو یا خفیہ شادی کرنے کے خواہش مند جن کا کہنا تھا کہ وہ اسے رخصت کرنا کر بھی نہ لے جائیں گے بلکہ بیٹین آکر لیں

روز نہیں جب وہ اس قابل ہو سکے گی کہ بیچ کر سکے۔ عمر کی تکمیل تنخواہ میں بھی وہ مطمئن تھی، گھر کے ایک کمرے کو کرائے پر دے رکھا تھا تو اس سے آمدن ہو جاتی تھی جسے اس نے چند سال پہلے کمیٹی ڈائمنڈ کے لیے کرائے پر چڑھا دیا تھا، اس میں کسی نے کرایے کی دکان کھول رکھی تھی جس سے انہیں بھی چھوٹا موٹا سودا لینے کی سہولت تھی۔

ووکروں کا چھوٹا سا گھر تھا مگر صالحہ اس میں ہمہ وقت مصروف رہتی۔ چولہا چوکی، صفائی ستھرائی اور اس کے علاوہ وہ کام جو اب اس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا، عمر چاہتا تھا کہ اب اماں کام نہ کریں مگر ضرورت مند مجبور کر لیتے تو وہ مان جاتی اور پھر اس سے اضافی آمدن بھی تو ہوتی ہی تھی۔ اسے عمر کی شادی کے لیے رقم درکار تھی۔

اسے کسی شریف گھرانے کی قبول صورت، شریف، پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار لڑکی چاہیے تھی۔ اس کی تلاش کے گھوڑے ہر طرف دوڑائے جا رہے تھے۔ عمر بسا اوقات ہنستا اور کہتا۔ ”کہ وہ ایک نہیں بلکہ چار لڑکیاں ڈھونڈیں کیونکہ کسی ایک لڑکی میں تو یہ سب خوبیاں اکٹھی نہ ملیں گی۔ جو بھی لڑکی اس گھر میں لانی ہے اماں وہ آپ نے اپنی پسند سے لانی ہے کیونکہ میرا تو بہت کم وقت گھر پر گزرتا ہے، اصل میں تو آپ کو اس کے ساتھ گزارہ کرنا ہے اور اسے آپ کے ساتھ.....“ وہ مسکرا کر رہ جاتی..... اپنی دور پار کی ایک رشتے دار کی پوتی پر اس کی نظر تھی، وہ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی، وہ بیٹی ان تمام خوبیوں پر پوری اترتی تھی جو اس نے سوچ رکھی تھیں مگر اسی اثنا میں.....

☆☆☆

”اماں جی، میرے دفتر کے ہیڈ کلرک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں!“ عمر نے ماں کے گلے میں بائیس حائل کیں۔

”وہ کیا ہوتا ہے بیٹا؟“ انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

”میں کلرک ہوں ماں اماں جی، تو وہ ہم سب کے.....“

نظام چلنا رہا گزارے ہوئے وقت نے اسے گزر دیا اور نظر کی کمزوری کا عطیہ بھی دے دیا مگر اسے کب اس کی پردہ تھی، اس کا عمر پڑھ لکھ جاتا تو اس کے سارے بوجھ اٹھا لیتا، نظر کے لیے چشمہ اور درد کے لیے گولیاں..... جیل سوچل اس کا عمر چودہ جماعتیں پڑھ چکا تو اس نے کئی جگہ ملازمت کے لیے درخواستیں دیں، خود صالحہ نے بھی ہر وہ درکھنکھنایا جہاں تک اس کا ہاتھ پہنچتا تھا۔ جن گھروں کا وہ سلائی کا کام کرتی تھی وہاں اس نے سب سے کہہ کہا کر بالآخر عمر کے لیے ایک کلرک کی ملازمت حاصل کر ہی لی۔ عمر کے بھی خواب اونچے سہی مگر دن رات ملازمت کے حصول کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھا کر اور جو تیاں چٹھا، چٹھا کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دفتر میں کلرک کی وہ ملازمت بھی اسے سفارش پر ملی تھی ورنہ کلرکوں کی سیٹوں کی بھی بولیاں لگتی تھی۔

عمر کی ملازمت کی خوشی میں اس نے محلے میں مٹھائی بھی بانٹی۔ اس کا بیٹا کماؤ ہو گیا تھا، اس کی عمر بھر کی پونجی، اس کی محنت کا نتیجہ اسے دیکھنے کو مل رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں اور طرح کے سنے دیکھنے لگی تھیں اور اس کی کمیٹی کی رقم ایک اور مقصد کے لیے جمع ہونے لگی، اسے عمر کو بیاہنا تھا۔ اسے دو لہا بنانا تھا۔ جہاں جانی اسے لڑکیاں اور اور رنگ میں نظر آتیں اور وہ راتوں کو ان کے سنے دیکھتی، اس کی شادی کر کے وہ اللہ کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے سارے فرائض احسن طریقے سے نبھائے۔ خود بھوک بھی رہی تو اسے بھوکا نہیں سلایا، اسے اچھا پہنانے کو وہ سالوں تک اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتی رہی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اس کا بیٹا اس کا خیال رکھے گا، تھوڑے عرصے میں گھر میں بہو آ جائے گی تو وہ آرام کرے گی۔

اس کے علاوہ اس کے دل میں جو خواہش چلتی تھی، وہ اللہ کے گھر کی زیارت کی تھی، حج کی خواہش اسے تھی مگر عمر کی پڑھائی تک اس نے اس خواہش کو اپنے اندر دبا کر رکھا تھا، اب تو وہ سوچتی تھی کہ وہ دن

ماہنامہ پاکیزہ 142 نومبر 2016

وہ رکا۔ "یوں سمجھیں کہ ہم سب کے افسر ہیں۔"
 "تو وہ ہمارے گھر کیوں آنا چاہتے ہیں بیٹا!"
 صالحہ گڑبڑا گئی تھی۔ "وہ بڑے افسر ہیں اور ہمارا گھر تو
 چھوٹا سا ہے۔۔۔۔۔" اس پر لفظ افسر نے رعب ڈال دیا تھا۔
 "مگر آپ کا دل تو بہت بڑا ہے ناں اماں جی!"
 اس نے اپنا سرماں کے کندھے پر ٹکا یا۔
 "جیسے تجھے ٹھیک لگتا ہے بیٹا۔۔۔۔۔" صالحہ نے کہا۔
 "تو پھر انہیں اتوار کے دن آنے کا کہہ دوں؟"

☆ ☆ ☆
 "اماں ہم کب جائیں گے ان کے گھر؟"
 "کس کے گھر بیٹا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔
 "ہمارے ہیڈ کلرک صاحب کے گھر!" اس نے
 جواب دیا۔

"ان کے گھر کیوں جانا ہے ہمیں بیٹا، مجھے تو وہ
 عورت بڑی مغروری لگی تھی۔"
 "اماں وہ اپنی بیٹی کا رشتہ مجھے دینا چاہتے
 ہیں۔" عمر نے بلی تھیلے سے باہر نکالی تو وہ مگر، مگر اس کا
 منہ دیکھنے لگی، اس کے لیے تو وہ اچھے کی بات ہی تھی کہ
 کوئی بیٹی والا اسے منہ سے رشتہ دینا چاہے، اس نے
 ان کی بیٹی نہیں دیکھی ہوئی تھی مگر اس کی ماں کو دیکھ کر
 کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا تھا۔

"وہ بہت بڑے اور پیسے والے لوگ ہیں بیٹا، ہمارا
 اور ان کا کیا جوڑ ہے۔۔۔۔۔ اس کی ماں کے رنگ ڈھنگ
 دیکھ کر میں اندازہ کر سکتی ہوں بیٹا کہ اس کی بیٹی اس گھر
 میں خوش نہیں رہ سکے گی۔" صالحہ نے کہا، سوچ رہی تھی کہ
 شاید اس بچی میں کوئی نقص ہوگا جو ان کے گھر کو دیکھ کر بھی
 وہ ان کے ہاں اپنی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔

تو اماں جان ہمیں کون سا ساری عمر اسی گھر میں
 رہنا ہے۔۔۔۔۔" اس نے فوراً کہا۔ "میں جوں جوں ترقی
 کرتا جاؤں گا ہمارے حالات بھی بدل جائیں گے اور
 ہم بھی اسی طرح ٹھاٹ سے زندگی بسر کریں گے۔"

"اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔۔۔۔۔" اس نے ہولے
 سے کہا۔ "چلو میں کسی دن جا کر دیکھ آؤں گی کہ ان کی
 بیٹی میرے شہزادے کے قابل ہے یا نہیں۔" اس کی

عمر نے خوشی سے اچھا۔
 "جس طرح تمہیں مناسب لگے۔۔۔۔۔" صالحہ نے
 اس کا سر چوما۔ "کیا خیال ہے کہ میں سمو سے اور
 فروٹ چاٹ گھر پر بنا لوں چائے کے ساتھ؟"
 "ٹھیک ہے اماں جان، میں کیک رس
 اور پیسٹریاں بازار سے لے آؤں گا۔"

صالحہ پر تو عمر کے ہیڈ کلرک کی افسری کا رعب تھا
 مگر اسے لگا کہ عمر کسی اور انداز سے خوش تھا اور چچھارہا
 تھا۔ اتوار کو سویرے ہی وہ جا کر وہ سارا سامان لے آیا۔
 صالحہ ابھی گھر کی صفائی سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ عمر نے
 تشددی انداز میں جائزہ لیا اور ماں سے کہا کہ فلاں چیر
 کو فلاں جگہ پر رکھ دیں اور فلاں چادر میز پر ڈال دیں۔
 وہ پھر بھی کچھ نہ سمجھی، چائے کا سامان تیار کیا، برتن
 ٹرے میں سجائے تو عمر نے اس سے بھی اچھی طرح تیار
 ہونے کو کہا۔

ہیڈ کلرک اپنی بیگم کے ساتھ آئے تھے۔ ان کا
 لباس، انداز اور چھب ہی نرالی تھی، گھر کی ہر چیز کو تشددی
 نظر سے دیکھتی ہوئی، ناک بھوں چڑھا کر بات کرتی
 ہوئی۔ چاہے اس نے منہ سے ایسا کچھ نہ کہا تھا مگر صالحہ
 سمجھ رہی تھی کہ انہیں وہاں آنا، بیٹھنا اور ان کے ہاں کی
 چائے پینا کس قدر ناگوار لگ رہا تھا۔ صالحہ پھر بھی ہنسی
 جاری تھی کہ آخر اس کے بیٹے کا بڑا افسر تھا۔

"آپ بھی کبھی آئیں ہمارے گھر!" رخصت
 ہوتے سے انہوں نے کہا تھا مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس
 کا فقرہ کتنا بادل ناخواستہ اور رکی سا تھا۔

خوشی کی خاطر اس نے دل پر پتھر رکھ کر کہا، جس قدر جلد ہو وہ اسے وہ لڑکی بھی دکھائے گی جسے وہ پسند کیے بیٹھی تھی بلکہ کسی کے ذریعے پیغام بھی بھجوا چکی تھی کہ ان کا عندیہ معلوم ہو یا یہ کہ وہ بچی نہیں منگنی شدہ نہ ہو۔

”اچھی ہے اماں..... جیسی ساری لڑکیاں ہوتی ہیں، میں نے دیکھی ہے۔“ عمر کے کہنے پر صالحہ دنگ رہ گئی۔ ”آج شام کو ہی میں اور آپ چلتے ہیں اور بات طے کر آتے ہیں۔“ بات تو صالحہ کے اندازے سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی، اس کی شمولیت اور منظوری فقط ضابطے کی کارروائی تھی تاہم اسے اس کارروائی میں بھی خوشی سے حصہ لینا تھا تا کہ بیٹے کو ماں کی طرف سے کوئی تکلیف نہ ہو۔

شام کو رکشے میں سوار ان کے گھر کی طرف جاتے ہوئے علی احمد نے ہزار، ہزار کے پانچ کرارے نوٹ ماں کو پکڑائے کہ وہ مونا کو دے ویں تو وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں، پانچ ہزار..... پورے پانچ ہزار! وہ سالوں سے محنت کر کے کماتی تھی تو بھی اس کی اتنی سکت نہ ہوتی کہ کسی بھی لڑکی کو یوں پانچ ہزار تمنا دیتی، تاہم اس نے خاموشی اختیار کی، اب حالات اس کے بس میں نہ رہے تھے، اسے ہوا کا رخ دیکھ کر ہی چلنا تھا، بیٹے کی شادی کے حوالے سے اس کے خوابوں کے عمل مسہار ہو گئے تھے مگر اسے یقین تھا کہ اس کے بیٹے کی پسند اچھی ہی ہوگی۔

☆☆☆

اس گھر کے دبیز قالینوں پر چلتے ہوئے بھی صالحہ کے پیروں میں کانٹے چبھ رہے تھے، اس کا گھر کسی بھی طرح ایسی لڑکی کے شایان شان نہ تھا جو اس گھر کی مکین تھی..... آہنوسی طویل میز پر بچے ہوئے لوازمات کے ساتھ چائے بھی صالحہ کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی، وہ بری طرح ان کے رعب میں آگئی تھی، خدا کرے کہ وہ خود ہی کسی بات سے انکار کر دیں، اپنے بیٹے کی خوشی تو اسے نظر آ رہی تھی کہ اتنے بڑے گھر کا داماد بننے چلا تھا۔

پانچ ماہ سے میں تمہیں، یقیناً ان کے بیٹے سے بڑی عمر اور گہرے رنگ کے چہرے کو میک اپ کی تہوں میں چھپائے ہوئے، مونا کے ہاتھ اور پاؤں اس کی عمر اور کپکپ کی چغلی کھا رہے تھے..... اس کی طرف غور سے کیا دیکھتی۔ سر جھکائے ہوئے اس کی گود میں پانچ ہزار کے نوٹ رکھتے ہوئے صالحہ کی آنکھوں سے گئی آنسو ٹپکنے کو بے چین ہوئے مگر اس نے ان پر بند باندھا اور نوٹ مونا کی گود میں رکھ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، نادانستگی میں وہ اس کا موازنہ اس بچی سے کر بیٹھی جسے وہ پسند کیے بیٹھی تھی۔ اسے علم ہو گیا کہ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔ ساری باتیں وہی تھیں جو انہوں نے پہلے سے سوچ رکھی تھیں اور اب کئی جا رہی تھیں۔ وہ خود کو کسی ڈرامے کا ایک کردار سمجھ رہی تھی جس کی لائسنس پہلے سے لکھی ہوئی تھی اور اسے وہی کرنا تھا جیسے ہدایت کار چاہتا ہے۔

واپسی پر مونا کی ماں نے مٹھائی کے دو بڑے ٹوکڑے اور ماں بیٹے کے لیے قیمتی کپڑے ہمراہ کیے اور ان کے گھر کی گاڑی انہیں چھوڑنے آئی تو محلے بھر کو علم ہوا کہ صالحہ کے بیٹے کی کسی اونچی جگہ منگنی ہو گئی ہے۔ اسے لگا کہ وہ کوئی کٹھ پتلی بن گئی تھی جس کی ڈوریں کوئی اور ہلا رہا تھا، بالابالا سب کچھ طے کیا جا چکا تھا۔ انہیں ہر مرحلے کے آغاز پر اگلے قدم کے بارے میں بتا دیا جاتا تھا۔ اسی پتلی تماشے کا حصہ بنے، بنے، شہر کے ایک بڑے شادی ہال میں ہونے والی تقریب میں صالحہ اور عمر اپنے چند گئے چنے رشتے داروں کے ہمراہ جا کر مونا کو بیاہ کر اپنے گھر لے آئے بلکہ اپنے بیٹی نہیں، اس گھر میں جو مونا کے باپ نے داماد کو سلامی میں دیا تھا اور وہ گھر مونا کے نام پر خرید گیا تھا۔

اپنا پرانا گھر انہیں کرائے پر دینا پڑا، وہ تو اس گھر کو نہ چھوڑنا چاہتی تھی مگر بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی، پرانا گھر پھر کرائے پر دے دیا گیا اور اس کا مختصر سامان سمٹ کر اس گھر کے ایک ہسٹور میں سما گیا تھا۔ صالحہ اپنے بیٹے کے گھر کے ایک کمرے میں کسی....

قصیدی ماں

رات آ جانے والی دولت کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کرتے، وہ ان کو جھٹلاتی کیونکہ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، اس نے تو اسے کبھی بے وضو و ودھ بھی نہ پلایا تھا اور اسے ہمیشہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کی تھی، اسے غلط اور صحیح کی تمیز سکھائی تھی اور حرام سے بچنے کی تاکید..... وہ ایسا کیونکر کر سکتا تھا؟ کاش ایسا ہی ہوتا جیسا کہ وہ سمجھتی تھی۔ بیٹے کو بلا کر استفسار کیا تو وہ سوچ رہی تھی کہ بیٹا کہے گا۔ ”لوگ جھوٹ کہتے ہیں، بہتان لگاتے ہیں!“

”ہر طرف یہی ہو رہا ہے اماں جان، سب لوگ ایسا کر رہے ہیں، میں کوئی اکیلا تو.....“ اس نے بغیر جھجک کے کہا تھا۔ ”وقت، زمانہ اور ضرورتیں بہت تبدیل ہو گئی ہیں اماں جان!“

”غلط کو اس لیے درست نہیں مانا جاسکتا میرے لعل کہ سب لوگ ایسا کر رہے ہیں۔“ اس نے رمان سے کہا، اسے امید تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اس کھائی میں

غضب و معطل کی طرح رہنے لگی، گھر کا گراہیہ صالحہ کے پاس آتا تھا جو وہ جمع کر لیتی تھی، ایک بے اختیار عورت کی خواہشات ہی کتنی ہوتی ہیں؟

☆☆☆

کئی رتیں آئیں اور چلی گئیں۔ گھڑی کی سوئیوں کو آگے پیچھے بھاگتے دیکھتے ہوئے صالحہ نے عمر کے گھر کے آئین میں بڑھتی ہوئی آسائشوں اور کھیلنے ہوئے چار بچوں کو دیکھا، جتنا وہ بچوں کو دیکھ کر نہال ہوتی اتنا ہی اسے دولت کی ریل پیل ہر اسان کرتی تھی..... گھر میں ہر طرح کی آسائشیں تھیں، عمر اسے بتاتا کہ اس کی ترقی بہت تیزی سے ہو رہی تھی۔ اسے اپنے بیٹے پر یقین تھا، دل ہی دل میں اسے دعا کیں دیتی، مونا کی قسمت پر نازاں ہوتی کہ اس کی قسمت سے اس کے بیٹے پر بہن برس رہا تھا اور اس کی اتنی تیزی سے ترقی ہو رہی تھی۔

کبھی کبھار پرانے محلے جاتی تو جاننے والے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کے بیٹے کے پاس راتوں

ماہی و مہرنگی سرسبکی شاہیں
تازہ و شامیے کی بہت رنگی بہاریں

تیسرے صدارت میں رہنا ہونے والی سیاست و رہنمائی تبدیلیوں کے
تخیر انگیز اثرات..... ایچ اقبال کے قلم سے سونات۔

انگاریے ● شریف آدمی کو بدعاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن معاشرتی یکجہائی
جنم لینے والا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید مغل کے قلم سے

آوازہ گرد ● چچلائی: محبوب میں بیے آسرا و تہا مسافر کی آبلہ پانی....
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سیرورق کی کہانیاں

پھلا رنگ ● زندگی کے سفر میں کھیلنے والوں کے قدم میں غنی مٹی تجربہ کے بیج و غم.....

دوسرا رنگ ● معاشرے کی نکاس ایک تیز رفتار کہانی آگے بڑھنے والوں کی اولاد آئینہ



پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

مزید گزرنے سے بچالے گی۔ ”کیا دوسرے کنویں میں چھلانگ لگائیں تو تم بھی لگا دو گے؟“

”میں کوئی ایسا بے عقل نہیں ہوں کہ کوئی کنویں میں چھلانگ لگائے تو اس کی تقلید کروں.....“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ کنویں میں چھلانگ لگانے سے جان جاسکتی ہے۔“

”یہ بھی تو کنواں ہی ہے بیٹا بلکہ دلدل ہے..... برائی کا راستہ کنویں اور دلدل سے بدتر ہے، اس میں سراسر نقصان ہی نقصان ہے، صرف جان ہی اہم نہیں ہوتی بیٹا، کردار بھی اہم ہوتا ہے، عزت بھی اہم ہوتی ہے، شرافت بھی اہم ہوتی ہے!“

”اب ایسے پتھر نہ دیں اماں جان!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی میں نے کبھی عمر بھر خواہش کی ہو گی نہ سوچا ہو گا کہ مجھے مل سکتا ہے! کیا میرے حالات پہلے سے بہتر نہیں ہوئے۔ جیسے آج کل سب کے ہیں۔ جس کے پاس پیسہ ہے، بڑا گھر ہے، گاڑی ہے اور اس کے بچے بہترین اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ عزت اسی کی ہے اور لوگ اسی کو سلام کرتے ہیں۔“

”یہ سراسر گھمانے کا سوا ہے بیٹا، جو کچھ تمہارے پاس نہیں تھا اس کی تمہیں کبھی خواہش بھی نہیں ہوتی تھی، تم نے ساری عمر قناعت کے ساتھ بسر کی ہے، خواہشیں بھی اتنی ہی تھیں جتنا ہمارا اختیار تھا۔ یوں کرنے لگو تو کوئی انت نہیں ہے، اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔“ اس نے اسے پیار سے سمجھایا۔

”کیا سنبھل جاؤں اماں جان؟“ اس نے ان کی طرف دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

”اب بھی حرام سے باز آ جاؤ، اپنی اولاد کو حلال کھلاؤ تا کہ تمہیں پچھتاوانہ پڑے.....“

”کیا میں اپنے بچوں کو اچھے اسکولوں سے اٹھا کر سرکاری اسکولوں میں ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھنے کے لیے بھیجنا شروع کروں جیسے کہ میں نے پڑھا ہے؟“

”تو تم پڑھ ہی گئے ناں بیٹا!“

”کیا پڑھ گیا..... کیا کر رہا ہوں..... کلر کی؟ ہونہہ!“ اس نے پتھر کر کہا۔ ”مجھے تو لوگوں میں اٹھتے بیٹھے شرم آتی ہے جب وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں کس اسکول یا کالج میں پڑھتا تھا، کس جگہ رہتا تھا..... سارا ماضی شرمندگی ہی شرمندگی ہے اماں جان!“

”تو یہ تو نصیب کی بات ہے بیٹا، پیدا کہاں ہوئے، کس کی اولاد ہو، اس پر کسی کا کیا اختیار، میں نے محنت کر کے تمہیں کھلایا اور پڑھایا لکھایا، تمہارے ابا جان بھی ایک نیک اور شریف انسان تھے، لوگ ان کی شرافت کی قسمیں کھاتے تھے، چھوٹا سا ذاتی کاروبار تھا، اس میں بھی فقط گھر کا گزارہ ہی چلتا تھا مگر میں نے اسی میں گزارہ کیا، کبھی زیادہ کی خواہش کی نہ انہیں غلط کاموں پر مجبور کیا..... جو تم اپنے جیسوں میں اٹھو بیٹھو تو تمہیں اپنے ماضی پر کوئی شرمندگی نہ ہو، جب تم نے دوستیاں ہی ایسے لوگوں سے لگائی ہیں جو تمہیں غلط کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں تو وہ تو ایسا ہی کریں گے ناں بیٹا!“

”اب تو جو ہے اماں جان سو ہے!“

”دنیا کے عارضی فائدے کے لیے تم دائمی دنیا کے لیے سراسر نقصان کا سودا کر رہے ہو.....“ پھر پیار سے اس کے سر کو سہلایا۔ ”جو تکالیف ایسے غلط کاموں کے نتیجے میں ہمیں آخرت میں جھیلنا ہیں اس کے مقابلے میں دنیا کی سختیاں تو کچھ بھی نہیں ہیں..... ہم تھوڑا کھالیں گے، بھوکے رہ لیں گے، بچوں کو تم اپنی تنخواہ، گھر کے کرائے اور میری کیشیوں کی رقم سے جہاں چاہے پڑھاؤ..... انہیں حرام کے لقمے سے بچاؤ، مونا بھی یقیناً میری حامی ہوگی، تم اس سے بات کرو تو وہ بھی تم سے یہی کہے گی!“

”اس کے باپ نے اپنی بیٹی کو کسی غریب گھر میں سڑنے کے لیے نہیں بیٹھا تھا اماں جان..... وہ ہمیشہ سے آسانوں کی عاوی سے اور میرے ساتھ ہی لیے رہ رہی ہے کہ اسے وہ سب کچھ میسر ہے جو اپنے باپ کے گھر پر میسر تھا، اپنے بیوی بچوں کے لیے آسانوں

اس روز اس کے ساتھ ڈرائیور تھا نہ گاڑی بلکہ وہ ٹیکسی پر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کالا بیگ تھا، وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا، ماں کی نظر تو اولاد کے چہرے سے اس کے اندر تک بھانپ لیتی ہے۔۔۔۔۔

”تم ٹھیک ہونا بیٹا؟“ اس نے سوال کیا۔
”ٹیکسی پر آئے ہو۔۔۔۔۔“

”وہ موٹا بچوں کو لے کر اپنے ابا کی طرف گئی ہے ماں!“ اسے بے فکری ہوئی اور وہ اٹھ کر چائے بنانے کو چل وی، چائے بنا کر لائی تو وہ اس کی چار پائی پر وارزور ہاتھ، ہلکے سے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

”بہت تھک گئے ہو کیا؟“ اس نے پیار سے پوچھا۔

”تھکا نہیں ہوں۔۔۔۔۔ بہت پریشان ہوں!“
چائے کا پہلا گھونٹ پیتے ہوئے اس نے کہا۔

”خیریت ہے ناں میرے لعل، میری جان!“

”موٹا ناراض ہو کر چلی گئی ہے ماں جان!“

”ہو جاتا ہے بیٹا، میاں بیوی کے درمیان سو

چھوٹی، چھوٹی باتیں ہو جاتی ہیں، چار دن میں ماں کر

واپس آ جائے گی، تم اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے دو اور خود

بھی دو دن تیار ہو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ

اس کی اہمیت تمہاری زندگی میں کیا ہے۔۔۔۔۔“ انہوں

نے اس سے قطعی نہ پوچھا کہ وہ کیوں ناراض ہو کر گئی

تھی، میاں بیوی کے ذاتی معاملے میں انہیں دخل

اندازی کی عادت نہ تھی۔

”نہیں ماں جان۔۔۔۔۔ چھوٹی موٹی جھڑپوں پر وہ

گھر چھوڑ کر نہیں جاتی مگر اب معاملہ گھبر ہے!“ اس نے

چائے کا کپ خانی کر کے ٹرے میں رکھا۔ ”وہ واپس نہیں

آئے گی جب تک کہ میں اس کا مطالبہ نہیں مانوں گا۔“

”اب بھی اس کا کوئی مطالبہ ہے تم سے۔۔۔۔۔ اب

تک وہ یہ سمجھتی ہے کہ تم اس کے مطالبات نہیں

مانتے؟“ دل کا دکھ ان کے لبوں پر آ گیا۔

”بات ایک چھوٹے سے جھگڑے کی ہے ماں

جان جس میں میں سمجھتا ہوں کہ اسے میرا ساتھ دینا

چاہیے مگر وہ اپنے باپ کا ساتھ دے کر مجھ پر ناجائز دباؤ

دیا۔۔۔۔۔“

”ماں! ہمہ پناہ ہے۔۔۔۔۔“

”ماں! ہمہ پناہ ہے۔۔۔۔۔“

”ماں! ہمہ پناہ ہے۔۔۔۔۔“

”ماں! ہمہ پناہ ہے۔۔۔۔۔“

کے حصول کا یہ راستہ مجھے دکھایا بھی اس کے ابا جان نے ہی ہے، انہوں نے ہی میری مدد کی ہے مجھے یہ سکھانے میں کہ میری کرسی کی کیا اہمیت ہے اور میرے دستخط کی کیا قیمت!“

”کس لیے کرتے ہو ایسا بیٹا؟“ وہ سسکی۔

”آپ کے لیے اماں۔۔۔۔۔ موتا کے لیے۔۔۔۔۔“

بچوں کے لیے اور ظاہر ہے کہ اپنے لیے!“ اس نے

ایک، ایک لفظ پر زور دے کر کہا تو اس کی ڈھٹائی پر وہ

ساکت رہ گئی۔

”نہیں چاہیے مجھے یہ سب کچھ۔۔۔۔۔“ نہ صرف

اس نے کہا بلکہ اس نے ثابت بھی کر دکھایا اور واپس

اپنے گھر میں لوٹ گئی۔ اسے سوچ، سوچ کر گھن آنے لگی

کہ اس کے خون میں حرام کی آمیزش ہو گئی ہے اور وہ۔۔۔۔۔

لا علمی میں ہی سہی مگر حرام کھاتی رہی ہے۔۔۔۔۔ سوچتی کہ

کہاں غلطی ہوئی جو اس کی محنت ضائع ہو گئی، اس کے

بچے کو حلال اور حرام میں تمیز نہ رہی، کہاں ایسا برادقت

آیا کہ عزت کے معیار بدل گئے اور پیسہ ہی عزت کا

معیار ٹھہرا۔

عمر کے پاس کہاں وقت تھا جو اس کے پاس

باقاعدگی سے آتا، وہ تو وقت کے سر پٹ بھاگتے ہوئے

گھوڑے پر بیٹھ کر ”ترقی“ کی راہ پر گامزن تھا، کبھی

کبھار وقت ملتا تو ماں کے پاس کھڑے، کھڑے

چلا آتا، بہت منت سماجت کی کہ وہ گھر چھوڑ کر نہ جاتی

مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ پہلی بار وہ ملنے کو آیا تو ساتھ

میں پھل اور ماں کی دوائیں بھی لے کر آیا، اس نے کچھ

بھی لینے سے انکار کر دیا، اس کے دیے ہوئے کپڑے

جو تے تک وہ اس گھر سے ساتھ نہ لے کر آئی تھی، کیوں

اب جان بوجھ کر اس کے حرام میں سے حصہ وصولی۔

جب بھی اس کے پاس وقت ہوتا اور اسے ملنے کو

آتا تو وہ اسے سمجھانے سے باز نہ آتی مگر وہ ان سب

چیزوں سے بالا ہو چکا تھا مگر آخری بار اس کے پاس

چند دن پہلے ہی تو آیا تھا۔

☆☆☆

دیکھ کر خوف سے خشک ہو گئے تھے۔
 ”اس میں تین سولا لاکھ ہیں اماں جان!“ اس نے
 ہنس کر بتایا۔

”ارے یہ تو بہت بڑی رقم ہے، اتنی رقم کوئی
 انعام میں دیتا ہے بھلا؟“

”یہ رقم تو مجھے اور آپ کو بڑی لگتی ہے اماں
 جان.....“ اس نے ماں کی حیرت کا مذاق اڑایا۔

”اصل میں اس فائل کو دبا کر میرے سر اس پارٹی کے
 ساتھ پانچ کروڑ کا سودا کر رہے تھے، یعنی پانچ سولا لاکھ

اماں جان..... وہ اس دن چھٹی پر تھے اور میں ان کی
 سیٹ پر کام کر رہا تھا کہ یہ پارٹی آگئی، مجھے تو علم نہ تھا

کہ اندر خانے کیا چل رہا تھا، انہوں نے مجھ سے بات
 کی اور دو کروڑ کی پیش کش کی، میں نے تین کروڑ پر

اصرار کیا تو وہ تھوڑی جیل و حجت کے بعد مان گئے اور
 میں نے فائل ان کے حوالے کر دی۔ اس کے بدلے

میں انہوں نے حسب وعدہ یہ بیگ میری گاڑی میں
 اس وقت رکھوا دیا جب میں دفتر سے گھر کے لیے روانہ

ہوا تھا۔ میں نے اسے گاڑی کی ڈگی میں ہی رہنے دیا
 کہ اتنا بڑا بیگ کسی کی نظر سے چھپانا ممکن نہ تھا، میں

نے مونا کو بھی اس کے بارے میں بتا دیا تھا اور اس کے
 بعد ہم نے ڈرائیور کو گاڑی کی چابی نہ دی بلکہ جب

ہمیں کہیں جانا ہوتا تھا تو اسی وقت اس کے حوالے
 کرتے..... ایک دن موقع ملا اور مونا گھر پر نہ تھی تو میں

نے اس بیگ کو گھر میں چھپا دیا، مونا کو ابھی میں بتا بھی
 نہیں سکا تھا کہ اس کے والد کو علم ہو گیا کہ ان کی غیر

موجودگی میں کیا ہوا تھا اور جس فائل کو وہ پانچ کروڑ کے
 مطالبے پر دبا کر بیٹھے تھے وہ میں نے تین کروڑ میں

دے دی اور انہیں بتایا بھی نہیں..... وہ ہمارے گھر
 آئے، بہت جھگڑے اور دھمکیاں دیں کہ یہ کر دیں

گے اور وہ کر دیں گے۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکا۔
 ”مونا بھی انہی کی دکالت کر رہی تھی اور مجھ سے

کہہ رہی تھی کہ چاہے تین کروڑ ہی سہی مگر وہ رقم میں ان
 کو دے دوں..... مگر میں وہ رقم انہیں کیوں دیتا اماں

ڈال رہی ہے۔“ وہ بتا رہا تھا مگر انہوں نے پھر بھی سوال
 نہ کیا، معاملہ اس کا اور اس کے سر کا تھا، انہیں کیا معلوم
 کہ کیا معاملہ تھا اور کون درست تھا اور کون غلط وہ خاموش تھیں۔

”آپ ہی بتائیں اماں جان کہ داماد اور سر کے
 مابین تنازع ہو تو بیوی کو کس کا ساتھ دینا چاہیے؟“

”مم..... میں کیا بتاؤں بیٹا، میں نے تو اپنی
 زندگی میں کبھی ایسی صورت حال اس سے پہلے سنی ہی

نہیں!“ انہوں نے حیرت سے کہا۔ ”مگر تمہارے اور
 تمہارے سر کے بیچ تو بڑی گاڑھی چھنتی ہے، تم دونوں

میں کیوں جھگڑا ہوا؟“ اس نے سوال کیا۔
 ”پیسہ انسان کو اچھے، اچھے رشتوں کی پہچان بھلا

دیتا ہے اماں جان، ان کی مجھ پر عنایتیں اور نوازشیں
 اپنی جگہ مگر جہاں ان کے اپنے مفاد کی بات آئی ہے

وہاں انہوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں!“ اس نے بتانا
 شروع کیا۔ ”یہ بیگ دیکھ رہی ہیں آپ؟“ اس نے

بیگ کی طرف اشارہ کیا جس کے بارے میں وہ سمجھ
 رہی تھی کہ وہ سامان سمیت اس کے پاس آ گیا ہے

تاکہ وہ مونا کو اپنی ناراضی دکھا سکے۔ ”اس میں اس
 وقت کچھ رقم ہے، وہی ہم دونوں کے بیچ وجہ تنازع بن

گئی ہے۔“ اس نے اٹھ کر بیگ جا رہا پائی پر رکھا اور اس
 کی زپ کھولی تو صالحہ کی سانسں رک گئی۔

”یہ کس کی رقم ہے اور کتنی ہے؟“ اس کے منہ
 سے بے اختیار نکلا۔

”اس بیگ میں تین کروڑ روپے ہیں اماں
 جان.....“ صالحہ کو اتنی رقم کی وقعت کا بھی اندازہ نہ تھا۔

”اور کس کے ہیں؟ یہی تو سوال اور جھگڑے کی بنیاد ہے۔“
 ”یہ کیا رشوت کا پیسہ ہے؟“ وہ ہکلائی۔

”ارے میری بھولی اماں جان، ایک پارٹی کا
 بیس کروڑ کا سودا پھنسا ہوا ہے، میں نے تو بس ان کی

فائل ڈھونڈ کر دی ہے ان کو تو انہوں نے مجھے انعام میں
 تین کروڑ دے دیے۔“ اس نے فخر سے بتایا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے..... اس میں کتنے لاکھ
 روپے ہوں گے بیٹا؟“ اس کے ہونٹ بھی اس رقم کے

گئے؟ خوشی سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اس ولدل سے گلنا اتنا آسان نہیں ہے اماں جان!“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ ”نہ ہی مجھے عادت رہی ہے عیش و آرام کے بغیر زندگی گزارنے کی، چند دن کی بات ہے جب میں اپنے سر سے بات کر لوں گا تو..... ویسے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کوشش ضرور کروں گا!“ آخری بات اس نے محض ماں کو خوش رکھنے کے لیے کی تھی۔ ”اصل میں مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے سر مجھے رشوت لینے کے الزام میں پکڑ واندیں!“

”تو رشوت لینا کیا جرم سمجھا جاتا ہے؟“ انہوں نے حیرت سے کہا۔ ”مگر تم تو کہتے تھے کہ سب لیتے ہیں۔“

”جرم ہے اماں جان قانون کی کتابوں میں، حالانکہ آج کل تو ہر کوئی رشوت لے رہا ہے، قانون بنانے والے بھی اور قانون کے رکوالے بھی، بس سزا سے ہوتی ہے جو پکڑا جاتا ہے یا پھر دوسروں کا حصہ نہیں دیتا! سزا میں بھی بڑی سخت ہیں، کئی سال کی جیل ہو سکتی ہے، نوکری تو جاتی ہی ہے۔“ وہ اپنی بات کر کے بیک اندر کمرے میں رکھ کر چلا گیا اور ان کی سوچ کو ایک نئی جہت دے گیا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے اپنی سفید چادر اوڑھی، گھر کو تالا لگایا اور پیدل ہی چل دی، جہاں اسے جانا تھا وہ گھر زیادہ دور بھی نہ تھا! وہ گھر ایک ریٹائرڈ جج کا تھا، وہ اپنے زمانے کے بڑے ایماندار جج مشہور تھے۔ صالحان کی بیبیوں کے کپڑے سیتی تھی اس لیے جانتی تھی، ان کے چار بیٹے تھے جن میں سے ایک ڈاکٹر، ایک وکیل، ایک پولیس میں ڈی ایس پی تھا اور چھوٹا فوج میں کپتان تھا، انتہائی عزت دار گھرانہ تھا..... ان کے ہاں پہنچ کر شربت کا گلاس پیا اور جج صاحب کی بیگم سے کہا کہ وہ جج صاحب سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے..... انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا تو مگر انہیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ (اس کے بعد کی کہانی کی تفصیل میں ماننا غیر ضروری ہے)

جان! آج میں دفتر میں تھا کہ مجھے ملازم نے فون کر کے بتایا کہ مونا گھر سے اپنا زیور وغیرہ لے کر بچوں سمیت چلی گئی ہے، اپنی دانست میں وہ گاڑی ساتھ لے کر گئی ہے کہ شاید اس میں وہ تین کروڑ رکھا ہوا ہے، میں فوراً دفتر سے اٹھا اور جس ٹیکسی پر دفتر سے گھر آیا تھا اسی میں یہ بیگ لے کر یہاں آ گیا ہوں..... اب مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے اماں جان!“

”میرا مدد؟“ انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”مونا سمجھ رہی ہوگی کہ میں ابھی تک دفتر میں ہوں اور ممکن ہے کہ جب اسے ڈنگی میں یہ بیگ نہیں ملے گا تو وہ واپس اپنے گھر کی تلاشی لینے ضرور آئے گی، آپ کا گھر وہ واحد جگہ ہے جہاں کے بارے میں اسے شک تک نہیں ہوگا، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کے حوالے یہ امانت کروں تاکہ کچھ وقت گزر جائے، میں مونا کو بھی سمجھا لوں گا اور اپنے سر سے بھی بات کر لوں گا..... حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو میں یہ بیگ آ کر آپ سے لے لوں گا؟“

”اتنی بڑی رقم..... نہیں بیٹا، میرا گھر تو قطعی محفوظ نہیں ہے!“

”ایسی ہی جگہ سب سے محفوظ ہوتی ہے اماں جان جہاں لوگوں کو علم ہو کہ آپ جیسی مفلس عورت تنہا رہتی ہے، میں جانتا ہوں کہ اس رقم کے لیے اس وقت اس سے بڑھ کر محفوظ جگہ کوئی نہیں ہے۔“

”لیکن میں اس حرام مال کو اپنے گھر میں کیوں رکھوں، جانے کس وقت میرا دم نکل جائے اور لوگ سمجھیں کہ میں حرام کاموں میں تمہاری شراکت دار رہی ہوں۔“ اس نے حجت کی۔

”ایک بار اماں جان!“ اس نے ان کے سامنے ہاتھ باندھے۔ ”ایک بار میرے لیے.....“

”تو کیا تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ تم اس برائی کی ولدل سے نکل آؤ گے، یہ رقم بھی اس کے مالکوں کو واپس کر دو گے اور آئندہ رشوت لینے سے توبہ کر لو“

رشتہ کی بنی ہوئی پوری کہانی کے سرے جوڑنا، رشوت کا مال، مجرم کے گھر کے حالات اور مجرم کی والدہ کی گواہی اس کے خلاف جاتی تھی، اس کی بیوی اور سر بھی اس سے نالاں تھے اس لیے اعزازہ کرنا دشوار نہ تھا، اس کے سر کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا کیونکہ عمر نے ان کے خلاف بھی بہت سے ثبوت فراہم کیے تھے..... رشوت دینے والی پارٹی کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا، مہینوں کیس چلا اور عمر اور اس کے سر کو قید اور جرمانے کی سزا ہو گئی، جرمانہ ادا کر سکنے کی صورت میں مدت قید بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”تم نے اپنے ہی بیٹے کے خلاف گواہی کیوں دی صالحہ؟“ جج صاحب نے اس سے پوچھا تھا۔ ”تم جانتی بھی ہو کہ اس جرم میں اسے کئی سال کی قید کی سزا ہو سکتی ہے؟“

”مجرم کوئی بھی ہو، مجرم ہی رہتا ہے..... رشتوں کی ڈور اگرچہ ہمیں اعانت جرم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ خاموشی اور پردہ داری سب سے بڑی اعانت جرم ہے، میں نے اپنے بیٹے کو ہر طریقے سے اس آگ سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آیا، اب بھی کہتا تھا کہ اس راہ کو چھوڑنا مشکل ہے، اس کے خلاف میرے پاس مکمل ثبوت موجود ہے، پہلے تو میں لوگوں کی زبانی سنتی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ رشوت صرف اللہ کی نظر میں ہی نہیں بلکہ اس ملک کے قانون کے مطابق بھی قابل سزا جرم ہے۔“

”کس طرح رہو گی اس کے بغیر؟“

”میں تو اب بھی تنہا ہی رہتی ہوں..... بلکہ میں تنہا تو ہوں ہی نہیں، میرا اللہ ہمہ وقت میرے ساتھ ہے، اسی نے میری اس معاملے میں بھی راہنمائی کی۔“

”اس کے بیوی بچے اسے چھوڑ دیں گے جب انہیں وہ تمام تہمتیں میسر نہ ہوں گے..... جب تک وہ باہر آئے گا، اگر تم زندہ بھی ہوئیں تو وہ تمہیں لٹے تک نہیں آئے گا، جس طرح تم بتا رہی ہو کہ اس نے تمہیں کتنی حقارت سے کہا ہے کہ تم دوبارہ اسے اپنی شکل تک نہ دکھانا۔“

بیوی نے تو ایوں بھی دنیاوی اور عارضی رشتے ہیں، میں تو اس کی ماں ہوں، اس جہاں میں نہ سہی، اگلے جہاں میں اس سے مل لوں گی۔“ اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

”تمہیں کس جذبے نے ایسا کرنے پر مجبور کیا؟“ سوال کیا گیا۔

”جج صاحب..... میں اس کی طرف دیکھتی تھی تو مجھے اس کے گرد آگ کی لپٹیں نظر آتی تھیں، میں خوف زدہ ہو جاتی تھی، سوچتی تھی کہ عمر بھر غلط کام نہ کیا اور ہمیشہ اس کے عوض جنت کی خواہش کی، جانے کہاں غلطی ہوئی جو اولاد بھنگ گئی، غلط راستے پر چل نکلی، اچھا ہے کہ مونا جیسی بیوی جو خداوند کی دنیا اور آخرت خراب کرے اس سے اسے چھٹکارا مل جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کا کوئی اور بہتر نعم البدل عطا کرے گا۔ میں اس کے باپ کو روز جزا کیا بتاتی، اللہ کو کیا منہ دکھاتی اور خود کیسے جنت میں جاتی جب میرا بیٹا آگ کی لپٹوں میں ہوتا!“

”تمہیں لگتا ہے کہ اب وہ غلط کام چھوڑ دے گا؟“

”اللہ تعالیٰ نے اسے موقع تو دیا ہے سمجھنے، توبہ کرنے اور گزرے وقت کی معافی مانگنے کا، اب بھی اگر وہ نہیں سدھرے گا تو کم از کم میں تو سرخرو ہوں گی ماں کہ میں نے تو ماں کی ممتا کی بھی قربانی دے دی تھی۔“

”اللہ ہر ماں کو تم جیسی سوچ اور عمل عطا کرے!“

جج صاحب کی بیگم نے کہا۔

”آمین!“ جج صاحب کے گھر والوں کی آوازیں آئیں، وہ سب بیٹھے ان دونوں کے بیچ کی گفتگو سن رہے تھے..... صالحہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور چادر سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھو ناں صالحہ!“ جج صاحب کی بیگم نے اصرار کیا۔

”چلتی ہوں آپاجی، عمر کی جو پونجی بیچ گئی ہے اسے پورا صرف کرنا ہے بیٹے کے لیے ہدایت کی دعا کرنے میں، شاید کوئی قبولیت کی گھڑی ہو جو میں باتوں میں گنوا بیٹھوں!“ سلام کر کے وہ اپنے گھر کو چل دی۔

سیٹھی

ہاجرہ رحمان

کس قدر تیزی اور نفاست سے میں تمہارے
کمال پر تھپڑ مار چکی تھی کہ خود بھی حیران کھڑی رہ گئی
تھی..... تم لمبے بھی تو بہت ہو..... ایک زمانہ تھا جب
میں تم کو پہروں بے نکان سوچا کرتی تھی کہ ہم دونوں کی
اگر شادی ہو گئی تو کتنا مشکل ہوگا میرا تمہارے گلے میں
بانہیں ڈالنا..... تم کچھ ایسے ہی لمبے ہو..... پھر میں تھک
بار کر سوچتی کہ تم کو کسی سیٹھی پر خود سے دو چار قدم نیچے
کھڑا کرو یا کروں گی..... تب ہی ممکن ہوگا کہ تمہارے

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 151 ﴾ نومبر 2016ء

گلے سے جمول سکوں..... اور یہاں تک پہنچتے ہیں شریا جاتی..... مگر آج تمہارا قد بھی میرے ہاتھ کی تیزی سے نہ بچ سکا..... پتھر ایسا شدید تھا کہ تم دو قدم پیچھے ہٹ گئے..... لفظ منہ میں کہیں دب کر رہ گئے..... تمہاری بیوی جو زبان درازی کی حد تک تھوڑی ہی در پہلے تم سے لڑ رہی تھی..... میرے اور تمہارے درمیان آگئی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی..... دو نکلے کی عورت.....؟“ اس نے نخوت سے مجھے دھکارتے ہوئے پھینکا..... اور پھر تمہارے تیزی سے پلٹ جانے پر خود بھی تمہارے ساتھ تیز، تیز قدم اٹھاتی ریٹورنٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

”یہ تو سراسر زیادتی ہے۔“ میں نے دل میں سوچا..... پہلے بھی تم مجھے اسی طرح پوری دنیا کے سامنے تنہا چھوڑ گئے تھے..... خود تو تیز، تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے تھے جبکہ میں بیچاری دو نکلے کی عورت..... لوگوں کے سوالوں کے جوابات تک کی سکت نہ رکھتے ہوئے بھی ان کے ہی درمیان زندگی گزارتی رہی تھی..... اور آج پھر تم مجھے یوں اکیلا اس ریٹورنٹ میں بیٹھے، کھڑے، کھاتے، بیٹے کئی لوگوں کی حیران نظروں میں اکیلا چھوڑ گئے..... بچپن میں بھی ایک اسٹیج ڈراما دیکھا تھا..... ڈراما ہوا، کرداروں نے اپنا، اپنا کردار ادا کیا اور چلتے بنے..... جبکہ تماش بین ابھی آہستہ، آہستہ جا رہے تھے..... ایک تنہا اکیلے گھسے ہوئے قد کے آدمی نے اسٹیج پر سب سامان کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا..... وہ جس نے تلے انداز میں سامان سمیٹ رہا تھا مجھے لگا کہ وہ بھی ایک کردار ہی تو ہے اور اپنے وقت پر اپنا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ ڈرامے کا ڈرامپ سن تو سیٹھ جانے پر ہوتا ہے اور میں..... میں بھی ڈرامے کے مکمل ہو جانے کے بعد..... ایک، ایک کردار کے واک آؤٹ کر جانے کے بعد..... آخر میں اسٹیج پر جا کر صرف سمیٹی ہوں..... کبھی گالیاں، کبھی طعنے..... اور بہت سی رسوائیاں اور پھر..... اب سوچتی ہوں..... اور پھر..... کے بارے میں تو کانپ جاتی ہوں..... کیا

ماہنامہ پاکیزہ، 152، نومبر 2016ء

دوبارہ میں وہی اکیلا بن رہا، رسوائی برداشت کر سکوں گی؟ میں نے اپنی قید کے سات سال بہت جانفشانی اور خاموشی سے کاٹے ہیں کہ اگر اب بھی نہ بولتی تو شاید ساری عمر گونگی رہ جاتی..... جب ہم ایک دوسرے کے عشق میں تھے، نئے گرفتار ہوئے تھے کیا سہانے، مسلسل بول چال، ہنسنے کھیلنے کے دن تھے..... تم کو ہمیشہ امریکا جا کر بس رہنے کا شوق تھا۔ اور وہاں جا کر اچھا کمانے، اچھا کھانے، تعطیلات پاکستان میں منانے، خود کو منوانے..... سب کے سامنے سرخرو ہونے جیسے تمہارے ہر خواب پر میں مسکرا کر رہ جاتی..... کبھی کبھی دل ہوتا بھی کہ تم سے پوچھوں کہ ان سب میں، میں کہاں ہوں..... اچھا ہوتا کہ اسی وقت پوچھ لیتی کیونکہ بعد میں مجھ پر تمہارے لیے اپنے ہونے اور نہ ہونے کے ایک برابر کا سا جو احساس ہوا تھا وہ بڑا جان لیوا تھا۔ میرے منہ سے سسکی نکل گئی..... چلو یوں بھی ٹھیک ہے، یوں بھی سب اچھا تھا اگر تم مجھے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے..... مگر کیسے خود کو سمجھاؤں کہ تم مجھے صرف نظر انداز کر کے تو آگے نہیں بڑھے..... تم نے مجھے باقاعدہ سیرھی بنایا..... میری محبت، میری وفاء، میری سادگی کا مذاق اڑایا، میں کہتی ہوں کہ کیا ضروری تھا کہ تمہاری عقابانی نظر پورے خاندان کی لڑکیوں کو چھوڑ کر مجھ پر ہی پڑتی؟ کیا ضروری تھا کہ مجھے تم پر یقین بھی آجاتا.....؟ کیا ضروری ہی تھا کہ تم مجھے خواب دکھاتے۔ وہ خواب جو صرف تمہارے تھے، میں، میں تو بس ایک سیرھی تھی..... اور یہ وہی سیرھی ہے جو اوپر کی طرف جانی ہے تو نیچے بھی یہی اترتی ہے۔ مگر معافی چاہتی ہوں، میں ایک سیرھی تو ہوں، تمہاری ترقی میں سانسٹی بن کر تمہیں اوپر تو پہنچایا ہے مگر تمہارے زوال میں تم کو نیچے واپس زمین تک پہنچانے کا سہرا میں اپنے سر ہرگز نہیں لوں گی۔

جب تم نے پہلی بار مجھ سے مدد طلب کی تھی اس وقت تک تو مجھے تم پر پورا، پورا اعتبار تھا..... اس وقت تک تو میں تم پر سب کچھ لٹا دینے سے دریغ نہیں کرتی

میں سکرانی رہی اور میرے یہ پوچھنے پر کہہ اٹھا کہ تم بڑھائی کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتے اس طرح تم بھی کسی امریکا کی یونیورسٹی میں اپلائی کرو تو بابا جانی خوشی سے تم کو بھیجیں گے..... تم آگ بگولہ ہو جاتے، مل کھاتے جو واپس جاتے تو کئی دن تک نہیں آتے تھے۔ مجھے کھانسی کے جان لیوا قسم کے دورے پڑنے لگے تھے..... میں کھانس، کھانس کر ادھ مری ہو جاتی..... بستر پر گر کر خود سے بیگانی ہو جاتی.....

تھی..... سب کچھ لٹا کر ہی تو ہوش میں آئی..... تم نے مجھے بتایا کہ کس طرح تمہاری ایک ایجنٹ سے بات ہوئی ہے اور وہ تمہیں امریکا کا ویزا دلوانے پر راضی ہے..... بس کچھ اتنی رقم چاہیے تھی جو تمہاری بیوہ ماں سے حاصل ہونے کی تمہیں کوئی امید نہیں تھی..... تم روز، روز میرے پاس آنے لگے..... ہر دوپہر میرے گھر پر گزارنے لگے..... تمہاری بے چینی، تمہاری لگن، تمہارا نشہ ہم سب نے محسوس کر لیا تھا..... بابا جانی ملک سے باہر ہو کر بھی تم کو کئی بار سمجھا چکے تھے کہ اگرچہ تم ان کی سگی بڑی بہن کے بیٹے ہو مگر پہلے بڑھائی مکمل کرو اور اپنا راستہ خود بناؤ..... صرف امریکا میں کیا رکھا ہے لوگ یہاں بھی تو جتے ہیں..... بیوہ ماں کو بڑھاپے میں چھوڑ جانا کہاں کی نظنندی کہاں کی ترقی ہے۔ مگر تمہاری بے چینی کسی طور کم نہ ہوتی تھی..... میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹی تھی..... عمر کے لحاظ سے تم میرے سب سے بڑے بھائی سے صرف دو سال چھوٹے تھے..... ہم دونوں کی عمروں میں ہی نہیں عقل و شعور میں بھی واضح فرق تھا..... اور مجھے یہ بات بہت بعد میں اپنی قید تمہائی کے دوران سمجھ آئی تھی کہ اس میں بھی تمہاری چال تھی..... ایک میں ہی بے وقوف پھنس سکتی تھی..... میری بڑی بہنیں تو تم کو اچھی طرح سے سمجھ چکی تھیں مگر بابا جانی کی تم سے انسیت کے باعث تمہیں ہمارے گھر میں آنے جانے کی کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی..... خاندان بھر میں ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھے جانے پر اب رشتے داروں نے بھی ہمیں ایسے ہی قبول کر لیا تھا۔

قارئین منوجہوں

پہچانیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارزار ہوگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

راہے اور مزید معلومات کے لیے

ٹھہر عباس 0301-2454188

جائے سوسائٹی ڈائجسٹ سلسلے کی

سپنس جا سوسائٹی پاکیزہ ہنگر گزشت

G-63 فی اے ایس ایس ڈیس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوٹ روڈ لاہور

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر کسی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

انہی دنوں کی بات ہے کہ میں نے لندن رائل یونیورسٹی میں پیچر آف کمپیوٹر سائنس کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تعلیمی ویزے کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا..... تم کئی دن تک ناراض رہے۔

”تو میں نہیں مرتا رہوں اور تم چلی جاؤ گی.....“ غصے سے مجھے آنکھیں دکھاتے۔ ”بس منع کرو..... صاف کہہ دو

اپنے بابا جانی سے کہ جہاں میں جاؤں گا وہیں تم جاؤ گی.....

تم فکر ہی کیوں کرتی ہو..... ہم امریکا جائیں گے اور خوب

کمائیں گے۔“

سارے گھر والے اسے میرا نازک بنا کر مذاق اڑاتے، امی مجھے غور سے دیکھا کرتیں..... مگر پھر بھی خاموش رہتیں..... اور اس دن ویزا انٹرویو کے لیے مجھے دیا گیا وقت میری کھانسی کی نذر ہو کر آہستہ آہستہ میری منگی سے پھسل رہا تھا..... میں بستر پر پڑی کئی بار خود کو مناجلی تھی کہ بس اب کی بار جو کھانسی آرہی ہے اس کے بعد اٹھ کھڑی ہوں گی..... میرے سر ہانے ہی میرا انٹرویو کال لیٹر پڑا تھا اور ایک نوٹوں سے بھرا لفافہ..... ای تمہیں اس وقت اچانک دیکھ کر کھل اٹھیں..... گھر میں کوئی اور نہیں تھا جو گاڑی چلا کر مجھے ایبھی لے جاتا..... اور ای سمجھ رہی تھیں کہ میں اس قابل نہیں کہ خود گاڑی چلا کر چلی جاؤں..... ای نے جلدی، جلدی تم کو ہدایات دینی شروع کر دیں۔

”دیکھو بیٹا..... پہلے اس آفس جانا..... یہ ایڈریس لکھا ہے، یہاں سے اس کو اس کا جو میڈیکل ہوا ہے اس کی رپورٹ لینی ہے۔ پھر تم اسے لے کر پونیورٹی کے لوکل آفس جانا جہاں یہ اپنی سال بھر کی فیس جمع کروا کر رسید لے گی..... یہ دونوں کا عند حفاظت سے اس کے ساتھ ہی ایبھی میں جانے ضروری ہیں۔ بس پھر پلیز بیٹا تم اس کو انٹرویو دلوا کر واپس لے آنا..... اس کی آج طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے..... بس ذرا خیال رکھنا۔“

امی تم کو ہدایات دیتی رہیں اور ساتھ کے ساتھ مجھے کسی نہ کسی طرح گاڑی میں بٹھا گئی تھیں..... اب یا د کرتی ہوں وہ دائرے میں گھومتا ہوا سا دن..... غبار وقت..... بادل، وہ کیا تھا جو میرے حواس پر سوار تھا..... تمہاری وہ گھورتی ہوئی میرا جائزہ لیتی ہوئی آنکھیں، تم نے شاید راستے میں کئی بار مجھے پکارا بھی تھا..... صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ میں ہوش میں بھی ہوں یا نہیں..... مگر میڈیکل سرٹیفکیٹ لینے تک تو میں ہوش میں ہی تھی..... خود ہی تو گاڑی سے نکل کر لائن میں لگ کر اپنا میڈیکل سرٹیفکیٹ ایک مہر لگے لفافے میں قید لے کر ڈرگ ہائی گاڑی تک آئی تھی..... اس کے بعد

شاید مجھے پھر سے کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا اور پھر تم، تم اس بادل، غبار میں نہیں چھپ گئے..... میں نے تمہاری آواز کئی بار سنی جیسے تم مجھے آواز صرف یہ دیکھنے کے لیے دے رہے ہو کہ میں ڈرانا تو نہیں کر رہی..... تمہارے آواز دینے پر ہوش میں تو نہیں آئی۔

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی..... امی کی آنکھیں رو، رو کر سوج چکی تھیں..... میں علاج کے بعد گھر آئی تو معلوم ہوا کہ گاڑی ہماری گلی کے باہر چھوڑ کر تم کہیں بغیر بتائے چلے گئے تھے۔ میں گاڑی میں کئی گھنٹے اکیلی بے ہوش پڑی رہی اور پھر کسی محلے والے نے مجھے یا ہماری گاڑی کو پہچان کر گھر پر اطلاع دی تھی..... میرے میڈیکل سرٹیفکیٹ کے ساتھ، ساتھ والا پیسوں والا لفافہ بھی غائب تھا..... ای نے پایا جانی کونون کر کے بتایا..... تمہاری گم شدگی پر پایا جانی نے ای کو خاموش رہنے کا کہا..... ان کا خیال تھا کہ تم ایسا کچھ کر ہی نہیں سکتے..... آخر کو ان کی بڑی بہن کے بیٹے ہو..... پایا جانی تم پر ایسا اعتماد کرتے تھے..... ہمارے گھر میں خاموشی چھا گئی۔ میں بھی اپنی بیماری میں ایسا گن تھی کہ مجھے کئی مہینوں تک کسی کے بارے میں بھی سوچنے کا موقع نہیں مل سکا تھا..... اور پھر ہمیں معلوم ہوا کہ تم امریکا روانہ ہو چکے ہو..... جو ای کو خدشہ تھا وہ صحیح ثابت ہونے پر بھی کوئی بھی خوش نہیں تھا..... پورے خاندان میں چہ گونیاں ہونے لگیں۔ ای کے پاس آنے والے رشتے داروں کا ایک ہی پسندیدہ موضوع بن گیا تھا..... میرا اور تمہارا..... تو اس کا اب کیا بنے گا..... تم ایسے گئے کہ پھر چار سال تک تمہارا کچھ پتا نہ چل سکا..... بڑی پھوپھی نے پایا جانی کو بہت دلا سے دیے تھے کہ تم اتنے بے وقاف نہیں ہو سکتے..... مجھ سے الگ ہو کر تمہارا کوئی وجود نہیں..... مگر یہ سب دلا سے ہی تھے..... چار سال بعد ہی ایک رشتے دار نے ہمیں اطلاع دی کہ تم وہاں شادی کر کے حراے میں ہو..... یوں تم تو اس بچ خالی کر کے چلے گئے اور میں بیماری اس تمام عرصے میں لوگوں کی چھتی ہوئی نظر یہ نظر اور کھنکھاتی زبان سے لکھے لکھتے ہی سمیٹتی رہی ہوں..... کیا

بیوی رتہ شورنت میں داخل ہوئی..... اس نے تم سے بے دریغ تیز، تیز آواز میں لڑنا شروع کر دیا..... اور تم دونوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ایک بار پھر تم مجھے سیڑھی بنا رہے تھے۔ تم دونوں کو ایک مکان خریدنے کے لیے بہت سا سرمایہ درکار تھا اور..... تمہاری بیوی نہیں جانتی تھی کہ میں ہی وہ سیڑھی ہوں جس پر چڑھ کر تم بیڑ سے لٹکے ہوئے روپے توڑ سکو گے..... وہ بھی تھی کہ میں تمہاری کوئی معمولی سی دوست ہوں جس کے ساتھ تم اپنا وقت خراب کر رہے ہو..... اس کے بقول اس وقت تو تم کو میرے گھر پر ہونا چاہیے تھا۔

مجھے شدید قسم کی مٹکی ہونے لگی جو میرے دورے کے شروع میں اکثر ہوتی تھی..... میں تم دونوں کی لڑائی سے گھبرا گئی اور عین اسی لمحے مجھے کھانسی کا شدید دورہ پڑنے لگا..... تم دونوں اب چپ حیران مجھے تکلیف سے دہرا ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے..... تمہاری بیوی نے تم سے ہمدردی سے پوچھا۔

”یہ تمہاری وہی سابقہ محبوبہ ہے کیا جس کوئی بی بی ہو گئی تھی جس کے باعث تم دکھ اور مجبوری میں اسے چھوڑ کر امریکا آ گئے تھے کہ بی بی کے مریضوں کو امریکا کا ویزا نہیں ملتا اور تم اسے مرنے نہیں دیکھ سکتے تھے..... تم نے اس کی میڈیکل رپورٹ بھی مجھے دکھائی تھی..... اور شاید ایک اسی دکھ نے ہم دونوں کو قریب کر دیا تھا..... کیا نام تھا..... اس کا؟“

اور کھانتے، کھانتے جیسے مجھے کسی غیبی طاقت نے پکڑ کر سیدھا کر دیا تھا..... میں جو تم سے قد میں بہت چھوٹی تھی اس ایک لمحے تم سے بھی قد میں بڑھ گئی جیسے کسی سیڑھی پر چڑھ گئی ہوں۔ اور پھر وہ زور وار تھپڑ..... میں بہت سے لوگوں کی حیران نظروں میں گھری کھڑی بے اختیار ہنسنے لگی..... جو سیڑھی آپ کو اوپر لے کر جاتی ہے وہی سیڑھی نیچے بھی..... اور بھی، کبھی نیچے جاتے ہوئے واپسی کے سفر پر آپ کو ایک عذر و دردار قسم کا تھپڑ بھی مار سکتی ہے۔

میری طبیعت کی ناسازی نے مجھے، گھر اور اس کے آرام سے باندھ دیا تھا..... میں خود اکیلے کہیں بھی جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی..... بی بی ایسی ہی کچھ لپچڑ بیماری ہے، ایک بار لگ جائے تو ہر دوڑھائی سال بعد پلٹ کر نئی قوت سے حملہ آور ہوتی ہے..... میں نے ان سات سالوں میں اپنی بیماری کے ساتھ، ساتھ تمہاری بے وقائی کو بھی بہت بہادری اور خاموشی سے نمٹایا..... کیا ہے تمہارے پاس جواز، کوئی حیلہ؟ کوئی بہانہ؟ اب جو تم اچانک پاکستان واپس آ گئے اور تمام رشتے داروں سے ایسے مل رہے تھے جیسے سب نے تم کو اپنی محبت اور خوشی کے زہرے سایہ ہی تو امریکاروانہ کیا تھا..... تم ایک بار پھر دھوکا دینے آئے ہو..... ہمارے خاندان نے جس طرح تمہاری بے رخی اور خود غرضی کو سہا ہے کیا اب ہم سے کسی بھی قسم کی اچھائی کی تو برابر بھی کہیں امید ہو سکتی ہے..... مگر تم نے پھر مجھے ہی سیڑھی بنایا..... پھر سے میرے راستے میرے خاندان میں گھسنے کی کوشش کی..... چلو یوں بھی ٹھیک تھا۔ میں نے تمہیں عرصہ ہوا معاف کر دیا..... امی اور بابا جانی ابھی تک تم کو بگڑا ہوا ”انوکھا لاڈلا“ ہی سمجھتے ہیں، تم میں صبر نہیں ہے، اسی لیے تم کو صبر آزما راستے سے بچانے کے لیے میں آج تم سے ملنے یہاں آئی تھی..... تمہاری بیوی کے قصے سن کر میں حیران تھی..... کس طرح اس نے تم کو قابو کیا، تمہارے بقول اس نے تم کو امریکا میں پاؤں جمانے میں مدد کی تھی اور اب تم اس کے اتنے مقروض ہو چکے ہو کہ چاہو بھی تو اس کو الگ نہیں کر سکتے..... تمہیں ہمارے رشتے کے یوں ٹوٹ جانے پر افسوس ہے..... تم خود کو اب تک معاف نہیں کر سکتے ہو اور اب بابا جانی اور امی سے مل کر ان سے معافی مانگنا چاہتے ہو..... یہ ساری باتیں مجھے مسرور تو نہیں مگر ہاں محسوس کر چکی تھیں۔ میں سر ہلا، ہلا کر تم کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ میں تمہارا کیس ضرور امی اور بابا جانی کے سامنے رکھوں گی کہ اچانک، تمہاری

Downloaded From Paksociety.com

معنی ناول

دوسرا حصہ

ہام کو عجب بے بدنام کیا

سیارضا ردا

کی کیفیت جان کر اس کا ٹریٹمنٹ کیا کرتی مگر اس وقت روزی نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اس پر رات بھر نیند نہ آنے کی وجہ سے بے چینی، تھکن اور کوفت طاری ہو چکی تھی۔ نیند کی ٹیمپلیٹ بھی اس پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ جھنجلا کر ڈرینگ ٹیبل پر سے چیزیں زمین پر پھینکنے لگی۔ اعزاز شاہ نے کسمسا کر کڑوٹ بدلتے ہوئے ذرا سی آنکھ کھول کر وانیہ کو دیکھا

وانیہ اعزاز نے جھنجلا کر موبائل فون بیڈ پر اچھال دیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ روزی اس کا فون اٹینڈ نہیں کر رہی تھی اور اب اس نے موبائل ہی آف کر دیا تھا جس پر وانیہ اعزاز کو تشویش ہونے کے ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ رات بھر سوئی نہیں تھی اور نیند بھی شاید آنکھوں سے روٹھ بیٹھی تھی جو ہزار جتن کرنے کے باوجود آ کر نہیں دی تھی، ایسے میں روری ہی تھی جو اس

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 156 ﴾ نومبر 2016ء

www.paksociety.com

Downloaded From
Paksociety.com



اس کے بعد پھر سو گئے۔ واپس کو ان کی یہ حرکت مزید غصہ ولا گئی تھی۔ اب وہ فرش پر پڑی چیزیں اٹھا کر انہیں کمرے میں ادھر ادھر پھینکنے لگی۔ جس سے اعزاز کی نیند میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ اعزاز شاہ کچھ دیر تو برداشت کرتے رہے پھر جھنجھلا کر اٹھ بیٹھے۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔ نہ خود سکون سے سوتی ہوں مجھے سونے دیتی ہو۔“

”میرا سکون تو تم برباد کر چکے ہو اور چاہتے ہو میں تمہیں سکون دوں.....؟ تو یہ تمہاری بھول ہے اعزاز شاہ.....“ وہ غصے سے چیخی تھی اور ایسا پہلی بار نہیں تھا، وہ شادی کی اولین رات سے لے کر اب تک ہر بات کا قصور وار اعزاز شاہ کو ہی ٹھہراتی آئی تھی اور اب بھی اس نے یہ ہی کیا تھا جبکہ سکون تو کسی اور نے چرایا تھا۔

”مجھے الزام دینے سے پہلے اپنے آپ کو دیکھو واپس بیٹھ۔“ اعزاز شاہ اسی کے انداز میں بولے۔ ”زندگی تو میرا برباد ہو گئی ہے تم سے شادی کر کے ون کو چین ہے نہ رات کو سکون.....“

”اور ہونا بھی نہیں چاہیے اعزاز شاہ..... کیونکہ مجھے تمہیں اذیت دے کر مزہ آتا ہے اور میری ذات کو تسکین اس وقت ملے گی جس وقت تم.....“ وہ قصداً بات ادھوری چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

کمرے کا دروازہ بہت زور دار آواز کے ساتھ بند ہوا تھا۔ اعزاز شاہ کی نیند اڑنے کے ساتھ ذہن پر بھی بوجھ آ گیا تھا۔ اعزاز شاہ نے گھر کے کشیدہ حالات کے باوجود کالج و یونیورسٹی لائف کو بہت انجوائے کیا تھا۔ وہ محفل کی جان تھے اور زندگی جیسے ان پر فدا تھی۔

دوستوں کے ساتھ پلنگ پر جانا، ہونٹنگ کرنا یہ صرف ان کا شوق ہی نہیں بلکہ ضرورت بھی تھی کیونکہ انہیں تنہائی سے خوف نہیں چڑھتی۔ اس لیے اعزاز شاہ نے پڑھائی کے ساتھ، ساتھ دیگر ایکٹیویٹیز میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انہوں نے اپنے دل کو بھی آزاد رکھا تھا لیکن کبھی کوئی لڑکی سیریس نہیں ہوتی تو کبھی کوئی ان

کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔

اعزاز شاہ اب بھی زندگی کو جینا چاہتے تھے مگر انہیں دنیا میں ہر رشتہ کھوکھلا اور خود پسندی کا لگتا..... اس لیے اعزاز شاہ نے دوستوں سے لے کر گھر کے ہر فرد سے خود کو الگ کر لیا تھا، انہیں تلاش تھی تو ایک مخلص دوست کی جو محض ان کی الجھی ہوئی زندگی کو سنبھالنے کی کوشش نہ کرے خود اعزاز شاہ جیسا ہرگز نہ ہو مگر ان کی ذات سے جڑا ہو۔ وہ اعزاز شاہ سے بات بے بات الجھے ضرور مگر پھر بھی ان کے ساتھ مخلص ہو۔

وہ واش روم سے فریش ہو کر نکلے تو موبائل فون بج رہا تھا۔ اعزاز شاہ نے بیڈ کارنر پر رکھا فون اٹھا کر اسکرین دیکھتے ہوئے لیس کا مٹن و باک رکان سے لگا لیا تو دوسری طرف سے کھٹکتی ہوئی آواز کے ساتھ شکوہ کیا گیا۔

”بہت دیر کروئی فون اینڈ کرنے میں ہے“
”ہمیں مظلوم نہیں تھا کہ آپ فون کر رہی ہیں، ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی۔“ اعزاز شاہ کا لہجہ کچھ دیر پہلے پیش آنے والے حالات سے بالکل مختلف تھا۔

”پھر آپ آرہے ہیں ناں..... اسی جگہ جوکل ہم نے طے کی تھی۔“

”جی بالکل.....“ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میں آپ سے ملنے کی تیاری میں ہی لگا ہوا ہوں۔“

”ارے میں تو بھی تھی کہ میں ہی بے مبری ہوں مگر آپ تو.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر خواہ مخواہ ہی ہنسی تھی اور اعزاز شاہ اس کی ہنسی کے جھڑنگ میں کھو گئے۔ وہ دل پھینک تو تھے ہی لیکن ساتھ ہی حسن پرست بھی بہت تھے۔ ان باتوں کے علاوہ اعزاز شاہ ہر لڑکی کو اپنے معیار کے ترازو میں تولتے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ دوستی کس حد تک آگے بڑھ سکتی ہے اور ابھی تک وہ ہر لڑکی سے پہلی اور آخری ملاقات کر کے ہی لوٹے تھے لیکن نہ جانے کیوں اس لڑکی سے بات کر کے انہیں اپنے اندر کا سناٹا ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اعزاز شاہ کو لگ رہا تھا جیسے یہ لڑکی ہر لحاظ سے ان کے

معیار پر پوری اترے گی اس لیے کافی دیر اسے فون پر ہی گفتگو میں الجھائے رکھا تھا۔

وانیہ نے ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھولا ایک نظر اعزاز شاہ کو دیکھا پھر فرش پر بکھری چیزوں کی طرف دیکھ کر نچوٹ سے سر جھٹک کر واش روم میں بند ہو گئی۔
اعزاز شاہ نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ وہ تو گفتگو میں اس قدر مگن تھے کہ انہوں نے کمرے میں اس کا آنا محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے ہی گفتگو کا اہتمام کر کے اپنی جگہ سے اٹھے ویسے ہی وانیہ واش روم سے کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ اعزاز شاہ نے سرسری سی نظر اسے دیکھا اور موبائل فون اور گاڑی کی چابی اٹھا کر کمرے سے نکلنے ہی لگے تھے کہ وانیہ کی آواز نے اُن کے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے تھے۔

”کسی ملازم سے کہہ کر روم کی صفائی کروادو۔“
”تم خود کیوں نہیں کر دیتیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اعزاز شاہ کی زبان سے جملہ پھسل گیا تھا۔ وانیہ نے خونخوار نظروں سے انہیں دیکھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس وقت اعزاز شاہ کا حشر بگاڑوے۔ اسے ویسے ہی رات بھر نیند نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے اسے ویسے ہی غصہ تھا اور اعزاز شاہ کے اس جملے نے مزید اس کے غصے کو ہوا دی تھی۔

”اعزاز شاہ تم.....“ وانیہ نے اس قدر ہی کہا تھا کہ اچانک موبائل فون بجتے سے اس کی ساری توجہ اسی طرف مرکوز ہو گئی اور روزی کا نمبر موبائل فون کی اسکرین پر دیکھتے ہی اس کا سارا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اعزاز شاہ بہت خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

ریبال کے لیے تشمیرہ کی غیر موجودگی کافی پریشان کن بات تھی۔ کیونکہ تشمیرہ بلا وجہ یونیورسٹی سے غیر حاضر نہیں ہوتی تھی اس لیے سرور کا من کی کلاس لینے کے بعد ریبال نے باہر آ کر تشمیرہ کو کال ملائی تو دوسری

طرف مسلسل بتل ہوئے پر جب اس نے فون ریسیو نہیں کیا تو ریبال کی تشویش بڑھ گئی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں کھڑا یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کہیں تشمیرہ کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔ ورنہ وہ کال ریسیو ضرور کرتی تھی۔ تشمیرہ سے رابطے کے لیے اس کے پاس صرف یہی موبائل نمبر موجود تھا ورنہ اس وقت تشمیرہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے نہ جانے کس، کس کو فون کر چکا ہوتا۔ اس وقت لائبریری جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے وہ اپنی بائیک کی طرف بڑھنے کے ساتھ مسلسل اس کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا اور دوسری جانب مسلسل بتل ہو رہی تھی۔ ریبال نے بائیک کے پاس پہنچ کر موبائل پینٹ کی جیب میں رکھا کہ اچانک فون بجنے لگا اس نے اسکرین پر نام دیکھے بغیر کال ریسیو کی۔
”کہاں تھیں تشمیرہ کب سے.....“

”ریبال.....“ دوسری طرف سے پکارا گیا تو وہ چونکنے کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

”امی کہہ رہی ہیں رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔“ عروج نے کہا تو وہ اچھا کہہ کر رہ گیا۔
”خالہ کو بھی لے کر آئیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ریبال نے کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔ ریبال نے کتنی بار اسے منج کیا تھا کہ وہ اسے فون نہیں کیا کرے لیکن نہ جانے وہ کس مٹی سے بنی ہوئی تھی جو اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا اور اب تو جب سے منگنی ہوئی تھی وہ دن میں ایک بار ضرور فون کرتی تھی کبھی خالہ کی طبیعت معلوم کرنے کی غرض سے تو کبھی کسی غیر معمولی کام کے لیے فون کرتی تھی اور اب ریبال نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ اس کے فون پر اندر ہی اندر جھنجھلا تا ضرور تھا لیکن اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ صرف اسے عاجز کرنے کے لیے ایسا کرتی ہے اور ریبال اس کی عادت جانتا تھا کہ وہ دوسروں کو تنگ کر کے مزہ لیا کرتی ہے خالہ زینب کے دونوں بچے ایسے ہی تھے۔ ضد، ہٹ دھرمی تو ان کی گٹھن میں شامل ہی نہ جانے کیوں

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

خالد اور خالو نے انہیں اتنی ذمیل دے رکھی تھی کہ عروج
 احمر کے دل میں جو آتا وہ وہی کرتے اور اپنے والدین
 کو تو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔

اور اب تو عروج کی ریبال سے معنی بھی ہو گئی
 تھی، اس رشتے کا ہی خیال کر کے وہ اپنے آپ کو
 سدھا رہتی مگر نہیں.....! وہ تو مزید بگڑ کر خود کو ریبال
 کے سامنے پیش کر رہی تھی۔ ریبال کے سامنے بغیر
 دوپٹے آ کر کھڑے ہو جانا..... بات بے بات اس پر
 طنز کرنا وغیرہ وغیرہ..... ریبال بھی شاید اپنی امی جی کی
 وجہ سے چیپ تھا ورنہ کب کا اس رشتے سے خود کو آزاد
 کر چکا ہوتا۔ اب بھی وہ خالد زینب کے گھر کے ہر فرد پر
 جھنجھلا تا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا کہ اچانک امی جی پر نظر
 پڑی تو محسن میں بانیگ کھڑی کرتا ہوا سیدھا وہ ان کے
 پاس محسن میں چلا آیا۔ امی جی اس وقت سالن بیچون
 رہی تھیں۔

”السلام علیکم.....“ ریبال نے سلام کیا تو امی جی
 چونکنے کے ساتھ سلام کا جواب دیتے ہوئے حیرت
 سے اسے دیکھنے لگیں۔

”تم اتنی جلدی کیسے آگئے؟“ وہ اس سے
 پوچھ بیٹھیں۔

”جانے کے دن جیسے، جیسے قریب آرہے ہیں،
 میں چاہتا ہوں زیادہ سے زیادہ وقت آپ کے ساتھ
 گزاروں۔“ وہ کہہ کر وہیں اسٹول پر بیٹھ گیا۔

”کیا پکار رہی ہیں؟“

”جو کہیں پسند ہے، منتر قیمہ.....“

”ہوں، مجھے تو بھوک لگنے لگی ہے۔“ ریبال نے
 کہا اور اس کا موبائل فون بجنے لگا تھا۔ اس نے پینٹ کی
 جیب سے فون نکال کر پہلے اسکرین پر نام دیکھا اس
 کے بعد کال ریسیو کر لی۔

”کہاں ہو تھمیرہ اور آج یونیورسٹی کیوں نہیں
 آئیں؟“ ریبال نے اپنے لہجے کی بے قراری و
 پریشانی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ امی جی نے ایک
 نظر میں اس کی کیفیت، جان لی تھی۔

☆☆☆

تھمیرہ نے ریبال سے بات کرنے کے بعد
 موبائل فون بیڈ پر رکھا اور خود کمرے سے نکل کر باہر آئی
 تو غیر معمولی خاموشی پر وہ ٹھکی تھی گوکہ اس گھر میں کوئی
 بہت زیادہ افراد نہیں تھے لیکن پھر بھی تائی جی کی چہل
 پہل اور بڑ بڑاہٹ پورے گھر میں سنائی دیتی تھی۔ اس
 وقت نہ جانے وہ کہاں تھیں۔ اس کے دل میں عجیب
 سے خوف نے دستک دینا شروع کر دی کیونکہ گھر میں
 جوان لڑکا بھی موجود تھا جس کے انداز و حرکات تھمیرہ کو
 ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ خوف سے دھڑکتے دل
 کے ساتھ محسن میں آئی تھی اور فرنیچ سے بوتل نکال کر
 واہس کمرے میں جانا چاہتی تھی کہ اچانک فاطمہ محسن
 کے دروازے پر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”ایک کپ چائے ملے گی؟“ اس کا دل چاہا کہ
 دے نہیں اور اسے دھکیل کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں
 بند ہو جائے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اثبات
 میں سر ہلا کر جلدی سے ایک برتن میں چائے کا پانی رکھ کر
 چولہا جلا کر پانی کے کھولنے کا انتظار کرنے لگی۔

فاطمہ اس سے بات کرنے کے لیے موضوع
 تلاش کرنے لگا وہ اتنی جلدی اسے اپنی آنکھوں سے
 اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ تھمیرہ بانو واحد لڑکی تھی
 جن سے بات کرنے کے لیے فاطمہ کمال کو مشکل پیش

آری تھی۔

”گھر میں اتنی خاموشی چھائی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔“

”تائی جی شاید سو رہی ہیں اور ویسے بھی تین افراد ہیں گھر میں خاموشی کا راج تو ہو گا ہی.....“ تشمیرہ کپ میں دودھ اور چینی ڈالنے کے ساتھ بولی۔

”تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی اس ماحول سے؟“ فاطرہ کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔

”گھبراہٹ کیسی، بچپن سے اس ماحول میں رہ رہی ہوں اب تو عادت ہو گئی ہے۔“

”مجھے تو بہت وحشت ہو رہی ہے۔“ تشمیرہ نے کن انکیوں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے سے وحشت صاف ظاہر تھی۔ وہ شاید خاموشی کا عادی نہیں تھا۔

تشمیرہ چائے کپ میں ڈالنے لگی... پھر چچ چلاتے ہوئے کپ فاطرہ کی طرف بڑھایا تو اس نے کپ اس کے ہاتھ سے لینے کے بجائے اس کا ہاتھ تھام لیا اور شیطانی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”ابھی کہیں مت جانا۔“

”کیوں.....؟“ تشمیرہ بانو نے اپنا ہاتھ پھراتے ہوئے بہت سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ اس وقت کمزور پڑ کر اس کی ہوس کا نشانہ بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس کے سامنے ڈنٹ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کی یہی ادا فاطرہ کمال کا دل چھو گئی تھی۔ اس لیے بجائے برمانے کے مسکرا کر بولا۔

”مجھے یہ تہائی مار ڈالے گی۔“

”تہائی سے بزدل مرتے ہیں۔“ وہ اپنے جملے کی بازگشت میں فاطرہ کو دھکیل کر کچن سے نکل کر میٹھیوں پھلانگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس کی سانسیں ناہموار ہو رہی تھیں۔ وہ دروازہ بند کرتی اپنے بیڈ پر آ کر ڈھم گئی۔ اسے فاطرہ کمال سے خوف آنے کے ساتھ اس پر غصہ بھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص سے کون طرح چھٹکارا حاصل کرے گی۔

تو اس کی ہمت صرف ہاتھ پکڑنے کی ہوئی تھی اگر تشمیرہ

بانو اس سے خائف ہو کر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی آئی تو نہ جانے بعد میں کیا کچھ کر گزرتا لیکن اب بھی تشمیرہ کو اس سے ڈرتھا۔ اسی لیے وہ آگے آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ وہ کوئی کمزور بزدل لڑکی نہیں تھی لیکن زندگی میں پہلی بار اسے اس طرح کی پھوٹیشن کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جہاں اسے اپنی ہی چار دیواری میں اپنی عزت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اور ابھی وہ اس حوالے سے تیار تھی سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی جگہ سے گھر کا ماحول خراب ہو اور فاطرہ کمال بھی ابھی حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ مگر تشمیرہ بانو کے ذہن میں بجتی خطرے کی گھنٹی آگے بہت کچھ ہونے کا احساس دل رہی تھی۔

فاطرہ کمال کو تشمیرہ کا جملہ اور اس کا انداز پسند آئے تھے کیونکہ وہ اب تک جتنی بھی لڑکیوں سے ملا تھا وہ بہ آسانی اس کے دام میں پھنس گئی تھیں۔ مردانہ وجاہت کی کشش کے ساتھ، ساتھ پیسے کی کمی نہ تھی۔ لیکن تشمیرہ بانو ان دونوں سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کے مقابل آکھڑی ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی میں ایسی ہی لڑکی تو چاہتا تھا لیکن اس وقت اس کے سر پر شیطان سوار تھا اس لیے وہ کسی بھی طرح اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں بالکل خاموشی ہونے کے ساتھ کسی اور وجود کا احساس بھی نہیں تھا۔ اور یہ موقع فاطرہ کمال کو بہتر ہی لگا کیونکہ اس وقت وہ تشمیرہ کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا، اس لیے وہ چائے کا کپ لیے تشمیرہ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا، اس کے چہرے پر عجیب مگر وہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے کمرے کے پاس پہنچ کر فاطرہ نے دو تین بار دستک دی تھی اور اندر تشمیرہ کچھ انہونی جان کر خاموش بیٹھی رہی کیونکہ تائی کی دستک کا یہ انداز نہ تھا جبکہ اس کا دل خوف سے حلق میں آ کر اٹک گیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود بھی چیخ کر تائی جی کو آواز نہیں دے پائی تھی اور دوسری طرف فاطرہ کمال اب دروازے کا ہینڈل گھما رہا تھا لیکن اندر سے دروازے کی گنڈی لگی ہونے کی وجہ

ماہنامہ پاکیزہ 161 نومبر 2016ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN



ظور پر گزارنے۔ آفس آنے کا کوئی نام مخصوص نہیں تھا لیکن جانے کا وقت مقرر تھا جہاں چار بجتے وہ آفس سے نکل جاتے چاہے کتنی ہی خاص میٹنگ کیوں نہ ہو وہ معذرت کر کے آفس سے نکل کر یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے اور جہاں سورج غروب ہوا وہاں سے خانے کا رخ کرتے۔

نئی زندگی کی ابتدا میں ہی انہیں باپ اور بیوی سے جو جملے سننے کو ملے تھے اس کی تپش وہ آج بھی اپنے کانوں کے ساتھ دماغ میں بھی محسوس کرتے تھے اور انہی کو بھولنے کے لیے اعزاز شاہ نے اس ممنوع شے کا سہارا لیا تھا۔

”میں نے سوچ لیا ہے مس ریحانہ۔“

”کیا سر.....؟“

”یہی کہ اب کسی بھی لڑکی سے بات کرنے سے پہلے اس سے اس کی عمر ضرور پوچھوں گا۔“

”سر پھر بھی آپ کا ہی نقصان ہوگا۔“ ریحانہ نے مستی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

”وہ ایسے سر..... کہ خواتین اپنی عمر چھپانے میں ماسٹر ہیں۔“ ریحانہ کی بات پر وہ محظوظ ہو کر نرسے۔

”یہ تو ہے مس ریحانہ.....“ اس سے پہلے کہ اعزاز شاہ کچھ اور کہتے ٹیلی فون کی بیل نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی انہوں نے پہلے ریحانہ کو جانے کا اشارہ کیا پھر فون کارڈ سے لگا لیا۔

”ہیلو.....“

”تمہارا موبائل کیوں آف ہے؟“ وانیہ اعزاز نے چھوٹے ہی پوچھا تو وہ ایک لمحے کو چوہے کے کیونکہ وہ اسے شاذ و نادر ہی فون کرتی تھی۔

”چارج نہیں ہوگا۔“ وہ سنبھلتے ہوئے بولے۔

”بہر حال میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں کچھ دنوں کے لیے لاہور جا رہی ہوں۔“ انہوں نے بھی اپنے گھر میں اس بات کا شکوہ نہیں کیا تھا کہ ان کی شریک حیات ان کے مزاج کے بالکل برعکس

سے اسے مایوسی ہوئی تھی اور وہ کچھ دیر اپنی ہی کوشش کرنے کے بعد واپس لوٹ گیا تھا..... لیکن مایوس نہیں ہوا تھا کیونکہ ابھی دوپہر کا ڈھلنا اور شام کا آنا باقی تھا کہ جب قاطر کمال اور شمیمہ بانو کو اس گھر میں کچھ وقت اکیلے گزارنا تھا۔

☆☆☆

”میں تو حیران ہوں مس ریحانہ کہ مجھے کہیں بھی اس کی آواز سے اس کی عمر پر شک نہیں ہوا۔“ اعزاز شاہ آفس میں بیٹھے ریحانہ کے ساتھ آج والی ڈیٹ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ کل جس لڑکی سے اعزاز شاہ نے فون پر بات کی تھی آج اس کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح آفس آنے کے بعد ریحانہ کو اپنے روم میں بلا کر اسے ساری روداد سنارہے تھے اور ریحانہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت شوق سے سن رہی تھی۔

”سر تقریباً کیا عمر ہوگی اس کی؟“

”بس زندگی کے اختتام پر ہی ہوگی۔“ اعزاز شاہ کی بر جھگی پر ریحانہ ہنستی چلی گئی۔

”پھر آپ نے کھانا کھایا یا ایسے ہی آگئے؟“ وہ سنبھل کر پوچھنے لگی۔

”ہاں بھئی اخلاق کا اتنا بڑا بھی نہیں ہوں کہ کسی کو ڈیٹ پر بلاؤں اور پسند نہ آنے پر دیکھ کر واپس آ جاؤں۔“

اعزاز شاہ کی ان خامیوں کو نکال کر دیکھا جاتا تو وہ ایک ہیرا انسان تھے۔ اور یہ خامیاں ان میں شادی کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ وہ کچھ دن اور زندہ رہنا چاہتے تھے ورنہ پے در پے جو غم انہیں ملے تھے ان سے وہ مشکل ہی چند دن زندہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے نئے کا سہارا لیا اور دل پہلانے کے لیے چند ایک سے ٹیلی فون پر دوستی کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ آفس اسٹاف اور کام میں ان کی دلچسپی اس وقت تک ہوتی جب تک میگزین مارکیٹ میں نہیں آ جاتا تھا یعنی شروع کے چند دن وہ نادشاہ کے

ماہنامہ پاکیزہ 162 نومبر 2016ء

ہے جبکہ گھر کا ہر فرد آئے دن ان دونوں کے جھگڑوں کی آوازیں سنتا رہتا لیکن کبھی کسی نے معاملے کی نوعیت جاننے کی کوشش نہیں کی۔

اعزاز شاہ آنکھیں بند کیے وانیہ کے بارے میں سوچے جا رہے تھے تھا کہ اچانک اس نے لاہور جانے کا پروگرام کیوں بنایا۔ گو کہ اس کے تمام پروگرام یونہی اچانک ہی بنا کرتے تھے لیکن انہیں تشویش اس بات کی تھی کہ صبح آفس کے لیے نکلتے ہوئے وہ وانیہ کو غصے میں چھوڑ کر آئے تھے اور ابھی اس کا ردعمل بالکل مختلف تھا اس کی آواز سننے ہی اعزاز شاہ یہ سمجھے کہ وہ اپنے غصے کی بھڑاس انہیں کچھ سنا کر نکالے گی مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے برعکس وانیہ نے بہت نارمل انداز میں مختصر بات کی اور سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اعزاز شاہ کو اچانک ہی یاد آیا تھا۔ آج شام ان کا پسندیدہ پروگرام آئے گا اسی لیے وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر آفس سے گھر جانے کے لیے نکل گئے۔

☆☆☆

روزی کی گاڑی لاہور جاتے ہوئے شہر سے باہر نکلتے ہی خراب ہو گئی تھی اور ایسے میں اسے وانیہ اعزاز یاد آئی تھی جس کی مدد سے وہ لاہور پہنچ سکتی تھی۔ اس پر وہ اندر ہی اندر تلملائی تو بہت لیکن مجبوراً اسے وانیہ کو ہی فون کرنا پڑا پہلے تو اس سے معافی مانگی کافی عذر پیش کیے اس کے بعد وانیہ کو اپنے ساتھ لاہور چلنے کی دعوت دینے کے ساتھ، ساتھ اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا بھی بتا دیا اور اب وہ وانیہ اعزاز کی گاڑی میں بیٹھی لاہور کا سفر طے کر رہی تھی۔

”کتنے دن کا ٹور ہے لاہور کا.....؟“ وانیہ نے یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

”موڈ پر ہے! ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں اور وہ دن بھی۔“ روزی کندھے اچکا کر بے نیازی سے بولی۔

”لیکن میں نے تو اعزاز کو دو دن کا کہا ہے۔“ وانیہ کچھ سوچے ہوئے بولی۔

”تو کیا پتھر کی لکیر ہو گئی ہے یہ بات؟“ اس نے

پلٹ کر کہا۔
”نہیں، میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔“
”مگر تمہارا انداز بتا رہا ہے۔“

”اچھا۔۔۔“ وانیہ خواہ مخواہ ہی ہنسی تھی۔ اس کے اندر اعزاز شاہ سے کچھ دور رہنے کا غم نہیں کسی اور سے دور جانے کا احساس ضرور تھا۔ اگرچہ اسے دیکھا ٹریک سیکل پر ہی تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی لیکن ایک شہر میں رہتے ہوئے وہ اس تک ایک ہفتے کے اندر رسائی ضرور حاصل کر لیتی لیکن اب دو دن ضائع ہونے کا دکھ ہو رہا تھا اور ان دنوں میں وہ نہ جانے کیا کچھ کر چکی ہوئی۔ روزی اس کی خاموشی کو محسوس کرنے کے ساتھ اس کے چہرے پر ابھرتی سوچ کی لکیریں بھی پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ وانیہ نے پوچھا۔

”یہ ہی کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔“ روزی بات بناتے ہوئے بولی۔ ”مگر تمہاری خوب صورتی کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔“

”ابھی تو زندگی پڑی ہے کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔“ وانیہ ہنستے ہوئے بولی۔

”مگر ضرورت تو ابھی ہے اور ہو سکتا ہے لوگ صرف اعزاز شاہ کے نام کی وجہ سے کنارہ کر جاتے ہوں۔“
”کم آن روزی، اس کا نام لے کر مجھے بدمعاش مت کرو۔“

”جب اس کا نام اتنا ہی بدمعاش ہے تو اسے اپنی زندگی سے نکال کیوں نہیں دیتیں۔“ روزی کا انداز سرسری سا تھا لیکن وہ وانیہ اعزاز کو اس کے ساتھ اسے بہکا بھی رہی تھی۔ وانیہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”تمہیں کیا کمی ہے وانیہ سب کچھ تو ہے تمہارے پاس پھر تمہیں اپنی پسند کا پورا اختیار ہے۔ کم سے کم دوسری بار انتخاب پر ایسی غلطی دوبارہ نہیں کرو گی۔“

وانیہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اعزاز شاہ تو اس کی زندگی کے باب پر کبھی کبھی سب سے بڑی غلطی تھی جس

سے وہ چاہے ہوئے بھی نظر میں نہیں بچ سکتی تھی اور بے ساختہ کسی شے جبکہ روزی اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا اس کیوں رہی ہو؟“

”نہیں اس لیے رہی ہوں کہ ہماری تمن پٹیاں ہیں۔“

”واٹ، تم نے کبھی بتایا نہیں۔“ روزی کو شاک

لگا تھا اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وانیہ نے اس سے اتنی

بڑی بات اب تک چھپائے رکھی تھے اس نے اپنی فکر کو

اس طرح مینہین کیا ہوا تھا کہ کہیں سے بھی وہ تمن بچوں

کی ماں تو کیا شادی شدہ بھی نہیں لگتی تھی۔

”کبھی ایسا موقع ہی نہیں آیا جو میں تمہیں بتاتی۔“

روزی اس کو جس قدر بے وقوف سمجھ رہی تھی وہ

اس سے کہیں زیادہ ہوشیار تھی اور اس بات کا ثبوت

وانیہ نے ابھی دے دیا تھا اس لیے روزی کا دماغ اس

حساب سے چلنے لگا تھا۔

”اور کیا، کیا چھپایا ہے تم نے مجھ سے؟“

”اور کیا چھپاؤں گی۔“ وانیہ کہہ کر شٹے سے باہر

دیکھنے لگی تھی۔ جبکہ روزی نے گاڑی کی اسپید بڑھانے

کے ساتھ اسٹیئرنگ پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط

کر دی تھی۔ روزی اپنے ذہن میں وانیہ اعزاز سے کی

جانے والی تمام ملاقاتیں لا کر ہر زاویے سے اس کی

باتوں کو سوچ رہی تھی کہ کہیں انجانے میں وہ کوئی غلطی تو

نہیں کر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے تم اسے وانیہ پر مکمل بھروسا

تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے جب وانیہ نے اسے اپنے

بچوں کا بتایا تو وہ سچ سچ چکرا کر رہ گئی تھی۔ یعنی اتنی بڑی

بات وہ اس سے چھپا گئی تھی اور روزی کا اب تک کا

سارا تجربہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ اس کے بعد روزی کو

ہر قدم پر سوچنے کے ساتھ بڑی ہوشیاری سے ہر چال

چلتی تھی۔ کیونکہ ابھی تک وہ وانیہ اعزاز کو ایک کٹ پتلی

سمجھ رہی تھی جو اس کے ہر اشارے پر اس کی مرضی سے

چل رہی تھی۔ مگر اس بات کے بعد روزی کو اعزازہ

ہو گیا تھا کہ وہ بھی صرف اس کے ساتھ ایک مقام تک

چل رہی ہے اس کے بعد وہ روزی کو اپنی زندگی سے

اس طرح الگ کر سکتی تھی جیسے کوئی روزی نام کی لڑکی تھی

یہ نہیں ہے۔

اب روزی نے اسے نیا راستہ دکھایا تھا تو اسے وہ ہی ٹھیک لگ رہا تھا مگر وہ فوراً اس پر عمل پیرا بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس سے علیحدگی کی بھی کوئی خاص وجہ ہونی چاہیے تھی۔

”روزی! میں بہت تھک گئی ہوں۔ اگر تم برانہ

مانو تو گاڑی تم ڈرائیو کر لو۔“ وہ اب فیول اسٹیشن پر

کھڑی تھیں۔ وانیہ نے کہا تو روزی اپنی طرف کا

دروازہ کھول کر لیک کر نیچے اتر آئی۔ وانیہ نے سیٹ

چینج کرتے ہی آنکھیں بند کرنے کے ساتھ سیٹ کی

پشت سے سر نکال لیا تھا۔

سرمئی شام اپنے پر پھیلا رہی تھی سورج کی چمکتی

کرنیں بھی اب نارنجی مائل ہو گئی تھیں، پرندے بھی دن بھر

دانہ چننے کے بعد ایک دوسرے کو اپنی بولیوں میں الوداع

کہتے ہوئے اپنے گھولوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”تم نے کام کا کیا سوچا ہے؟“ وانیہ نے اپنے

اندروں باہر پھیلی دونوں خاموشیوں کو توڑنے کی غرض

سے پوچھا تھا۔

”کسی خاص موقع اور بندے کے انتظار میں

ہوں۔“ روزی کے مختصر جواب پر وہ اسے نا سنجی کے

عالم میں دیکھنے لگی تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے

ہوئے بولی۔ ”یہ کام ایسا ہے کہ ہم ہر ایک پر تو بھروسا

نہیں کر سکتے، اس لیے کسی ایسے انسان کی تلاش میں

ہوں جس کو ہم شٹے میں اتار سکیں اور ہمیں کوئی نقصان

بھی نہ ہو۔“

”تو اس میں میرا کیا کردار ہوگا؟“

”وقت آنے پر سب بتا دوں گی۔ تم ابھی

انجوائے کرو لائف اور زیادہ اس وقت انجوائے کر

پاؤ گی جب اعزاز شاہ کو اپنی زندگی سے نکال دو گی۔“

روزی نے کہا تو وانیہ سر جھٹک کر بولی۔

”اس کے لیے کوئی وجہ بھی ہو۔“

”وجہ؟ ہوں.....“ روزی سوچتے ہوئے بولی۔

”کہہ دو کہ وہ بار بار نہیں بن سکتا۔“ روزی کی بات پر وانیہ

ماہنامہ پاکیزہ 164 نومبر 2016ء

عزیز تھی اس لیے وہ مصلحتاً خاموش ہو جایا کرتا اور خالہ اور ان کے بچوں کی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتا لیکن اب معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ خالہ کا بڑھتا ہوا اصرار کہ وہ جرمنی جاتے ہی ان کے نکلے بیٹے کو وہاں بلا لے اور اس کے ایسا نہ کرنے پر نہ جانے خالہ، امی جی کے ساتھ کیا سلوک کرتیں یہ اس کے لیے زیادہ پریشان کن بات تھی۔ وہ امی کی خوشی کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھا مگر یہاں وہ مجبور تھا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا کہ اچانک امی کمرے میں آئیں اور اسے دیکھنے لگیں۔ وہ عام سے حلے میں بھی بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ ”چلیں.....؟“ وہ برش رکھ کر امی سے پوچھنے لگا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اس سے پہلے ہی کمرے سے نکل کر بائیک کے پاس آکھڑی ہوئی تھیں۔ ریہال بائیک کی چابی، موبائل فون اور اپنا والٹ بیڈ پر سے اٹھا کر تیزی سے بائیک کے پاس آیا تھا پھر بائیک اشارت کرتے ہی وہ امی کو لے کر خالہ نئب کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی نئب خالہ کے گھر پہنچنے میں یہاں خالہ نئب کے گھر کا تو منظر ہی کچھ اور تھا، ہر طرف قہقہے لگے ہوئے ہونے کے ساتھ محلے کی چند چھوٹی بچیاں ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کی پلیٹ لیے کھڑی تھیں۔

”ارے مبارک ہو بھئی.....“ خالہ نے آگے بڑھ کر ریہال کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہوئے کہا تو وہ تیراں ہو کر انہیں دیکھنے لگا جس پر خالہ بجائے جھینپنے کے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ارے میاں، آپا نے تمہیں بتایا نہیں، آج تمہارا نکاح ہے۔“ ریہال نے نظروں کا زاویہ بدل کر امی کی طرف دیکھا جو اس کی طرح ہر چیز کو حیران کن نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”بھئی بڑھا ہوا ہے بھول گئی ہوں گی۔“ خالہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے بولے۔

☆☆☆

”خالہ نے آخر کیوں بلایا ہے؟“ ریہال نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ الماری سے شرٹ نکال کر بیڈ پر امی کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا تو انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

”کھانے پر ہی تو بلایا ہے۔“ وہ بہت سادگی سے بولیں۔
”وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“

”پھر.....؟“ ریہال نے الماری بند کرتے ہوئے امی کو دیکھا جو اس کی شرٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”آپ کو حیرت نہیں ہوئی خالہ پر..... جن کے لیے ہم ہمیشہ سے برے تھے اب اچانک اچھے کیسے ہو گئے۔ صرف اس لیے کہ میں جرمنی جا رہا ہوں۔“
”نہیں بیٹا، وہ ایسی نہیں ہے۔“ امی فوراً بہن کی طرف داری کرتے ہوئے بولیں۔ ”وقت اور حالات نے اسے خود غرض بنا دیا ہے۔ پر میری بہن ہے، بہت اچھی طرح جانتی ہوں اسے۔“

”لیکن امی آپ یہ بھی کیوں بھول رہی ہیں کہ ان کا رویہ ہمارے ساتھ بھی اچھا نہیں رہا پھر یہ سب اچانک؟“
”بیٹا، وقت کے ساتھ سب کچھ بدلتا رہتا ہے اور پھر اس کے علاوہ کوئی اور قریبی رشتے دار بھی نہیں ہے۔“ امی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی پھوٹے بچے سے بات کر رہی ہوں۔ امی ریہال کو تو مطمئن کر رہی تھیں لیکن اندر سے وہ خود خائف تھیں کیونکہ اپنی بہن سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھیں۔ بدتمیز و بد لحاظ تو وہ شروع سے ہی تھی، وہی سہی کسر شادی کے بعد احساس کمتری کے شکار بنے۔ میاں نے لالچی بھی بنا دیا تھا اور یہ عادتیں میاں کے ساتھ بچوں میں بھی منتقل ہو گئی تھیں۔ مگر امی، ریہال کے سامنے تو اپنی بہن کی بڑائی نہیں کر سکتی تھیں، اندھا دانا سمجھ تو خیر وہ بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی امی ہر لمحہ بہن کی پروہ پوشی کرتی رہتیں۔

ریہال، امی کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے زیادہ بحث نہیں کیا کرتا تھا۔ اسے امی کی خوشی زیادہ

امی کو اندر محلے کی خواتین نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور انہیں باتوں میں الجھا لیا تھا۔ پہلے ہی امی اس غیر متوقع صورت حال سے حیران تھیں مزید محلے کی خواتین سوالات کر کر کے انہیں پریشان کر رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک نکاح تک بات کیسے آگئی تھی انہوں نے تو اس کے متعلق کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

کمرے میں ایک طرف لڑکیاں بیٹھی عروج کو مہندی لگانے کے ساتھ شادی بیاہ کے گیت بھی گاتی جا رہی تھیں۔ محلے کی کچھ خواتین امی کو گھیرے بیٹھی سوالات پر سوالات کیے جا رہی تھیں۔

”کیا تمہارا بیٹا لڑکی کو بھی کو اپنے ساتھ جرمی لے جائے گا؟“ ایک خاتون نے سوال کیا تو امی حیران پریشان نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو رہا ہے۔ وہ یہاں دعوت میں بلائی گئی تھیں اور یہ سب جیسے سوچتی سمجھتی پلاننگ کے تحت ہو رہا تھا۔

”ارے نہیں! عروج کو تو یہ اپنی خدمت کے لیے لے کر جا رہی ہیں۔“ ایک اور خاتون نے کہا تو امی فوراً اپنے حواس پر قابو پانے لگی اور ساری بات سمجھنے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں کہ اچانک مولوی صاحب رجسٹرا ہاٹھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ احمر اور خالہ زینب بھی عروج کی رضامندی جاننے کے لیے اندر آگئے تھے۔ مولوی صاحب ایک صوفے پر اطمینان سے بیٹھنے کے ساتھ نکاح کے پیمپرز کو ترتیب دیتے ہوئے عروج کے گواہوں کے بارے میں پوچھنے لگے۔

”زینب ہم اب چلیں گے۔“ امی نے ایک لمحے میں فیصلہ کرنے کے ساتھ خالہ زینب کی سب چالوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ خالہ زینب پہلے بوکھلا گئیں پھر تیزی سے امی کے قریب آ کر بولیں۔

نکاح تو ہو جائے دو۔۔۔ میں نے اشارتا

اور گھر کی بات ہے کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو ہے نہیں، زینب.....“ خالو، ریال کو ایک کرسی پر بٹھا کر آواز دیتے ہوئے خود اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ریال کی نظریں ہر ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جبکہ ذہن اچانک اس رونما ہونے والے حادثے کے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے قاصر ہو چکا تھا۔ اس کی نظریں امی پر گئی تھیں جو اس کی طرح حیران کھڑی ہر ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ تیزی سے امی کی طرف آیا لیکن دوسرے ہی لمحے خالہ زینب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جانے کس طرف سے آئیں اور امی کو اپنے ساتھ لے کر اندر چلی گئیں وہ بھی ان کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن خالو اور احمر نے بازو سے پکڑ کر اسے کرسی پر لا بٹھایا تھا۔

”جی مولوی صاحب نکاح شروع کریں۔“ خالو نے سر پر ٹوپی پہنتے ہوئے کہا تو مولوی صاحب رجسٹر کھولنے لگے۔

”لڑکی کا حق مہر کتنا ہے؟“ انہوں نے خالو سے پوچھا۔
 ”پانچ سو گز کا ایک گھر 25 تولہ سونا اور پچیس لاکھ نقد.....“ ریال پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہو رہا کیا رہا تھا۔ وہ تو یہاں دعوت کھانے آیا تھا اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ دعوت اسے قربان کرنے کے بعد ہوئی اور امی بھی اس سچویشن میں تنہا چھوڑ کر نہ جانے کس کمرے میں جا بند ہوئی تھیں یا انہیں بند کر دیا تھا۔ ریال اب بالکل ہی ان کے رحم و کرم پر تھا اس کے پاس سوائے ہامی بھرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ منظور مستد..... بے بسی کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے مسلسل امی کی فکر کھائے جا رہی تھی گو کہ خالہ زینب امی کی سگی بہن تھیں لیکن پیسوں کی ہوس نے انہیں سوتیلوں سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔ اس کی نظریں ہر ایک چہرے پر اپنی ماں کے چہرے کو تلاش کرتی ہوئی خالہ زینب پر آ کر ٹھہری تھیں۔ خالہ زینب کے چہرے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سکون بھی تھا۔

”شادی بیاہ کوئی گڈے گڑیوں کا کھیل نہیں ہے۔“ ای نے سخت لہجے میں کہا تو خالد نضب، ای کو دیکھنے لگیں۔ ان کی پچھائی شطرنج کی بساط ای نے ایک لمبے میں پلیٹ دی تھی اور خالد نضب فوراً ہار تسلیم نہیں کر سکتی تھیں اس لیے نئے سرے سے خود کو پچانے کی ترکیب سوچنے لگے۔

”اپنوں میں تو ایسے ہی سب ہوتا ہے۔“ وہ چپکے، چپکے ای کو رام کر رہی تھیں۔



اعزاز شاہ نے ٹی وی آن کرنے کے بعد بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے گلاس اٹھا کر اس میں روم فرنیچر سے برف کے کیوبز ڈالے اور پھر الماری سے بوتل نکال کر پیگ بنانے لگے۔ ان کا ذہن اس وقت اپنی بیوی وانیہ میں الجھا ہوا تھا۔ دن بھر وہ خود کو کسی بھی طرح مصروف رکھتے تاکہ انہیں وانیہ کی باتوں کے ساتھ اس کی حرکات یاد نہ آئیں کیونکہ وہ اعزاز شاہ کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنتی تھی اس لیے وہ گھر بھی وانیہ اعزاز کے سونے کے بعد ہی آتے یا پھر کسی ہوٹل میں قیام پزیر ہو جاتے تھے لیکن اس وقت وہ ٹی وی پر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھنے کے ساتھ، ساتھ اپنے مشروبات سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اعزاز شاہ نے اپنی زندگی بہت پُر جوش انداز میں گزاری تھی انہوں نے آنے والے کل کے لیے کئی خواب سجانے کے ساتھ کئی امیدیں بھی باندھی تھیں۔ ان کا ارادہ الگ بزنس کرنے کے ساتھ اپنا آپ منوانا تھا گوکہ نام ان کا اب بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا لیکن جو اعزاز شاہ کی سوچ و خواہش تھی اس منزل سے وہ بھٹک کر خود کو نشے کی بوتل میں قید تصور کرتے تھے وہ چاہتے تو اب بھی اپنی زندگی کو آئیڈیل گزار سکتے تھے مگر وہ زندگی کو نہیں زندگی اب انہیں گزار رہی تھی ان کے پاس بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی سکون نہیں تھا۔

ان کے دل میں یہ خواہش بھی شاونی کے اولین

دلوں سے پوشیدہ تھی کہ جب وہ گھر میں داخل ہوں تو وانیہ ان سے دپر سے آنے کی وجہ پوچھے، باہر جا کر کھانا کھانے کی فرمائش کرے یا شاپنگ پر جانے کی ضد کرے اور پھر روٹھ جائے اور اعزاز شاہ اپنی محبت سے اسے منائیں مگر یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا بلکہ وانیہ اعزاز تو ان سے ٹھیک سے بات کرنا تو دور کی بات ان کا وجود ہی برداشت نہیں کرتی تھی۔

آدھا انسان تو ای وقت مر جاتا ہے جب وہ کسی سے توقع کرے کہ کوئی اپنا اسے سمجھے، اس کے دکھ سکھ کو محسوس کرنے کے ساتھ اسے کچھ پل سکون و محبت کے دے اور جب یہ خواہشات اس انسان جس سے توقعات باندھی گئی ہوں اپنے پیروں کے نیچے روند کر آگے بڑھ جائے تو ان روندے ہوئے احساسات کے ساتھ خود انسان بھی مٹی میں رُل جاتا ہے جیسے اعزاز شاہ جو کہنے کو تو زندہ تھے مگر زندگی سے کسی معصوم بچے کی طرح روٹھے ہوئے۔ اور چاہتے تھے کہ زندگی انہیں منائے مگر یہ بھول گئے تھے کہ زندگی صرف موت کو مناتی ہے اور اپنا آپ موت کی آغوش میں دے دیتی ہے۔ احساسات سے اسے کوئی بہرہ و کار نہیں ہوتا۔ رات اپنے انتہائی مراحل طے کرنے کے ساتھ اعزاز شاہ کو نیند کی وادیوں میں پہنچا رہی تھی۔

”وانیہ اعزاز.....!“ وہ نیند کی وادیوں میں اترنے سے پہلے چیخے تھے۔ ”تم بہت بری ہو اور تم سے زیادہ برا میرا باپ ہے، جس نے تمہیں میرے گلے باندھ دیا اور تم وانیہ اعزاز.....“ انہوں نے غصے سے شراب کی بوتل ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر مارنے کی کوشش کی لیکن نشے کی وجہ سے بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گری گئی اور ایک چھوٹا سا کالج کا کلکٹرز مین کو چھہ کران کے پیر پر لگا تھا جس کی وجہ سے خون بہت آہستہ، آہستہ زمین پر ٹپکنے لگا۔ ”ورنہ تم میرے گلے میں پھنسی وہ ہڈی ہو جسے میں نہ اگل سکتا ہوں اور نہ نکل سکتا ہوں۔“ اعزاز شاہ مزید بھی کچھ بولنا چاہتے تھے مگر نیندان پر غالب آگئی تھی اور وہ ستر پر اڑے ترے پڑ گئے۔

خواب آور گولیاں کھا کر جاسوتی تھی اور وہ خود تمام شب تہائی و ذلت کی آگ میں جلتے رہے تھے اور اب تک جل رہے تھے۔

☆☆☆

صبح ابھی پوری طرح سے پھیلی نہیں تھی لیکن پرندوں نے اپنے گھونسلوں سے دانے کی تلاش میں نکلنا شروع کر دیا تھا اور اب آسمان پر بھی ہلکی، ہلکی سپیدی پھیلنے کے ساتھ باد نسیم بھی چلنے لگی تھی جو روزی کو اب تھک رہی تھی، ایک پورا دن ڈرائیو کرنے کے بعد وہ اب پوری طرح تھک چکی تھی جبکہ پھیلی سیٹ پر وانیہ اعزاز گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ رحیم یار خان شروع ہو چکا تھا صوبہ پنجاب کا چھوٹا سا شہر ہونے کی وجہ سے یہاں ہوٹل بھی چھوٹے تھے۔ اگر روزی کی آنکھیں تھکن و نیند کی وجہ سے بند نہیں ہو رہی ہوتیں تو وہ ان چھوٹے ہوٹل میں سے کسی ایک میں بھی ٹھہرنا پسند نہیں کرتی لیکن اس وقت مجبوری تھی۔ اس لیے اس نے قدرے غنیمت ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی اور ایک نظر وانیہ اعزاز کو دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی پھر تیزی سے گاڑی سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گئی اور ہوٹل کے منیجر سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد جب واپس آئی تو دیکھا وانیہ گاڑی سے باہر کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”صبح بخیر.....“

”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ وانیہ نے روزی کی آواز پر چونکنے کے ساتھ پوچھا۔

”اپنے آرام کا انتظام کرنے، بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ کندھے اچکا کر بے پروائی سے بولی۔

”تو مجھے جگا دیتیں۔“

”تم بھی تو یہیں کرتی جو میں نے کیا.....“

روزی گاڑی میں سے اٹنا بیگ نکالتے ہوئے بولی۔

وانیہ کو اس کا انداز کچھ عجیب سا لگا شاید روزی واقعی

بہت تھک گئی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی۔ وانیہ جاننے

سے قاصر تھی۔

اعزاز شاہ نے آنکھ ایسے گھر میں کھولی جہاں سب کچھ تو تھا آسائشوں کی صورت مگر والدین کی توجہ نہیں تھی۔ شروع میں انہوں نے اس بات کو بہت محسوس کیا کہ ان کی ہر چھوٹی بڑی خوشی تو کرسیلی بریٹ کرتے پھر تھوڑا پیچور ہوئے تو خود باہر دوستوں کے ساتھ مل کر خوشی کو انجوائے کرتے لیکن جب اچانک ان کی شادی ہوئی تو اس رات کمرے میں جانے سے پہلے انہیں انجانی سی خوشی نے آگھیرا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اب وہ اس دنیا میں تہا نہیں ہیں کوئی اور بھی ہے جو صرف ان کے لیے بنا ہے اور اب وہ اس کے ساتھ مل کر اپنی زندگی کی تمام خوشیاں ادھرے خواب مکمل کریں گے۔ وہ خود کو آسمان پر اڑتا ہوا محسوس کرنے کے ساتھ اپنے آپ کو کسی ریاست کا شہنشاہ سمجھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے والد محترم زوار شاہ کے کپے جلتے کٹے الفاظ بھی بھول گئے تھے۔ ان کے دل میں ٹریکس جیات سے ملنے کی تمنا اور نہ جانے کتنے ارمان کروٹ لے رہے تھے، ان کے ہونٹوں پر دلچسپ مسکراہٹ اور ہاتھ میں رونمائی کا تھکا تھا۔ وہ وانیہ کے جذبات سے بالکل ہی بے خبر تھے یا شاید دل میں کہیں یہ بات بھی تھی کہ وانیہ روایتی دلہنوں کی طرح کٹھی ہوئی بے صبری سے انتظار کر رہی ہوگی مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی سارے خواب ملیا میٹ ہو گئے۔

وہ دروازے میں حیرت زدہ کھڑے وانیہ کو دیکھنے

لگے۔ وانیہ سوٹ چینج کرنے کے بعد الماری

میں زیورات رکھنے کے ساتھ جھنجھلا رہی تھی، اس نے

ایک نظر بھی اعزاز شاہ کو دیکھا گوارا نہیں کیا تھا۔ اعزاز

شاہ کو یوں لگا جیسے زندگی نے بہت بڑا اور بھیا تک

مذاق ان کے ساتھ کیا ہو، کئی سوال ذہن میں اٹھ رہے

تھے مگر جواب نہیں مل رہا تھا انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ

آسمان سے پاتال میں جا گرے ہوں۔ وہ وانیہ اعزاز

کو یہ یاد دلانے کہ ”میں اعزاز شاہ تمہارا شوہر ہوں۔“

آگے بڑھے اور وانیہ شاید ان کا ارادہ بھانپ گئی تھی

اس لیے اعزاز شاہ کو ان کی نظر میں دو کوڑی کا کر کے

”تم نہیں چلوگی؟“ روزی نے اس کے قریب رک کر پوچھا تو دانیہ لٹی میں سر ہلا گئی۔

”نہیں، میں کچھ دیر تازہ ماحول میں رہنا چاہتی ہوں۔“ اس کی بات پر روزی مسکراتے ہوئے ہونٹ کے اندر چلی گئی اور وہ کچھ دیر یونہی کھڑی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر گاڑی اشارت کرتے ہوئے ابھی کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ اپنی کنٹنی پر کسی چیز کی سختی کا احساس ہوا اس کی طرف کا شیشہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہی تھی اس نے ذرا سی گردن موڑ کر شیشے کی طرف دیکھنا چاہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی طرف کا دروازہ کھول کر ایک بھاری بھر کم شخص نے اسے دوسری سیٹ کی طرف دھکیلا تھا جس کی وجہ سے اس کا سر مڑ گیا تھا اور تکلیف سے اس کی چیخ نکل گئی جبکہ تیزی سے پیچھے بیٹھے دوسرے شخص نے فوراً ہی اس کے منہ پر کپڑا رکھا تھا جس کی وجہ سے پہلے تو دانیہ نے اس شخص کے ہاتھ پر کئے بھی مارے پھر آہستہ آہستہ وہ بے ہوش ہوتی چلی گئی۔

رات بھر گاڑی ڈرائیو کرنے کی وجہ سے روزی بہت تھک چکی تھی شاید اور زیادہ تھکن کی وجہ سے اس وقت اسے فوری نیند نہیں آرہی تھی اس لیے اس نے پہلے چائے کا آرڈر دیا اور خود فریش ہونے چلی گئی۔ فریش ہو کر روم میں آئی تو چائے کے ساتھ بسکٹ بھی حاضر تھے۔ وہ چائے کا کپ لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تھکن کی وجہ سے اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا اس لیے اس کا سارا دھیان چائے پر ہی تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے کپ ایک طرف رکھا اور سونے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ موبائل فون بجنے لگا۔

”ہیلو..... کون.....؟“ اس نے انجانا نمبر دیکھ کر

کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔
”تعارف کر دینے کا وقت نہیں..... اتنا سن لو کہ تمہاری دوست ہمارے قبضے میں ہے۔“ اس نے کبر کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور روزی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ حیرت و پریشانی کے عالم میں

موبائل فون کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ نیند تو اب آنکھوں سے کافی دور ہو چکی تھی مگر جسم میں تھکاوٹ کے باعث دروہور ہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کچھ دیر کی نیند اسے فریش کر دے گی مگر یہ نئی صورت حال اس کے لیے بالکل انوکھی اور ناقابل یقین تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

روزی کبھی کبھی اسے میں ٹھنکنے لگتی تو کبھی ایک جگہ بیٹھ کر اپنا وقار کرنے کے بارے میں سوچنے لگتی اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ دانیہ اعزاز کہاں اور کس حال میں ہے اور اسے انخوا کرنے والے بدلے میں کیا چاہتے ہیں۔ وہ صرف اپنا سوچ رہی تھی۔ روزی اپنے مفاد کے لیے ہی ہر کام کرتی تھی اور یہاں توئی طور پر وہ اپنے تمام مفاد بھول کر راہ فرار تلاش کر رہی تھی۔ گوکہ اس نے ابھی اپنا موبائل فون آف نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ابھی لاہور سے بھی بہت ضروری کال آتی تھی لیکن اس وقت وہ ہر بات پس پشت ڈالنے یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک موبائل فون دوبارہ بجنے لگا تھا۔

روزی نے پہلے موبائل اسکرین پر نمبر چیک کیا پھر کچھ سمجھ کر فون ریسیو کر لیا۔

”ہیلو.....“ دوسری طرف جو کوئی بھی تھا پر اس نے یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ کسی مشکل سے دوچار ہے بلکہ بڑی خوشگواہی کے ساتھ بات کر کے اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر سے الجھن کو سلجھانے کی ترکیب کرنے لگی تھی۔ مگر ہر ترکیب کے آگے ایک سوالیہ نشان اسے کچھ سوچنے سے روک دیتا کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے دانیہ کو اغوا کیا۔

روزی چاہتی تو پوئیس کا سہارا لے کر اسے چھڑا سکتی تھی مگر اس وقت وہ ایسا کرنے سے گریز کر رہی تھی کیونکہ اس کی نظر میں یہ سب ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت ہو رہا تھا اور جو کوئی بھی اس کے پیچھے تھا روزی کی سوچ اس تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔

نیند سے بچنے کے لیے اس نے اسٹرٹ نام پر کافی کا

”تم صبح صبح کہاں جا رہے ہو؟“ تائی جی نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔

”گاڑی کے کام سے آیا ہوں تو آج یہ کام کر لوں..... پھر کل واپس چلا جاؤں گا۔“ اس نے کہہ کر تشمیرہ کی طرف دیکھا شاید اس پر جتنا مقصد تھا۔

”اتنی جلدی، ابھی کل ہی تو آئے ہو..... کچھ دن تو روکو.....“ تائی جی نمک دانی ٹرے میں رکھتے ہوئے بولیں تو تشمیرہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ میں جاؤں؟

”ہاں چلو..... باقی باتیں ناشتے کی ٹیبل پر کرتے ہیں۔“ تائی کہہ کر ان دونوں کے ساتھ چلتی ہوئی ڈائننگ روم تک آئی تھیں۔

”تم ابھی تک یونیورسٹی جانے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔“ تایا جی نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر تشمیرہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو تیار ہوں۔ بس اپنی قائل اٹھانی ہے لیکن اس سے پہلے آپ کی اجازت چاہیے۔“ وہ ان کے کپ میں چائے اٹھیلے ہوئے بولی۔

”کیسی اجازت.....؟“ تایا جی کے بجائے تائی جی نے پوچھا تو وہ ایک لمحے کو زروس ہوئی مگر پھر سنبھل گئی۔

”میں جا ب کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہرگز نہیں.....“ اب کی بار بھی تائی جی کی طرف سے دو ٹوک جواب آیا تو وہ تایا جی کو دیکھنے لگی جو بہت خاموشی سے ناشتا کرنے میں مصروف تھے یہ پہلا موقع تھا جب تایا جی نے جواب نہیں دیا تھا ورنہ وہ ہمیشہ تائی جی کو خاموش کروادیا کرتے تھے اور تائی جی کبھی تایا جی کے سامنے اس انداز سے بات نہیں کرتی تھیں پھر آج کیا ہو گیا تھا، وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”پلیز تائی جی..... میں پریکٹس کے لیے جا ب کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ منت سے بولی۔ تایا جی بظاہر ناشتا کرنے میں مصروف تھے لیکن وہ بیوی اور بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ وہ یہ بھی

آرڈر دیا اور خود کمرے سے نکل کر بالکلونی میں آکھڑی ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کے ذہن کو تازگی بخشنے کی کوشش کی تھی اگر اس وقت وانیہ اس کے حواس پر سوار نہ ہوتی تو یہ سب اس کے لیے بہت خوب صورت و دلچسپ ہوتا لیکن اس وقت سب کچھ پس منظر میں کہیں کھو گیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس الجھن سے نہیں نکال پارہی تھی۔

☆☆☆

کسی بھی ایک خواب کی کیفیت سے جیسے اجانک تشمیرہ کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ کچھ دیر تو پھٹی، پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر لاجول پڑھ کر اٹھ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر جوڑا بناتی سلیمپر پہن کر واش روم چلی گئی۔

رات معمول کے مطابق روزہ مرہ کی ڈائری لکھتے ہوئے نہ جانے کب اسے نیند آگئی اسے پتا ہی نہیں چلا اور وہ اپنے اطراف پھیلی چیزیں سمیٹ نہیں پاتی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھ وقت سے کافی پہلے کھل گئی تھی۔ اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھر پور نیند لے کر اٹھی ہو۔ اس لیے وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد سیدھی کچن میں چلی آئی تاکہ ناشتا بنانے میں تائی جی کی مدد کر سکے اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ تائی جی ناشتا بنانے کے لیے پہلے سے کچن میں موجود تھیں اور ان کا موڈ بھی خوشگوار تھا اس لیے تشمیرہ کو روکنے ٹوکنے کے بجائے وہ اسے کام بتاتی جا رہی تھیں۔ اور ایسا شازو نادر ہی ہوتا تھا کہ تائی جی کا موڈ اتنا اچھا و خوشگوار ہو۔ اسے اس وقت تائی جی اپنی سگی ماں لگتیں اور اس کا دل چاہتا کہ تائی جی ہمیشہ اس کے ساتھ ایسے ہی رہیں مگر یہ کہاں ممکن تھا۔

”السلام علیکم.....“ تشمیرہ نے ناشتے کی ٹرے سجاتے ہوئے ایک نظر کچن کے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ فاطر بلو جینز اور سفید چیک وار شرٹ پہنے نہ جانے کہاں جانے کے لیے تار کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے چائے کی پیالی میں سچ چلائے گی۔

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 170 ﴾ نومبر 2016ء

ریورس کرتے گھر سے نکال کر ملی میں لے آئے تب تک دونوں ہی اپنی جگہ خاموش بیٹھے ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے ذہن میں الفاظ کو ترتیب دینے میں لگے ہوئے تھے۔

”بیٹا..... میں جانتا ہوں کہ تائی جی کی بات نے تمہیں ہرٹ کیا ہے لیکن اس میں تمہارا ہی بھلا ہے اور پھر میں بھی تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔“ تایا جی نے تمہید باندھ کر اسے مزید مایوس کر دیا وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

”میں یہ بات اس لیے کر رہا ہوں بیٹی کہ تمہیں ایک نہ ایک دن اپنے گھر جانا ہے۔“ اس نے ایک دم سے سرونچا کر کے تایا جی کو دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں کل ہم جس دعوت میں گئے تھے وہاں جیلانی صاحب کی فیملی کو تم پسند آگئی ہو۔ وہ آج اسی سلسلے میں ہمارے گھر آ رہے ہیں۔“

”مگر تایا جی میری تعلیم.....“

”اس کی فکر مت کرو، میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارا جنون ہے اسی لیے ان سے کچھ وقت مانگ لیں گے۔“

”مگر تایا جی مجھے سوچنے کا کچھ وقت تو دیا جائے۔“ یونیورسٹی کے گیٹ پر گاڑی رکی تو وہ اترنے سے پہلے تایا جی سے کہنے لگی۔

”پوری زندگی کا معاملہ ہے ویسے تو آپ کی مرضی میں ہی میری رضامندی ہے لیکن میں کچھ وقت چاہتی ہوں۔“

تایا جی ’ہوں‘ کہہ کمرہ گئے تھے۔

”اسی کوئی بات نہیں ہے تایا جی جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔ میں نے آپ کا مان نہیں توڑا اور نہ ہی کبھی توڑ سکتی ہوں۔“

”مجھے تم سے یہی امید ہے۔“ تایا جی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ انہیں خدا حافظ کہتی ہوئی گاڑی سے اتر کر یونیورسٹی گیٹ میں داخل ہو گئی تھی۔

جانتے تھے کہ ان کی بیگم تعمیر کو نوکری کرنے سے کیوں منع کر رہی ہیں۔ اس لیے انہوں نے بیچ میں مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”ایک بار منع کر دیا تمہیں نہیں تو نہیں۔“

”مگر تائی جی.....“

”بس.....“ انہوں نے دو ٹوک انداز میں ہی بات ختم کر دی تو وہ جریزی ہو کر ناشتا کرنے لگی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر تائی جی اپنا فیصلہ بنا کر بات ختم کر دیں گی اور تایا جی جو ہمیشہ اس کا ساتھ دیا کرتے تھے اس مقام پر خاموشی اختیار کر لیں گے۔ اس نے آس و امید سے تایا جی کی طرف دیکھا جو چائے کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ وہ جلدی، جلدی اپنا ناشتا ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کے ساتھ فاطمہ کی نظریں بھی اٹھی تھیں اور اسے اپنے حصار میں لے گئیں۔

”کیا ہوا..... ناشتا تو ٹھیک سے کر لو۔“

”نہیں بس.....“ تایا جی کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ بولی۔ ”یونیورسٹی کے لیے لیٹ ہو جائیں گی۔“ وہ کہہ کر تنزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”اس کو ساری بات آپ ہی راستے میں سمجھا دیجیے گا۔ میری تو یہ سنتی ہی نہیں ہے۔“ وہ میاں سے مخاطب ہوئیں۔ ”دیکھا ناں آپ نے کس طرح ضد کر رہی تھی، اب اس کو کیا پتا کہ کس وجہ سے منع کیا ہے اگر بتا دوں کہ شام میں لڑکے والے اسے دیکھنے آ رہے ہیں تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔“ تائی جی کی بات پر فاطمہ نے چونک کر باری، باری دونوں کو دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس آنے والے رشتے کو روکے کیونکہ ابھی تک وہ اپنی شیطانی سوچ کو حقیقت کا رنگ نہیں دے سکا تھا۔

”میں سمجھا دوں گا۔“ شہیرہ کے آنے پر تایا جی صرف اتنا ہی کہہ سکے اور اسے اپنے ساتھ لے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے پھر گاڑی اشارت کر کے اسے

تعمیرہ ہاتھوں فاطمہ کے لیے طہرح کی بازی سے اب برواشت نہیں ہوتی۔ تائی جی کا انداز ایسا تھا جیسے اب وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

”میں تعمیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ ہر ایک لفظ پر زور دے کر بولا تو تائی جی اسے یوں دیکھنے لگیں جیسے اس کی ذہنی حالت پر انہیں شبہ ہو اس لیے فوراً کچھ نہیں بولیں۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں پھوپھا! میں تعمیرہ سے.....“
 ”بس کر لڑ کے.....“ تائی جی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ”شادی بیاہ گڑیوں، گڈوں کا کھیل نہیں، جب دل چاہا منہ اٹھا کر شادی کرنی۔“

”مجھے معلوم ہے، اس لیے میں نے آپ سے پہلے بات کی ورنہ میں پھوپھا صاحب سے بھی بات کر سکتا تھا۔“

”شکر کرو کہ نہیں کی..... ورنہ تمہارے ساتھ مجھے بھی گھر سے باہر نکال دیا جاتا۔“ تائی جی کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھیں کہ فاطمہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ان کے سامنے دوڑا تو بیٹھ گیا۔

”پھوپھا میں سچ کہہ رہا ہوں، میں تعمیرہ سے بہت محبت کرتا ہوں اور اب سے نہیں بہت پہلے سے، بس آپ کو بتا اب رہا ہوں کہ اگر تعمیرہ سے میری شادی نہیں ہوتی تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔“ وہ تائی جی کو زلزلوں میں دھکیل کر خود وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ ایک طرف جیلانی صاحب کے گھر والے آج تعمیرہ کے لیے رشتہ لے کر آ رہے تھے دوسری طرف فاطمہ نے انہیں عجیب مشکل میں ڈال دیا تھا۔

”بچے کی خود سری سے وہ بخوبی واقف تھیں وہ کس حد تک جاسکتا تھا یہ سوچ کر ہی انہیں خوف آ رہا تھا۔“

”اچھا پھوپھا! میں جا رہا ہوں، مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی۔“ کچھ دیر بعد وہ انگلی پر گاڑی کی کی ہیں گھانا ہوا آیا تو تائی جی نے اسے باہر جاتے ہوئے

بن گئی تھی جسے وہ ہر حال میں جیتنا چاہتا تھا اس سے پہلے بھی کئی لڑکیاں اس کی زندگی میں آ کر گئی تھیں مگر نہ جانے اس میں ایسی کیا بات اسے نظر آئی تھی جس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتا تھا اس وقت جو آگ فاطمہ کے سینے میں دھک رہی تھی اسے وہ بچانے کی ترکیب سوچ رہا تھا لیکن اب تعمیرہ کے آنے والے رشتے سے بھی وہ پریشان ہو گیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے۔

وہ مسلسل سگریٹ پھونکنے کے ساتھ کمرے میں ٹہل رہا تھا اور ساتھ ہی اس رشتے کو روکنے کی پلاننگ کر رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ تمام باتیں اور وجوہات اپنے شاطر دماغ میں لیے تائی جی کے سامنے کھڑا تھا۔

”میں ساری زندگی تو بغیر کسی وجہ کے اسے اپنے گھر بٹھا کر نہیں رکھ سکتی ناں.....“ تائی جی فاطمہ کی بات سن کر بولیں تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھا رہا۔

”لیکن اچھی بھلی تو کرانی آپ کے ہاتھ سے جاری ہے۔ سوچیں اس کے جانے کے بعد آپ بالکل اکیلی ہو جائیں گی اور سارے کام آپ کو خود کرنے پڑیں گے۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”کون سے بہت سارے کام ہوتے ہیں ہم دو افراد تو ہیں، کتنے کام ہوں گے۔“ تائی جی نہ جانے کیا سوچے ہوئے تھیں جو اس وقت فاطمہ کی تمام ترکیبیں الٹ رہی تھیں۔ وہ بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ تائی جی کا بازو تمام کران کو اپنے ساتھ بٹھاتا انہیں کائل کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔

”پھوپھا ذرا سوچیں..... آپ نے کتنا اس کے لیے کیا ہے، پڑھایا لکھایا، اچھا کھلایا، پہنایا تو اب آپ اس کا بدلہ لیں۔ کیوں اس کو اتنی آسانی سے پرایا کر رہی ہیں۔“

”آج نہیں تو کل..... اسے اپنے گھر کا تو ہونا ہی ہے پھر آج ہی کیوں نہیں..... اور ویسے بھی وہ مجھ

رہی تھیں۔
 ”تم امی کی فکر مت کرنا..... ان کے پاس
 میں روز چلی جایا کروں گی۔“ ریبال کے ہاتھ پر وہ اپنا
 ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلاتی ہوئی بولی تھی۔

ریبال کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔
 ”تم بہت اچھی دوست ہو۔ میرے کہنے سے
 پہلے ہی تم نے میرے اندر کا حال جان لیا۔“ وہ کچھ نہیں
 بولی۔ مسکرا کر یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کے اندر
 اداسی آ کر ٹھہر گئی تھی ایک مخلص دوست جو بہت دور
 جا رہا تھا گوکہ دو سال کوئی طویل عرصہ نہیں تھا لیکن
 جہاں روز کی ملاقات تھی وہ اب کافی عرصے بعد ہونی
 تھی اور اس عرصے میں کیا کچھ بدلنا تھا اس سے وہ خود
 بھی ناواقف تھے۔

”تم وہاں جا کر مجھے فون تو کرو گے نا.....؟“
 قدرے توقف کے بعد تھمیرہ نے دل میں آئے سوال
 کو زبان وی تو وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے لٹی میں سر
 ہلانے لگا۔

”بھلا کیوں.....؟“
 ”صرف اس لیے کہ کہیں ہم دونوں ڈمگنا نہ
 جائیں۔ جہاں ہم اتنا ساتھ رہے ہیں وہاں ہم سے یہ
 دوری برداشت نہ ہو۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ روز بات ہوگی تو دور
 ہونے کا احساس بھی کم ہوگا اور پھر کب وقت گزرا
 ہمیں.....“ تھمیرہ نہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ
 ایک دم ہی ہونٹ سمجھ کر نظریں جھکا کر میز کی سطح انگلی
 سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی۔ وہ تھمیرہ کو دیکھنے لگا
 اس کا دل چاہا کہ وقت یہیں ٹھہر جائے اور وہ اسے
 یونہی دیکھتا رہے لیکن پھر اپنے اس خیال کو جھٹک کر وہ
 فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”چلو ویر ہو رہی ہے۔“ وہ کچھ نہیں بولی بہت
 خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی پوائنٹ تک
 آئی تھی۔ پوائنٹ میں سوار ہونے سے پہلے اس نے
 ایک نظر ریبال کو دیکھا تھا۔ جانے کیا تھا اس کی نظروں

دیکھا..... اس کے بعد ایک گہری سانس ہونٹوں سے
 خارج کرتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر بچن میں چلی
 آئیں۔ فاطمہ کی بات نے ان کا دماغ بالکل ہی ماؤف
 کر دیا تھا۔

☆☆☆

”ہا نہیں ریبال! مجھے کیوں اس شخص سے بہت
 ڈر لگتا ہے۔ جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو مجھے ایسا
 لگتا ہے جیسے ابھی وہ مجھے کھا جائے گا۔“ تھمیرہ نے
 ریبال کے ساتھ چلتے ہوئے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تو
 وہ اسے دیکھنے لگا۔ خوف کی چادر میں لپٹی سہمی ہوئی وہ
 کسی مصوم سی بچی کی طرح لگ رہی تھی نہ جانے کیوں
 آج پہلی بار ریبال کے دل کی دھڑکن اس کے لیے
 عجیب سی ہوئی تھی وہ فوراً نظریں چرا گیا۔

”اس طرح ڈرو گی تو وہ واقعی تمہیں کھا
 جائے گا۔“
 ”پھر میں کیا کروں.....؟“ وہ بچا رنگی سے
 پوچھنے لگی۔

”ہمت و بہادری سے اس کا مقابلہ کرو.....“
 ریبال نے ایک گھٹے درخت کے نیچے رک کر کہا۔ ”اس
 کو اس کے مقصد میں کمزور کر دو لیکن خوفزدہ ہو کر خود
 کمزور مت بنو۔“

”میں کمزور نہیں ہوں مگر.....“
 ”اگر کمزور نہیں ہو تو پھر اگر مگر کیا..... دیکھو تھمیرہ
 ہر انسان کے اندر ایک خوف چھپا ہے اور اس خوف کو دبا
 کر وہ حاکم بنتا ہے۔“ ریبال درخت سے ٹیک لگا کر
 اسے سمجھانے لگا۔

ریبال کی باتوں سے تھمیرہ کو حوصلہ ملا تھا اس کے
 اندر جو خوف کے باول چھائے تھے وہ اب چھٹ چکے تھے
 وہ اب دور تک روشنی پھیلی ہوئی تھی جس میں اسے اپنا
 راستہ صاف نظر آ رہا تھا اور پھر کچھ دیر میں ہی وہ خود کو
 پرسکون محسوس کر رہی تھی اور اب ریبال کے ساتھ کافی
 شاپ میں بیٹھی اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے
 ساتھ اس کے جرمی جانے کے حوالے سے بھی پوچھ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



www.paksociety.com
 "لو چائے پیو... آگئی میں... دو تھوڑی صبر
 نہیں کر سکتے۔"

"اچھا..... چلیں اندر چل کر میرے پاس
 بیٹھیں..... ویسے بھی دو دن بعد میں چلا جاؤں
 گا۔" ای ایک دم سے افسردہ ہو گئیں۔

"میں روز فون کروں گا اور میری غیر موجودگی
 میں تھمیرہ بھی آتی رہے گی اور پھر وقت گزرتے پتا
 تھوڑی چلے گا کب دو سال گزر جائیں گے۔" وہ ان کا
 ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"اور پھر تھمیرہ کے لیے تیرا رشتہ لے کر جاؤں
 گی۔" وہ ایک دم سے ٹھنک کر ای کو دیکھنے لگا اور اسے
 اندازہ نہیں تھا کہ ای اتنی جلدی اس کے دل کی بات
 سمجھ جائیں گی۔

"تھمیرہ اور میں صرف دوست ہیں۔" وہ ان کی
 بات پر نظر بس چرا کر بولا۔

"اسی دوستی کو ہی تو مضبوط رشتے میں باندھنے کا
 سوچ رہی ہوں۔ دیکھو تو میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ اس
 کے روز، روز بیچ اور فون کال سے بھی اندازہ نہیں
 ہوا۔" ای نے ہلکے ہلکے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ای..... پسند صرف
 میں اسے کرتا ہوں یا وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے اس
 بات کا میں نے اندازہ لگایا ہے اور نہ ہی پوچھا ہے۔"
 "تو پوچھ لو، دیر کیوں کر رہے ہو؟"

"پوچھ لوں گا..... جب واپس آؤں گا۔" وہ کہہ
 کر مسکرا کر انہیں دیکھنے لگا۔ "اب جلدی سے میری
 تیاری مکمل کروادیں۔"

"اچھا چلو۔" ای کہہ کر ریبال کے ساتھ کمرے
 میں چلی آئی تھیں جبکہ دوسرے ہی لمحے اس کا موبائل
 فون بجنے لگا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور
 اسکرین پر فون نمبر دیکھ کر کال ڈسکلیٹ کر دی تھی لیکن
 موبائل دوبارہ بجنے لگا تھا۔ اور وہ واقعی اس کال پر
 بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

(بانی آئندہ)

میں ریبال کو اپنے دل کی دھڑکن کچھ عجیب ہی سنے
 لاتی محسوس ہوئی۔ جبکہ دوسری طرف تھمیرہ کی کیفیت
 بھی اس سے کچھ الگ نہیں تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے
 وہ اپنا بہت کچھ ریبال کے پاس چھوڑ آئی ہو مگر کیا یہ وہ
 جاننے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

محبت ایسے ہی ہوتی ہے، بے نام سی
 کیفیت..... بے آہٹ دل کے دروازے پر دستک
 دے کر تمام راستوں پر چلتی اپنا نام لکھ کر خود کو منواتی
 ہوئی زندگی میں شامل ہو جاتی ہے اور ایسے جیسے اس کے
 بغیر دنیا میں کچھ بھی نہ ہو یا اس سے پہلے انسان زندہ ہی
 نہ ہو..... وہ انسان کی شخصیت کے ساتھ اس کے آس
 پاس کی بھی ہر چیز بدل دیتی ہے۔

ریبال حسن پر جرمی جانے سے کچھ دن پہلے ہی
 یہ انکشاف ہوا تھا کہ تھمیرہ بانو سے دل کی گہرائیوں سے
 محبت کرتا ہے اور اب سے نہیں شاید تب سے یہ محبت
 اس کے اندر پنپ رہی تھی جب سے اسے وہ پہلی دفعہ
 جانا تھا یعنی یونیورسٹی کے پہلے سال سے مگر یہ انکشاف
 اس پر اب ہوا تھا مگر دقت کی قسم ظریفی یہ تھی کہ وہ اسے
 بتا نہیں سکتا تھا۔

جس انسان سے ہم بہت ساری دوسری باتیں
 کر جاتے ہیں اسی سے ہم یہیں آ کر مات کھا جاتے ہیں
 کہ ایک لفظ محبت کہتے ہوئے شرم، لحاظ اور نہ جانے کیا
 کچھ درمیان میں آ کر ٹھہر جاتا ہے اور یہی ریبال کے
 ساتھ بھی ہوا تھا۔

وہ اس وقت اپنا بیگ پیک کرنے کے ساتھ
 مسلسل جھنجھلا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں اپنی ہی کیفیت نہیں
 آرہی تھی۔ یعنی جرمی جانا بھی چاہ رہا تھا اور
 نہیں بھی.....

"ای کہاں ہیں؟" وہ کمرے سے نکل کر
 برآمدے میں آکھڑا ہوا، ای نے کچن کی کھڑکی سے
 اسے دیکھا اور اس کے لیے چائے کپ میں ڈال کر اس
 کے پاس چلی آئیں۔

Downloaded From PAKSOCIETY.COM



ٹاورنٹ

ہنسنا منع ہے

محمّد طیفور

سے ضائع شدہ دودھ کو دیکھا پھر ”ریخ پڑ غضب“
چولھے کے بالکل پاس دھرے بیڑے۔ یہ نشی کشور کی
طرف کیا۔

”او..... بیڑا غرق! اہل گیا، پکڑ، پکڑ اسے پکڑ
بھی۔“ اماں نے بڑی کوشش کی تھی کہ دودھ کو پکڑ سکیں
پر وہ دعا دے گیا تھا۔ جتنی تیزی سے وہ کھن میں داخل
ہوئی تھیں سانس الگ چڑھ گئی تھی۔ کچھ لمبے تاہف۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 175 ﴾ نومبر 2016ء

چینٹ بھی پڑ گئی تو..... نکل ادھر سے نہیں تو تجھے لیوں
کی طرح نچوڑ دوں گی۔“

”ہاں اماں! آپ واقعی نچوڑ سکتی ہیں، گاؤں کی
جم پل (پلی بڑھی) ہیں۔ مجھ جیسی ”شہری دوشیزہ“ کی
”دیکھی پہلوان“ کے آگے کیا اوقات.....“

”دفع ہو جا کچھو..... نہیں تو ج میں سر کھول دوں
گی تیرا.....“ اماں نے غصے سے دودھ میں تھری صافی
سنگ میں دھونے کے لیے ہنٹی۔

”اماں، اماں یہ دیکھو ذرا..... اے اماں.....
ٹوٹی بند کرو پہلے میرے بال دیکھو ذرا۔ مجھے لگتا ہے اس
دفعہ پرویز سے جو دہی آپ نے منگوا لیا ہے وہ دد نمبر

ہے۔ منگوسوں نے شاید صمد بوٹڈ ڈالنی شروع کر دی ہے
اس میں..... یہ دیکھ تو.....“ کچھ لحوں کی خاموشی کے بعد
پھر کشور کی آواز ابھری تھی اور تنگ آ کر اماں نے ٹوٹی

بند کی پھر مڑ کر کشور کو دیکھا تو یک دم جو ہنستا شروع
ہوئیں تو لال سرخ ہو گئیں۔ بڑی مشکل سے بیڑھے پہ
بیٹھیں..... اماں کا مٹانہ کمزور تھا اور ایسے ہی کسی نازک

موقع پر اکٹھ ہنس ہنس کر ان کے کپڑے خراب ہو جاتے
تھے۔ کچھ لحوں کی خاموشی کے بعد پھر کشور کی آواز
ابھری تھی اور اس وقت بھی کشور جس شکل میں ان کے

سامنے تھی اس نے ان کی حالت عجیب سی کر دی تھی۔
پہلے نو بچن میں دودھ اٹھنے کی افراتفری اور غصے نے
انہیں کشور کو دیکھنے کی فرصت کب دی تھی اور اب جو

فرصت سے دیکھا تو قہقہے قہقہے تم نہیں رہے تھے اور کشور
شدید پریشانی کے عالم میں اپنے بالوں کے اکڑاؤ پر غور
کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اماں پہ بھی غصہ آرہا تھا جو

بجائے اس کی مشکل آسان کرنے کے اس پر ہنسے
جا رہی تھیں۔ پتا نہیں گڑ بڑ کہاں پہ ہوئی تھی۔ کسی
ڈائجسٹ میں سے حسن نکھارنے کے نسخے لیے تھے،

جن کو آزمانے کا موقع آج کشور نے ڈھونڈ نکالا تھا۔
آسان سے تو نسخے تھے۔ بالوں پہ دہی میں تھوڑا سا
سرسوں کا تیل کس کر کے لگاتا تھا اور چہرے پر تالیں

لگانا سکتے..... پھر مسئلہ کیا تھا؟ ہال یوں اکڑے

غصہ آتا تو ایسے ماضی کے یادگار نام سے ہی بلاتی تھیں۔
”آئی..... (اندھی) ہو گئی ہے کیا.....؟ دیدوں

میں سلایاں پھیر کر بیٹھی ہے، جو اہلتا دودھ تجھے نظر نہ
آیا؟ ڈڈو جیسے پھٹے ہوئے ڈیلے ہیں پر مجال ہے کوئی
کام ڈھنگ سے بھی کر لے..... لے کے سارا دودھ

بر باد کر دیا۔ چولھے کا ناس مارا سو الگ.....“ اماں کا
بس نہیں چل رہا تھا کہ کشور کا سر ہی چولھے میں دے
ماریں، تاؤ کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔

”اماں..... یہ کچھ کس کو کہا ہے؟“ شاید دودھ
اوپر گر جاتا تو کشور اتنا نہ بلبلاتی۔ جتنا اماں کے کچھو کہنے
پر تڑپتی تھی۔ ”ہزار بار کہا ہے میرا صحیح نام بلایا کرو..... پر

نہ جی، دنیا چاند پر پہنچ گئی پر ہم ابھی تک کچھو، پوپے اور
پہنچے سے باہر نہیں آئے۔ بدلو اماں، بدلو خود کو..... اب
آپ وہ پرانی اماں نہیں رہی ہو۔ پٹڈ سے شہر آ چکی ہو،

اب دودھ اٹھنے پر پٹڈ والی اماں کی طرح داؤ پلانہ کیا
کر..... بلکہ.....“

”تاں..... رولا نہ ڈالوں تو کیا کروں.....؟
بتا..... بتا ذرا.....“ اماں نے کشور کی بات کاٹ کر
خطرناک تیوروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”گمرنا کیا ہے اماں..... بس صافی لے کر چو لھا
صاف کر لو، اللہ، اللہ خیر صلا۔“ کشور نے نادر
مشورے سے نوازتے ہوئے پھر سے سابقہ مشغلے کی

طرف توجہ دی۔ وہ پچھلے دس منٹ سے ہاتھ، بازوؤں
اور پیروں پر لیوں رگڑنے میں مصروف تھی۔ اماں
غصے سے بڑ بڑاتی چو لھا صاف کرنے لگیں۔ انہیں خفا،

خفا سا دیکھ کر کشور بیڑھے سے اٹھی۔ دونوں پاؤں
چپلوں کے اوپر جمائے اور بھروسہ بھروسہ کرتی چولھے کے
پاس آکھڑی ہوئی۔

”لاؤ اماں! خفا کیوں ہوتی ہو؟ لاؤ میں صاف کر
دیتی ہوں۔“ اس نے لیوں سے سنے ہوئے ہاتھ آگے
بڑھائے جنہیں اماں نے زور سے پرے جھٹک دیا۔

”پرے.....“ ”کھٹا اس مارے“ ہاتھ لے کر
آگئی۔ رہا رہا دودھ بھی غارت ہو جائے گا جو ہلکی سی

”ج..... چل فیر پتر باہر کمرے پہ نال۔“ اماں نے کشور کو طرز اچکا کر ارا..... ”چل کے سر دھوا لے مجھ سے کیونکہ ابھی تیری دادی کمرے سے باہر آگئی اور تیری یہ جو ملکوں جیسی موٹی، موٹی ٹیس بنی ہوئی ہیں ناں، دیکھ لیں ناں تو میرا پتر اس نے انہیں تلی دکھا دینی ہے۔ تجھے بتا ہے تیری دادی کو تیلیاں لگانے کا کتنا شوق ہے اور کچھ تو لگ بھی بیوں والا چولہا ہی رہی ہے۔“ اماں پھر ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگیں تو کشور باؤں بیٹھے ہوئے خود ہی سر، منہ دھونے چل دی۔ کیونکہ دادی کی نظر میں واقعی وہ نہیں آنا چاہتی تھی۔ انہوں نے شہد اور دعی جیسی قیمتی چیزوں کے زیاں پر رات سونے تک ”میرے پتر کی کمائی، میرے پتر کی کمائی“ کرتے رہتا تھا۔

☆☆☆

بڑی مزے کی دھوپ نکل ہوئی تھی۔ کشور صحن میں چار پائی پر دروازے کی طرف سر لٹکائے لیٹی دادی کے سر پر بجز بھر کے مہندی تھوپ رہی تھی۔ ایک یہ شوق ایسا تھا جو شہد یا سردی میں بھی دادی کا جانا نہیں تھا۔ چاہے گردن اکڑا کر جاتی پر بال ضرور رہتی تھیں۔

اور کشور مہندی لگانے سے سخت چڑتی تھی لہذا تقریباً نیند سے اوجھتی دادی کو مہندی سے ”تھیڑنے“ کا شوق پورا کر رہی تھی۔ قریب ہی اماں شہد کاٹ رہی تھیں مگر کشور کو روک ٹوک نہیں کر رہی تھیں کیونکہ ساس کی حالت دیکھ کر خود کو بھی مزہ آرہا تھا۔ بس ہنسی روک رکھی تھی، مبادا ساس جاگ جائیں، ویسے بھی اماں کے دو ہی تو شوق تھے۔ بے تحاشا غصہ کرنا اور بے تحاشا ہنسنا۔

چھپ کی آواز کے ساتھ کشور مہندی ہاتھ میں بھر کر دادی کے سر پر مل دیتی تھی۔ مزیدار دھوپ کی گرمائش دادی کو نیند کے گہرے جمونے میں لے گئی تھی اور یہ بہترین موقع تھا کہ جی بھر کر دادی کا مہندی لگوانے کا ارمان پورا کرو جی تاکہ آئندہ دادی کم از کم کشور کو مہندی لگانے کا فریضہ نہ سونپیں۔

سر پر مہندی کا رقبہ بڑھا کر ہمووں تک پھیلا دیا۔

جا رہے تھے جیسے کزنٹ لگا ہو۔ چھوٹی، چھوٹی پہاڑیاں کشور نے خود ابھی بنا چھوڑی تھیں۔ جب انھیوں کی پوروں سے بالوں کو کھینچ، کھینچ کر ان کے اکڑاؤ کی وجہ معلوم کر رہی تھی۔ جبکہ چہرے پر بھی عجیب بھلی سی خچیا ہٹ چکی ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ کشور اپنے بھیا تک منہ سے رونے کی بھیا تک آواز نکالتی اماں نے یہ مشکل ہنسی روک کر قریب پڑی ڈوٹی اٹھا کر اس کی پنڈلی پر دے ماری۔ کشور نے تڑپ کر پنڈلی تمام لی تھی۔ اماں کی ڈوٹی نے وقتی طور پر ہی سہی کشور کا دھیان اس کے بالوں سے ہٹا دیا تھا۔

”مز جانیے..... جا کر ذرا بوتھی دیکھ شیشے میں۔ عقل کی آبی تو نے نئے نئے پٹھے (اٹے) کر دیے ہیں۔ عقل تو تیری ویسے ہی چولے میں ڈالنے جوگی ہے۔ جو الا بلا پڑتی ہے، تو تمہنی پل لیتی ہے ناں..... ذرا بتا مجھے ملا کیا ہے تو نے اپنے جھانٹے میں اور بوتھے پر۔“ اماں رنج، رنج ہنسنے کے بعد کافی حد تک نارمل ہو چکی تھیں اور نارمل حالت میں اماں ”خضبتاک“ ہی رہتی تھیں۔

”اماں.....! دعی میں سرسوں ملا کر لگایا ہے بالوں میں۔ لکھا تھا خشکی دور ہوگی اور بال ریشم کے پھولوں جیسے ہو جائیں گے اور منہ پر گلابی پن لانے کے لیے شہد لگایا تھا۔ پر مجھے لگتا ہے میرے بال ریشم کے پھولوں جیسے نہیں، چولے کی بیوں جیسے دئے گئے ہیں۔“

”بالقلے! ریشم کے بال تو آپ نارمل کی چھال سے بنے لگتے ہیں، تجھے کیوں اتنے پسند آگئے؟“ اماں کے لہجے میں حیرت در آئی تھی۔ ریشم دو گھر چھوڑ کر ہی رہتی تھی جو اپنے اچھائی ٹھکرالے اور روکھے بالوں کی وجہ سے جانی جاتی تھی۔

”ناں اماں، مجھے کیا ڈھنگی ہو گیا ہے جو میں ریشم کے ”پلے کی جنت“ (چھترے بکرے کی کھال) جیسے بال پسند کروں گی۔ میں نے اصل ریشم، دھاگے جیسی نرمی اور ملائمت کی بات کی ہے اماں.....“ کشور کو ریشم پڑوں کے حوالے سے چھٹے لگا دیے تھے۔

کان تو پہلے ہی ”مہندی کی ٹوپی“ میں گم ہو چکے تھے۔ اماں نے شگم کا کمر آمنہ میں ڈالتے ہوئے ساس کا جائزہ لیا جن کو ایک نظر دیکھنے میں یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے موٹی اونٹی ٹوپی کو اچھی طرح سر پر اوڑھے دھوپ انجوائے کر رہی ہیں۔ بس ٹوپی ذرا کھینچ کر ماتھا اور کان ڈھکنے کا اہتمام بھی کر لیا تھا۔ اتنی سی بات تھی..... اماں کے ہونٹ چسنے کے اشارے میں پھلتے دیکھ کر کشور نے گھورا تھا۔ کیونکہ اگر خدا خواستہ مہندی خشک ہونے سے پہلے دادی اٹھ جاتیں تو جوتے تو پڑتے ہی (جن کی کشور کو پروا نہیں تھی) مگر رنگ چڑھنے سے پہلے ہی دادی سر دھولیتیں۔ تو اتنا رسک لینے کا فائدہ بھلا کیا ہوتا؟ کوئی اور وقت ہوتا تو اماں، کشور کی گھوری پہ یقیناً اس کی آنکھیں نکال دیتیں۔ بر اس وقت ہنسی کنٹرول کرنا ضروری تھا کیونکہ بڑا شغل ہاتھ آنے والا تھا۔ بڑی مشکل سے کشور کو کٹے ہوئے شگم کی ٹوکری اشارے سے بچن میں لے جانے کو کہا اور خود کھڑی ہوتی کھٹنے سے گھٹنا جوڑتی ہاتھ روم روانہ ہوئیں۔

☆☆☆

دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ ساڑھے گیارہ کا ٹائم تھا۔ جس وقت کشور مہندی تھوپ کر ہٹی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ دادی کے مہندی لگے۔ لال، مال، رنگ تو یقیناً پکڑ ہی لیا ہو گا نا تھے اور کانوں کی جلد نے، کشور نے بچن کے جالی والے دروازے سے دادی کو دیکھ کر سوچا۔ ساتھ سلا د کے لیے باریک، باریک پیاز کترتے اس نے دادی میں نیز سے جا گنے کے آثار محسوس کر لیے تھے۔ اسے پتا تھا دادی ابھی کچھ دیر مزید لیشیں گی، سر کی مہندی خشک کرنے کے لیے۔ پھر قریب ہی مہن کے کپڑے بنے کھڑے پر جا کر سر دھولیں گی۔ کشور کی نظر نے بے چینی سے اماں کو ڈھونڈا جو اسے برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی اپنا اور دادی کا سوٹ کاٹی نظر آئیں۔ اماں نے کپڑے بدل لیے تھے، یقیناً اماں کا شانہ پھر دغا دے گیا تھا۔ کشور نے سکون کی سانس لی کیونکہ ایک دفعہ اماں کپڑے بدل لیتیں تو مزید

نہیں ہنستی تھیں۔ شاید دادی ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ تمہاری ماں ہنستی ہی کپڑے بدلنے کے لیے ہے۔ ہا ہا ہا..... اسے بچن میں کھڑے ہنسی آگئی۔ ابھی وہ مزید ضرور ہنستی اگر کوئی زور، زور سے گیٹ نہ دھڑ دھڑاتا۔ کشور نے کھڑی کی سمت دیکھا، ٹائم تو ابا کے آنے کا تھا مگر گیٹ کھلوانے کا انداز ابا کا نہ تھا۔ اس نے تجسس سے گیٹ کی سمت دیکھا جسے اماں کھولنے جا چکی تھیں جبکہ دادی بھی ٹانگوں سے کبل ہٹا کر اٹھ کر بیٹھ چکی تھیں۔

”کیا ہوا جی.....! خیر تو ہے پوپے کے ابا.....؟“ دروازے پہ واقفی ابا ہی تھے اور ان کے پیچھے کشور سے سال چھوٹا شاہد عرف پوپا تھا۔ دونوں ہی بے حد غصے میں تھے۔ اماں نے جلدی سے موٹھا کھینچ کر ابا کو دیا جبکہ پوپا، دادی کے پاس نکل گیا۔ کشور نے جلدی سے پالی کا گلاس بھرا اور جالی والا دروازہ کھولتی باہر نکل آئی اور ابا کو گلاس پکڑاتے ساتھ ہی پوچھ ڈالا۔

”کیا ہوا ہے آپ کو ”بابا جان“؟“ اتنے غصے میں کیوں ہیں آپ؟ کیجیے پانی۔ نہیں۔“ جبکہ ابا نے غصے میں ہاتھ مار کر گلاس کو پرے جھٹک دیا۔ جس کی وجہ سے قریب بیٹھے پوپے کو اتنی ٹھنڈ میں تراوٹ پہنچ گئی۔

”یہ جو تو نے مجھے ابا جان سے ”بابا جان“ بنانے کا سیاہا ڈالا ہے ناں یہ سب اسی کا قہر ہے مجھے۔“ ابا نے کشور کو لال، لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھی نہیں بابا جان، ہوا کیا ہے؟“

”ابا کہہ ابا..... مجھی!“ ابا جھٹکا کھا کر بولے تھے جبکہ جھٹکے سے کشور بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”کیوں غصہ کر رہے ہیں، ہوا کیا ہے آخر؟ بتائیں بھی تو سہی.....؟“ اب کے اماں نے پوچھا تھا۔

”جب سے پنڈ سے شہر میں آئے ہیں، اس کڑی نے سیاہا ڈالا ہوا ہے، شہری بنو، شہری بنو۔“ ابا نے کشور کی نقل بھی اتار چھوڑی۔ شروع میں تو میں بھی خوش ہوا تھا ”بابا جان“ بن کر پرناں جی..... میرے مرے پیو کی تویہ میں ابا ہی بھلا۔“ ابا نے سچ ملن کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”تو ایسا کر مجھے تو بکل سے سیدھا، سیدھا شلوار قمیص دے اور یہ جو ”سفری سوٹ“ ہے ناں یہ تو اپنے نکلے کو بھجوادے۔ وہ طہیثا ویسے بھی چمکو رہا ہے۔ بڑے شوق سے پہن لے گا یہ سوٹ۔“

”ناں وہ کیوں چمکو رہا ہونے لگا۔“ اماں کو بھائی کے لیے ایسے القابات انتہائی ناگوار گزرتے تھے، حالانکہ تکلیف کی طرح فٹ بیٹھتے تھے۔

”تمہارے وڈے بھرا۔ یعنی اپنے جیٹھ کو نہ بھیج دوں، وہ تو ایک دفعہ پہن بیٹھا تو نہاتے وقت بھی نہ اتارے گا۔ یاد ہے ناں..... پچھلے مہینے جو آپ نے ٹھیلے سے کالی عینک لے کر بھیجی تھی پوپے کے ہاتھ اللہ معافی..... توبہ.....! حد ہوتی ہے چولیس مارنے کی بھی..... دو دن بعد جب پوپا واپس آیا تھا تو اس نے بتایا تھا مجھے کہ..... اماں، تاپا تو رات کو سونے کے وقت بھی عینک نہیں اتارتا۔ محن میں نچی (چارپائی) ڈال کر، کھوپے (عینک) چڑھا کر سوتا ہے کہ سویرے، سویرے دھوپ تنگ نہیں کرتی، دو دن تو یوں ہی سویا تیرے دن صبح آنکھ کھلی تو سارے محن میں رولا ڈالتا پھر رہا تھا۔“

”او..... میری آنکھوں میں موتیا اتر آیا..... او..... میرے ربا مجھے معاف کریں، میری آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔“ وہ تو پوپے نے ہی اپنی تالی کے کان میں جا کر کہا۔ ”تائے کی عینک اتر واؤ، اس کے شیشوں پہ کوئے نے وٹھ (بیٹ) کر دی ہے جسے وہ موتیا سمجھ رہا ہے..... میرے بھرا کو چمکو را کہتے ہیں، اونہہ.....“ اماں نے جی بھر کر غصہ نکالا تھا۔ ابا کے لتے لینے کے چکر میں تاپا کو رگڑ ڈالا تھا اور یہ بات بھلا داوی کو کیسے ہضم ہوئی، تبھی بہو کو لکارا۔

”اے فضیلت..... منہ سنہال، نہیں تو منہ میں وٹے (پھر) ڈال دوں گی.....“

بڑی آئی میری پتروں کو پٹنے (چھاننے) والی۔ اپنی کڑی کو لگام ڈال، شہری بننے کے چکر میں سبھی کے ومانوں کے ڈھکن سوندے (الٹے) مار رہی ہے۔ لے دس۔ اچھا بھلا بیبا بھرا پھر جس کو سویرے لے اٹھا (نگلا) بنا کر بھیج چھوڑا ہٹی پر۔“

”اچھا بھلا میرا جلیہ تھا، گریوں میں گلی کرتا اور سردیوں میں شلوار قمیص۔ اسے پتا نہیں کیا تکلیف ہوئی جو میرے لیے ”سفری سوٹ“ (سفری سوٹ) پکڑ لائی۔ اور آج صبح زبردستی مجھے پہنایا تھا اس نے.....“

”بابا جان، پہن لیں ناں..... بالکل محمد علی لگیں گے آپ۔“ ایک پار پھر کشور کی نقل اتاری گئی جس پر وہ محض جربز ہو کر رہ گئی تھی جبکہ پوپے اور اماں کو ہنسی آگئی تھی۔

”لے دس..... مجھے بھی بھلا پاؤ لے سکتے ناں“

تھا جو میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ کریمانے کی ہٹی ہے میری، اب تو خود سوچ پوپے کی ماں..... اپنی ہٹی پہ میں یہ ”سفری سوٹ“ پہنے بیٹھا کیسا لگ رہا ہوں گا؟ میری سازی دکھ (شو) کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا اس نے۔ جو بھی ہٹی پہ سودا کوانے آیا مجھے سر سے پاؤں تک یوں گھور کر گیا جیسے میں اپنے ویسے کے اسٹج پر بیٹھا ہوں۔“ اماں نے ابا کی آخری بات پہ ناگواری سے پہلو بدلا اور دل میں دو باتیں بھی لگا دیں۔ (بڈھے ہو گئے پر ولیمہ کرانے کا چاہ نہیں گیا، ساٹھے پاٹھے نہ ہوں تو.....)

”چلو یہاں تک تو ٹھیک تھا۔“ اب کے ابا نے اماں سے نظریں چرابی تھیں۔ ”ویسے والا مذاق تو یار دوست کرتے ہی ہیں پر جب سامنے گلی میں جو امام صاحب رہتے ہیں ناں..... انہوں نے مجھ سے دو گلو چینی تلو کر میرے کپڑوں کو گھورا تو میں تو مانوں ترلیو ترلی (سینے، سینے) ہو گیا۔ اور پھر جاتے، جاتے مجھے چوٹھی (چنگلی) بھی وڈ گئے۔ کہنے لگے۔ ”کرم دین اچھا بھلا بندہ ہے تو، نماز بھی میرے پیچھے پڑتا ہے۔ پھر تیری مت کو لی (الٹی) کیوں ہو گئی جو دشمنوں کا لباس ٹانگ کر آ گیا ہے۔“

مجھتیں تو تیری بھلی ہیں ناں آج کل..... لے دس اب اس عمرے میں نے جڑے مندے یار تو نہیں بتانے ناں..... بڑی مٹی پلید ہوئی آج تو میری..... تو ایسا کر.....“ ابا نے اماں کو مخاطب کیا جو کشور کو کینہ تو ذنظروں سے گھور رہی تھیں جبکہ کشور کا سارا دھیان داوی کی ”ٹوٹی“ کی طرف تھا اور داوی کا سارا دھیان ابا کی باتوں کی طرف تھا۔

داوی نے بروقت ابا کو لکھ پہنچائی تھی۔ جو ابا نے ایسی نظروں سے اماں کو دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں اب بول۔
 ”وے پوپے۔“ اب کے داوی نے پوپے (شاہد) کو گھنچوڑا۔

”تجھے کیا تکلیف ہے..... منہ کیوں سو جا ہوا ہے؟ تیرے ناگوں میں کوئی مرگ ہو گئی ہے..... ہا ہا ہا.....“ داوی کو اماں کا میکا مارنے کا بڑا شوق تھا۔
 ”کچھ نہیں داوی، اپنی تو عزت ہی تار، تار ہو گئی آج۔ کچھ باقی نہیں رہا۔ کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا اب۔ زندگی سے دل اچاٹ ہو گیا میرا تو۔“

”ناں..... تجھے بتا تو ابا کے ساتھ ہٹی پہ گیا تھا یا سینما دیکھنے؟ شکل تیری ”کان“ (کوا) جیسی اور ڈائیلاگ بول رہا ہے تو ویلپ کمار کے۔“ داوی نے پوپے کی شکل پہ چوٹ کر کے اس کی گردن پہ پھر دھرا تھا۔
 ”داوی، ہزار بار کہا ہے مجھے کال نہ کہا کریں، میرے یار بنی تجھے وحید مراد جیسا ”ہمکین“ کہتے ہیں۔“ پوپے نے فخر سے گردن اکڑائی۔

”آہو..... کالے نمک جیسا ہمکین.....“ اب کے کشور نے لقمہ دیا تھا۔ نتیجتاً داوی، پوپا، ابا اور اماں چاروں کی قہریاں نظر میں اکٹھی اس پر پڑی تھیں۔
 ”اسی کی وجہ سے داوی.....“ پوپا ایک دم کشور پر انگلی تان کر ابا کی طرف پیٹھ کیے کھڑا ہوا تھا۔ جسے کسی وجہ سے ابا نے پیٹ سے کھینچ کر بٹھایا تھا۔

”اس نے داوی، اس نے مجھے یہ نئی پیٹ لاکر دی تھی کہ آج کل لاہور میں فیشن ہے، کولہوں سے نیچے گری ہوئی پیٹ کا..... پر داوی..... تمیں اس نے مجھے پیچے کی پہننے کو دے دی تھی۔ جو مجھے چھوٹی تھی اور آج جب میں ہٹی سے کسی کام کو باہر نکلا تو سب مجھے دیکھ، دیکھ کر ہنسنے لگے۔ پہلے تو مجھے پتا نہیں چلا کہ جب محلے کے بچے اکٹھے ہو کر میرے پیچھے لگے تو میں کھٹک گیا۔ اب مجھے کیا خبر تھی کہ میرے ”پچھواڑے“ کیا چل رہا ہے؟ وہ تو جب ریاض ورزی نے ہانک لگائی ناں..... آف مت پوچھیں داوی..... مت پوچھیں۔ اس کشور کی

وجہ سے آج میرے پچھواڑے کیسا اندھیرا چاہے۔ وہاں کون تھا، جو مجھے پر ہنسا نہیں..... اور یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ یہ مجھے ایسی پیٹ لاکر دیتی، نہ میری جتنی چادر کو داغ لگتا۔“ پوپے کے جذباتی اسٹائل میں جاری کیے گئے بیان نے کشور کی زبان پر پھر مچھلی کر ڈالی تھی۔

”میرا کوئی قصور نہیں ہے شاہد.....“ کشور پوپے کو اصل نام سے ہی بلاتی تھی۔ ”یہ تم اماں سے کہو، جو تم دونوں بھائیوں کو پندرہ، پندرہ روپے والے لال اور پیلے ”جاگے“ لاکر دیتی ہیں..... میں تو خود بڑا منع کرتی ہوں مگر میری.....“ داوی کی دھاڑ نے کشور کا منہ بند کر دیا۔ جس کے نزدیک قصور اب بھی ”گرتی پیٹ“ کا نہیں تھا۔

”تو بک بک بند کر، تو نے ہی سب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تو خود کتنی شہری ہے۔ شکل سے ہی ایلے تھا پنے والی جھنگن لگتی ہے۔ شرم نہ آئی تجھے بھائی کو آدھا کجا (ڈھکا) اور آدھا ننگا بازار بیچتے ہوئے اور پیو کو بگلا بنا کر.....“ ابا جو غصہ نکال لینے کے بعد بڑی حیرت سے داوی کی شکل کافی دیر سے دیکھ رہے تھے، خود کو بچوں کے سامنے ایک بار پھر بگلا بنانے جانے پہ تڑپ اٹھے۔
 ”کیا اماں تو بھی..... اب بس بھی کر..... مجھے

بگلا کہے جا رہی ہے، ذرا یہ بتا..... اسے ساتھ تو نے کیا ظلم کیا ہے؟ کیا سارے محلے نے آکر تجھے مہندی تھوپی ہے جو سر پہ جگہ نہیں رہتی تو منہ بھی پیٹ میں لے لیا۔“ ابا نے کامیابی سے داوی کا دھیان بگلے سے ہٹا کر اُن کی خود کی طرف موڑا تھا۔

”کیا ہانک رہا ہے پتر.....؟ دماغ کو بستی (بے زنتی) تو نہیں پڑھ گئی تیرے.....؟ مجھے کیوں پورے محلے نے مہندی لگائی تھی بھلا..... یہ تو میں نے کھوسے ہی لگوائی ہے۔“ کشور کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے، جتنی مرضی کوشش کرتی تھی کچھو کا دم چھلا ہٹانے کی مگر ناکام رہتی..... پر اس وقت متوقع ”چھترول“ سے بچنے کے لیے کھسکنے میں ہی عافیت تھی۔

”او..... پوپے جاؤ پتر..... شیشہ تو لے کر آؤ۔ تیری داوی کو اس کے ورثن کراؤں۔“ ابا نے

... سے دادی بننا قبول کیا تھا۔ اسی طرح باقی سب افراد نے بھی بخوشی ابا سے بابا جان، پوپے سے شاہد اور بیچے سے پرویز تک کا سفر کیا، کچھوکی جون تو پنڈ میں ہی بدل گئی تھی۔ صرف ایک اماں تھی جو ابھی تک اماں تھیں کیونکہ اماں نے کچھ بھی بننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ شروع، شروع میں جب کسی بچے نے لاڈ میں آکر ماما کی ہانک لگائی بھی تو اماں دوڑی چلی آئیں۔

”آئے ہائے، میں صدقے، میرا دیر آیا ہے؟“
 کدھر ہے تم لوگوں کا..... ماما۔“ بس اس کے بعد کشور نے اماں پر محنت کرنا بند کر دیا پر اب دادی کو گا ہے بگا ہے پنڈ کا ہڑکا لگ جاتا تھا۔ کبھی انہیں اپنی نجیس (بھینس) چھترے بکرے، بکریاں اور مرغیاں یاد آنے لگتیں اور کبھی پنڈ والے گھر کا وہ لبا چوڑا سیا ویہڑا (محن)۔ دادی کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں سب ہی پاس قریب کے پنڈوں میں لیتے تھے۔ اماں نے بہتیرا کہا کہ اگر آپ کا دل نہیں لگتا تو پنڈ، کسی بھی پتر کے پاس چلی جائیں۔ پر دادی نے بھی اماں کی خواہش پوری کر کے نہ دی۔ انہیں بھی نہ، نہ کرتے شہری سہولتوں کا چیکا لگ گیا تھا۔ جس میں سرفہرست ”کیبل کی سہولت“ تھی۔ فجر پڑھ کر دادی جونی دی کے آگے نکلتیں پھر ظہر کی اذانوں پہ ہی اٹھتی تھیں۔

پنڈ سے آکر ابا نے ایک چلتا ہوا جنرل اسٹور خرید لیا تھا، جسے ابا نے مزید ابھی حالت میں کر لیا تھا۔ زندگی ایک مخصوص روٹین پہ سیٹ ہوئی تو کشور نے سب کو ”شہری پولش“ کرنے کا اہتمام کیا۔ لہجوں سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک سب کے انداز و اطوار سنوارنے میں جت گئی۔ اور ابھی تک سب ہی بلاچوں و چرا اس کی باتوں پہ عمل بھی کر رہے تھے جو آج والا واقعہ رونما نہ ہو جاتا۔ اب ابا، اماں، دادی اور پوپا تو شہری بننے کی فہرست سے خارج ہو گئے تھے۔ بچے تھے تو کشور اور سب سے چھوٹا پرویز عرف بچا..... جو دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور مکمل کشور کا حمایتی و مددگار..... اب دیکھنا یہ تھا کہ اس رسمہ کشی میں جیت کس کی ہوتی ہے اور

سکون سے کڑی سے کڑکاتے پوپے سے کہا۔ اماں بھی چپ چاپ کھانا لگانے کی خاطر بچن میں کھسک لی تھیں، پوپا شیشہ لے کر آیا اور لہرا کر دادی کے سامنے کیا۔
 ”شن، شن، شن..... لیس دادی نظارہ کریں۔“
 پوپا ہتھی نکالتا بولا۔

”کم بخت..... اپنی شکل کیوں دکھا رہا ہے، بھوتے۔ میری طرف شیشہ کر۔“ دادی اپنی صورت پہچان نہیں پائی تھیں۔

”دادی غور سے دیکھیں، یہ آپ کا ہی رخ روشن ہے۔“ پوپا پر امانتے ہوئے بولا۔

”او..... تیرا بیڑا غرق کشور..... ہائے میں مر گئی..... کچھو تیرا ستیاناس کھی..... ہڈ حرام نہ ہو تو..... وڈی آئی تو شہرن..... ویسی گٹری (مرغی) ہو کر ولایتی بانٹیں دینے والی، باہر نکل ذرا.....“ دادی پورے محن میں چکرائی، ہاتھ سے مہندی رگڑ، رگڑ کر اتارے جا رہی تھیں۔ ساتھ، ساتھ کشور کو کونے بھی جاری تھے۔ ان کی حالت سے محظوظ ہوتے ابا کب کے انہی کی چارپائی پر لیٹے دھوپ کا مزہ لینے لگے تھے۔ پوپا کپڑے بدلنے کمرے میں جا چکا تھا۔ جبکہ کشور اسٹور میں لگانوں کے پیچھے وکی بیٹھی تھی۔

اب اسے دادی کا غصہ شندھا ہونے کا وہیں بیٹھے، بیٹھے انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

جمعہ، جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے، اس سارے ٹبر کو ”شوقیہ“ اندرون شہر شفٹ ہوئے۔ حالانکہ پنڈ میں بڑا ٹیکا تھا۔ اور ابا پہ کشور کا بڑا ”ٹیکا“ تھا۔ روزکان میں شہر میں رہنے کے فوائد پھونکتی تھی۔ ابا بھی آخر انسان تھے۔ انہیں لگا وہ شہر جا کر واقعی زیادہ باعزت ہو جائیں گے۔ لہذا زمینیں بیچ کر ایک دس مرلے کا مکان لیا۔ جانور سارے بڑے بھائی کے حوالے کیے تاکہ ان کی دیکھ ریکھ ہو سکے اور یہ پورا چھ افراد کا کنبہ شہر شفٹ ہو گیا۔ سچی بات تھی شروع میں تو دادی بھی بڑی خوشی، خوشی ساتھ روانہ ہونے لگیں اور بڑی مسرت سے بے

جان چھڑانا قطعاً نہیں بھایا تھا۔
 ”ناں، تو کس نے کہا تھا کہ تین ہی جم (پیدا) کے ہاتھ جھاڑ بیٹھ..... ہوتی تو میرے وقت کی تو تجھے پتا چلتا۔ تین بچے ہونا کتنی نموشی (بے عزتی) کی بات ہے۔“ واوی کو اماں کی تھوڑی اولاد کا بڑا قلق تھا۔ ان کے نزدیک کم از کم بچوں کی تعداد چھ مناسب تھی۔ ہاں جو اس سے تجاوز کر جائے تو وہ ”زندہ باد.....“

”ناں تو بے بے! میرے ہاتھ اختیار میں ہے کیا؟ شکر ہے اللہ کا، بے اولاد تو نہیں ہوں نانا.....“
 ”تو اور کیا واوی.....“ ”کشور چھپاک کی آواز کے ساتھ تو لیا پانی سے بھرے ٹب میں پھینک کر میدان میں کودی..... انداز تقریر والا تھا۔

”بہت ہو چکا ظلم و جبر واوی! اب وہ دور نہ گئے۔ جب جمعے کے جمعے ایک ”نیا کا کا“ ٹیکے کے نیچے سے نکلا کرتا تھا۔ عورت کو مشین سمجھا جاتا تھا..... تو یہ..... دے دے نیچے پہ بچہ دے نیچے پہ بچہ..... یہ بھی بھلا کوئی زندگی تھی۔ میں تو کہتی ہوں.....“ ”ابھی کشور کو کچھ اور بھی کہنا تھا مگر نائیں کندھے سے اماں کا جوتا، چھوٹا ہوا بڑی تیزی سے گزرا تھا۔ یہ دیکھ کے واوی کو بھی جوش چڑھا اور بولیں۔

”دے فضیلت! دے جوتے پہ جوتا..... دے جوتے پہ جوتا.....“ واوی کا بس چلا تو جس طرح کشور نے ان کا منہ ہندی سے لال کیا تھا۔ ویسے ہی وہ بھی کشور کا کر دیتیں۔ (مگر چھپڑوں سے)

”لے دس..... بے ہدایتی نہ ہو تو..... کیسے منہ پھاڑ کر نیچے پہ بچہ پیدا کروانے جا رہی ہے۔ بے شرم نہ ہو تو..... ہم نے تو بھی نہیں سنا کہ کسی کے گھر جمعے کے جمعے کا کا... ہوتا ہو۔ اور ٹیکے بھی بھلا کا کے دیتے ہیں؟ پٹھی مت والی نہ ہو تو.....“ واوی نے اس کی تقریر کا وہی بنا دیا تھا جبکہ کشور کینہ تو ز نظروں سے دونوں کو دیکھتی کندھا سہلا رہی تھی۔

”اماں سن لیں آپ دونوں، اول تو میری مرضی پٹھ میں شادی کروانے کی ہے ہی نہیں۔ پھر بھی اگر

”اے فضیلت..... یہ اپنی کشور اب بیاہ کے لائق ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے تائے کو بلوا کر بات کروں اب..... آ کر لے جائے اپنی امانت.....“
 واوی نے تار پر کپڑے پھیلاتی کشور کو دیکھ کر کہا۔

وہ حسب معمول صحن کے بالکل بیچ چار پائی ڈالے مالٹے چوس رہی تھیں۔ واوی ہمیشہ مالٹوں کو بیچ سے کاٹ کر کالائمنک ڈال کر چوسا کرتی تھیں۔ پھانسی بنا کر نہیں کھاتی تھیں۔ اسی چار پائی کے ایک طرف اماں پیٹھی پالک کے پتے چھانٹ رہی تھیں۔ واوی کی بات پر انہوں نے نظر اٹھا کر کشور کو دیکھا جبکہ دوسری طرف کشور نے بھی منہ پھیر کر واوی پر ایک نظر ڈالی مگر جلدی سے رخ واپس موڑ لیا تھا۔ جب سے واوی کے منہ کو ہندی کا رنگ چڑھا تھا کشور، واوی کو دیکھنے سے گریز ہی کرتی تھی۔ کیونکہ انہیں دیکھ کر ہنسی روکنا محال ہوتا تھا اور وہ بڑی مشکل سے پہلے ہی واوی کے عتاب سے بچ پائی تھی۔ اس وقت بھی اس نے بہ مشکل اپنی ہنسی دبائی تھی۔ پیلی چمکتی دھوپ میں پیٹھی واوی، واوی کا چمکتا ”مالٹے“ رنگ کا منہ اور منہ سے لگا آدھا کٹا مالٹا ہنسی نہ آتی تو اور کیا ہوتا..... حیرت تھی کہ اماں بغیر ہنسی کس طرح پیٹھی تھیں۔

”ہاں بے بے..... میرا بھی یہی خیال ہے کہ پاکرم واو کو بلوا کر کشور اور آصف کے بیاہ کی بات کر دینی چاہیے۔“ اماں کی سوچتی نظریں پھر بیٹی پر آٹھمیں۔

”میں تو کہتی ہوں کہ چڑھے چاند کی تاریخ دے دیں گے، کون سا غیروں میں جا رہی ہے جو متر سیاہے کرنے ہیں، اپنوں میں جا رہی ہے، چار جوڑے دے کر ٹھیل دینا (جان چھڑانا)۔“ واوی کو کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔

”نہ بے بے وہ کیوں.....؟ ٹھیلانا ایس ہی ہے، میرے کون سے درجن بال ہیں، تین تو بچے ہیں اور اک اک کڑی..... اس کو بھی مغر وادوں۔“ اماں کو واوی کا

دیکھ، جب یہ پنڈ میں بھی۔ تو خوں گئی، اسی ماحول میں رہتی ہی ہوئی تھی۔ شہر آئی تو یہاں کے رنگ ڈھنگ اپنا لیے۔ یہ سمجھتی ہے اس نے ہمیں بدلا ہے جبکہ یہ خود ہی ارد گرد کا ماحول اپناتی ہے اور سمجھتی ہے کہ باقی سب کو اپنی مرضی کا ڈھال لیا ہے، بس یہی ساری بات ہے، یہ جدھر جائے گی ویسے ہی ڈھل جائے گی اور ویسے بھی پنڈ میں اب کون سی سہولت ہے جو نہیں ماسوائے گیس کے۔ باقی بجلی بجلی سب ہے، تو فکر مت کر.....“ دادی نے اماں کو ان کی بیٹی کی نفسیات سمجھانے کی اپنی سی سٹی کی تھی۔ اماں کچھ سمجھی اور نا سمجھی کی کیفیت میں دادی کو ایک اور مالٹا چیرتے دیکھنے لگیں۔ پھر کچھ دیر دادی کے مالٹے گننے کے بعد۔ جو کہ سات تو ضرور بنے تھے اپنی جگہ سے انہیں اور کشور کے چھوڑے کپڑے دھونے چل دیں۔

☆☆☆

شادی ہوئی اور بڑے لمحے سے ہوئی۔ تایا اور تانی کج و ج کے کشور کو بیاہنے آئے تھے۔ تایا کالے کھوے (ٹینک) لگانا نہیں بھولے۔ شہری بہو بیاہ لے جانے کی خاطر تانی ساڑھی پہن کر آئی تھیں۔ جو ساڑھی کم اور دھوتی زیادہ لگ رہی تھی۔ پتا نہیں کس سے بندھوا بیٹھی تھیں کہ ساری قال دائیں ٹانگ کی طرف کھسکی ہوئی تھی اور بائیں طرف سے ساڑھی ٹخنے سے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ تانی نے ساڑھی پہلے کب باندھی تھی۔ جو چلنے پھرنے کی پریکٹس ہوتی۔ دو قدم چل کر یوں جھٹکا کھاتیں جیسے کسی نے دھکا دیا ہو۔ دادی کو تو رہ، رہ کر تاؤ آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سب کی نظر بچا کر دادی نے تانی کو ساڑھی کے پلو سے کھینچ کر اپنے ساتھ کرسی پر بٹھا دیا اور ڈپٹ کر بولیں۔

”ہیں..... زہرہ! تجھے یہ ”الماس بوبی“ بن کر آنے کو کس نے کہا تھا.....؟ اس سے تو اچھا تھا تو محکم کا لاچا نہیں آتی، کم از کم نور تو تیری سہی رہتی۔ ابھی تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تجھے ”قبض“ لگنے لگا ہے چہن کر رکھا

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 183 ﴾ نومبر 2016ء

میرے مقدر ماڑے لگے اور ایسا ہو گیا تو تایا کو بتا دینا کہ انہیں اپنے پورے ٹبر سمیت شہر آنا ہوگا۔ میرا نہیں گزارہ اب پنڈ ہنڈ میں۔“ وہ سخت لہجے میں دادی اور ماں سے مخاطب ہوئی۔

”ناں تیرے بوتھے پہ ستارے ٹنگے ہیں جو تیری ساری فرمائشیں پوری ہوں، چکی بیٹھی رہ اب۔ اور یوں گلا پھاڑ، پھاڑ کے بولنا بند کر دے۔ نہیں تو تیری آواز بھی..... فلاں جیسی ”کھروئی“ (کھردری) ہو جائے گی۔“ انہوں نے ایک مشہور سیاسی خاتون کا نام لیا۔

”اونہہ..... صورت باجیاں، آواز بھائیاں۔“ دادی نے چونکہ کشور سے متاثر ہونا بالکل چھوڑ دیا تھا..... سو خوب لتے لیے۔

”آپ لوگ بھی دیکھ لیتا پھر.....“ کشور نے غصے میں ٹوٹی بند کی اور کپڑے یونہی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اگر میں ابا کو شہر لاسکتی ہوں تو سسرال بھی لاسکتی ہوں..... ہاں.....“ تن من کرتی کشور خاتون کپڑوں سے جان چھڑاتی اندر گم ہو گئی تھی۔

”ہو..... ہائے بے بے..... یہ کیا کہہ گئی ہے؟ بچے بیچ میں اس نے نہ کر دی تو.....؟ یا کل کو سسرال میں بھی پواڑا ڈال دیا، شہر آنے کا..... پھر کیا ہوگا؟ لوگ تو ہمارے سروں میں کھے (خاک) ڈالیں گے۔“ اماں کے لہجے میں فکر مندی جھلک رہی تھی۔

”او تو فکر نہ کر فضیلت، یہ صرف گرج کر گئی ہے، برسے گی نہیں، ہماری تربیت میں کھوٹ نہیں، سچی کڑیاں آپ بہتی ہیں، منڈے نہیں بسا تیں، دیکھ لیں..... اس کا حال بھی وہی ہوگا.....“ میں آئی..... بُو گوائی۔“

دادی مزے سے سرد ہنستی ہوئی بیچ بیچ کی آواز کے ساتھ مالٹا چوستے ہوئے بولیں۔

”کیا مطلب بے بے، میں آئی..... بُو گوائی کا؟“ اماں کے سر سے اکثر دادی کے محاورے بغیر قیام کیے گزر جاتے تھے۔

ولیمہ وہی کھانا اے.....“ (میں نے کہا سوہنیو..... اب سو جاؤ صبح ولیمہ بھی کھانا ہے)

اور کشور کا دل چاہا کہ ایک زوردار مکا آصف کے پھولے پیٹ پر مارے جو یقیناً بارات کے کھانے کی وجہ سے ابھر آیا تھا۔ جس وقت رخصتی سے پہلے بارات کا کھانا کھلا تھا۔ تب اس کی سہیلیوں نے اسے بتایا تھا کہ ”کشور تیرا دولہا تو لگتا ہے ایک ہفتے کا بھوکا ہے، سب سے پہلے وہی میز کی طرف لپکا ہے اور پر سے شور بے والا سا نچاؤ لولوں پر ڈال رہا تھا تو پوری آستین کو سالن میں ڈوبا دے دیا۔“

مگر چونکہ کشور کے دماغ میں اس کی خود کی منطقیں گردش کرتی تھیں لہذا فکر کو سوار نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ تو اپنے تئیں پنڈ جانتی سب کو بدلنے کے لیے رہتی تھی۔ آصف کا بارات کی خوراک سے بھر پیٹ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ نہ صرف کھانے بلکہ بے تحاشا کھانے کا شوقین ہے اور بیوی سے دو ٹھنی باتیں کرنے کے بجائے اسے صبح کا انتظار تھا۔ جب وہ ولیمہ ٹھونس سکے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ کسی زوردار بھیانک آواز نے اس کے حواس گم کر دیے۔

”اووو.....“

”اللہ مجانی! ڈکار ہے یا ڈرون ایک کیا ہے اس بندے نے؟“ کشور حیرت میں گم تھی۔ آصف کے بھرے ہوئے پیٹ نے زوردار گڑائی لی تھی جو ہستر پر وراز شیروانی سمیت عنقریب نیند میں غوطہ کھانے والا تھا۔ کشور نے غور سے اس کی شیروانی کے پھڑکتے جن کو دیکھا جو عین پیٹ کے اوپر دم گھٹنے کے باعث ہک میں سے نکلنے کو بے تاب تھا۔ کشور کا جی چاہا اس جن کو خود ہی کھول کر آصف کے پیٹ کو آرام سے ”پھولنے“ کا موقع دے۔

”استغفر اللہ..... ہلڈوزر نہ ہو تو.....“ شدید کوفت سے اس نے آصف کو اپنے لہنگے سے پرے لڑھکایا تھا اور اس لڑھکانے کے نتیجے میں آصف بیڈ سے نیچے گرا پڑا۔ کشور کا جی چاہا اس راک اینڈ رول سے

ہے۔“ یہ کہہ کر داوی خود ہی ہنسنے لگیں۔ جبکہ تائی نے پتر کے ویاہ کے موقع پر ساس کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا۔ سب کچھ بخیر و خوبی ہو گیا۔ کشور خاتون رخصت ہو کر اسی پنڈ پہنچیں، جہاں کی خاک تھیں۔ کچھ زیادہ پرانی بات بھی نہیں مگر کشور کو یوں ہی لگتا تھا کہ وہ تو پیدا انٹی شہری ہے، پتا نہیں پنڈ میں کیسے رہے گی؟ ”نہیں کبھی نہیں..... ہولے، ہولے وہ ان سب کو بھی شہر لے آئے گی۔“ یہ پروگرام محض اس نے دل میں ترتیب دے رکھا تھا۔

پنڈ پہنچ کر وہ تمام رسمیں ہوئیں جن کا کبھی ماضی میں کشور بھی حصہ رہی تھی۔ ہر بیاہ میں اور رسم میں وہ آگے، آگے ہوتی تھی۔ مگر اس وقت کوفت اور تھکن اعصاب پر پوری طرح سوار تھی۔ کچھ رسمیں ادا کرنے والی عورتوں کے کپڑوں اور سروں سے عجیب سی باس اس کے دماغ کے بیچ کھولے دے رہی تھی۔

آخر تائی کو اس کے حال پر رحم آیا اور اسے کمرے میں پہنچایا۔ کمرے میں پہنچ کر، اپنے آرام وہ ”جینزی مسہری“ پر بیٹھ کر اس نے سکون سے پاؤں پھار لیے تھے۔ اسے نیند کے شدید جھوٹے آرے تھے کہ جب دروازے پر کھٹکا ہوا۔ وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ آنے والا آصف تھا۔ کشور نے شہری کڑی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے گرون اکڑا کر اسے دیکھا۔ مگر اس کا دھیان ہی کب تھا کشور پر..... اس کی موٹی، موٹی آنکھوں میں نیند کا سمندر تھا جس میں مار رہا تھا۔

آصف دھب سے کشور کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ کشور کو پہلی بار زندگی میں تھوڑی شرم آئی۔ آصف نے بڑی چاہ سے اس کا ہاتھ تھاما، کشور نے سر جھکا لیا۔ اسے انتظار تھا کہ آصف اسے اب رونمائی کے طور پر انگوٹھی یا کوئی نکلن، شکن پہنائے گا۔ آصف نے بڑے پیار سے کشور کو پکارا۔

”کشور.....“

”جی.....“ کشور نے آنکھیں پینائیں۔ ”میں آگیا سوہنیو..... ہون سو جاؤ، سورے

دنائے کسی بھی گوشے میں اور ملک میں

گھر بسٹھے

رسالے حاصل کیجئے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(شمول رجسٹرڈ ایک خرچ)

پاکستان کے بھی شہریا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
اور سال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ایک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے ہمارے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر
بیماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرمسٹا (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹاؤن، سسٹم انٹرنیٹ بین کورٹی روڈ، کراچی

021-35895313 - 021-35802551

میں بھی کھانے کی بیماری کی شدت برقرار رہی تھی۔ کشور
نے اسے یونہی چھوڑا اور خود ہاتھ روم کا رخ کیا۔

☆☆☆

”کشور پتر..... اٹھ جا پتر..... نماز پڑھ لے فجر
کی۔ نہیں تو ویلا لنگ جائے گا۔ اور چڑیاں سارا دن
ہیزے پہ بیٹھی تھیں لعنتیں بھیجیں گی۔“ تائی کی اپنی ہی
منطق تھی۔ روزِ صبح اسی طرح فجر کے وقت سب کو اٹھانی
تھیں اور جو نہیں اٹھتا تھا تو اس کے حصے کی چیزوں کو سارا
دن ہیزے پر لعنتوں کے لیے بٹھائے رکھتی تھیں۔

بڑی مشکل سے کشور نے آنکھیں کھولی تھیں۔
آصف تو تہجد کے وقت ہی زمینوں پہ نکل جاتا تھا اور یہ
اس کی صفت تھی۔ رات کو کتنی ہی دیر سے کیوں نہ سوتا
صبح پانچوں سے بھی پہلے اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ ہنفتے ہو گئے
تھے کشور کی شادی کو اور ابھی تک تائی ہی آصف کو ناشتا
کرا کر بھیجتی تھیں۔ ویسے بھی آصف کے لیے بیماری
بھگت کرنا شتابانہ کشور کے بس کی بات نہیں تھی۔

کبھی ساگ اور کبھی کی روٹی، کبھی پراٹھے اور
لہسن..... وہ بھی زیادہ مقدار میں..... خود کشور کو وہ ہفتوں
سے یہی کچھ کھانے کو مل رہا تھا۔ مگر اسے احساس تک
نہیں تھا کہ ناشتے میں چائے رس یا تو س کھانے والی کو
سسرال کتنا وزنی ناشتا کرا رہا تھا۔

اصلی گھی اور کھن کا مزہ منہ کو دو بارہ لگ گیا تھا۔
کشور نماز سے فارغ ہو کر چپل اڑستی، شال لپیٹتی
باہر صحن میں چلی آئی۔ تائی نے لکڑیوں کے بالن کو آگ
دکھا دی تھی۔ اب اس پر پورے شبر کے دھڑا دھڑ پراٹھے
پکے تھے۔ پنڈ میں ہر طرح کی سہولت موجود
تھی۔ ماسوائے گیس کے..... مگر تائی کے گھر گیس سلنڈر
موجود تھا۔ یہ الگ بات کہ تائی اس کا استعمال نہیں کرتی
تھیں۔ انہیں سلنڈر سے خوف آتا تھا۔ کبھی کبھار کشور کی
جیٹھانی اسے ضرور استعمال کر لیتی تھی۔ کشور کی جیٹھانی
ناہید بھی عجب آگے تھی۔ سات سال شادی کو ہو چکے تھے
اور چھ بچے تھے۔ سال کے سال آباوی میں اضافہ کرتی
تھی مگر اب بھی مزید کانے کھلانے کا چاہہ ختم نہیں ہوا تھا۔

www.paksociety.com

کون سا "ہر اچھا" کون ہے؟

☆☆☆

"مبارک ہو بے بے....." اماں دائیں چپل، بائیں میں اور بائیں، دائیں میں پھنسائے بیٹھتے قدموں سے وادی کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"مبارک ہو بے بے..... بڑی بڑی....." اب کے دادی نے اماں کو گھور کر دیکھا جو ایک بار پھر اتنا جملہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

"ناں..... اٹھانوے بار ہور بول..... سو کی تصحیح تو پوری کرنا..... مبارک ہو بے بے، مبارک ہو سب بے بے....." دادی نے اماں کے ہی انداز میں نقل اتاری پھر یک دم اچھل کر بولیں۔

"کہیں تیرے پیکے میں کوئی چٹا بال (گورا بچہ) تو نہیں جم بیٹھا..... تبھی تو خوشی سے پاگل ہو گئی ہے۔ تیرے پچھلوں کے کالے چکیلے رنگ جو ہوئے ہا ہا ہا....." دادی نے بات پوری کر کے ٹھٹھا لگا یا تھا۔

"خیر بے بے..... ایسی بھی بات نہیں..... میرے پیکے میں اگر کوئی اتنا گورا نہیں تو کاسٹک سوڈا آپ کے ٹبرنے بھی نہیں ملا ہوا..... ہیں تو وہ بھی ڈب کھڑے....."

"اتار لیا نہ بدلہ..... تو رہ سکتی ہے بھلا..... یہ جو تیرے بیچ اتنے گورے ہیں ناں تو وہ اپنے وادکوں پر ہی پڑے ہیں، ماسوائے پوپے کے، ایک وہی تیرے پچھلوں پر گیا ہے کبھی.....؟" دادی نے ناراض ہو کر پہلو بدلا تھا اور کھری سادی تھیں۔

"ہاں، ہاں بھی تو جب میری جج (باراٹ) آئی تھی تو میری سمیلیوں نے مجھ سے کہا تھا کہ فضیلت تیری تو ساری جج ہی دھوا کی ہوئی ہے۔ میری تو اماں کو فکر پڑ گئی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ بیٹی کس یرقان کے مارے خاندان کو پکڑا دی۔" اماں اپنے میکے کی عزت کی خاطر مبالغہ آرائی کی آخری حدوں کو چھو لیتی تھیں۔

"چپ کر جا، چپ کر جا..... پھولن دیوی کی ہم نظر....." دادی کا جلال خود گرا آیا تھا۔ "بھلا میں چاہتی

ایک بار پھر ہونے والے تو مولود کے لٹکوت تیار تھے۔ ساتواں بچہ تھا پر الٹیاں کر کے بے حال ہوئی رہتی۔ جو بھی تھا کھاتی ڈٹ کر تھی۔ کشور کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ دو پراٹھے ڈکار جاتی تھی اور پانچ منٹ بعد ہی کمرے پر بیٹھی الٹ رہی ہوتی۔ بھلا..... اتنا ٹھوسٹی کیوں ہے.....؟ یہ محض کشور سوچ کر رہ جاتی تھی۔

اس وقت بھی گھی کی خوشبو سے بچنے کے لیے ناک پہ شال کا کونہ دھرے اور سب سے چھوٹے پانچ ماہ کے بچے کو گود میں لیے تائی کے بالکل پاس بیٹھی پراٹھا اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔

کشور نے گھڑیاں گنتی شروع کر دیں۔ ادھر ناہید نے دو پراٹھے ختم کرنے تھے اور ادھر کمرے کی طرف دوڑنا تھا۔

"ندی..... بھلا کھا ہی اتنا جتنا پچا سکے۔ کم بخت، دو بیڑوں کا آٹا کمرے میں روڑ (بہا) آتی ہے۔" کشور کو محض جی ہی جی میں تاؤ کھانا آتا تھا۔ پر ظاہر ہے جیٹھانی کو کھانے سے تو نہیں روک سکتی تھی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد تائی صفائیاں کرانے میں جت جاتیں۔ صفائی کے لیے پنڈ کی ایک میراٹن آتی تھی جو تائی کے ساتھ ہانڈی روٹی کرنے میں بھی ہاتھ بٹاتی تھی، چونکہ کشور نے اپنے ہاتھوں کی مہندی ابھی اترنے نہیں دی تھی لہذا تائی اسے چولھے کے آگے بیٹھنے نہیں دے سکتی تھیں۔

تائی نے دو گائیں اور تین بھینسیں گھر کے پچھواڑے باندھ رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی جانور تھے۔ پر وہ ڈیرے پر بندھے رہتے تھے۔ تائی اور ناہید خود گھر کے جانوروں کی دیکھ بھال کرتیں اور گوبر اکٹھا کر کے ایلے تھاپتی۔ سامنے گھن کی ایک پوری دیوار ایلوں کی مدد سے بنائے گئے تجربیدی آرٹ کا نمونہ تھی۔ جس وقت ایلے تھپتے تھے اگر بچے اسکولوں کو نہ گئے ہوتے تو تمام بچے گوبر پہ ٹوٹ پڑتے تھے اور پھر دیوار کے ساتھ، ساتھ وہ خود بھی اس قدر ہرے، ہرے ہو جاتے کہ ناہید کو ایک نظر میں پہچانا مشکل ہو جاتا کہ

ہوگئی۔ ابا کو گردن میں کچھ مسئلہ ہوا تو ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا کہہ دیا۔ پوپا، ہٹی میں مصروف اور چھوٹا بیجا کتابوں میں..... اور اماں ان سب کی دیکھ بھال میں مصروف..... کشور سے محض فون پر رابطہ تھا۔ پھر دادی نے کشور کو خوشی کی خبر دی تو ساتھ ہی سفر سے بھی منع کر دیا۔ کچھ تائی کی وہی طبیعت نے بھی شہر کا منہ نہ کرنے دیا۔

اور اب جبکہ اللہ نے خوشی دکھائی تھی تو دونوں ساس، بہو کو بری طرح کشور کی یاد ستانے لگی۔ اب تو ابا بھی دوبارہ ہٹی پہ جانے لگے تھے۔ اگر دادی اور اماں بیچے کو ساتھ لے کر چلی بھی جاتیں تو پوپا ابا کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ ویسے بھی دودن کی تو بات تھی۔ اماں اور دادی کو تو مانو کچھ سوچہ نہیں رہا تھا کہ کشور اور اس کے بیچے کے لیے کیا، کیا سوچا تیں لے کر جائیں۔ دادی کی خوشی تو دیکھنے والی تھی۔ آخر کو ان کی تیسری نسل کا بچہ تھا۔ اور بوڑھے، کمزور، جسموں میں اگر کوئی چیز حرارت کا موجب بنتی ہے تو وہ اپنی نسل کو بڑھتے پھولتے دیکھنا ہے۔

☆☆☆

تایا کے لمبے چوڑے محن میں خوب رونق لگی تھی۔ دادی کے پہنچنے ہی ان کے سارے بیٹے اور بیٹیاں تایا کے گھر جمع ہو گئے تھے۔

شدید سردی کے باعث دادی نے کشور اور اس کے بیٹے کو باہر محن میں لانے سے منع کر دیا تھا کہ سب سے مل ملا کر وہ اور اماں کشور کے کمرے میں ہی چلی جائیں گی۔ گرما گرم دودھ پتی پی کر اور بیسن کا حلوا جی بھر کے کھا کر دادی اور اماں کچھ دیر کمر نکانے کے لیے اور کشور سے ملنے کے لیے اس کے کمرے کی طرف چل دیں۔ عورتوں نے باورچی خانے کا رخ کیا اور مردوں نے ڈیرے کا۔ بیجا بھی دادی اور ماں کے پیچھے ہو لیا۔ کمرے کے دروازے کے باہر سے ہی تینوں نے کشور کی آوازیں سنیں جو اپنے بیٹے کے ساتھ لاڈلیاں کرنے میں مصروف تھی۔

نہیں..... تیری ماں کو سب سرے دانی کہتے تھے۔ بڑی آئی ”چھانٹی“ ہو کر ”سج“ کو مینے (طعنے) مارنے والی۔“ اب کے جو ابا اماں نے کچھ نہ کہا بلکہ منہ پھلا کر رخ موڑ لیا۔ چند لمحوں بعد دادی کی ہی آواز پھر ابھری۔

”چل اب منہ سیدھا کر..... غصے میں ویسے بھی تیرا منہ فلاں جتنا ڈٹا ہو جاتا ہے۔ کہ متھے سے دیکھنا شروع کر دو تو بل (ہونٹ) تک آتے، آتے پون گھنٹا مارا جاتا ہے۔“ دادی نے کسی کا نام لے کر اماں کو ہنسانا چاہا تھا اور اماں ہنس بھی دی تھیں۔ انہیں ہنستا دیکھ کر دادی نے فٹ نوکا۔

”بس، بس..... تھوڑا ہنسیں! میں نے تخت پوش کی چادر سویرے ہی پوپے کو کہہ کر بدلوائی تھی۔“ اماں، دادی کے ہی تخت پوش پر براجمان تھیں لہذا دادی کی سمجھہ لازمی تھی۔

”چل اب بتا بھی دے..... کون سی خوشی کی خبر سنانے آرہی تھی مجھے؟“

”ہاں..... وہ.....“ اماں نے ماتھے پر ہاتھ مارا..... ”باتوں میں لگ کر ذہن سے ہی نکل گیا کہ کہنے کیا آئی تھی۔ وہ اپنی کشور کے گھر منڈا ہوا ہے، کل رات کو۔“

”کیا.....؟“ دادی تو اچھل ہی پڑی تھیں۔

”اور تو اب بتا رہی ہے، اب بھی رہنے دیتی۔ خیر سے سال کا تو ہو لینے دیتی۔“

”میں تو بتانے ہی آئی تھی بے بے..... پر آپ نے ہی میرے پیکے کے لتے لینے شروع کر دیے تھے۔“

”حق ہاہ.....“ دادی نے ٹھنڈا ہوا کا بھرا تھا۔

”دیکھ فضیلت، وقت تھی تیزی سے نکل جاتا ہے اور پھر جب کی کشور بیاہ کر گئی ہے، بس ایک واری ہی چکر لگ سکا ہے اپنا۔“

یہ بات واقعی سچ تھی کہ پوپے درپے کچھ ایسی مصروفیات آڑے آئی تھیں کہ نہ اماں پنڈ جا سکیں

اور نہ دادی..... دادی محن میں گریں تو پنڈالی کی بڑی فریگی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|------------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کیڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کو بھی لے آئیں۔ سچی تم لوگ تو بیاہ کر مجھے بھول ہی گئے۔“ کشور اماں سے مخاطب تھی جبکہ اماں کا منہ ابھی تک حیرت سے ادھ کھلا تھا۔ اسی منہ سے ان کی آواز برآمد ہوئی۔

”آئیں گے سب آئیں گے میری بچی..... پر تو یہ بتا کہ تیرا داغ تیرے کھوکھے (سر) میں ہی ہے یا کہیں پھینک پھونک بیٹھی ہے۔“

”کیا اماں! میں کیا پوچھتی ہوں اور آپ کی بتاتی ہو..... نواسے کی شکل تو دیکھو۔“ اب کے کشور نے دھیان بیٹے کی طرف کرایا جیسے اماں نے دادی سے لے کر تمام لیا۔

”آپا نام کیا رکھا ہے میرے بھانجے کا؟ یقیناً بڑا اچھوتا ہی سوچا ہوگا۔“ بیچے کو پتا تھا کہ کشور کو نئے اور خوب صورت ناموں کا کتنا شوق تھا۔

”خورشید..... خورشید رکھا ہے کیسا.....؟“ کشور نے فخر یہ بیویں اچکانے ہوئے ہم پھوڑا۔

دادی، اماں اور بیجا پھر سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

”آپا تمھوڑا“ ہولا“ رکھنا تھا۔ لگتا ہے پورے پنڈ کے ناموں کا وزن اس اکیلے بیچارے پر لا دیا۔ ہے۔“

”او جا اونے! چنگا بھلا تو ہے..... کیوں..... اماں؟“ اور اماں نے مردانہ اثبات میں ہلا دیا تھا جبکہ دادی کا اطمینان قابل دید تھا۔

”اچھا، تو یہ ٹلوکان ہے؟“ بیچے کو کسی طور چین نہیں پڑ رہا تھا۔

”یہی ہے! اور کون ہوگا..... اس کا ماما.....؟“

”ہا.....“ کشور اپنی بات پردل کھول کے منس دی۔

”اللہ نہ کرے آپا..... میں پرویز ہی ٹھیک ہوں، بس ٹلو نام کچھ ہضم نہیں ہوا۔ اس لیے پوچھ لیا، تمہیں تو نام بگاڑنا برا لگتا تھا ناں آپا.....؟“

”لگتا تھا..... پر وہ کیا ہے ناں، یہاں پنڈ میں سب کے نام بگڑے ہوئے ہیں، سو اس کا بھی نام سوچا جا رہا تھا کہ خورشید کو کیا کہہ کر بلا یا جائے..... اس کی

”او..... میرا ٹلو..... میرا پیارا ٹلو..... یہ تو سب سے سوہنا ٹلو ہے۔“ تینوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ کشور اور نام بگاڑے..... وہ بھی اپنے بیٹے کا..... وہ تینوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ کشور کی نظر بڑی تو بے ساختہ جھنجھٹی ہوئی اماں اور دادی کے گلے جا لگی۔ کتنے مہینوں بعد تو ملے تھے سب.....

”اماں، دادی میں بہت اداس ہو گئی تھی۔ قسم سے بڑا یاد کرتی تھی، پر پنڈ کے جھیلے جان ہی نہیں چھوڑتے اور پھر میرے شہر آنے پر بھی روک لگ گئی تھی۔“ کشور بیڈ سے کپڑے سمیٹتی دادی اور اماں کے بیٹھنے کی جگہ بنانے لگی۔ دادی نے تو لیٹنے کی، کی اور لحاف سینے تک اوڑھ لیا اور اماں نے بھی ٹانگیں لحاف میں گھسالیں۔ سیٹ ہو کر دادی کو پوتے کا خیال آیا۔

”ہیں، کشور ڈرامنڈے کو تو دے مجھے، رب دی سوں میں تو فیراک واری جوان ہو گئی ہوں۔“ کشور نے بیٹے کو دادی کی گود میں ڈالا۔

”فیراک واری کا کیا مطلب دادی؟ آخری دفعہ آپ کب جوان ہوئی تھیں۔“ یہ بیچا تھا جس نے اصل میں کشور کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

”ہائے میں صدقے، میرا دیر..... تو، تو ہور لیا ہو گیا ہے، کیسا ہے تو بیچے.....؟“ کشور، بھائی پر داری صدقے جانے لگی۔ جبکہ بیچے کی آنکھیں پھٹ کر کانوں کو جا لگیں۔

”آپا، تجھے سردی تو نہیں لگ گئی یا پھر تیری... یادداشت ماری گئی ہے کیا؟ پرویز نام ہے آپا میرا، پرویز.....“ بیچے نے یاد دلایا تھا۔

”پرویز ہو یا بیجا میرا اور..... نام سے کیا ہوتا ہے، اصل چیز کام ہے کام، کسی کام سے لگ جائے گا تو نام خود ہی ہو جائے گا۔“ اماں کو تو ہول پڑ رہا تھا کشور کی فلسفیانہ گفتگو سے جبکہ دادی پڑ پڑتے کو ہاتھوں میں لیے اس سے باتیں کرتی کن آنکھوں سے کشور کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

”اور اماں، گھر میں سب کیسے ہیں؟ پوچھے اور ابنا ماہنامہ پنکیزہ 168 نومبر 2016ء

ساری رات میری غسل خانے میں گزری تھی۔“
 ”او..... دادی! اب آپ لڑانا شروع کر دیں۔
 آگے بھی تو بتائیں کیا ہوا تھا۔“ بیجے نے بچا لڑانے
 سے پہلے ہی دونوں کو روک دیا۔

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ابھی میرے منہ پر
 چڑھا مہندی کا رنگ پھیکا نہیں پڑا تھا۔“ دادی نے
 مہندی کا ذکر اس انداز میں کیا جیسے کسی نئی دلہن کے
 ہاتھوں کی مہندی کا تذکرہ.....

”اس دیلے میں نے تجھ سے کہا تھا فضیلت کہ
 اپنی کشور کی تربیت میں کھوٹ نہیں۔ اس کا حال وہی
 ہوگا۔“ میں آئی بُو گوائی ”وہ جہاں جائے گی ویسی ہی
 ڈھل جائے گی۔ حالانکہ اسے یہی محسوس ہوگا جیسے
 دوسرے اس کی مرضی کے مطابق خود کو تبدیل کر رہے
 ہیں۔ جبکہ اصل بدلاؤ اس کی اپنی ذات میں آئے گا۔“
 دادی نے بڑے فخر سے پونی کی نفسیات ڈہرائی تھی اور
 اماں نے ساری بات سمجھ کر سردھننا تھا۔

”شوں، شوں، شوں.....“

”بے بے! بیجے! آپ لوگوں کو خوشبو آ رہی ہے
 کوئی.....؟ شوں..... شوں.....“ اماں ناک سے کسی
 نادیدہ چیز کو سونگھتی ہوئی پوچھنے لگیں۔

”ہاں آ رہی ہے ”مٹر قیمہ“ کی۔“ دادی بولیں۔
 انہیں مٹر قیمہ بہت پسند تھا۔ ”میرا خیال ہے کچن میں
 تیری جیشخانی شاید یہی بنا رہی ہے۔“

”نہیں بے بے ”مٹر قیمہ“ نہیں مجھے تو مولیوں کی
 خوشبو آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے اپنی کشور نے سویرے
 ناشتے میں مولیوں والے پراٹھے کھائے ہوں گے اسی
 پٹنگ پر۔“ اماں نے لحاف سونگھتے ہوئے قیاس آرائی کی
 تھی کیونکہ خوشبو یا بدبو جو بھی تھا لحاف میں ہی تھا۔

”تو مجھے خوش نہ ہونے دینا فضیلت..... اپنی پسند
 کی چیز کی ہی خوشبو مٹھی ہے تیری ناک میں۔“ تبھی کشور
 رُے میں دودھ پتی کنگ رکھے اندر داخل ہوئی۔

”بے کشور سے پوچھ۔“ داوی نے کشور کو
 درمیان میں کھینٹا۔ ”آج کس چیز کا ناشتا کیا ہے تو نے

پھپھیاں ”شیدی“ کہہ رہی تھیں..... ”تایا“ کھرچی ”بول
 رہا تھا اور چاچا ”شیدا ٹلی“، بلا رہا تھا۔ مجھے ایک بھی
 پسند نہیں آیا تو میں نے اپنی مرضی سے ”ٹلو“ رکھ لیا۔ سبھی
 کو بھا گیا۔ کیوں دادی آپ کو کیسا لگا..... آپ بھی تو
 کچھ کہیں تاں.....؟“

”پتر کھینے کی طرح فٹ بیٹھا ہے وڈا ہو کر
 سارے ٹبر کی ”ٹلیاں“ بجائے گا ہا ہا.....“ دادی نے
 ہنستے ہوئے سردھننا تھا جبکہ اماں کو ان کا اطمینان ایک
 آنکھ نہ بھایا تھا۔ ان کی برداشت ختم ہو گئی۔

”کشور لگتا ہے، دن، رات بھینسوں میں رہ
 تیرے دماغ کا گوبر بن گیا ہے۔ کہاں تو پنڈ اور ادھر
 کے لوگ تیرے وارے میں نہیں آ رہے تھے اور اب تو
 خود ہی ڈنگروں کی طرح ہونی جا رہی ہے۔“ ابھی اماں
 نے اور بھی لٹاڑنا تھا کہ دادی کا تیشی ہنکار اسٹانی دیا۔

”ہوں..... ہوں.....“ پھر کشور سے مخاطب ہوئیں۔
 ”کشور پتر جاؤ ایک، ایک کپ دودھ پتی کا اور
 بنالا..... پنڈ کا پالا (ٹھنڈا) تو گوڈوں میں مٹس رہا ہے۔“
 کشور کو باہر بھیج کر دادی نے اماں کا مغز ٹھنڈا کیا۔

”اے فضیلت..... قد تیز امر کر چار فٹ ہوگا پر
 عقل تیری ہورے کیوں گٹوں میں ہے، حالانکہ سنتے
 آئے ہیں لمبے کی عقل گٹوں میں ہوتی ہے..... یہ تو بیٹی

سے کس طرح کی باتیں کر رہی ہے..... یاد ہے اک
 داری میں نے تجھے کیا سمجھایا تھا؟ ”دادی کا انداز
 استفہامیہ تھا جبکہ اماں کے چہرے پر ہنوز اکٹا ہٹ تھی۔
 ”یاد کرو وہ دن جب ویٹرے میں منچی (چارپائی)
 پر بیٹھ کر گرم، گرم دھوپ سینکتے ہوئے ہم مالٹے چوپ
 (چوس) رہے تھے۔“ دادی کی نظریں خلاؤں میں بھٹک
 رہی تھیں۔

”ہم نہیں..... آپ بے بے اکیلی آپ اور
 پورے سات مالٹے چوپے تھے آپ نے.....“ اماں
 نے بردقت دادی کو یاد دہانی کر دئی تھی۔

”کم بخت ہتا تھا مجھے تو یقیناً میرے مالٹے گن
 رہی ہوگی۔ تبھی تو اس دن میرا پیٹ ڈھیللا ہو گیا تھا اور

اور تیرا بچا غرق ہو کشور..... دادی نے ایک

جھکے سے لحاف پر بے پھینکا..... ”دس مرتے سہی، ناس مارا آصف تو لگتا ہے بھینس کی بو پرو کر لے آیا ہے اس میں اور تو نے وہی ”کیلا لحاف“ ہمیں اوڑھا دیا۔“
دادی کا غصہ عروج پر تھا اور بچے کی ہنسی.....
”پر بے بے..... مولیوں کی ہمک کدھر سے آرہی ہے؟“ اماں مولیوں پر ہی اٹکی تھیں۔

”اوہو..... اماں! چھوڑ بھی دو مولیوں کو۔ کھالی ہوں گی بھوری نے مولیاں، پاس ہی تو ڈھیر لگا رہتا ہے سبزیوں کا۔ جو میرا دیور ہمارے کھیتوں سے لاتا ہے۔“
کشور کے لہجے میں کھیتوں کا فخر بول رہا تھا۔
”اور دادی..... وہ تو سحری کی بات تھی۔ اب تو بو اڑھ رہی گئی ہوگی۔“ کشور نے دادی کو تسلی دی۔

”مر جا بیٹے..... ابھی تک اندھیر مگری بچی ہے اندر..... ذرا منہ ادھر لا۔ اندر گھساؤں تیرا مگر تجھے اپنی بھوری کی کر توت پتا چلے۔“ دادی کو کشور کی بے نیازی زہر لگ رہی تھی۔

”آئے ہائے دادی، میں بھی تو اسی لحاف میں سوئی ہوں، مجھے تو کوئی نہیں آئی بو.....“ (میں آئی بو گوائی)
”ویسے بھی بھوری والا پاسا (سائڈ) یہ تھوڑی تھا۔ وہ تو اماں والا تھا۔ بھی تو مولیوں کی ہمک چڑھ رہی ہے انہیں۔“ اور اماں کو مانو کسی نے تیلی دکھا دی تھی۔ شرٹی کی طرح اوپر کو اچھلیں اور ایک جھکے سے لحاف اتار کر پرے پھینکا جو سیدھا دادی کے اوپر آ کر انہیں پیٹ میں لے گیا۔ دادی بیچاری جو پہلے ہی خود کو لحاف سے آزاد کر چکی تھیں اور اپنی ناک کو شال سے اچھی طرح ڈھکے بیٹھی تھیں۔ اس اچانک سر پڑنے والی افتاد پر بری طرح لحاف میں مچھلنے لگیں۔ وہ بیچاری شال میں اچھی طرح لپیٹی ہوئی تھیں۔ اس میں سے ہاتھ نکالتیں تو لحاف ہٹا پائیں ناں..... اور بس ایک بار وہ لحاف سے نکل آئیں تو یقیناً باقیوں کی خیر نہیں تھی۔ جو ہنس، ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔

کشور؟ مٹر قیرہ کھایا تھا یا مٹولی کا پراٹھا؟“

”افوہ دادی..... میں نے تو سویرے دلیہ کھایا تھا۔ بھلا نکلے سے بچے کے ساتھ میں اتنی بھاری خوراک کیسے لے سکتی ہوں۔“

”ہاں! گل تو تیری ٹھیک ہے..... پھر مگن میں کچھ پک رہا ہوگا؟“ دادی کو بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔
”پر بے بے، ہمک اس لحاف میں سے اٹھ رہی ہے.....“ اماں بھی سابقہ بیان پر قائم تھیں۔

”اوہو.....! اماں آپ لوگ بھی کمال کرتے ہو۔“ کشور نے ٹرنے پائی پر رکھی اور پھر گویا ہوئی۔
”دادی! مٹر قیرہ تو تانی نے واقعی پکایا ہے، خاص آپ کے لیے۔“ کشور نے دادی کو اطلاع بہم پہنچائی۔
”آئی شاداں اے.....“ دادی نے لہرا کر ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اماں کی جان جلائی تھی۔

”پر ناں جی..... مجھے تو اب بھی کچھ مولیوں کی وہاڑ (بدبو) آرہی ہے۔“ اماں نے حسی انداز میں ہاتھ اٹھا کر بات ختم کی۔

اماں کی بات پر دادی نے بھی کچھ کھٹک کر لحاف میں منہ گھسا کر کچھ سو گھسنے کی کوشش کی۔ پھر لاشعوری طور پر لحاف ذرا سا پرے سرکا دیا جسے سینے تک اوڑھ رکھا تھا۔

”دہنیں اماں..... اصل میں رات آصف سرگی (سحری) دلیے آ کر لحاف لے گئے تھے۔ وہ ناں پچھلے مگن میں جو بھوری مچ (بھینس) ہے ناں آصف کو لگا وہ ٹھنڈ کے مارے کالی سے نیلی ہو رہی ہے۔ وہ ٹھہرے درو مند اور ہمدرد سدا کے۔“ کشور کے لہجے میں آصف کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

”فانٹ لحاف لیا اور اس نمائی کے اوپر ڈال آئے۔ مجھے تائی کے کمرے سے دوسرا لایا پر آپ کو تو پتا ہے ناں اماں، مجھے اپنے عیالے اور لحاف کے بغیر نیند کہاں آتی ہے، صبح روشنی پھوٹے ہی میں نے واپس منگو لیا اور تانی والا بھیج دیا۔“ کشور کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی۔

دلہائی ناواں

ماہوش طالب



کہیں نہیں بھاگا جا رہا میں۔“ معظم بیزاری سے بولا اور پھر ساری توجہ ٹی وی پر لگے فٹ بال میچ کی طرف مبذول کر لی۔

”کیا سوچا ہے تم نے، چلو گے آج شام مسز احتشام کی پارٹی میں، میرے ساتھ؟“ مسز بخاری ایک بار پھر پرانا موضوع لے کر بیٹھ گئی تھیں۔

”مجھے پتا ہے تم کہیں بھاگے نہیں جا رہے اور میں

”آخر آپ کو جلدی کس بات کی ہے.....“

تہیں بھاگنے بھی نہیں دوں گی لیکن تمہارے دماغ میں جو کچھ دیکھ رہی ہے میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی سمجھے! "اب کی بار معظم ٹھکانا تھا۔

"کیا مطلب، کیا پک رہا ہے میرے دماغ میں؟" اس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

"اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں نشا کو تمہارے لیے سلیکٹ کر لوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے، اتنے عرصے سے تم جو انکار کیے جا رہے ہو سب بھوتی ہوں، آج کی پارٹی میں مسٹر ہاشمی کی بڑی بیٹی بھی موجود ہوگی اسی سے انٹرویو کرواؤں گی میں تمہیں۔"

"آپ کو نہ جانے کیوں نشا پسند نہیں ہے، کیا بڑائی ہے اس میں کزن ہے وہ میری، بچپن سے آپ دیکھ رہی ہیں۔" اسے اپنی اس پھوپھو زاد سے مٹی کی بیزارگی کی وجہ سے سمجھ نہیں آئی۔

"کزن ہے تو کیا سر پر بٹھالوں، بٹھانا کیا بلکہ بیٹھ چکی ہے وہ، اسے پال پوس کے بڑا کیا یہی احسان کافی ہے، اب اس یتیم کی میں تمہارے ساتھ شادی بھی کروادوں تو اس اچھائی کی توقع مت رکھنا مجھ سے۔"

وہ زہر خند لہجے میں بولی تھیں۔
"آپ سے کس نے کہا کہ میں نشا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ جواب تک آڑھا ترچھا صوفے پر بیٹھا تھا ایک دم سیدھا ہو بیٹھا، اب ممکنے کی باری ان کی تھی اور دروازے کے پار کھڑی نشا کا دل لرز کر رہ گیا۔

"واٹ ڈویومن، کس نے کہا تم نے ہی تو بتایا تھا مجھے کہ تم اسے پسند کرتے ہو، اس کی تعریف میں زمین، آسمان ایک کر رکھا تھا تم نے آسٹریلیا جانے سے پہلے۔"

"واؤ نمی، آپ کو اتنی پرانی بات یاد ہے..... امیزنگ لیکن پسند کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... پسند تو مجھے اس کی ڈیزی بھی بہت ہے تو کیا میں اب اس سے

شادی کر لوں؟" اس نے نشا کی مٹی کا نام لیا تھا، تضحیک اڑاتے ہوئے وہ ان کے اندازوں کی تردید کر رہا تھا۔ نشا نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا اور واپس اپنے کمرے کی جانب چلی گئی..... صبح تو کہہ رہا تھا معظم، کسی کو پسند کرنے کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا ناں کہ وہ شادی بھی اسی سے کرے گا۔ اگر اس نے دو سال پہلے آسٹریلیا جانے سے قبل نشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا تھا۔

"نشا مجھے لگ رہا ہے، میں وہاں جا کر تمہیں بہت مس کرنے والا ہوں۔" اور نشا نے خواہ مخواہ ہی کچھ خواب اپنی آنکھوں میں سجالیے تھے، وہ تمام دن ان دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھا۔

وہ اس گھر میں اپنے ماموں کے ساتھ تین سال کی عمر میں آئی تھی بہت جلد اس کی معظم کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ مہمانی یعنی معظم کی مٹی جسے نشا بھی مٹی ہی کہنے لگی تھی نے کبھی اس کے ساتھ سوتیلوں والا برتاؤ نہیں رکھا تھا مگر کبھی بیٹی والا درجہ بھی نہیں دیا..... کہ بہر حال تھی تو وہ ان کی ٹڈل کلاس سند کی بیٹی..... جس کا بڑی کسمپرسی میں انتقال ہو گیا تھا کہ وہ علاج بھی نہیں کروا پائی تھی۔ کچھ سال پہلے ماموں کے انتقال کے بعد مٹی کی پیشانی کے بلوں میں نشا کو دیکھ کر بے وجہ ہی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہاں تو غلطی نشا کی ہی تھی..... معظم نے کب اس سے اظہارِ محبت کیا تھا، جو یوں اب وہ کسی کو الزام دیتی.....

☆☆☆

پرل کانٹی نینٹل میں سماں بندھا تھا..... مٹی کی نظریں اپنے بیٹے اور ہونے والی بہو سے نہیں ہٹ رہی تھیں آج تو وہ نشا کو بھی اپنے ساتھ لیے نت نئے لوگوں سے متعارف کر رہی تھیں۔ نشا کے لیے تو کم از کم وہ چہرے نئے ہی تھے..... معظم نے اپنی ماں کی پسند پر چپ چاپ ہاں کر لی تھی..... بظاہر لا تعلق نظر آتی نشا کی نگاہیں بار بار معظم اور ارشد کی جانب اٹھتی تو اپنی کم مائیگی کا احساس خادای ہونے لگتا..... سچ پر بیٹھے

تمہارا کوئی ارادہ نہیں تھا شادی دادی کا۔“ انہوں نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش کی۔

”وہ کچھ عرصے پہلے کی بات تھی می! ارادے اور نیتیں بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ویسے بھی آپ کو خوش ہونا چاہیے ایک ساتھ دو، دو فکروں سے آزاد ہو جائیں گی۔“ بہت مشکل سے اس نے اپنے لہجے کو نرم ہونے سے روکا اور بیرونی دردازے کی جانب بڑھ گئی۔ ناشتا کرتے معظم نے چونک کر اسے جاتے دیکھا تھا۔ اور پھر می کی جانب..... انہوں نے کندھے لچکا دیے۔ انہیں تو واقعی خوش ہونا چاہیے تھا سو وہ خوش تھیں.....

”ایکسکوز می۔“ کہہ کر وہ اپنی چیئر سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔

”نشا یہ سب کیا ہے؟ کیا کہہ رہی تھیں تم می سے؟“

”کیوں، کیا کچھ غلط کہا ہے میں نے جو آپ کو اعتراض ہے۔“ بہت ساری ہمت جمع کر اس نے معظم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے، میں نے تمہیں اس دن سب سمجھایا تھا، مت کرو ایسا۔“

”آپ کو کس نے کہا کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔“ معظم کے لیے یہ دھچکا شدید تھا۔ ”کیا میں تمہیں بالکل بھی پسند نہیں ہوں؟“ وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”پسند..... ہاں پسندیدگی اپنی جگہ، وہ تو میں اس ڈوگی کو بھی بہت کرنی ہوں جو آسٹریلیا سے آپ اپنے ساتھ لائے تھے..... اس کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا۔“ معظم لا جواب کھڑا تھا۔ نشا گیٹ سے باہر نکل گئی تھی..... اپنی بے نام محبت کو خواہشوں سمیت اس نے گزشتہ رات ہی دفنا دیا تھا..... اب تو بس فاتحہ پڑھنی تھی اور وہ آنسو بہانا باقی تھے وہ بھی شاید خشک آنسو.....



مسکرائیں کھیرتے دونوں ایک ساتھ برقیٹ کھل لگ رہے تھے۔ وہ اب ایک کونے میں بیٹھی ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی کہ اچانک وہ نشا کو اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

”تم بہت خوب صورت لگ رہی ہونشا، معظم۔“ سر تا پا اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے نشا میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔“ نشا کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

”تمہیں بتاؤں میں نشا... کہ یہ صرف ایک ڈراما ہے..... ہاں صرف می کے اصرار پر میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔“ وہ حیرت زدہ اس کی بات سن رہی تھی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں نشا!“ معظم کے لہجے کی سچائی.....؟ وہ اب بھی بے یقین تھی۔

”بس تمہیں ہر حال میں میرا ساتھ دینا ہے.....“

اس سب سے۔“ معظم نے اریبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے ریلیشن شپ پر کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔“ وہ اب عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بول رہا تھا اور نشا کو پہلی بار معظم کی آنکھوں سے نفرت محسوس ہوئی تھی..... وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ گئی۔

معمظم، اریبہ کی ہانپوں میں ہانپیں ڈالے دنیا و ما فیہا سے بے خبر اسے نئی زندگی کے خواب دکھا رہا تھا..... ہاں سے باہر نکلتے ہوئے نشا نے آخری نظر ان دونوں پر ڈالی کچھ دیر پہلے یہ شخص کہتا تھا کہ یہ فنکشن صرف دکھاوا ہے۔ وہ رات اس نے مشکل سے کافی تھی۔



”می میں نے آپ کو حدیفہ کے بارے میں بتایا تھا ناں آج فائنلی میں حدیفہ سے بات کر کے آپ کو انفارم کر دوں گی کہ اس کے پیئرس کب تک آسکیں گے۔“ یہ پہلی بار تھا کہ وہ ان کے رد بردار تھے پورا عماد لہجے میں اپنے کسی کلاس فیلو کے لیے بات کر رہی تھی۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے، کچھ عرصے پہلے تک تو



سہری ڈھوپ میں برستی بارش

فناطہ چوہدری

Downloaded From
Paksociety.com

ہی سے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور یہ رونق رات
گئے تک جاری رہی تھی۔ مہندی کی رسم بڑی دھوم، دھام
سے منائی گئی تھی اور اب شاہ ہاؤس کے مکین اور تمام مہمان
خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ماسوائے اس

آج شاہ ہاؤس اپنی پوری شان سے کھڑا روشنیوں
اور رنگ برنگی قہقہوں سے جگمگ، جگمگ کر رہا تھا۔ آج
بڑے شاہ جی سید و جاہت علی شاہ کے بڑے پوتے سید
زمان علی شاہ کی رسم مہندی تھی۔ شاہ ہاؤس میں شام ڈھلے

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 194 ﴾ نومبر 2016ء

www.paks



شاید یہ کسی کی نظروں کی تپش تھی جو رائیل کو پیچھے دیکھنا پڑا اور پیچھے نظر جاتے ہی ایک گروپ پر پہنچی جس کے کچھ کھڑا ایک بھر پور مردانہ وجاہت کا حامل لڑکا اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ رائیل کی نظروں کے تعاقب میں جب زار نے بھی دیکھا تو وہ جھٹ سے بولی۔

”ارے یہ تو یونیورسٹی کا سب سے بیسٹ گروپ ہے۔ اس کے تمام لڑکے لڑکیاں یونیورسٹی کے ٹاپ اسٹوڈنٹس ہیں اور تو اور یہ لوگ تو کسی اور سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ خاصے اونچے و ماغ کے ہیں یہ سب۔“ زار نے ایک ہی سانس میں سب کچھ رائیل کو بتا دیا۔

”اور وہ جو سب سے ہینڈ سٹ لڑکا ہے ناں جو بچوں کچھ کھڑا ہے، وہ اس گروپ کا ہیڈ ہے۔ سید حمدان علی شاہ جو اپنی پرنسٹن اور قابلیت کے بل بوتے پر بہت اگڑا ہے۔“ رائیل کافی حیران تھی کہ زار کو یہ سب کیسے پتا ہے جبکہ آج تو اس کا بھی پہلا ہی دن تھا۔

”تم اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہو؟“

”لو..... اکیچو علی میری ایک کزن بھی ادھر ہی پڑھتی ہے بلکہ ان سب کی کلاس فیو یو ہے تو اس نے ہی مجھے بتایا تھا۔ اور ایڈمیشن کے دوران کئی دفعہ آنا ہوا تو ان کے بارے میں مجھے کافی معلومات ہیں۔“ اور پھر جتنی دیر زار اور وہ وہاں بیٹھی رہیں، رائیل کو اس کی نظروں کی تپش محسوس ہوتی رہی۔ کلاس تو ہوئی نہیں تھی سو دونوں نے واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

گاڑی کے ہارن پر چوکیدار نے گیٹ واکیا جس پر سید حمدان علی شاہ گاڑی اندر لے آیا۔ پورچ میں گاڑی روکتے ہی اس کی نظر لان میں بیٹھی اماں جان اور اپنی ماما جان پر پڑی، ساتھ ہی اس کے ماموں کی بیٹی عرشہ بھی بیٹھی تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ لان کی طرف بڑھا۔

”السلام علیکم“

”و علیکم السلام، جیتا بڑا میرا شہر پتر۔“ اماں جان

کے جس کی آج پوری دنیا ہی تپن نہیں تھی۔ رسم کے دوران جب اس نے اس شخص کو دیکھا جو اس کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا تو اس کے اندر عجب بے کلی پھیل گئی تھی۔ وہ شخص وہ تھا جس نے اس سے اس کی عزت، غرور اور اس کی ذات کا مان چھین لیا تھا جس کی وجہ سے وہ آج جی دامن تھی۔ ماضی قریب کی تمام سچ یا دیاں آج نئے سرے سے یاد آ کر اسے کچھ کے لگا رہی تھیں۔ شاہ ہاؤس میں آنے کے فیصلے نے اسے پھر سے ماضی میں لا چکا تھا۔

یونیورسٹی کے پہلے روز ہی وہ کلاس میں لیٹ پہنچی تھی۔ اسے اپنی کلاس ڈھونڈنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج طالب علموں کی کافی کم تعداد حاضر ہے۔ وہ پہلی نشستوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی جب اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک لڑکی آ کر براجمان ہوئی۔ وہ خود تو کافی کم گو اور لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی اس لیے دوسری لڑکی نے ہی بات چیت میں پہل کی۔

”ہیلو! آئی ایم زارا شہباز۔“

”اور میں رائیل شاہ۔“ اس نے بھی اپنا نام بتاتے ہوئے زارا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔

”لگتا ہے کہ آج کلاس نہیں ہوگی، فرسٹ ڈے عموماً کلاس نہیں ہوتی۔ چلو آؤ باہر چلتے ہیں اور ویسے بھی کلاس کا آدھا نام تو گزر رہی چکا ہے۔“ زارا کے کہنے پر رائیل نے ایک نظر کلاس کو دیکھا جس میں اب ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا سو رائیل کو زارا کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ وہ دونوں باہر گراؤنڈ میں بیٹھ گئی تھیں۔

”تمہیں فزکس میں ماسٹرز کا خیال کیسے آیا؟“

”یہ میری ڈیئر ماما کا شوق تھا کہ میں فزکس کی فیلڈ جوائن کروں۔“ زارا کے پوچھنے پر رائیل نے جواب دیا۔

”اور مجھے بچپن سے ہی پور سائنسز کو پڑھنے کا

بہت شوق ہے اور میرا یہ شوق آج مجھے یہاں پنجاب یونیورسٹی کچھ لایا۔“ زارا نے اپنا بتایا۔

عرشہ کی ہاؤس جاب اور امان کے ایم بی اے کے بعد ہونا طے پائی تھی۔ اس رشتے سے حمدان آتے جاتے عرشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا۔

☆☆☆

ساہیوال کے بس اسٹاپ پر اترتے ہی راتیل نے ایک لمبی سانس لی اور فضا میں اپنے شہر کی خوشبو کو محسوس کیا۔

اسے اپنے شہر سے بہت پیار تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ کبھی اپنے شہر سے دور نہ جاتی لیکن ”کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے“ پر عمل کرتے ہوئے اپنی پڑھائی کی خاطر اپنے شہر کو خیر باد کہنا پڑا۔ بی ایس سی تک ساہیوال میں تعلیم حاصل کر کے اب اسے ایم ایس سی کے لیے مجبوراً لاہور جانا پڑا۔ کیونکہ ساہیوال میں کوئی بڑا ادارہ ایم ایس سی نہیں کروا رہا تھا اور جو کروا رہا تھا وہاں فزکس کا مضمون نہیں تھا۔

راتیل نے بہت خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے شفیق سے پاپا جانی اسے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتے تھے اور بقول ان کے راتیل ان کی بیٹا ہے۔ یہی حال بہت سو برادر پیاری سی ماما جانی کا تھا۔

راتیل کے پاپا جانی سید منہاج علی شاہ مقامی کالج میں میٹرس ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے اور وہ اس شہر کی جانی پچانی شخصیت تھے۔ انہوں نے لندن سے میٹرس میں بی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ جبکہ راتیل کی ماما جانی نے ان ہی کے سبکیٹ میں ایم فل کر رکھا تھا لیکن وہ ہاؤس وائف کا کام سرانجام دے رہی تھیں۔ دونوں ماما، پاپا کی یہی اکلوتی اولاد تھی اور دونوں کے پیارنے اس کی ذات میں کوئی خرابی یا بگاڑ کے بجائے اس کی ذات میں مضبوطی اور نکھار پیدا کیا تھا۔ وہ اکلوتی ہونے کے باوجود اپنے والدین کی بہت فرمانبردار اولاد تھی۔ اس کی بڑی وجہ ان کے گھر کا ماحول تھا۔ پاپا جانی کا وقت، وقت پر دیا ہوا اخلاقیات پر لیکچر اور ماما جانی کی گھریلو تربیت نے اس کی شخصیت کو پراعتماد اور مکمل بنا دیا تھا۔

راتیل ساہیوال آئی تو سامان رکھ کر فوراً اپنی

کے بچے میں اس کے لیے محبت جھلک رہی تھی۔
”اتنے دن لگا دیے آنے میں، جانتے بھی ہو کہ ماں تمہارے بغیر کتنی ادھوری ہے۔“ ماما جان نے اسے گلے لگاتے ہی شکوہ کیا۔

”کیا ماما جان! اب ایک سال ہی تو رہ گیا ہے پھر یہاں آپ کے قدموں میں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے ڈیرا ڈال لوں گا۔“

”باتیں کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔“ شافیہ بیگم نے اس کے فلسفیانہ انداز پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔
”اور عرشہ جی آپ کیسی ہیں؟ اور ہماری حویلی میں کب قدم رکھا؟“

”ارے، ہم تو کب سے آئے ہوئے ہیں، آپ کو اپنے کاموں سے فرصت ملے تو ادھر ادھر کی خبر ہو۔“ عرشہ کی اس سے گہری دوستی تھی جو اب اس کے یونیورسٹی جانے سے ماند پڑ گئی تھی۔

”ہا..... ہا.....! یہ ڈائلاگ آپ اپنے ”ان“ کے لیے سنبھال رکھیے..... بس اگلے ماہ آنے ہی والے ہیں۔“ حمدان نے اسے اپنی عادت کے مطابق چھیڑا۔ جس سے شرمیلی عرشہ کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

”ہل ہٹ پرے..... بے شرم، کیوں تنگ کرتا ہے پچاری کو.....“ اماں جان نے اسے جھاڑا۔

”ہاں جی! پچاری تو بہت ہیں یہ محترمہ..... جی تو ہمارے بھیا کو لے اڑنے کے ارادے رکھتی ہیں۔“ حمدان نے یہ سرگوشی عرشہ کے کان میں کی ورنہ اماں جان سے کوئی بعید نہ تھی کہ اسے جوئی کھینچ مارتیں۔

عرشہ سے اس کی بچپن کی دوستی تھی۔ کھیل کود، دکھ، تکلیف سب میں وہ اس کی ساتھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ حمدان کے بڑے بھائی سید ایمان علی شاہ کو عرشہ اچھی لگنے لگی اور لگتی کیوں نہ..... وہ تھی ہی اتنی سادہ دل اور چھوٹی موٹی سی کہ کسی کا بھی دل اس پر آسکتا تھا لیکن حمدان نے ہمیشہ اسے چھوٹی بہن ہی سمجھا تھا۔ امان کی پسندیدگی کو بد نظر رکھتے ہوئے عرشہ کو امان کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی تھی جبکہ شادی

اب تو وہ سب یونیورسٹی سے مالوس ہو چکے تھے۔ چار ماہ کیسے گزرے پتا بھی نہیں چلا۔ آج راتیل اور زارا کا فرسٹ سیکسٹر کلاسٹ پیپر تھا۔ دونوں آج بہت خوش تھیں کیونکہ دونوں کے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے۔ راتیل اپنی کلاس کی سب سے ہونہار اسٹوڈنٹ تھی۔ پورا ڈیپارٹمنٹ یہ بات جانتا تھا۔ ایک تو وہ۔۔۔ بی ایس سی میں تھی بھی گولڈ میڈلسٹ اور اس یونیورسٹی آنے پر تو اس کے جوہر کھل کر سامنے آ رہے تھے۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی۔

وہ دونوں پیپر دے کر ہال سے باہر نکلیں تو موسم بہت حسین ہو رہا تھا۔ آسمان پر کالی بدلیاں اگھیلیاں کر رہی تھیں۔ ایک تو پیپر ختم ہونے کی خوشی اور دوسرے موسم حسین، دونوں نے کینٹین جانے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کینٹین میں داخل ہوتیں وہی بیسٹ اور یونیورسٹی کا مشہور گروپ آن کی طرف بڑھا اور ان میں سے حمدان علی شاہ نے انہیں سلام کیا۔

سید حمدان علی شاہ اپنی وجاہت کے علاوہ ذہانت میں بھی بے مثال تھا۔ راتیل کی طرح وہ بھی بہت ذہین اسٹوڈنٹ تھا اور یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ اسے اچھے سے جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ اینول فنکشن میں اسے ہوسٹنگ کے لیے کہا جاتا لیکن اس سال اساتذہ نے راتیل شاہ کا نام بھی دیا۔ ایزاے کو ہوسٹ..... اسی کی بابت حمدان علی شاہ آج اس کے پاس چلا آیا تھا۔ حمدان علی شاہ کے سلام کا جواب صرف زارا نے دیا جبکہ راتیل نے ایک ناگوار نگاہ اس پر ڈال کر اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

”ایسیکو زری مس راتیل شاہ! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ حمدان نے راتیل کا رویہ نظر انداز کر کے اسے مخاطب کیا۔ جبکہ حمدان تو کسی ایرے غیرے کو بلانا پسند نہیں کرتا تھا مگر راتیل کو دوسری مرتبہ مخاطب کرنے پر حمدان کو ناگوار نہیں گزرا جبکہ گروپ کے باقی ممبرز حمدان کے بڑے بڑے تھے۔

”لیکن مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سنی۔“ راتیل

بیسٹ فرینڈ آمنہ کی طرف دوڑ لگا دی جو ان کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دونوں نے بی ایس سی تک اکٹھے پڑھا تھا اب آمنہ کی شادی اس کے کزن کے ساتھ طے ہو گئی تھی۔ اس لیے یونیورسٹی میں دونوں کا ساتھ نہ ہو سکا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آمنہ نظر آ گئی تھی۔ جولان میں پوچھو کی کانٹ چھانٹ کر رہی تھی۔ ”کیسی ہو راتیل؟ تمہارے بغیر دیکھو کن، کن چیزوں میں خود کو الجھا لیا ہے میں نے۔“ گلے ملتے ہی آمنہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

”بس، بس رہنے دو..... اتنا ہی افسوس ہو رہا ہے تو پھر مجھ اکیلی کو جانے ہی کیوں دیا؟ لیکن تمہیں تو شادی کا شوق سوار تھا نا..... اب سڑتی رہو.....“ راتیل کو ابھی تک آمنہ کے لاہور نہ جانے پر غصہ تھا سو آتے ہی اسے سنا ڈالیں۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو، اب اتنے دن بعد آئی ہو چلو سکون سے باتیں کریں..... اتنا کچھ ہے تمہیں بتانے کے لیے اور کچھ، کچھ تم سے سننے کے لیے۔“ آمنہ نے راتیل کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی سہیلی کی اس ادا پر مسکرا دی۔

”ہاں تو اب سناؤ لاہور کا کوئی ڈریم مین ملا؟“ آمنہ نے راتیل کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں وہاں پڑھنے گئی ہوں..... ڈریم مین ڈھونڈنے نہیں۔“

”اچھا تو جناب ڈریم مین کے لیے آنکھیں کھول کر رکھنا پڑتی ہیں۔ وہ خود تمہارے پاس چل کر نہیں آئے گا۔“ آمنہ نے حسب عادت راتیل کو چھیڑا۔

”اچھا چھوڑو اپنے منگیتر کی سناؤ کب آرہا ہے تمہیں لینے۔“ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ اس طرح آمنہ سے ایک خوشگوار ملاقات کر کے وہ اپنے گھر آ گئی کیونکہ ابھی اسے اپنے پاپا جانی کو اپنے ہاتھ کی کافی بھی پلانی تھی۔

☆☆☆

نے حمدان میں ایسی کون سی فضولیات دیکھ لیں جن کی بنا پر تم اسے فضول کہہ رہی ہو؟“

”ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کیوں اس کی طرف وار بنی ہوئی ہو، خیر میں تمہیں یہ پہلی اور آخری مرتبہ بتا رہی ہوں کہ مجھے اس شخص کی آنکھوں سے فرعونیت نکلتی ہوئی نظر آتی ہے، مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ غرور پتا نہیں کس بات کا ہے اس میں بڑا آیاؤ پرا کہیں کا۔“ رائیل نے بھی ایک ہی سانس میں حمدان علی شاہ کے گن گنوا دیے۔

”کیوں، اس نے تم پر ایسی کون سی نظر بازی کر لی ہے؟“ زارا اب بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی اور ہوتی بھی کیسے؟ رائیل کے تمام الزامات مفروضات کی طرح خود ساختہ ہی تھے۔ جو کم از کم زارا کی سمجھ سے باہر تھے۔ اب زارا کو کون سمجھاتا کہ زندگی میں کچھ لوگوں سے بس اللہ واسطے کا بیڑا ہو جاتا ہے اور رائیل کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ رائیل کو اول روز سے ہی حمدان سے عجیب سی چڑ ہو گئی تھی۔

”میں تمہیں اب کچھ نہیں سمجھا سکتی اور پلیز اب اس بندے کو گولی مارو اور چلو ورنہ بس نکل جائے گی۔“ زارا، رائیل کو یہ بات دوبارہ سمجھانے کا ارادہ ترک کر کے اس کے ساتھ چل پڑی مبادا وہ مزید استفسار پر اسے ہی جھاڑ پلاوے۔

☆☆☆

ساہووال آ کر بھی رائیل کا موڈ آف ہی رہا تھا۔ اس فضول شخص کی وجہ سے آج زارا سے بھی تلخ کلائی ہو گئی تھی۔ یہ سوچ، سوچ کر رائیل کو زور بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ کب سے فی وی لاؤنج میں بیٹھی کڑھ رہی تھی کہ کچن سے ماما جانی اس کے لیے جوس لے کر نکلیں۔

”ارے رائیل جانو، میں کب سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم کچھ الجھی، الجھی سی ہو، کیا پرابلم ہے میرا بچہ؟ آپ کو پتا ہے ماما جانی تو آپ کی فرینڈ ہیں، چلو جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے؟“ کچن ونگٹو سے وہ رائیل کو نوٹ کر رہی تھیں۔ سانسے فی وی لگا ہونے کے باوجود

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 199 ﴾ نومبر 2016ء

کے ری ایکشن پر وہاں موجود سبھی لوگ حیران کھڑے تھے۔ رائیل جیسی ویل مینزڈ لڑکی سے کوئی بھی اس طرح کی بدتمیزی کی امید نہیں رکھتا تھا۔ جبکہ رائیل کو تو ندان پہلے دن سے ہی عجیب لگا تھا کچھ زارا کی باتوں سے بھی رائیل کو حمدان کا غرور ایک آنکھ نہ بھایا۔

حمدان علی شاہ نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں لیکن کہا کچھ نہیں..... نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت وہ رائیل کو کچھ کہے بغیر چھوڑے جا رہا تھا۔ حمدان نے اپنے گروپ کو اشارہ کیا اور وہاں سے چلے گئے۔ حمدان کے فرینڈز اس کے رویے پر حیران تھے تو دوسری جانب زارا، رائیل کے بی بیویئر پر حیران تھی۔

”تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ وہ یونیورسٹی کا سب سے ڈین اور ویل مینزڈ لڑکا ہے اور تم نے بغیر کسی سولڈ ریزن کے اسے سنا ڈالیں۔ ایسا کیا کہہ دیا تھا اس نے۔ ایک ضروری بات ہی تو کہنا تھی اسے تم سے۔“ ان کے جانے کے بعد زارا نے رائیل سے استفسار کیا اور اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی جبکہ رائیل اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال بھی چکی تھی۔

”تمہیں کچھ اور کہنا ہے یا اب چلیں؟“

زارا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ رائیل جیسی اچھی سلیمی ہوئی لڑکی تو وہ اب کہیں سے نہیں لگ رہی تھی۔ ”مجھے تم سے ایسے رویے کی امید نہیں تھی۔ اس نے صرف بات کرنا تھی، تمہیں کھانا نہیں جانا تھا۔“ زارا نے ایک بار پھر رائیل کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

”پار زارا، تمہیں پرابلم کیا ہے؟ ہاں..... میں جب اس شخص کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہ رہی تو پھر تم کیوں اسے بارہ بار درمیان میں لا رہی ہو۔ انتہائی فضول لوگوں کو کب سے ڈسکس کرنا شروع کروا ہے تم نے؟ چلو اب ویر ہو رہی ہے، ابھی سامان بھی اٹھانا ہے پھر بس عمارت نکل جائے۔“ ابھی رائیل نے وو قدم اٹھائے ہی تھے کہ زارا نے اس کی کلائی تھام لی۔ ”ہم کہیں نہیں جا رہے، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم

نانا نانی، دادا، دادی ان کو عید دی دینے آئے تو وہ اسکول میں خوشی، خوشی اپنی چیزیں دکھا رہے ہوتے اور راتیل کی آنکھیں پانیوں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ اسکول سے واپسی پر پاپا جانی سے استفسار کرتی تھی اور پھر گھر آ کر ماما جانی سے بھی سوال کرنا نہیں بھولتی تھی..... لیکن جواب دہی ہوتا تھا۔

”بیٹا ابھی آپ چھوٹی ہو جب بڑی ہوگی تو سب سے ملوائیں گے آپ کو۔“ جیسے، جیسے راتیل شاہ بڑی ہوتی گئی اسے سمجھ آتی گئی کہ کوئی ایسا حادثہ یا کوئی ایسی بات ماضی میں ضرور ہو چکی ہے جس کی وجہ سے یہ رشتے اس سے دور ہو گئے ہیں لیکن ایک نسلی بھی تھی کہ بڑے ہو کر یہ رشتے مل جائیں گے اور پھر وہ اپنے دادا، دادی اور نانا، نانی سے بہت سی عیدیں لیا کرے گی اور اپنی فریڈز کو دکھایا کرے گی لیکن اب جب وہ بالغ ہو گئی تھی تب بھی ماما جانی اور پاپا جانی اسے بتانے سے انکاری تھے۔ آج ماما جانی کا انکار سن کر اسے دلی دکھ ہوا تھا لیکن اس نے سوچا کہ اگر یہ رشتے اچھے ہوتے تو ضرور میرے پاس بھی ہوتے شاید انہوں نے ماما جانی اور پاپا جانی کے ساتھ کچھ برا ہی کیا ہوگا جو آج دونوں ان رشتوں کے بارے میں سننا بھی پسند نہیں کرتے۔

ماما جانی اسے سوچوں میں گم چھوڑ کر کچن میں پانڈی دیکھنے کے لیے جا چکی تھیں۔ اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تو وہ بھی اپنے کمرے کی طرف آرام کی غرض سے چل دی۔

☆☆☆

”یار حمدان غصہ تھوک دے۔ وہ ایک لڑکی ہے، اس سے بدلہ لے کر تو کیا کرے گا اور پھر سب کو تمہاری عادات کا علم ہے، اس کے کہہ دینے سے تم برے تو نہیں بن سکتے ناں.....“ معزز پچھلے دو گھنٹوں سے اسے سمجھانے میں اپنا سر کھپا رہا تھا لیکن حمدان بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ اس کے سر پر راتیل شاہ سے بدلہ لینے کی دھن سوار ہو گئی تھی اور اب اس کا اپنے ہدف سے پیچھے ہٹنا ناممکن ہی لگتا تھا۔ اول تو وہ کسی گوبلا وجہ چھیڑتا نہیں تھا

وہ عاصب دماغی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کی بچپن سے عادت تھی کہ اگر کوئی بات بری لگتی تو وہ بات دنوں اس کے حواس پر سوار رہتی۔

”تو ماما جانی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، ایوری تھمک ازاد کے.....“

”اوہ، ماما کی جان.....“ ماما جانی نے اسے پیار سے گلے سے لگا لیا۔

وہ ان کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے تمام پیار سمیٹتی تھی۔ اسے دیکھ کر شازیہ بیگم کو اپنی ممانی جان یاد آ جاتی تھیں یعنی راتیل کی دادو..... وہ ہو بہو اپنی دادو پر بڑی تھی۔ ایک، ایک نقش رب نے بڑی خوب صورتی سے بنایا تھا۔ دسی ہی بڑی، بڑی غزالی آنکھیں، سرو قد، کمر تک لمبے سلکی جھکتے بال اور ستواں ناک اور ساتھ، ساتھ سنہری رنگت اس کی شخصیت کو مزید جاذب نظر بناتی تھی۔

راتیل نے ماما جانی کو اسے لگاتار دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر رکھا۔

”کیا ماما جانی! آپ کبھی، کبھی مجھے ایسے کیوں دیکھنے لگتی ہیں، جیسے کچھ کھوج رہی ہوں..... میرے چہرے میں کسی اور کا چہرہ ڈھونڈ رہی ہوں؟“ وہ راتیل کے اس قدر پرفیکٹ اندازے پر چونکی ضرور تھیں لیکن لمحوں میں ہی سنبھل گئی تھیں۔

”آں ہاں.....! ایسا کچھ بھی نہیں ہے، میری بیٹی ہے ہی اتنی پیاری کہ اس کے ایک، ایک نقش کو دل میں اتارنے کو دل کرتا ہے۔“ ماما جانی نے پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔

”آں ماما جانی! آپ نے اور پاپا جانی نے مجھے کبھی اپنے رشتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ آپ دونوں ہمیشہ بات ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر کہ ابھی تو تم چھوٹی ہو لیکن اب تو میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہو گئی ہوں۔ پلیز اب تو بتا دیں۔“ راتیل کو ہمیشہ سے ہی رشتوں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی فریڈز کے کزنز آتے تھے۔ کھیلتے، کھوتے پکارتے تھے۔ پھر ان کے

اور نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا اسٹوڈنٹ تھا۔ جب وہ تینوں ایم ایس سی میں آئے تو آذر اور عمیر سے ان کی دوستی ہوئی۔

سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اس طرح سے ان پانچ لڑکوں کا ایک گروپ بن گیا تھا جو یونیورسٹی میں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ سب اپنے گروپ میں تو بہت شرارتیں کرتے تھے لیکن دوسروں کو بہت کم ہی شامل کرتے تھے۔ اس لیے سب ان کو تھوڑا مغرور سمجھتے تھے حالانکہ ضرورت پڑنے پر یہ لوگ سب کی مدد بھی کھلے دل سے کرتے تھے۔ ان میں کبھی کسی نے کوئی غلط عادت نہیں دیکھی تھی۔

کبھی تو حمدان کی بات سن کر معیز کو دکھ ہوا تھا کیونکہ ان سب نے تو کبھی کبھی ایسا غلط سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بات صرف حمدان اور معیز کے درمیان تھی۔ حمدان ہمیشہ اپنی ذاتی بات معیز سے شیئر کرتا تھا کیونکہ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے۔

”تو غلط کر رہا ہے ایک بار پھر سوچ لے یار، ایسے جذبات میں آ کر بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔“ معیز نے ایک بار پھر حمدان کو سمجھانے کی کوشش کی جو رانگاں ہی گئی۔

”تو میرا ساتھ دے رہا ہے کہ نہیں؟ بس مجھے اتنا بتا دے۔“ حمدان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ راتیل جیسی ضدی چڑیا کے پرکاٹ ڈالے اور اسے بے بس کروے۔

”او کے یار! کول ڈاؤن..... میں نے تجھے کبھی انکار کیا ہے۔“ معیز نے آخر کار ہتھیار ڈال ہی دیے۔ اگر وہ نہ بھی مانتا تو بھی حمدان نے کون سا اپنی سوچ کو عملی جامہ نہیں پہناتا تھا۔

”یہ ہوئی ناں بات! مجھے یقین تھا کہ تو انکار کر ہی نہیں سکتا۔“

”چل یار تجھے کچھ کھلاؤں پھر مجھے اپنے مشن پر کام میں شروع کرنا ہے۔“ حمدان تو اس وقت کا سوچ

اب جبکہ شروعات راتیل کی طرف سے ہوئی تھی اور وہ بھی بلا کسی وجہ کے تو حمدان کا غصہ سوائیزے پر تھا۔

کچھ اس کی رگوں میں خاندانی خون دوڑ رہا تھا جو اپنا بدلہ لیے بنا ملتے نہیں تھے۔ بدلہ لینے پر آتے تو جان لیے بنا نہیں ملتے تھے لیکن اس وقت حمدان جان لینے سے پرے کچھ مختلف سوچ رہا تھا۔ راتیل نے بغیر کسی وجہ کے اس کی عزت اور وقار کو کرچی کرنے کی کوشش کی تھی۔ حمدان کو تو اساتذہ بھی بہت عزت دیتے تھے۔ ایک تو وہ تھامی ذہین اور فرمانبردار اور دوسرے وہ کسی کے لیے اذیت کا باعث نہیں بنتا تھا۔ وہ جس سچ پر اب سوچ رہا تھا اس پر تو کسی کا دھیان جاسی نہیں سکتا تھا۔

”تم اس انسلٹ کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے جو سچ چوراہے پر مجھے محسوس ہوئی ہے۔“ حمدان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہونے آرہا تھا۔

”یار تو سمجھنے کی کوشش تو کر..... یار کون پاگل لڑکیوں سے بدلہ لیتا ہے اور پھر یہ کہاں کی ٹھنڈی ہے کہ اس کی عزت بھی سچ چوراہے پر بکھیرنا..... دیکھ وہ لڑکی ہے، اسے بہت فرق پڑے گا، تو، تو لڑکا ہے تجھے نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ تجھ پر کوئی انگلی اٹھانے والا ہے۔“ حمدان نے معیز کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو معیز کے پسینے چھوٹ گئے کیونکہ وہ خود بہنوں والا تھا اور وہ سمجھ سکتا تھا کہ راتیل کے ساتھ جو کچھ حمدان کرنے جا رہا ہے اس سے راتیل کی زندگی محدود اور مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔

”تو اپنا لیکچر بند کر اور بتا کہ تو میرا ساتھ دے رہا ہے یا نہیں۔“ حمدان کو معیز کا سمجھنا سخت زہر لگ رہا تھا کیونکہ وہ کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

معیز کے تو پسینے چھوٹے ہوئے تھے کیونکہ اس نے کبھی ایسا کام نہیں کیا تھا۔ کیا تو حمدان نے بھی ایسا کچھ نہیں تھا، معیز، حمدان کو بچپن سے جانتا تھا، دونوں اکٹھے بورڈنگ میں پڑھتے تھے اور کلاس فیلوز ہونے کے ساتھ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ کالج میں بھی

دونوں نے ایک سے بچھلکھن رہے تھے پھر یونیورسٹی آ کر ان کی دوستی عزیزانے ہوئی وہ کبھی انہی کی طرح پڑھا کو

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

کر خوش ہو رہا تھا جب رائیل شاہ بنے بس ہو کر اس کے سامنے گڑ گڑا رہی ہوگی۔ جبکہ معجز بڑی پرسوج لگا ہوں سے حمدان کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوست کو جس نے کبھی چیونٹی کا بھی دل نہیں دکھایا ہوگا اور اب بدلے کی آگ اسے کس حد تک لے آئی تھی۔

ٹھہرے پانی میں پتھر نہیں پھینکنے چاہئیں ورنہ چھیننے تو آپ پر پڑیں گے ناں اور کبھی، کبھی خاموش جھیل میں کنگر پھینکنے سے آپ پر پڑنے والے چھیننے آپ کے کپڑوں کے ساتھ، ساتھ وجود کو بھی داغ وار کر جاتے ہیں اور ایسے داغ سیاہ داغوں کی طرح ان مٹ ہوتے ہیں جو آپ کے وجود پر اس طرح سے ثبت ہو جاتے ہیں کہ دوست احباب بھی آپ کو پہچاننے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ حمدان علی شاہ اور رائیل شاہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اول تو حمدان کسی کو تکلیف نہیں دیتا تھا لیکن اب تو رائیل شاہ نے خود اسے پکارا تھا..... بلکہ لکارا..... آہیل مجھے مار کی طرح..... اور یہ پکارنا رائیل شاہ کو بہت مہنگا پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

ساہیوال سے واپسی پر بھی سارا راستہ رائیل اپنے رشتے داروں کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی..... بس اسٹاپ سے یونیورسٹی ہاسٹل جاتے ہوئے بھی وہ اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اسے اپنے قریب رکتی پراڈو کا بھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ ہوش میں تو وہ تب آئی جب دو آدمیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر پراڈو میں کھینچ ڈالا۔ گاڑی میں بیٹھے ہی اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ ایک آدمی نے اس کے چہرے پر رومال رکھ دیا جس سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

”آف..... آ آ آ..... ماما جانی؟ پاپا جانی..... آ آ.....“ ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی اس نے اپنے جان سے پیارے ماما اور پاپا کو پکارنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اسے اپنے پورے جسم میں بہت درد محسوس ہو رہا تھا لیکن آنکھیں کھلنے کی دیر بھی اس نے جب خود کو غیر مانوس ماحول میں پایا تو سب کچھ اُسے آہستہ آہستہ

یاد آنے لگا تھا کہ کس طرح وہ یہاں پہنچی تھی۔
”یعنی کہ میں اغوا ہو چکی ہوں..... آف..... لیکن یہ سب کون کرے گا؟ میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا..... ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا ہے۔“ رائیل شاہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اغوا ہو چکی ہے۔

”اور میرے ماما جانی اور پاپا جانی..... وہ..... وہ کیسے یہ خبر سن پائیں گے..... لڑکی کے لیے تو یہ داغ بن جاتا ہے کہ وہ اغوا ہوئی ہے پھر میرے ماما اور پاپا جانی کیسے برداشت کریں گے؟ اے میرے اللہ یہ کیا ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ سوچوں کا ایک لاقتنا ہی سلسلہ تھا جو رائیل کو رونے اور چیخنے چلانے پر مجبور کر رہا تھا۔ سب سوچ، سوچ کر رائیل کو لگ رہا تھا کہ اس کے داغ کی نہیں پھٹ جائیں گی۔

ایک دم ہی اسے کچھ خیال آیا جس کے تحت اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ بہت ہی نفس اور خوب صورت بیڈ پر موجود تھی۔ حد سے زیادہ خوب صورت اور اسٹائلش پروے اور ان سے ہم رنگ قالین اور کمرے میں موجود ڈیکوریشن پتھر بہت اعلیٰ ذوق کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ رائیل نے بھاگ کر کھڑکی دیکھنے کی کوشش لیکن یہ کیا کھڑکی پر تو بہت مضبوط جنگلا لگا ہوا تھا۔ باہر بہت اندھیرا تھا اور شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”میں دو پہر دو بجے بس سے اتری تھی اور اب رات کا پہر ہے..... یعنی مجھے آدھا دن گزر گیا یہاں آئے ہوئے..... آف میرے خدایا۔“ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

”سب میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟“ رائیل کو اس سوچ کے ساتھ، ساتھ ڈر بھی لگ رہا تھا کیونکہ باہر بارش شروع ہو چکی تھی اور اسے رات کی بارش سے بہت خوف آتا تھا۔ بادل کی گرج اور چمک سے اس کا دل و دل جاتا تھا۔ جب بھی رات کر ایسی بارشیں اور گرج چمک ہوتی تو ماما جانی اس کے کمرے میں آ کر اسے اپنی نرم، نرم آغوش میں چھپا لیتی تھیں لیکن اب وہ تنہا تھی۔ رائیل کو یہ سوچ کر اور بھی

”اس سب بگو اس کا کیا مطلب ہے تمہارا؟“
اس کی باتوں سے مطلب اخذ کر کے رائیل کے توپکے
چھوٹ گئے تھے۔

”وہ ہی جو مطلب تمہیں سمجھ آیا ہے۔ اچھا پہلے یہ
کھانا کھالو پھر تمہیں اپنے سب مطلب سمجھا دیتا
ہوں۔“ حمدان نے کھانے سے بھری ٹرے اس کے
سامنے رکھ دی جسے رائیل نے بڑے زور سے زمین پر
وے مارا تھا۔

”تراخ.....“ حمدان کا ہاتھ بے ساختہ ہی اٹھا تھا
اور رائیل کا چہرہ سرخ کر گیا تھا..... ہاتھ اتنا بھاری پڑا
تھا کہ رائیل کا سر سائڈ ٹیبل کے کنارے لگا تھا اور وہ
درد سے بلبلاتا بھی تھا جبکہ اس کا چہرہ لمحوں میں خون سے
تر ہو گیا تھا۔

حمدان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھاما تھا
اور رائیل، حمدان کی بانہوں میں ہی جمول گئی تھی۔

☆☆☆

رائیل کی آنکھ کھلی تو اس نے کراہ کر پانی کی
ضرورت محسوس کی۔ جس پر قریب کرسی پر بیٹھے حمدان
نے سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی
اٹھایا اور رائیل کے آگے کیا۔ اس نے گلاس پکڑنے
کی کوشش کی لیکن سر کا درد اتنا شدید تھا کہ وہ اٹھنے سے
قاصر تھی جس پر حمدان نے اسے کمر سے پکڑ کر سہارا دیا
اور پانی کے چند گھونٹ اسے پلائے۔

اگر رائیل اس حال میں نہ ہوتی تو کبھی وہ یہ سب
برداشت نہیں کرتی لیکن ایک تو سر میں شدید درد اوپر
سے اس ظالم کی قید..... رائیل کو اپنی بے بسی پر جی بھر
کے رونا آیا۔

حمدان دیکھ رہا تھا کہ گزشتہ دو دن سے رائیل کی
حالت کیسی دگرگوں ہو گئی تھی۔ گلابی، گلابی گال اب
بخار میں ہونے کے باوجود پیلے، پیلے سے ہو گئے تھے۔
حمدان کے دل کو کچھ ہوا تھا لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔

رائیل شاہ..... رونا بند کرو اور یہ کھانا کھا
مہینہ پاکیزہ 203 نومبر 2016ء

شدت سے رونا آ رہا تھا اب اس کی حالت بہت خراب
ہو رہی تھی۔ کمرے میں پانی نام کی کوئی شے نہیں تھی اور
وہ صبح سے بھوکی پیاسی تھی۔ اس پر پھر سے غنودگی طاری
ہو رہی تھی۔ شاید اس رومال والے نشے کا اثر تھا کہ وہ
دو بارہ نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے دروازہ کھلنے کی
آواز آئی تو اس نے اپنی آنکھیں بھر پور کوشش سے
پوری کھولیں۔ کھڑکی سے آتی روشنی اسے صبح کا سلام
پیش کر رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی دروازے پر
پڑنے والی رائیل کی نظر پلٹنا بھول گئی تھی۔ دروازے
پر تو سید حمدان علی شاہ اپنی تمام تر وجاہت سمیت کھڑا تھا
اور رائیل کی ہونق بنی شکل دیکھ کر سگڑا رہا تھا لیکن رائیل
کو تو اس کی ہنسی مکروہ لگ رہی تھی۔

”تمت..... تم! تم..... کیسے یہ سب.....
کیوں.....؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ روتے، روتے
رائیل کو وہ سب ایک دم یاد آ گیا تھا۔ ہاں وہ یونورٹنی
کا دن..... اُف تو اس نے اس دن کا بدلہ لینے کے لیے
یہ گھنیا حرکت کی۔

”میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے.....؟ ہاں؟ اگر تم
اس دن کی بات کو لے کر یہ سب کر رہے ہو تو دیکھو میں
تم سے معافی مانگ لیتی ہوں..... مجھے جانے دو
پلیز..... تم نہیں جانتے لڑکی کی عزت کیا ہوتی
ہے..... پلیز.....“ اور کوئی موقع ہوتا تو رائیل، حمدان کو
دو چار تھپڑ رسید کرتی لیکن اب تو وہ اس کی قید میں تھی
اور اسے اس قید سے جلد از جلد چھٹکارا پانا تھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ اب تم یہاں سے جب تک
میں نہ چاہوں کہیں بھی نہیں جاسکتیں اور ہاں اگر تم نے
یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ
دوں گا..... دوسری بات عزت..... ہا..... ہا تو مس
رائیل شاہ عزت کا تو آپ کو خود نہیں پتا کہ کیا ہوتی ہے
اور ویسے بھی اب تو تمہیں سب لوگ میری عزت کی نگاہ
سے دیکھیں گے۔ سو..... اپنی عزت کی تو تم فکر مت
کرو..... وہ میری امانت.....“ حمدان نے بڑے
تکمانہ انداز سے رائیل کو سب کچھ باور کروانے کی

یہاں سے جانے ہی نہیں دوں گا۔“ حمدان کا ڈھکا چھپا مطالبہ سن کر رائیل تو بے ہوش ہوتے، ہوتے پئی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حمدان ایسا کچھ کرے گا کیونکہ اگر رائیل کو حمدان سے کوئی چڑ بھی تو وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے اپنے و ماخ کا ثور ہے اور اتنا تو وہ علم رکھتی تھی کہ حمدان یونیورسٹی کا اچھا اسٹوڈنٹ تھا۔ حمدان کے مطالبے نے اسے بہت سے پہلوؤں پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتی تو حمدان اسے جانے نہیں دیتا اور پھر ایسی صورت میں اس کے ماما، پاپا کیسے جی پاتے جن کی اکلوتی پونجی ہی وہ تھی۔ ان سب پہلوؤں کو دیکھتے سوچتے ہوئے ان نے حمدان کو ہاں کر دی تھی اور اس کے علاوہ کوئی آپشن بھی تو نہیں تھا۔

لیکن حمدان کو رائیل کی ہاں کھلکی تھی..... وہ کیسے اتنی جلدی مان گئی یہ حمدان کی سمجھ سے باہر تھا۔ خیر اس نے یہ سب سوچیں فوراً سے جب تک ڈالیں کیونکہ اس کا مقصد تو رائیل کو بے بس کرنا تھا اور اپنے بچرے میں قید کرنا تھا۔ جس طرح رائیل نے اسے بے عزت کیا تھا اسی طرح اب وہ بھی رائیل کو تاعمر بے بس ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس پر خوشیوں کے دروازے بند کر دینا چاہتا تھا۔ یہ سب حمدان شاہ کے مزاج کے بالکل برعکس تھا لیکن بدلے کی آگ کب کسی کو کچھ سوچنے کے قابل چھوڑتی ہے۔

اگلے چند گھنٹوں میں رائیل کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ رائیل منہاج شاہ سے رائیل حمدان علی شاہ بن گئی تھی۔ سائن کرتے ہوئے اسے اپنی بے بسی اور اکیلے پن پر بہت رونا آیا۔ ایسا کیا تھا جو رائیل یہ سب کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ یہ خود رائیل بھی نہیں جان پاتی تھی۔

”پلیز اب تو مجھے جانے دو.....“ حمدان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر رائیل نے پھر سے اس کی منت کی۔

جوں، جوں حمدان بیڈ کے قریب آ رہا تھا ویسے ویسے رائیل کا دل دھڑک رہا تھا۔

لو.....“ جب سے رائیل یہاں آئی تھی تب سے اس نے صرف ایک گلاس پانی ہی پیا تھا۔ یعنی اس نے مسلسل دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

”نہیں، میں یہ نہیں کھا سکتی..... پلیز تمہیں رب کا واسطہ..... مجھے جانے دو۔“

”دیکھو اگر تم یہ کھانا نہیں کھاؤ گی تو میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔“

”اوکے، تم وعدہ کرو کہ میرے کھانا کھالینے کے بعد تم مجھے چھوڑ دو گے؟“

”وعدہ نہیں کرتا ہاں کوشش ضرور کروں گا۔“

ابھی تو حمدان نے اپنا پلان پورا کرنا تھا وہ کیسے جانے دے سکتا تھا رائیل کو.....

”تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟“ رائیل نے روئے ہوئے حمدان سے استفسار کیا تھا۔

”پہلے تم کھانا ختم کرو..... پھر تمہیں سب کچھ بتا دوں گا وعدہ.....“ حمدان نے بھی سوچا کہ چلو جلد ہی کام پورا ہو جائے گا اور پھر اسی بہانے یہ لڑکی کچھ کھا ہی لے گی۔

رائیل یہ سن کر کھانا کھانے لگی لیکن اس سے نوالے طلق سے نیچے اتارے نہیں جا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے گلے میں کانٹے آگ آئے ہوں لیکن پھر بھی اس نے تھوڑا بہت کھانا زہر مار کر ہی لیا تھا کچھ تو وہ بھوک بھی تھی اور کچھ اسے کچھ وجوہات جاننے کی بھی جلدی تھی۔

”پلیز اب بتا دو یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

رائیل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنی غلطی بتا چلے جس کی سزا میں اسے یہاں لایا گیا تھا۔

”ہاں تو اب تم میری بات محل سے سننا..... تمہیں اپنی عزت کا بہت خیال ہے ناں تو اب تم میری عزت بن جاؤ..... تمہاری عزت کی ذمے داری بھی میرے ذمے آ جائے گی..... اور ہاں جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے ورنہ تم جاتی ہو کہ یہ کام کیسے ہاں میں تمہیں

ماننامہ پاکیزہ 204 نومبر 2016ء

”تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟“ کار اشارت کرتے ہی حمدان نے رائیل سے پوچھا جو کسی گڑیا کی طرح خاموش بغیر پلکیں جھپکائے بیٹھی تھی۔

”اوہیلو..... میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں.....“ حمدان نے رائیل کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا تو وہ دنیا میں واپس لوٹی تھی۔

”کہیں بھی اتار دو..... اب زندگی میں کوئی بھی راستہ مجھے سرخرو نہیں کر پائے گا۔“

”اور میں ایسا چاہتا بھی نہیں ہوں۔“ حمدان نے بڑی بے رحمی سے یہ الفاظ اواکیے تھے۔ حمدان نے یونیورسٹی سے تھوڑا پہلے ہی کار روک دی تھی مگر رائیل کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

”چلو اترو بھی اب.....“ حمدان نے رائیل کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

رائیل بنا اس کی طرف دیکھے کار سے نیچے اتر گئی تھی۔

”اور یہ اپنا بیگ بھی لیتی جاؤ۔“ حمدان نے اسے ابن کا بیگ دینے کے لیے پیچھے سے ہانک لگائی۔

رائیل نے پلٹتے ہی بیگ گاڑی کی سیٹ سے اٹھالیا تھا۔

رائیل کے پلٹنے پر حمدان کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تھی اور پلٹتا بھول گئی تھی، کچھ تو تھا جو رائیل کے چہرے کو حمدان کے لیے خاص بنا گیا تھا۔ بس ایک لمحہ تھا

وہ..... حمدان کے دل میں کچھ، کچھ ہوا تھا رائیل کے پیلے، پیلے نعوش کو دیکھ کر..... سرخ ہوتی ناک کو دیکھ کر.....

اوہ اوڑھے ڈوٹے میں رائیل کے بکھرے بالوں کو دیکھ کر..... کیا حال ہو گیا تھا رائیل کا صرف اس کی وجہ سے..... حمدان ابھی ملال کی داوی میں قدم رکھتا ہی چاہتا تھا کہ خود ساختہ اتانے راستہ روک لیا۔

”تمہیں..... یہ سب تو ہونا ہی تھا..... ہر چیز کا بدلہ تو لازم ہے۔“ حمدان نے تمام خیالات کو جھٹکتے ہوئے گاڑی آگے بڑھائی۔

☆☆☆

ہاسٹل وارڈن نے رائیل کو آڑے ہاتھوں لیا تھا اور یونیورسٹی سے نکال دینے جانے کے سنگین نتائج سے

مناہنامہ پیکیزہ 205 نی مہر 2016ء

ڈونگھو میں نے تمہارا کہا مان لیا ہے لیکن اس سے آگے کچھ نہیں مان سکتی پلیز مجھ سے دور رہو.....“

”ہا..... مسز رائیل حمدان شاہ کو کتنی خوش جہی ہے اپنے بارے میں..... تم میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ تمہارے قریب آیا جائے بلکہ مجھے تو تمہارا وجود ہی برداشت نہیں تو تمہیں چھوٹا تو دور کی بات ہے۔“

حمدان بول نہیں رہا تھا بلکہ پھنکار رہا تھا۔

”تو پھر تمہیں مجھے اس بندھن میں باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”صرف اور صرف تمہیں اپنی نظروں کے سامنے بے بس دیکھنے کے لیے اور شاید دنیا کے سامنے۔۔۔

بے عزت کرنے کے لیے..... تمہیں بہت اچھا لگتا ہے ناں کہ لوگ تمہیں نیک و پارسا جانیں تو دیکھ لو اب لوگ کیا

کہیں گے۔“ وہ مکروہ ہنسی ہنسا تھا۔ رائیل کا اندر تک جل اٹھا تھا۔

”اب کرو مجھ سے بدتمیزی..... منہ توڑ دوں گا میں تمہارا.....“ حمدان نے رائیل کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اتنی زور سے دبایا کہ رائیل کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”چلو آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں اور ہاں..... یہ بات ذہن نشین کر لو کہ آسودہ کسی بھی لڑکے سے بدتمیزی

مت کرنا ورنہ نتیجہ تم دیکھ ہی چکی ہو۔“ رائیل کو تو کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا اسے اب حمدان کی باتوں سے

کوئی سروکار نہیں رہا تھا کیونکہ زندگی تو وہ اس کی برباد کر ہی چکا تھا۔ اسے زارا کی، یونیورسٹی کی، لوگوں کی

کوئی فکر نہیں تھی..... اسے بس اپنے ماما، پاپا کی فکر ستا رہی تھی کہ وہ کس حال میں ہوں گے..... وہ اس سے

کیسا سلوک کریں گے۔ لیکن اسے ایک یقین بھی تھا کہ ماما، پاپا اس کی بات سنیں گے..... انہیں رائیل پر

یقین ہوگا کیونکہ زندگی میں کبھی کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں کیا تھا اور پھر وہ کردار کے لحاظ سے کوئی

گری ہوئی لڑکی نہیں تھی۔ اسے اپنے پاپا، ماما پر پورا یقین تھا کہ وہ اسے سنبھال لیں گے۔

☆☆☆

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک

سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

اور یونیورسٹی میں تم نہیں تھیں پھر تمہارا انتظار کیا گیا لیکن انکل، آنٹی کی ڈیڈ باڈیز اس قابل نہیں تھیں کہ انہیں زیادہ دیر رکھا جاتا۔ سو ہمیں انہیں ان کی آخری آرام گاہ پہنچانا پڑا..... بہت افسوس ہوا..... لیکن تم..... آمنہ، راتیل کی طرف نظریں کیے بغیر ہی اسے روح فرسا خبر سنا رہی تھی لیکن جیسے ہی آمنہ کی نظر راتیل کے پھلکے چہرے پر پڑی تو زبان تالو سے لگ گئی اور اگلے ہی لمحے راتیل پورے قد سے زمین پر آگری تھی۔

☆☆☆

ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے جسم سے روح کھینچ لی ہو۔ زندگی بہت پھسکی لگنے لگی تھی۔ زندگی کے سب رنگ عجیب لگنے لگے تھے۔ راتیل..... رنگوں سے پیار کرنے والی لڑکی..... رنگوں سے بھاگنے لگی تھی۔ راتیل کو جب کچھ سمجھ آنے لگا، تب تک سب لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ صرف آمنہ اور اس کے ای، اورہ گئے تھے۔ آنے زندگی اکیلے کیسے کٹی تھی..... یہ سوچ راتیل کو بستر سے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ جان سے پیارے والدین کی وفات پر کون، کون آیا تھا..... تدفین کیسے کی گئی۔

سوائے چند جاننے والوں کے اور کوئی رشتے دار نہیں آیا تھا۔ کوئی بھی پروفیسر صاحب کے خاندان کو نہیں جانتا تھا۔ صرف پروفیسر صاحب کے کولیکڑ، اسٹوڈنٹس اور چند ایک آس پڑوس کے لوگ ہی تدفین میں شامل ہوئے تھے۔ یہ سب آمنہ ہی کی بدولت راتیل کو پتا چلا تھا۔

آمنہ نے راتیل سے بہت پوچھا کہ وہ کہاں تھی یا اگر کوئی پریشانی کی بات ہے تو بھی بتا دے وہ اور اس کے والدین اس کا پرابلم حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن راتیل کے منہ پر پڑے قفل نہیں ٹوٹے..... پھر آمنہ نے بھی استفسار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر اینڈ مسز منہاج علی شاہ کو دنیا سے گئے بیس دن سے اوپر ہو گئے تھے۔ راتیل کو تو دنیا کی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی رہتی۔ آمنہ ہی تھی جو اس کا کسی بچے کی طرح خیال رکھ رہی تھی۔ وہ دن رات

بھی آگاہ کرو یا تھا۔ وہ حیران تھی کہ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی تو پھر.....؟ اب راتیل کے پاس گھر جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ زارا سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن وارڈن نے اس سے بھی نہیں ملنے دیا۔ یہ کہہ کر کہ ”تم باقی گرتز کو بھی خراب کرو گی، نہ جانے کہاں رہیں گے“ والے بھی پتا کرتے رہے۔ ”وہ اپنے ماما، پاپا کے خیال سے کانپ گئی تو کیا ان کو بھی پتا چل چکا تھا کہ وہ ہاسٹل میں نہیں تھی۔

لاہور سے ساہیوال تک کا سفر آج سے پہلے کبھی اتنا طویل نہیں لگا تھا لیکن اب تو یہ سفر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ راتیل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جائے اور اس بات کا یقین کر لے کہ اس کے ماما، پاپا کو اپنی بیٹی پر بھروسا ہے اور وہ اسے لوگوں کی طرح بے عزت نہیں کریں گے مگر.....!

چارون غائب رہنے کے بعد وہ آج اپنے گھر کی وہلیز پر کھڑی تھی مگر اسے کسی انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔ گیٹ کھلتا تھا..... چونکدار موجوں نہیں تھا۔ لان میں سفید چادر پھیلتی تھی جس پر جا بجا کھجور کی گٹھلیاں پڑی تھیں اور بہت سے مرد حضرات گٹھلیوں پر کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

اس کے قدم یہ سب دیکھ کر ڈمگائے تھے لیکن وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے اندر لاؤنج تک آئی۔ وہاں خواتین بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں پھر چائیک سامنے سے آئی ہوئی آمنہ دکھائی دی۔

”راتیل کہاں تھیں تم.....؟“ آمنہ نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ سب کیا ہے؟ ماما جانی اور پاپا جانی کہاں ہیں؟“ راتیل کو بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنے پاپا جانی اور ماما جانی کو نہیں دیکھا تھا۔ آمنہ نے اسے کندھوں سے تھاما۔

”راتیل حوصلے سے سنو انکل، آنٹی کا تو تین روز پہلے ایکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا، ہم نے تمہیں کالمیکٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن تمہارا سائل فون آف تھا

رائل کی بہت فکر تھی..... جوان بچی تھی..... منہاج صاحب نے بہت کچھ چھوڑا تھا رائیل کے لیے..... لیکن ایک لڑکی کی زندگی صرف پیسے پر تو نہیں بسر ہوتی، اسے ایک مضبوط سائبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس دنیا کے بھیڑے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔

لینے، لینے رائیل کو اچانک حمدان کا خیال آیا تھا۔ ”ہاں وہی ہے اس سب کا ذمے دار..... میری بربادی کا اور ماما جانی، پاپا جانی کی موت کا ذمے دار، نہ وہ میرے ساتھ ایسا کرتا، نہ ماما جانی اور پاپا جانی کو میرے اغوا کی خبر ملتی اور نہ ان کا ایکسیڈنٹ ہوتا۔“ سوچ تو رائیل ٹھیک رہی تھی لیکن مسٹر اینڈ مسز منہاج کا تو رب کی طرف سے لکھا ہی یوں ہوا تھا اور لکھے ہوئے کو کون ٹال سکتا ہے اور پھر موت کا تو ایک بہانا بننا ہوتا ہے۔ موت تو برحق ہے، یہ سوچتے ہوئے رائیل کو حمدان سے بہت نفرت محسوس ہوئی تھی اور خود سے اس سے بھی زیادہ نفرت اس کا غدی تعلق کی بنا پر جو حمدان اس سے زبردستی قائم کر چکا تھا۔ اس لمحے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

کیا جانتی تھی وہ حمدان علی شاہ کے بارے میں؟ کچھ بھی تو نہیں سوائے اس کے کہ وہ یونیورسٹی کا ہونہار اور اساتذہ کا ہر دل عزیز اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ کہاں کا رہنے والا تھا، اس کا خاندان کیسا تھا؟ اس کا کاشیکٹ نمبر؟ کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس..... یعنی وہ تھی دامال رہ گئی تھی۔ زندگی کی بازی، خوشیوں اور امیدوں کی بازی ہار گئی تھی وہ.....!

”سید حمدان علی شاہ.....! تم سے زیادہ نفرت میں اس دنیا میں کسی سے نہیں کرتی..... سنا تم نے..... کسی سے نہیں..... کسی سے بھی نہیں۔“ رائیل ہذیبانی انداز میں چلی تھی کہ اس کی کپٹی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

☆☆☆

”چاچی.....! میری باری ڈول کہاں ہے؟“ دانی نے ہانپتے ہوئے اپنی چاچی سے چھوٹی بہن کا پوچھا جو خود کسی تمام میں مسرور تھی..... وہ خود بھی

ماہنامہ پاکیزہ 207 نومبر 2016ء

اس کے ساتھ تھی۔ گھر میں ایک گاڑی، اس کی آیا اماں جو کچن سنبھالتی تھیں اور گھر کی صفائی کی ذمے داری بھی انہی کی تھی اور ان کے شوہر شرفو بابا جو باہر سے ضرورت کا سامان لا دیتے تھے یا لان کو دیکھتے تھے۔ یہ فیملی شروع سے ہی سردنٹ کو ارٹھر میں رہائش پزیر تھی اور گھر کے افراد ہی کی طرح تھے۔ رائیل کو ماما جانی سے زیادہ شریفاں اماں نے پالا تھا۔ اب بھی شریفاں اماں، رائیل کی حالت دیکھ کر بہت پریشان تھیں۔

”رائیل..... میری دھی! ایسا کب تک چلے گا؟ کمرے سے تم باہر نہیں نکلتیں، کپڑے تم نے سفید اور کالے پہننے شروع کر دیے ہیں، میری دھی! زندگی اسی کا نام ہے، ایک نہ ایک دن ہم سب کو اس رب سوہنے کے پاس جانا ہے..... کوئی پہلے تو کوئی بعد میں جائے گا۔ میری دھی سنبھال خود کو..... ابھی تو تیرا پورا جیون پڑا ہے۔“ اماں شریفاں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی رائیل کو سینے میں بھیج کر پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تو اس کی سسکیاں نکل گئیں۔ آج اس کے آنسو نکل کر برسے تھے۔ آخری بار، وہ حمدان کے آگے گڑ گڑائی تھی اور دوبارہ اب رو رہی تھی۔

”نہ میری دھی.....! روتے نہیں..... جانے والوں کی روح کو دکھ ہوگا۔ ان کی روحیں بے قرار ہوں گی۔“

”اماں کیوں چلے گئے ماما جانی اور پاپا جانی..... انہیں پتا بھی تھا کہ ان کی رائیل کا ان کے علاوہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں.....“ رائیل نے اماں شریفاں کا جھریوں بھرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا۔ اماں کیا جواب دیتی..... وہ جانتی تھی کہ رائیل اکیلی نہیں ہے، رشتے دار موجود ہیں لیکن ان کا کسی کو علم نہیں کہ وہ سب کہاں ہیں۔ رائیل کی ماما جانی اکثر ان سے اپنے رشتے داروں کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن کبھی انہیں ان کے شہر کا نہیں بتایا۔

اماں شریفاں بہت نیک خاتون تھیں تو شرفو بابا بھی عاجزی و انکساری میں کچھ کم نہیں تھے..... دونوں کو

شاید کھیل کر آ رہا تھا۔ بیٹیاں ہی تو ماں کے دکھ، سکھ کی ساتھی ہوتی ہیں۔

جبکہ گڑیا کی ماما بھی یہ بات سن کر خوش تھیں.....
انہیں بھی بھابی کے تینوں بیٹے اور خاص طور پر دانی بہت
پسند تھا اور وہ تھا بھی ان کی لاڈلی کا دیوانہ.....

☆☆☆

سید حسنین علی شاہ کی ایک ہی اولاد تھی۔ سید
وجاہت علی شاہ..... وجاہت علی شاہ کی پیدائش پر چند
دبھید گیاں ہونے کے باعث سید حسنین کی شریک
حیات اس جہان سے کوچ کر گئی تھیں۔ پھر انہوں نے
بہنوں کے بے حد اصرار پر اور کچھ وجاہت شاہ کا سوچ
کر دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیگم بہت ہی نیک دل
خاتون تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے پتا نہیں کس مصلحت کے
تحت انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ انہوں نے
وجاہت شاہ کو ہی اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر متا کا پیار دیا
پھر انہوں نے وجاہت شاہ کے لیے اپنی بھانجی ذکیہ کو
منتخب کیا جس پر وجاہت شاہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔
ذکیہ بیگم بھی اپنی خالہ کا پر تو تھیں..... نہایت صابر و شاکر
اور عاجز تھیں۔ وجاہت شاہ کی زندگی کی گاڑی ذکیہ
بیگم کے ہمراہ نہایت سبک روی سے چل رہی تھی۔
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سید حسنین شاہ اور ان کی
بیگم وجاہت شاہ کو داغ مفارقت دے گئے۔

سید وجاہت علی شاہ کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں سے
نوازا تھا۔ سید منان علی شاہ اور سید منہاج علی
شاہ..... دونوں میں مثالی پیار تھا۔ منان شاہ نے بی
اے کر کے ہی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور باپ کی زمینوں
اور فیکٹریوں کو سنبھالنے لگے۔

اماں جان یعنی بیگم وجاہت علی شاہ نے منان شاہ
کی شادی ان کی پسند سے اپنی بیٹی سے کر دی جو نہایت
ہی خوش اخلاق تھی۔ انہوں نے آتے ہی تمام کام اپنے
ذمے لے لیے تھے اور اپنی بھتیجی کو بستر پر بٹھا دیا تھا۔ ان
کی اپنے دیور منہاج سے بہت ہنسی تھی۔ منہاج شاہ ان
دونوں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ ان کا ارادہ
ہی اچھی ڈی گرنے کا تھا جبکہ وجاہت شاہ چاہتے تھے کہ

بڑی مشکل سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے
پارک تک گیا تھا ورنہ تو اسے صرف پارٹی ڈول ہی اپنا
سب کچھ لگتی تھی۔ اور بچوں کے ساتھ وہ زیادہ فری نہیں
ہوتا تھا۔ اسے زندگی کے رنگ ڈول کے ہونے سے ہی
نظر آتے تھے۔

”دادو کے روم میں دیکھو دانی.....“ چاچی نے
اس کے چہرے پر اپنی گڑیا کے لیے لگر دیکھی اور وہ
مسکرا دیں۔

دانی اپنی پارٹی ڈول سے تین سال بڑا تھا.....
ڈول اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ پھولے، پھولے گلہابی
گال اور سفید کھلتا ہوا رنگ، سنہرے بال..... ایسے ہی تو
وہ اسے ڈول نہیں کہتا تھا۔ دانی کو ہر وقت ڈول کی ہی
فکر ستاتی رہتی۔ اسکول جاتے وقت سب سے پہلے وہ
اس کے گال پر چٹا چٹا پیار کرتا تھا۔ واپس آتے ہی
اسے ڈھونڈتا..... اس کے لیے راستے سے خریدی
کینڈیز اسے خود کھلاتا۔

جب ماما جان سونے کا کہیں تو وہ ڈول کو ساتھ لیے
اپنے بیڈ روم میں چلا جاتا اور اسے اس کے کاٹ میں خود
سلاتا تھا۔ بڑے پیار سے اس کے بال سنوارتا اور
باقاعدہ ماں کی زبان سے سنی لوری سناتا۔ گالوں پر بوسے
دے کر سلاتا..... گھر والے اس کی ان حرکتوں پر ہنستے تھے
اور اس قدر پیار پر زور پریشان مگی ہو جاتے تھے۔

”یہ لڑکا تو رانو کے پیچھے باؤلا ہو گیا ہے، میں تو
کہتی ہوں ان دونوں کو ایک ہی کر دیں گے..... ورنہ
یہ لڑکا تو اس کا ساتھ چھوٹنے پر ایک، ایک کو مار ڈالے
گا۔“ اماں جان ہنس کر کہتیں تو ان کی دونوں بہویں بھی
ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیتیں۔

”اماں جان مجھے تو کوئی اعتراض نہیں..... مجھے تو
گڑیا اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر پیاری ہے۔“ شافیہ بیگم
کی آنکھیں نم ہو گئیں..... دراصل تین بیٹوں کے بعد
ڈاکٹر نے انہیں مزید بچوں کے لیے روک دیا تھا ان کی
حالت کے پیش نظر ورنہ انہیں بیٹی کا بہت شوق تھا۔

وہ بھی منان شاہ کی طرح کاروبار سنبھالیں۔ وقت آگے گزرا تو شافیہ بیگم نے اماں جان کے کہنے پر منہاج سے اس کی پسند دریافت کی جس پر انہوں نے اپنی دور پرے کی رشتے کی پھپھو کی بیٹی کا نام لے دیا۔ جس پر گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس کو منہاج کے لیے بیاہ لائے۔ سز منہاج بھی بہت اچھی تھیں۔ دونوں بہوؤں کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ منہاج شاہ نے شادی کے بعد اپنا ایم فل مکمل کیا اور اب وہ پی ایچ ڈی کا سوچ رہے تھے۔ انہیں تعلیم سے بہت لگاؤ تھا اور وہ ایک اعلیٰ استاد بننا چاہتے تھے۔ کاروبار سنبھال کر اپنی ڈگریوں کو زنگ آلود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس آکلن میں بھی قفقاریاں گونجنے لگی تھیں۔

درمیان ہی بیٹھوں گاناں.....
 ”ٹھیک ہے اگر تم نہیں مانتے تو چلے جاؤ لیکن اپنی بیوی اور بچی کو یہاں ہی چھوڑ دو اور دوبارہ یہاں قدم مت رکھنا۔“ بابا کا حکم سن کر تو ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی لیکن شاید سید و جاہت شاہ یہ بات بھول گئے تھے کہ ان کی یہ اولاد بھی ان ہی کی طرح ضدی ہے جبکہ دروازے کی اوٹ سے باتیں سنتی بیگم منہاج اپنے ماموں کا یہ حکم سن کر ہٹکا بکا رہ گئیں۔ وہ اپنے شوہر کو جانتی تھیں..... وہ پی ایچ ڈی کیے بغیر نہیں ٹھیں گے اور وہ خود اپنے محبوب شوہر کے بغیر کیسے رہیں گی؟ ایک طرف اتنے پیارے رشتے تو دوسری طرف محبوب شوہر..... خیر..... ہونا تو وہی تھا جو منہاج شاہ کہتے۔

سید منان علی شاہ کے ہاں یکے بعد دیگرے تین بیٹے ہوئے..... زمان علی شاہ، امان علی شاہ اور سب سے چھوٹا، لاڈلہ شاہ..... یعنی سب کا وانی..... لیکن منہاج شاہ کو قدرت نے صرف ایک بیٹی سے نوازا تھا جو سب سے بڑھ کر وانی کی گڑیا تھی۔ منہاج شاہ نے اپنے بابا سے پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت طلب کی تو وہ بھڑک اٹھے۔
 ”تمہیں آگے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں..... اتنا بڑا کاروبار ہے اور تمہیں پڑھ کر نوکری کرنے کا شوق ہے؟ تم تو شاہوں کی اولاد لگتے ہی نہیں۔“

منہاج شاہ نے جب اپنے بابا جان کو کسی صورت مانتے نہ دیکھا تو پھر ایک فیصلہ کر کے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے کہ انہیں اپنے کاندھے پر ایک نرم ہاتھ محسوس ہوا..... دیکھا تو شریک حیات تھیں۔
 ”آپ پریشان نہ ہوں، اللہ سب بہتر کرے گا۔“
 ”لیکن میں بابا جان کو جانتا ہوں..... وہ اب کبھی نہیں مانیں گے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو..... جو میں کہوں گا اس میں میرا ساتھ دو گی؟“ نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے اپنی بیگم سے ایسا کہا لیکن وہ تو تھیں ہی ان کی ویوانی..... سو جھٹ سے انہیں ہاں کہہ دی۔

”لیکن بابا پلیز یہ لاسٹ ڈگری ہے، بس تین سال لگیں گے اور پھر میں آپ کے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آ جاؤں گا۔“ منہاج شاہ اپنے بابا کو تسلی دے رہے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وجاہت شاہ کے دامغ کی سوئی جہاں انک جائے وہاں سے آگے نہیں ہلتی۔

”تمہیں یو سوچ..... مجھے تم سے یہی امید تھی..... چلو اب جلدی سے اپنی اور ڈول کی پیکنگ کر لو..... ہمیں اگلے دو گھنٹوں میں یہ سب کچھ چھوڑ کر جانا ہے۔“ منہاج شاہ کا حکم تھا یا روح فرسا خبر..... وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں ایسا..... تم یہ کہہ ان سے وعدہ کر چکی تھیں۔

”تم اپنی بچی کو سنبھالو..... ماں ہے تمہاری جو تم سے پیار کرتی ہے۔ بھائی، بھائی ہیں تمہارے..... تمہیں کسی کا خیال نہیں.....“
 ”بابا تو میں تین سال بعد آ کر بھی سب کے

آنکھوں میں آنسو لیے وہ اس امید پر پیکنگ کرنے لگیں کہ اماں جان یا بڑی بھائی روک لیں گی لیکن وقت رونا کی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اماں جان اور

بھابی کے رزقے ہوئے چہرے بھی منہاج شاہ کو روک نہیں پائے اور پھر اماں جان اور بھابی کو انہیں روکنے کی اجازت بھی نہیں تھی کیونکہ سید و جاہت علی شاہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا ورنہ بصورت دیگر وہ بھی ان کے ساتھ ہی اس گھر سے جاسکتی تھیں۔

منہاج شاہ، اماں جان اور بھابی سے مل کر گھر کی ولینز پار کرنے ہی والے تھے کہ وجاہت شاہ کی گرج وار آواز نے ان کے قدم روک دے۔

”اب اس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں..... گھر کی ولینز پار کر جاؤ گے تو کبھی یہاں کا رخ مت کرنا۔“
 ”اور سنو لڑکی..... تمہیں اپنے ماں، باپ کے گھر دیکھا تو وہاں سے بھی نکلنا نہیں۔ تم دونوں کا اب شاہ خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔“

منہاج شاہ کو تو بابا جان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اپنا جنون پانے کے لیے یہ سب برداشت تو کرنا پڑے گا اور اگر اس کٹھن سفر میں اپنی جان سے عزیز بیوی کا ساتھ رہا تو سفر سہل ہو جائے گا لیکن وہ تو شاک میں آگئی تھیں..... یعنی اب ماں باپ سے بھی نہیں مل سکتیں..... جو ایک موہوم سی امید باقی تھی وہ بھی ختم..... لیکن اپنے شوہر اور بچی کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔

اور پھر منہاج شاہ اپنی بیوی اور بچی سمیت اس عالی شان حویلی سے چلے گئے تھے کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔
 اسکول سے گھر آتے ہی بچوں نے چاچا، چاچی اور دانی نے تو صرف ڈول کا پوچھا..... پھر جو خبر انہیں دی گئی وہ بچوں کے ننھے ذہنوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ زمان اور اماں تو نارٹل زندگی گزار رہے تھے لیکن دانی نے اپنے جان سے پیارے چاچو اور ڈول کا دکھ سینے سے لگا لیا تھا۔ پورا ایک مہینہ بخار میں پھنکارا..... رات کو ڈول کے بغیر روتے، روتے سوتا تھا۔

وقت گزرنے کا علم ہی نہیں ہو سکا..... بچے جوان ہو گئے.....!

زمان نے ایم بی اے کر کے اپنے والد زمان شاہ

ماہنامہ پاکیزہ 210 نومبر 2016ء

کے ساتھ کا ڈول بار سنجانا شروع کر دیا تھا۔ اماں ایم بی اے کر چکا تھا اور ہائیر اسٹیڈیز کے لیے ملک سے باہر گیا تھا۔ جبکہ دانی بزنس فیلڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلا گیا تھا۔ اسے بھی اپنے چاچو کی طرح پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

سید منہاج شاہ کے گھر سے چلے جانے کے چار سال بعد وجاہت شاہ کو ہارٹ ایکٹ ہوا اور وہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ منہاج شاہ سے رابطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ وہ تعلقات کی راہوں کی سب راہیں مسدود کر گئے تھے۔

زندگیاں سنبھل گئی تھیں لیکن سب کے دلوں میں کہیں نہ کہیں ایک ہوک اٹھتی تھی..... اماں جان کو اپنا لاڈلا منہاج، خواہوں میں آکر سنا یا تو بھابی کو اپنا لائق اور نٹ کھٹ دیور بہت یاد آتا تھا۔ زمان اور اماں کو بہن کی کئی محسوس ہوتی تھی تو دانی کو اپنی باریبی ڈول بہت یاد آتی تھی..... دادو اکثر ذکر چھیڑ دیتے کہ ڈول کو تو اپنے دانی کی دلہن بنانا تھا لیکن اب نہ جانے ڈول کہاں کھو گئی تھی..... منان شاہ نے بھی باپ کے بعد بھائی کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کو نہ ملنا تھا اور نہ ملے۔

ہاں دانی کو انتظار تھا اپنی ڈول کا..... گلابی گالوں والی گڑیا کا.....

”دیکھیے گا دادو..... میری باریبی ڈول ضرور آئے گی ایک دن..... اسے ہماری چاہت واپس لائے گی۔ ہاں میری چاہت اسے لائے گی..... چاہت کی شدت.....“ وہ اکثر دادو کی گود میں سر رکھے پیار سے ڈول کو یاد کرتا تھا لیکن آخری جملہ اپنے دل میں ہی کہتا تھا۔ اس کی سوچوں کے گرداب میں اس کی ڈول تھی اور اب جوان ہو کر بھی سوچوں کا محور وہی ڈول تھی۔

ہاں اسے شدید محبت تھی اپنی باریبی ڈول سے..... اور یہ محبت وہ سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

دو مہینے اور آج ہی ججہ اگلے ماہ

مارکی کی لاٹھی

کائنات غزل



ہوگی۔

”میں پاگل نہیں ہوں، نہیں ہوں میں پاگل.....“

شدید پڑتی سر دی میں بھی وہ جسم پہ دو کپڑے پہنے
سینے میں تر ہتر ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رو، رو کر سرخ
پڑ چکی تھیں..... مسلسل بھوسکے رہنے اور نیند نہ آنے کی وجہ

نکالو مجھے یہاں سے، مار ڈالوں گی میں سب کو.....“
چاروں طرف سے بند کمرے میں ایک چھوٹی سی کینڑکی
جس کی لمبائی اور چوڑائی ایک بالشت سے کچھ ہی زیادہ

ماہنامہ پاکیزہ 211 نومبر 2016ء

کبڑے گلے کی شرٹ پہنے بھائی سے لگی کھڑی تھی۔ اس طرح اسے دیکھ کر مینا کو شرم آگئی اور وادی کی بات یاد آئی جو کہتی تھیں کہ ”باپ، بھائی سے بھی پردہ ہوتا ہے جو ان لڑکیوں کو حیا، شرم ہونی چاہیے۔ اور بھائیوں سے قاصد رکھ کر بات کرو۔“ جو نصیحتیں کبھی سمجھ نہ آئیں لیکن ہمیشہ عمل میں رہیں آج ایک نیا رشتہ جڑتے ہی اس کی سمجھ آنے لگیں۔ وہ دونوں اب بیڈ پر بیٹھے ہلسی مذاق میں مگن تھے۔ نند عرشہ اپنی مطلوبہ رقم لے کر ہی ملی اس کے بعد اس کے مجازی خدا کو مینا کا خیال آیا۔ اور پھر سات سال تک یہی ہوتا رہا پہلے بہن پھر بیوی..... صبح ہوئی، ناشتے سے فارغ ہو کر دونوں ماں، بیٹی نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ مینا کے میکے والے آئے بیٹھے تھے اسے لینے۔ ان کے انتظار میں تقریباً دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ وہ واپس آئیں تو آتے ہی عرشہ نے گلے میں سونے کا دیباہی لاکٹ پہنا جیسا رات میں اس کے شوہر امان نے اسے منہ دکھائی میں دیا تھا۔ مینا کے دل میں عرشہ کے خلاف پہلی گرہ لگی۔ اور شادی کے تین سالوں میں اسی طرح گرہیں لگتی چلی گئیں۔ سونے پر سہاگا اس کی جھیشانیوں نے کم دیش اسی طرح کے قصے سنا، سنا کر اس کے دل میں بدگمانی کی ان گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیا تھا۔ مینا کے شوہر امان کا گھر میں ساتواں نمبر تھا۔ عرشہ چوتھے نمبر پہ تھی اس سے بڑے تین اور چھوٹے تین بھائی تھے۔ سب کی لاڈلی، نازوں میں پلی اور ضد میں کچی.....

☆☆☆

ہیل کی ٹک، ٹک پر وہ اس بالشت بھر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

”ارے، میں نے اگر غلط نہیں پہچانا تو تم کلثوم باجی کی بیٹی عرشہ ہی ہوناں؟“ اجنبائی اپنائیت بھرے لہجے میں انہوں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ جو کم صم کھڑکی تھی چونک کر نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اسے وہ کہیں سے بھی پہچان میں نہیں آئیں۔ لیکن اس نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

”کیسی ہو گڑیا..... اور یہاں کس نے بھیجا

سے اس کی آنکھوں کے گرد خلتے برچھے تھے۔ تین دن ہو گئے تھے اسے یہاں قید، اسے لگنا وہ اسی طرح بند رہی تو واقعی پاگل ہو جائے گی۔ اس کھڑکی سے اسے کھانا پانی ملتا..... لیکن وہ سب ہاتھ مار کر گرا دیتی..... پہلی بار جب ایک عورت دروازہ کھول کر اسے کھانا دینے آئی تو وہ اس کے پیروں میں گر گئی۔

”خدا کے لیے مجھے نکالو یہاں سے..... میں پاگل نہیں ہوں۔“

”تم یہ کھانا کھا لو، میں ڈاکٹر سے بات کرتی ہوں، وہ تمہیں یہاں سے نکالیں گے۔“ اس نے اسے اٹھایا اور بہت پیار سے بولی۔

”ڈاکٹر، ڈاکٹر سے کیوں اتن بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو۔“ چٹاخ، اس نے اس عورت کے منہ پر طمانچہ مارا اور اچھی خاصی موٹی عورت کو جھجھوڑ ڈالا۔ وہ اٹنے قدموں بھاگی۔ بس اس کے بعد اسے اسی کھڑکی سے کھانا دیا جاتا..... اور وہ گرا دیتی۔ کبھی چینی۔

”اماں! اماں دیکھو اپنی لاڈلی کا حشر، مار ڈالا تمہاری بہوؤں نے..... خدا غارت کرے تمہاری بہوؤں کو۔“ چیننے، چیننے غڈ حال ہو کر فرش پر گر جاتی اور پھر وہیں سو جاتی۔

☆☆☆

جلد عروسی میں بیٹی مینا کو یہاں بیٹھے کتنا وقت جیتا اسے اندازہ نہیں تھا۔ فائرنگ اور پٹاخوں کے درمیان اسے گاڑی سے اتارا گیا۔ کئی تھکا دینے والی رسموں کے بعد اسے کمرے میں لے جایا گیا۔ گلاب اور موہیے کی لڑیوں سے سجایا کمر اس کی سوچ سے زیادہ حسین تھا۔ وہ چاروں طرف کا جائزہ لینے میں مصروف تھی جب اسے پہلی بار چینوں کی آدازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی لڑ رہا ہو، اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کا پھٹنے لگا..... کچھ دیر بعد خاموشی ہو گئی۔ چند منٹوں بعد آہٹ پردہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دل بے ترتیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ سلام کی آواز پر اس نے نظریں اٹھائیں تو اس کے مجازی خدا کے ساتھ اس کی اکلوتی نند عرشہ بیٹھا دوپٹے کے جسم سے چپکی اور

یہاں تم کھانا وغیرہ سب سے گھاؤ ورنہ یہ لوگ واقعی تمہیں کچھ انٹا سیدھا سمجھیں گے، سمجھ گئیں ناں.....“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ مبادا نرس قریب آکر ان کا نام پکار لے اور ان کی بنائی اسٹوری کمزور پڑ جائے۔ ڈاکٹر وانیہ نفسیات کی نای گرامی ڈاکٹر تھیں وہ مریض کی کیس ہسٹری بہت اچھے انداز میں اسٹڈی کرتی تھیں اور مریض کو ایسے ہنڈل کرتیں کہ وہ اپنے دل کی ہر بات اُن سے کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ اس ہسپتال کے صرف دس کیس اسٹڈی کرتی تھیں۔ عرشہ خوش نصیب تھی جس کا کیس ڈاکٹر وانیہ کے ہاتھ میں آیا تھا۔ وہ مریض کے ماں، باپ، بہن، بھائی، عزیز واقارب کے نام باقاعدہ اچھی طرح یاد کر کے پھر مریض سے ملتی تھیں کہ مریض کو مکمل اپنائیت ملے۔

☆☆☆

موسم بہت دلنریب ہو رہا تھا۔ شام کے اس پہر شہنڈی، شہنڈی ہوا کین چلتی بھلی محسوس ہو رہی تھیں۔ آسمان پر بادل اٹھیلیاں کر رہے تھے۔ نم گھاس پہ دو نفوس بیٹھے تھے۔ یہ ہسپتال میں پچھلے حصے پر بنالان تھا۔ ”میری اماں نے میری کوئی خواہش کبھی رو نہیں کی..... ابا کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ زبان سے بات نکلنے سے پہلے میرے بھائی بات پوری کرنے دوڑ جاتے۔ کبھی کوئی خواہش ایسی نہیں تھی جو رو ہوئی ہو۔ پھر میرے دو بڑے بھائیوں کی شادی ہو گئی۔ ان کی بیویاں انہیں لے کر الگ ہو گئیں۔ یہ صدمہ میرے لیے بہت بڑا تھا کہ میرے دونوں بھائی اب صرف سلام دعا کی حد تک مجھ سے بات کرتے اور اس سے زیادہ کرتے بھی کیا..... وہ آتے ہی رات کو کچھ دیر کے لیے تھے۔ میں گھٹ، گھٹ کر روتی، اسی دوران میرا رشتہ خاور شاہ کے لیے آ گیا۔ وہ بڑی بھابی کے دور کے کوئی رشتہ دار تھے۔ فرمان بھائی نے ہاں کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تو میری ماں کو ہاں کرتے ہی بنی۔ خاور بظاہر بہت ملنسار تھا۔ لیکن اسے عورت میں کوئی دلچسپی نہ تھی یا شاید اس کی انا عورت پر خود کو کمزور ظاہر نہ ہونے دیتی۔ خیر جو بھی تھا میں

تمہیں..... مجھے نہیں پتہ چاہتا تم نے، جب تم اتنی ہی نہیں میں تمہارے گھر آتی تھی اکثر کلثوم باجی کے پاس بیٹھ کر کبھی لگاتی یا دیا کچھ.....؟“ وہ اس کے سر پر چپٹ لگاتے ہوئے بولیں۔ اسے یاد تو کچھ بھی نہیں آیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے چہرے کا تناؤ اب کم ہو گیا تھا۔ ”نہیں، مجھے نہیں یاد آ رہا.....“ عرشہ کپٹی کو دو انگلیوں کی مدد سے دباتے ہوئے بولی۔ ”تم یہاں سے نکلو، آؤ باہر لان میں چل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ نری سے گویا ہوئیں۔ ”نہ، نہ، نہ نہیں یہ کرا بند ہے، تالا لگا ہوا ہے باہر سے۔ میں باہر نہیں آ سکتی۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”کیوں..... تالا کیوں لگا ہوا ہے۔“ وہ اچنبھے سے بولیں۔

”یہ لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”تمہیں یہاں تک لایا کون ہے؟“ ”بھائی اور بیٹا بھابی۔“ ”اماں.....؟ وہ تو تم سے بہت محبت کرتا تھا.....“ ”کہے ہر بات پوری کرتا تھا..... پھر وہ کیوں لے آیا تمہیں یہاں.....؟“ وہ اسے جاگتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ”اپنی بیوی کے کہنے پر.....“ اس نے ”اپنی بیوی“ ایسے منہ بنا کر کہا کہ جیسے منہ میں کڑوا باوام آ گیا ہو۔ ”اور باقی بھائی رحمان، فرحان وغیرہ.....؟“ ”وہ بھی سب اپنی، اپنی بیویوں کے غلام ہیں۔“ اس کی آنکھوں سے نفرت جھانکنے لگی۔ ڈاکٹر وانیہ کی نظر سامنے سے آتی نرس پر پڑی تو انہوں نے جلدی سے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”اوکے، میں بعد میں تم سے ملتی ہوں تم پریشان نہ ہو کلثوم باجی کی وجہ سے تم بھی مجھے بہت عزیز ہو۔ میں انشاء اللہ تم سے کل ملتی ہوں پھر تفصیل سے بات ہوگی۔“ وہ اس کا ہاتھ تھپک کر آگے بڑھیں پھر کچھ خیال آنے پر پیچھے پلٹ آئیں۔

جو اتنی محبوبوں کے پاس میں رہتی تھی، مجھ سے اس کی بے رحمی نہ سہی گئی اور میں اماں کے گھر واپس آ گئی۔ میری اماں نے بجائے مجھے سمجھانے کے مجھے سینے سے لگایا اور میرے بھائیوں کی عدالت میں میرا کیس بڑھا چڑھا کر رکھا۔ میرے بھائیوں نے خلا کا مقدمہ کر دیا وہ تو شاید انتظار میں ہی بیٹھا تھا۔ فوراً ہی مجھے طلاق کا پروانہ پکڑا گیا۔ میری شادی کے ساتھ، ساتھ مجھ سے بڑے بھائی فوزان کی بھی شادی ہوئی تھی۔ فوزان بھائی جب بھی مجھے پیار کرتے مجھے ولاسا ویسے تو ان کی بیوی مجھے ایسی کاٹ ورنظروں سے گھورتی کہ میں کٹ کر رہ جاتی۔ لیکن بظاہر ڈھیٹ بن کر بھائی سے مزید لاڈ کرواتا۔ میرے تینوں چھوٹے بھائی اب بھی میرا ویسا ہی خیال رکھتے جیسے پہلے رکھتے تھے۔ میں کبھی اکیلی بیٹھی کسی سوچ میں گم ہوتی تو فوراً مجھے باتوں میں لگا لیتے۔ میری ماں، آہ میری ماں..... میرا بے حد خیال کرتیں۔ پھر فوزان بھائی کی بیوی نے ایک رشتہ کرانے والی سے میرا رشتہ ایک اور جگہ کروا دیا اور دونوں چھوٹے بھائیوں کی شادیاں اپنی کزنز سے کروا دیں۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ میں کچھ سوچ نہ پائی اور فراز کے گھر شادی ہو کر آ گئی جو ایک بد قماش، عمر رسیدہ شخص تھا۔ نشے میں ہوتا تو مار پیٹ کر تاورنہ دن میں نارمل حالت میں رہتا۔ اس کی انہی حرکتوں سے میرا بچہ بھی ضائع ہو گیا۔ ایک دن پیسوں کے مطالبے پر میرے انکار کرنے پر اس نے مار پیٹ کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ گھر کی دلہیز پر میں بے یار و مددگار پڑی دوڑے تڑپ رہی تھی کہ پڑوس سے کسی نے ایسبولینس کو بلا یا میرے گھر والوں کو اطلاع دی وہ فوراً پہنچے..... میں جب ہوش میں آئی تو اپنا قیمتی سرمایہ کھو چکی تھی۔ اور میں جو یہ سمجھ رہی تھی کہ میرے بھائی فراز کی جان کے ورپے ہو جائیں گے ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ صرف اماں ہی تھا جو میرا ہاتھ تھام کر روتا رہتا، میرے حال پر کڑھتا رہتا۔ پانچ بھائیوں نے میرا حال تک پوچھنا گوارا نہیں کیا..... سب ہی نے مجھے قصور وار جانا۔ مجھے دورے پڑنے لگے، میں ہسٹریائی ہونے لگتی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی، نعمان کی بیوی بھی امید سے

ماہنامہ ہلاکوز 214 نومبر 2016ء

تھی کہ وہ میرے چاہیے جان بوجھ کر نعمان کے خڑے کرتی..... میں منہ نہیں کر کرے میں بند ہو جاتی۔ گھر کے ماحول سے تنگ آ کر میری اماں نے دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھی الگ کر دیا اب گھر میں صرف میرے دو محبت کرنے والے رشتے بچے تھے میری اماں اور چھوٹا بھائی اماں۔ میں آہستہ آہستہ زندگی کی طرف آنے لگی۔ اب میں جان، جان کر اماں سے فرمائش کرتی۔ شاید اپنی اتنا تو تسکین پہنچانے کے لیے، اماں میرا بہت خیال رکھتا۔ کبھی، کبھی مجھے اندر سے دکھ بھی ہوتا۔ لیکن میں اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی۔ اماں کے لیے لڑکی میں نے خود تجویز کی تھی۔ میری دوست کی بہن مینا بہت محسوس ہی گڑیا لگتی تھی۔ وہاں اماں کا نکاح کر دیا۔ نکاح کے بعد میں اماں کو ہر وقت جا چھتی نگاہ سے دیکھتی کہ اس میں کچھ تبدیلی تو نہیں آرہی لیکن مجھے ایسا کچھ نظر نہیں آیا۔ تو میں نے اماں کو رخصتی کا سگنل دے دیا کہ گھر میں تنہائی مجھے کاٹتی تھی۔ اماں زیادہ تر محلے پر بیٹھی رہتیں ملازمہ کام نبٹا کر چلی جاتی اور میں ہولتی رہتی..... لیکن اماں کی رخصتی ہوتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرا یہ بھائی بھی مجھ سے چھن جائے گا۔ جب اماں نے اماں کو وہن کو منہ دکھائی دینے کے لیے لاکٹ دیا تو میں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت ایسا لاکٹ چاہیے یا یہی مجھے دے دو۔ میری ماں اور اماں نے مجھے سمجھا بھجا کر اس پر آمادہ کیا کہ صبح ہوتے ہی مجھے وکان پہ لے جا کر میری پسند کا لاکٹ دلا دیں گی۔ میں سمجھتی کیا..... مجھے تو صرف اماں کی بیوی کو یہ جمانا تھا کہ وہ بیوی سے زیادہ بہن کی مانے گا۔ جو خوف میری پانچوں بھائیوں کی طرف سے ملا تھا۔ میں اس خوف سے لگنا چاہتی تھی۔ لیکن انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا کب ہے..... اماں کی شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اماں ایسی سوئیں کہ پھر نہ اٹھ سکیں..... میں سچ سچ میں وہاڑیں مار کر روئی۔ میرے پانچ بھائیوں نے صرف میرے ہاتھ رکھ کر ولاسا دیا لیکن اماں نے گلے لگایا۔ مجھے تسلی ہو گئی کہ یہ اب بھی میری طرف ہی ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ گھر میں اب بھی میرا ہی حکم چلتا، کھانا میری مرضی کا پکا..... ہر کام میری مرضی کے مطابق

بھری نظروں سے دیکھا اور کچھ کہنے شایان کو گود میں اٹھایا اور چلا گیا۔ خدا جانتا ہے میں نے اس کے بچے کو جان بوجھ کر نہیں مارا۔ وہ مجھے ایسے، ایسے طعنے دیتی کچھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ وہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ وہ اماں کو کئی بار میرے بارے میں جھوٹ، جھوٹ لگاتی رہی تھی، بھڑکانی رہتی تھی۔ رات تک بیٹا گھر آگئی، میں شرمندہ تھی بہت شرمندہ..... میں نے سوچا تھا اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گی۔ لیکن اماں کو بہت جلدی تھی شاید مجھے یہاں لانے کی..... اس نے مجھے آکر صرف اتنا کہا کہ مجھے نعمان کے گھر چھوڑنے جا رہا ہے میں سامان باندھ لوں۔ میں نے جلدی، جلدی اپنا بیگ تیار کیا..... میرے کپڑے مار کٹائی کے دوران پھٹ گئے تھے۔ مجھے جلدی میں بدلنے کا بھی خیال نہ آیا۔ یونہی اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔ گاڑی انجان راستوں کی طرف جا رہی تھی۔ میری ہمت نہیں تھی کہ اس سے پوچھ سکوں کہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ وہ اس عمارت کے آگے رکا۔ مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا۔ اندر سے آیا میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اندر لے آیا وہاں میرا ہاتھ ایک نرس کے ہاتھ میں تھما دیا اور باہر کی طرف جانے لگا، میں چیخی۔

”اماں کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر.....“ وہ مڑے بہت باہر نکل گیا۔ میری نظر بورڈ پر پڑی جہاں نفسیاتی اسپتال لکھا تھا۔ میں چیخی رہی، میں پاگل نہیں ہوں اماں میری بات سنو..... لیکن وہ لکھا چلا گیا۔ یہ لوگ مجھے اس کمرے میں بند کر کے چلے گئے۔ اب مجھے بتائیں کیا میں پاگل ہوں۔“ میں..... میں تو ماں کی لاڈلی ہوں..... اپنے بھائیوں کی لاڈلی ہوں.....“ وہ کہتے کہتے دیہں گھاس پہ گر گئی۔ صرف اس کے ہونٹ مل رہے تھے۔

”میں تو ماں کی لاڈلی ہوں، ماں کی لاڈلی ہوں.....“ ڈاکٹر دانیاہ کسی گہری سوچ میں گم تھی کہ آخر کون عرشید کی اس حالت کا ذمے دار ہے، ماں کا بے جالا ڈ..... شعور کی کمی یا رشتوں کا عدم توازن.....

ہو رہا تھا۔ اماں کی بیوی..... امید سے ہوئی اور وہیں سے میرا درجہ نیچے ہوتا چلا گیا۔ پہلے جو وہ میرے کام کرتی تھی، اماں نے اسے وہ کام کرنے کو بھی منع کر دیا..... یا اس نے خود ہی ہاتھ کھینچ لیا..... میرے کام کون کرتا، میرے بال بکھرے رہتے۔ اماں نے نہ جانے کون، کون سے تیل لگا کر میرے بال گھنٹوں تک پہنچائے تھے۔ مجھے وہی بال وحشت زدہ کر دیتے۔ میں نے بھی بال نہیں سلجھائے تھے، وہ پہلا طعنہ اماں کی بیوی نے مجھے مارا تھا۔

”آپنی ان کو کاٹ لیں کون سا آپ نے اپنے شوہر کو دکھانے کے لیے رکھنے ہیں۔“ اس نے اپنے لمبی سلکی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اماں کو لمبے بال پسند تھے، یہ مجھے بھی معلوم تھا۔ میں تیزی سے اٹھ کر کمرے میں بند ہو گئی۔ اور پھر سچ سچ ان بالوں سے نجات حاصل کر لی۔ اماں کے..... پہلا بیٹا ہوا مینا چلہ گزارنے ماں کے گھر چلی گئی تو اماں نے مجھے دوسرے بھائی کے گھر بھیج دیا۔ وہاں بھی مجھے بات، بات پہ طعنے ملتے، میں وہاں پندرہ دن رہ کر اور دوسرے بھائی کے ہاں چلی گئی۔ اسی طرح پندرہ بیس دن ہر بھائی کے گھر میں رہ کر تقریباً چار ماہ بعد میں اپنے گھر آئی چند ماہ گزرے تھے کہ مینا ایک بار پھر امید سے گئی اور اس بار وہ زبان میں پتھر چھپائے ہوئے تھی بات، بات پر مجھے طعنے دینا، طنز کرنا، میری دوشاد یوں کو ٹارگٹ بنا کر مجھے یہ جملے کسنا، میں کی اسے دبدب جواب دیتی۔ ایک دن حد ہو گئی۔ وہ مجھے میرے اذھورے بچے کے طعنے دینے لگی کہ اسے میں نے مارا ہے۔ میں نے اس کے بال پکڑ لیے۔ اس نے میرے منہ پر طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ یوں مار کٹائی میں میرا پاؤں اس کے پیٹ پر پڑ گیا وہ دیہیں پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اپنا وقت یاد آ گیا۔ میں نے گھبرا کر اماں کو کال کی وہ دس منٹ کے اندر، اندر گھر پہنچا اسے گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے گیا۔ چار گھنٹے میں دعا کرتی رہی کہ اس کے بچے کو کچھ نہ ہوا ہو۔ اس کے بیٹے کو سنبھالتی رہی، اس کے کپڑے تبدیل کرائے فیڈر دے کر سلا دیا۔ چار گھنٹے بعد اماں آ گیا۔ میں نے جینا کی حالت پوچھی تو اس نے مجھے قہر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





ادنی صدی بعد
سرین جمیل سیال

Downloaded From
Paksociety.com

وہ پہلی بار کسی شادی میں شریک ہوئی تھی اور ابھی
تک ای جان کے پہلو میں چھپی بیٹھی تھی کہ ریحانہ
دندانہ ہوئی آئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے اسٹائل سے
ای جان سے مخاطب ہوئی۔

گولڈن فر کالمبا کوٹ اور اس پر بلیک فر کے
بڑے کالر..... بے بی کٹ ہیئر اسٹائل، سرخ چوڑے
سلکی رہن میں بندھے ہوئے سلکی بال اسے سب سے
منفرد اور جاذب نظر دکھا رہے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ پاکیزہ 2016 نومبر 2016ء

www.paksociety.com



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



یارت تم تو مٹی کا مادہ ہو۔ میں نے بتایا نہیں کہ ابھی ذاکر بھائی آنے والے ہیں، ان کا پارٹ ٹو کا آخری پیر تھا یونیورسٹی سے سیدھے یہیں آئیں گے۔ میری سب دوستیں تو ذاکر بھائی کے گانے سننے کو ترستی ہیں، تم بھی سنو گی تو ہمیشہ سننے کی خواہش کر دو گی۔“ اس نے مزے لے کر کہا۔

”تم ای کی فکر نہ کرو، وہ دونوں دوستیں اپنی گپ شب میں اتنی محو ہیں کہ انہیں ساری دنیا بھولی ہوئی ہے، ابھی چائے آنے والی ہے تم بیٹھو تو۔“

دس چندرہ منٹ بعد بلیک ٹوپس میں ملبوس سانولا سا ذاکر اقبال خوشبوؤں میں بسا ہال میں داخل ہوا۔

ریحانہ نے آگے بڑھ کر بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔ دو تین کزنز بھی ذاکر کے ساتھ تھے۔ سب اسٹیج پر براجمان ہو گئے۔ ریحانہ بھی بھائی کے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گئی۔ ذاکر نے ہارمونیم کو چھوا تو لڑکیوں کی کھسر پھسر ایک دم بند ہو گئی۔ تب پھر ایک خوب صورت آواز کرے کی خاموشی کو توڑتی ہوئی فضا میں لہرائی۔

”بے رحم آسمان میری منزل بتا ہے کہاں“ آواز میں اس قدر سوز تھا کہ ہال میں سکوت چھا گیا۔ ہر کوئی متوجہ تھا۔ بے شمار لمحے اسی خاموشی کی نذر ہو گئے آخر کار طلعت محمود والا یہ طویل نغمہ ذاکر نے اپنے اختتام کو پہنچا دیا۔ تالیوں کی آواز بلند ہوئی اور اسی دوران پھر لے چھڑ گئی۔

”میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہیں ملا“ یہ پُرسوز آواز نائلہ کے دل پر بھی اتر کر رہی تھی۔ وہ تو جب بہت چھوٹی تھی تب بھی ریڈیو پر بجنے والے سیڈ ساگ ہی سن کر متاثر ہوتی تھی۔

ملازمہ اپنی بیٹی کے ہمراہ ہال میں بیٹھے سب لوگوں میں چائے تقسیم کرنے لگی۔ ساتھ ہی پلیٹوں میں مٹھائی اور سکٹ بھی رکھے جا رہے تھے۔ گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے کے ساتھ پُرسوز گانوں کا سلسلہ جاری تھا تب پھر تھوڑی دیر کے لیے وقفہ آ گیا۔

”حائشہ آئی اس نیک پردین کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی اگر اس نے آپ کے کندھے سے ہی لپٹے رہنا تھا۔ اٹھو بی بی میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ اور میں ایویں چھوڑنے والی نہیں ہوں، ریحانہ اہل ہوں۔“ اس نے نائلہ کا ہاتھ پکڑا اور یہ جاہدہ جا.....

بڑے ہال میں فرش پر سرخ قالین اور دیواروں کے ساتھ صوفے اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے بڑی سی کھڑکی کے نیچے اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر موسیقی کے آلات نظر آ رہے تھے۔ ایک سائڈ پر بڑی سی بانسی نوکری پھولوں سے بھری بڑی تھی۔ لڑکیوں کا ایک ٹولا بڑی بے پردائی سے قالین پر آلتی پالتی مارے براجمان تھا۔ خوب تہقہ لگ رہے تھے۔

”تشریف لائیں میڈم! یہی ہیں ہمارے یارنہیلی جو ہمارا کل اثاثہ ہیں۔“ ریحانہ نے سینے پر ہاتھ مار کر بڑے اسٹائل سے بتایا اور بڑا شوخ سا تہقہ بلند ہوا۔

”آؤ نیلی (نائلہ) ادھر میرے ساتھ بیٹھو۔“ شہناز بابی نے مہندی اور ہری پیلی چوڑیوں والا ہاتھ بڑھا کر نائلہ کا ہاتھ تھام لیا۔

نائلہ اس شوخ ماحول میں جھجک محسوس کر رہی تھی، کھانے کے بعد مہندی کی رسم ہوئی اور ساتھ ہی اس شوخ ٹولے نے ڈھولک پیتا شروع کر دیا۔ چوڑیوں کی کھنک، مہندی لگے ہاتھ، رنگ برنگے آئینے بہت مختلف قسم کی خوشبوؤں کی پٹیس مہندی کی رسم کو چار چاند لگا رہے تھے۔

ڈھولک پر مایے اور ٹپے گائے جا رہے تھے۔ تالیوں کی گونج میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نائلہ کٹھی سمٹائی رخسانہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ چہرے پر خوشی اور جھجک کے ملے جلے آثار تھے۔ اسے بھی یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔

رسم خاتم ہوئی تو ڈھولک کی آواز بھی ختم ہوئی۔ خواتین کا رش کم ہونے لگا۔ نیلی نے ای جان کے پاس جانے کا ارادہ کیا تو ریحانہ راست روک کر کھڑی ہو گئی۔ ”بھئی تم سے اور رنگ لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔“

رخسانہ اور شیریں بھی وہی موجود تھیں۔ پندرہ، سولہ لوگوں کی یہ محفل پھر ہال میں برافسان تھی۔

”آپ کی تعریف.....؟“ ذاکر نے نالکھ عرف نیلی کو مخاطب کیا۔

”تعریف اس خدا کی جس نے انہیں بنایا.....“
ریحانہ تمام تر شوخی اپنے لہجے میں سمیٹے درمیان میں کود پڑی..... ”بھائی مجھ سے پوچھیں یہ آپ کو کیا بتائیں گی۔ یہ تو ”مٹی کا مادھو“ ہیں، میں جو موجود ہوں آپ کی ہیلپ کے لیے۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر شوخ ہوتے ہوئے کہا۔

”ان کا نام نالکھ حمید ہے پیار سے نیلی بھی کہتے ہیں۔ یہ ای جان کی دوست عائشہ آئی کی بیٹی ہے، کسی کو لفت تو نہیں کرائی لیکن اچھی بہت لگتی ہے ایمان سے۔“
”کبھی کم بھی بولا کرو.....“ ذاکر نے ہلکی سی چپت لگا کر بہن سے کہا۔

”بچوں آپ لوگ کب اٹھو گے یہاں سے، بس اپنے، اپنے بستروں میں کس جاؤ..... کل بارات کی تیاری کرنی ہے۔“ صالحہ خالہ نے ہال میں آتے ہی سب کو مخاطب کر کے کہا اور باری، باری چائے ختم کرتے ہی سب اٹھنے لگے۔

☆☆☆

صبح ویر سے آنکھ کھلی، نیلی نے ٹوتھ برش پر پیسٹ لگایا اور صحن میں لگے واش بیسن بر جا کر دانت صاف کرنے لگی۔ کلی کرتے ہوئے اوپر لگے آئینے پر نظر پڑی تو دو آنکھیں آئینے میں اسے اپنی طرف گھورتی نظر آئیں۔

وہ ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹی..... جلدی، جلدی چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور ٹاول سے چہرہ صاف کرنے لگی۔ اور تیز قدموں سے ای کے کمرے میں چلی گئی اور جھٹ لٹاف میں کس گئی اور آنکھیں میچ لیں۔ ای جان کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد کسی نے پیشانی پر ایک انگلی سے دستک دی۔

”اٹھو شہزادی صاحبہ! یہ چند دن نیند کی قربانی دے دیجیے..... سونے کے لیے سناری عمر پڑی ہے۔“

لوگوں نے دوبارہ گانا سننے کی فرمائش کی..... فضا میں دوبارہ آواز بلند ہوئی۔

”گوریے میں جانا پرویس.....“
میں جانا تیرے تال وے.....“

ریحانہ بھی اپنی آواز کا جاو جگانے لگی۔
ذاکر اور ریحانہ مل کر گارے تھے اور تالیوں کی آواز اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی۔ گانا ختم ہوا تو ریحانہ نے اپنی شوخ آواز میں لوگوں کو مخاطب کیا۔
”دوستو آپ لوگوں کو اداس کرو یا سے سیڈ سا رنگ نے، میرا خیال ہے کہ ہال میں اداسی کو کم کرنے کے لیے ایک مزے وار سا گانا سنیں۔“

باؤ جی میں اک عرض کراں
نہ کھسکو جی اراں اراں.....
دیکھو رہناں ہداں ہداں
نیڑے نیڑے آوندے او
ساڈا دل دھڑکاندے او.....“

ریحانہ کے چہرے پر شوخیوں کے رنگ نے مست سی لالی بھروی۔

وہ ذاکر کے کندھے سے اپنا کندھا ٹکرا کر لہک لہک کر گار رہی تھی اور تالیاں بجا کر بار بار اسے داد سے نوازا جا رہا تھا۔

ماحول بڑا خوشگوار سا لگنے لگا۔ ایک کے بعد ایک گانا گایا جا رہا تھا۔ وال کلاک نے رات تین بجے کا اعلان کر دیا تو محفل برخاست ہونے لگی۔ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ نالکھ نے بھی رخسانہ کا ہاتھ تھام کر جانے کے لیے پرتولے.....

”جی نہیں آپ کو کس نے اجازت دی ہے جانے کی؟ ابھی تو مل بیٹھنے کا موقع ملنے والا ہے۔ تم دونوں کہیں نہیں جا رہیں..... سنا تم نے۔“ اور وہ دونوں دوبارہ بیٹھ گئیں۔

ذاکر اور ریحانہ بھی آکر درمیان میں سب لڑکیوں کے پاس بیٹھ گئے۔ شہناز ماجھی بڑی پلٹوں میں ڈرائے فروٹ اور چائے رکھوانے لگیں۔ نالکھ

وہ بادل ناخواستہ اٹھ بیٹھی۔

گا۔ ”ریحانہ نے نیلی کی تھوڑی کوچھو کر کہا تو وہ بڑی مصحومیت سے سر ہلانے لگی۔

”مجھے کچھ نہیں آتا ریحانہ..... یہ تمہاری نیلی کی شادیاں بہت مشکل ہیں۔“

”مشکل نہیں بڑی مزے کی شادیاں بلکہ بڑی شاندار ہوتی ہیں اور بڑی یادگار بھی ہوتی ہیں۔“ شہناز

باجی نے نائلہ کو اپنے ساتھ لگا کر کہا..... اتنے میں ریحانہ، ذاکر کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئی۔

”سنو دوستو! عابدہ باجی کی شادی روز، روز تھوڑی ہونی ہے، میں اس شادی کو سب کے لیے یادگار بنوادوں گی..... سب اپنا، اپنا حصہ اس میں ڈالیں گے۔“ اتنے میں ایوب بھائی، طارق، خالد سب آن دارو ہوئے۔ محفل نے پھر اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔

باری باری سب اپنا کمال دکھا رہے تھے۔ نیلی بھی اس محفل کو انجوائے کرنے لگی۔

تب پھر اچانک محسوس ہوا کہ دو آنکھیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی ہیں، وہ گھبرا گئی۔ رخ تھوڑا سا چیخ کیا اور خود کو گانے والوں کی طرف متوجہ کیا لیکن کہیں کوئی گڑبڑ ضرور موجود تھی۔

☆☆☆

”اے دل تجھے اب ان سے یہ کیسی شکایت ہے وہ سامنے بیٹھے ہیں کافی یہ عنایت ہے“

ذاکر گانے لگا اور ریحانہ گلاب کی چٹیاں پھٹا اور کرنے لگی۔

نیلی کو یہ سب کسی قلم کا ڈراپ سین لگ رہا تھا۔ ریحانہ نے بڑھ چڑھ کر ہلا گلا کیا۔

”بچوں! آپ لوگ تھکے نہیں۔“ زینا آیا اپنا آنچل لہرائی ہوئی کمرے میں آئیں۔ رات بھر ہلا گلا کرتے رہے ہو۔ میرا خیال ہے اب کچھ بارات کی تیاری کا بھی سوچو۔“ آبانے بڑی اپنائیت سے کہا تو آوازیں آہستہ، آہستہ تھمنے لگیں۔

”یار، بہت تنگ کرتی ہو، میں اب کہیں نہیں جا رہی..... اس شادی سے پہلے تو میں نے کبھی کسی گیدرنگ کو فیس نہیں کیا تھا۔“

”یہ کیا منطق ہے تمہاری؟ عانتہ آئی آپ بھی کیا“ مٹی کا مادھو“ ساتھ لے کر آئیں اس سے بہتر تھا کہ آپ شہلا کو ساتھ لے آئیں۔“ ریحانہ منہ بسورنے لگی۔

”تمہاری آئی کے سب بچے اسی طرح کے ہیں۔“ ریحانہ کی ای نے بتایا۔

”اوہو! اب سمجھ میں آیا کہ... ملکوال“ میں سارا مال ایک جیسا بنتا ہے لیکن سوری آئی آج میں اسے چھوڑ کر جلنے والی نہیں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اسے بتا دیں میرے ہوتے یہ سب نہیں چلے گا۔“

”لگتا ہے آج شیطان سے جان چھڑانی مشکل ہے۔“ وہ مسکراہٹ کو دباتے ہوئے بڑبڑائی اور بال ہیئر کچر میں سمیٹتے ہوئے بستر سے نکل آئی۔ اس چیخ سی ریحانہ کو بھلا ایک مصحوم سی نیلی کے بڑبڑانے سے کیا فرق پڑتا تھا۔

”اٹھیے میڈم، داش روم جا کر ذرا اپنا حلیہ درست کیجیے، ہماری فرینڈز آپ کے ورژن کرنا چاہتی ہیں۔“

گلابی چوڑی دار پاجامہ، اڈھیلا ڈھالا کزنا، کروشیہ سے بنا پر پل کلر جوئیٹر اور اسی کلر کی کروشیہ سے بنی چھوٹی سی خوب صورت شال کندھوں پر ڈالے، بالوں کی پونی ٹیل گلابی رین میں جکڑی ہوئی اس کے حسن میں چار چاند لگا رہی تھی۔ ہال میں داخل ہوئی تو سب کو وہ اچھی لگی۔

ریحانہ کی سب دوستوں نے باری، باری ہاتھ ملایا۔ گوش، شیریں، مریم، بیلی، طیبہ، کائنات اور نہ جانے کتنی دوستوں نے اپنا تعارف کرایا۔ نیلی نظرس ملائے بغیر ہی سب سے ہاتھ ملا رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھو چندا..... آج میرے سب ہی دوست اپنا، اپنا فن سجاویں گے، تمہیں بھی کچھ نہ کچھ سنانا پڑے۔“

باجی کی شادی کے لیے سلوایا ہے، اس پر سلور گولے کا کام ہے۔ سلور جوتا اور سلور جیولری..... میک اپ کے لیے میں نے الگ سے بیوٹی بکس رکھا ہے۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہوئی لے لینا۔“

”ارے نہیں، میں میک اپ بھلا کب کرتی ہوں اور ڈریس بھی میں چمک دکھ والے کب پہنتی ہوں۔ تم پر یہ سب بہت اچھا لگے گا۔ اس کے ساتھ تم جوڑے میں لگانے کے لیے موٹیے کے ہار نیچرل ہی منگواؤ۔“

”تم کیا کہن رہی ہو؟“ ریحانہ نے پوچھا۔
”ای جو دیں گی کہن لوں گی، میک اپ میں کرتی نہیں۔ تم تو جانتی ہو۔“

”بھئی اتنی سی عمر میں اتنا پیکا پن..... میں نے ایس تو تمہارا نام ”مٹی کا مادھو“ نہیں رکھا ناں..... میرے دل کو یہ بات کچھ ہضم نہیں ہوتی۔“ ریحانہ کہہ رہی تھی۔

ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد دونوں اٹھ گئیں۔ نیلی نے اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کے دو تین اسٹیپ ہی لیے تھے کہ اوپر سے تیزی سے کوئی نیچے اترتا ہوا آیا اور اس کے قریب آ کر رک گیا۔

نلی ہولے، ہولے واپس نیچے اترنے لگی تو وہ ایک چھلاگ میں نیچے اتر کر اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔

”نو، نو مس نلی اس راستے میں واپسی کی گنجائش نہیں رہتی۔ آپ جس طرف مڑیں گی، اس خاکسار کو سامنے پائیں گی۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔ چند ساعتیں خاموشی سے گزر گئیں۔ ذرا کرنے اس کے نازک ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹا دیے۔ آنکھیں سادوں بھادوں برسانے کی تیاری میں تھیں۔ ذرا کرا دل کٹ گیا۔

”سوری، آپ کو دکھ دینا میرا مقصد نہیں تھا۔ جائیں اور چپلی جائیں۔“ اور خود تیزی سے نیچے اتر گیا۔

وہ بہ مشکل خود کو سنبھال پائی چہرہ صاف کیا اور

چاہتی تھی کہ نہیں قریب سے آواز آئی۔
”ایکسکیوز می اشادی والے گھر میں جو کام ہوتے ہیں وہ سب آپ کے ذمے ہیں کیا؟“ ذرا کرنے ایک دم سامنے آ کر نالہ سے سوال کر دیا۔
”جی میں سمجھی نہیں؟“ نلی کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”میرا مطلب ہے محترمہ اگر اس گھر کی کچھ ذمے داریاں آپ کے سر ہیں تو ضرور انہیں پورا کرنے کے لیے آپ اٹھ جائیں ورنہ یہاں بیٹھے رہنے میں کیا حرج ہے۔“ وہ بڑے غور سے نلی کے چہرے کا مشاہدہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ریحانہ ابھی آنے والی ہے۔“ وہ سہمی ہوئی سی واپس بیٹھ گئی۔ سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”اور ڈریس مت، یقین کریں میں کوئی بھوت ووت نہیں ہوں، بڑا بے ضرر سا انسان ہوں، آپ بتائیں آپ حمید ملک صاحب کی صاحبزادی ہیں؟“ وہ فری ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

”جی ہاں.....!“ اس نے مختصر جواب دیا۔
”آپ کا کون سا نمبر ہے؟“ ذرا کرنے بات بڑھائی۔

”مجھ سے بڑی باجی اور بھائی ہیں۔“ جواب پھر مختصر دیا گیا۔

”آپ کے بھائی کو میں ایک فنکشن میں مل چکا ہوں۔“ وہ پھر بات کو طول دینے لگا۔ نلی کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ اتنے میں ریحانہ گولے کناری سے بھرا ہوا رائل بلوسوٹ بیگ میں لٹکائے اندر داخل ہوئی۔

”ارے..... ذرا کر بھائی آپ نے موقع ڈھونڈ ہی لیا۔ میں نے سمجھا تھا وہ بڑی معصوم سی لڑکی ہے میں تو اسے ”مٹی کا مادھو“ کہتی ہوں، آپ کیا توقعات لے کر بیٹھ گئے۔ انھیں آپ، میں نلی کو اپنا ڈریس دکھانے لائی ہوں۔“ وہ آ کر نالہ کے پاس بیٹھ گئی اور نلی کی جان میں جان آئی۔

”وہ کچھ نلی، یہ سوٹ میں نے خاص طور پر تیار کیا ہے۔“

سیرجیاں چھٹی ہوئی اور پرائی کے کمرے میں پہنچ گئی۔
 ای جان اور مصروف خالدہ (ریحانہ کی امی) رازو
 نیاز میں مصروف تھیں۔ نیلی نے بیڈ پر بیٹھ کر تکیہ کود میں
 لے لیا۔ وہ ابھی تک نروس تھی۔

”کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک
 ہے؟“ ای جان نے ایک نظر اسے دیکھا۔

”جی ذرا سر میں درد ہے، میں سونا چاہتی
 ہوں۔“ وہ بولی۔

”ارے نیلی میری بچی تم بھی اس شادی کو
 انجوائے کرو کیوں ٹینشن لیتی ہو پیناروز، روز یہ موقع تو
 نہیں ملتا نا۔“

”بس آج اور کل کا دن ہے خیر سے..... پھر خدا
 خیر کرے زندگی میں ملاقات ہونہ ہو..... میں تو بچوں کو
 کھلی چھٹی دے دیتی ہوں۔ ایسے موقعوں پر۔“ اتنے
 میں تیز، تیز قدموں سے چلتے ہوئے ڈاکر اقبال
 معروف خالدہ کے پاس آ کر رکا۔

”ای جان میں سوچ رہا ہوں آج واپس ہاسٹل
 چلا جاؤں؟“

”ارے کیوں تمہارے امتحان تو ختم ہو گئے ہیں؟“
 ”دراصل ای جان ضروری کام یاد آ گیا تھا؟“
 اس نے کن آنکھوں سے دیکھا نیلی کود میں تکیہ رکھے
 نظریں جھکائے اپنی آنکھوں سے کھیل رہی تھی۔ اور یقیناً
 ڈاکر کی اپنی والدہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو سن رہی
 تھی۔ اسے لگا جیسے ڈاکر کے جانے کا سن کر اس کے اندر
 ہی اندر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہو۔ وہ اس حقیقت کو نظر
 انداز کرنا چاہتی تھی لیکن یہ جذبے جب و بے پاؤں دل
 پر دستک دینے لگیں تو بغیر آہٹ کیے دل میں ہلچل مچ
 جاتی ہے۔ ڈاکر کمرے سے واپس چلا گیا۔

شام کو سب لوگ تیاری میں مصروف تھے۔ نائلہ
 نے سفید فرائیڈ کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ
 پہنا..... بالوں کو سفید سلکی ربن میں باندھا، کانوں میں
 سفید پھولوں والے ٹاپس، ہیروں میں نازک سی جین

اور سیٹ کا سفید دوپٹا سر پر اوڑھنے وہ کوئی آجہائی مخلوق
 لگ رہی تھی۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ اور کسی جسم کی
 چولہی کے بغیر..... چہرے پر ہلکی سی لالی اور معصوم سی
 سنجیدگی نے اسے منفرد سا بنا ڈالا تھا۔

”کہاں چھپی بیٹھی ہو نائلہ؟“ ریحانہ اپنی
 شوخیوں سمیت بجلیاں گراتی ہوئی اوپر آئی۔ ”ارے،
 ارے یہ کیا بڑی بوڑھیوں والا لباس پہن رکھا ہے۔
 تمہیں کوئی ٹکڑ نہیں ملا تھا۔ یہ میری طرف دیکھو۔“ اس
 نے گھوم کر اپنا پورا سراپا دکھایا یا بالوں کا بڑا سا
 جوڑا جس کے ارد گرد موہیے کے پھول لپٹے تھے۔ راکل
 بیلو سوٹ، سلور چولہی، فل میک اپ اور خوشبوؤں
 میں لپٹی ہوئی ریحانہ کسی فلم کی ہیروئن لگ رہی تھی۔
 سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری وہ اپنے منگیترا افتخار کی
 باتیں کر رہی تھی جو بات کے ساتھ آ رہا تھا۔
 نائلہ اسے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

”یہ لو، یہ گجرے ہاتھوں میں پہن لو۔“ ریحانہ
 نے گجرے دیتے ہوئے کہا۔ ”ہلکا سا میک اپ اگر تم
 کر لیتیں تو کیا حرج تھا۔ لیکن بھئی“ مٹی کے مادھو سے
 کون مغز مارے۔“

نائلہ نے گجرے دونوں کلاسیوں میں پہن لیے
 تھے۔ دور سے کہیں بینڈ کی آواز آئی تو بارات آگئی.....
 بارات آگئی کا شور بلند ہوا۔ لڑکیاں ادھر ادھر بھاگنے
 لگیں۔ رخسانہ اور شیریں بھی تیار ہو کر نائلہ کے پاس
 آگئیں اور سب بالکونی میں کھڑے بارات کو آتے
 دیکھنے لگیں۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ شیریں نے نائلہ
 کو ٹھوکا دیا..... ”وہ سامنے دیکھو ڈاکر بھائی کتنے محو ہیں
 تمہیں دیکھنے میں۔“ وہ ایک دم گھبرا سی گئی سامنے والی
 بالکونی میں ڈاکر کندھے پر ٹاول پھیلائے اسی طرف
 دیکھ رہا تھا۔ وہ بے گناہ ملزم کی طرح ماتھے پر آئے سینے
 کے قطرے صاف کرنے لگی۔

”چلو پارے نیچے چلیں..... پھر جگہ نہیں ملے گی۔“ اس
 نے رخسانہ اور شیریں کو ساتھ لیا اور نیچے ہال میں پہنچ گئی

جہاں خواتین کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ ہاں میں خاصا رش تھا لیکن جگہ مل ہی گئی۔ اتنے میں اس کا چھوٹا زین طارق اپنے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑے اندر داخل ہوا اور کسی کو تلاش کرنے لگا اور پھر اچانک نائلہ کو دیکھا تو اسی طرف خواتین کے رش میں گستاہوا اکن پہنچا.....

”نائلہ باجی میں آپ کے لیے یہ چپس اور کشمش لے کر آیا ہوں جب تک کھانا نہیں لگتا آپ اس سے بھوک مٹائیں.....“ اس نے مسکرا کر لفافہ پکڑا اور شکر یہ کہا۔

”نائلہ باجی آپ کو میرا شکر یہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں بس آپ آم کھائیں بیڑ نہ نکلیں۔“ اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا بھیڑ میں نہیں غائب ہو گیا۔

اس نے لفافہ رخسانہ کی طرف بڑھایا وہ چپس نکالنے لگی تو ایک جٹ اس کے ہاتھ میں آگئی۔ تینوں نے ایک دم دیکھا تو شعر درج تھا۔

”تجھے کیا خبر اے بھولے پن سے دیکھنے والے
کہ کتنی سادگی سے حشر برپا کر دیا تم نے“
اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا.....

”ارے نہیں چندا پریشان نہ ہو۔ زندگی میں یہ روز تو آتا ہی ہے۔“ رخسانہ نے اس کا گال تھپتھپا کر

کہا..... کب کھانا کھایا گیا کب عابدہ باجی کی رخصتی ہوئی وہ سارے فنکشن میں موجود رہ کر بھی گم صدم تھی۔

ایک ہی جملہ بارہ بار اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ ”نو..... نو مس اس راستے سے واپسی کی گنجائش نہیں

ہوتی۔ آپ جس سمت بھی مڑیں گی اس خاکسار کو اپنے سامنے پائیں گی۔“ اس کے کانوں کی لوئیں تپنے لگیں۔

رات گئے رخصتی ہوئی لیکن وہ رخصتی سے پہلے ہی ای جان کے لحاف میں گھس کر سونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

اگلے دن وہ ویسے میں نہیں جانا چاہتی تھی لیکن پھر ریحانہ مصنوعی رعب جماڑتے ہوئے اسے جانے پر مجبور کرنے لگی۔

سی گرین سوٹ پر ہلکا سا باریک موتیوں کا کام تھا جو اس نے ای جان کے اصرار پر پہن لیا۔ جو اس پر رنج

ماہنامہ پاک سوسائٹی 224 نومبر 2016

بھی رہا تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ..... کپلے بالوں کی خوب صورتی اس کے حسن کو دوبالا کیے دیتی تھی۔ عابدہ باجی کی سسرال پہنچ کر سب بہت خوش ہوئے وہ بہت پیاری لگ رہی تھیں، میک اپ والوں کی آمد پر خوشی، خوشی سب کے گلے مل رہی تھیں۔ دولہا بھائی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

ویسے کی تقریب ختم ہوئی تو رسم کے مطابق دلہن کو لے کر سب لوگ خوشی، خوشی گھر واپس آئے۔ ای جان نے واپسی کی اجازت صالحہ خالہ سے مانگی تو کہنے لگیں۔

”نہیں بھئی عائشہ آج ہی تو فارغ ہوئی ہوں تم سے تو کوئی مل بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کل تمہیں ملکوال بھجوا دیں گے۔“

اس رات پھر ایک بار محفل موسیقی سج گئی۔ یہ الوداعی محفل موسیقی تھی اس میں بہت سے چہرے اداس، اداس تھے۔

”جھوم، جھوم کے ناچو آج گاؤ خوشی کے گیت.....“ ذاکر اقبال پھر نغمہ سرا تھا۔ ”جب تم اکیلے

ہو گے ہم یاد آئیں گے.....“ اور پھر بہت سے گانوں کے بعد چائے کا دور چلا اور محفل اختتام کو پہنچی۔

☆☆☆

واپس گھر جانے کی اسے بہت خوشی ہوتی تھی، گھر سے دور وہ زیادہ دن نہیں رہتی تھی۔ آج بھی گھر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی وہی گولڈن فر کا کوٹ، وہی

پرسنائی لیکن اندر ہی اندر دل میں ایک اداسی کی لہر اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سارے خیالات یہیں جھٹک کر جانا

چاہتی تھی۔ لیکن کہیں کوئی گڑ بڑ تھی۔ وہ اپنے رب سے دعا کرنے لگی کہ خداوند، مجھ سے کبھی کوئی بھول نہ ہو۔

”اوہر آؤ میرے پاس بیٹھو اور میرے ساتھ ناشتا کرو۔ میں تو تم سے اداس ہو جاؤں گی تم اسی طرح کبھی

پنڈی آنا صدیقہ آتی رہتی ہے کبھی اس کے ساتھ آ جانا۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی میرے لیے تم ریحانہ کی

طرح ہو۔“ معروف خالہ نے اسے اپنے پاس بلایا۔ ”جی اچھا.....“ وہ مسکرا دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”نو، نومس اس راستے پر واپسی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ آپ جس طرف مڑیں گی خاکسار کو سامنے پائیں گی۔“ زندگی میں کوئی تبدیلی یقیناً آچکی تھی۔

بے شمار دن گزر گئے۔ ایک روز صدیقہ بھابی اپنے بچوں کے ہمراہ آئیں اور سارا دن یہیں پر گزارا..... انہوں نے امی جان سے چپکے، چپکے کوئی بات کی اور امی جان نے سوچنے کی مہلت مانگی۔ صدیقہ بھابی خوشی، خوشی گھر واپس چلی گئیں۔ گھر میں بڑوں کے درمیان کچھ کھسر پھسر ہونے لگی۔ اور ایک شام صغرا نے اسے بتایا کہ صدیقہ بھابی نے آپ کا رشتہ مانگا تھا۔ اپنے کسی بھائی کے لیے لیکن یہاں سے انکار ہو رہا ہے کیونکہ ذات برادری کو ایٹھنایا جا رہا ہے اور کوئی خاص وجہ نہیں..... بہر کیف نائلہ کو ابھی اتنی سمجھ نہیں تھی کہ جہاں کوئی پسند آجائے وہاں شادی ضروری سمجھی جاتی ہے۔

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے گھومتا رہا..... بے شمار دن گزر گئے۔ اسے آج بھی عابدہ باجی کی شادی کا منظر یاد آتا رہتا..... دو گھورتی ہوئی آنکھیں..... کاغذ پر لکھا ہوا وہ خوب صورت شعر جو اس نے یونہی سنبھال رکھا تھا اور سب سے زیادہ وہ خوب صورت آواز میں انتہائی خوب صورت گانا.....

بے رحم آسماں میری منزل بتا ہے کہاں یہ سب یادیں اسے ایک قیمتی سرمایہ لگتی تھیں۔ زندگی دھیرے، دھیرے گزر رہی تھی کہ ایک روز پھر صدیقہ بھابی اپنی فیملی کے ساتھ آن وارد ہوئیں لیکن ان کے ساتھ ایک نئی نویلی دلہن بھی آئی تھی۔ چھوٹا بھائی طارق بھی ہمراہ تھا۔

تب پھر پتا چلا کہ ذاکر اقبال نے اپنی دلہن کو بھیجا ہے تاکہ یہاں سب کو پتا چلے کہ کوئی کسی کے بغیر مرتا نہیں۔ بلکہ زندگی کی نئی شروعات ہو جاتی ہیں۔

امی جان نے خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی..... دلہن کو اور طارق کو سوٹ دے۔ طارق کی پانکشن کشش سے بھری ہوئی تھیں اس نے منہ سے بھر کشش

”بس امی جان اس سے زیادہ کی امید مت رکھیے..... جی اچھا کہہ کر محترمہ نے گویا بڑا معرکہ مارا ہے۔“ ریحانہ ابھی تک باز نہیں آئی تھی۔

سب گھر والوں نے اکٹھے بیٹھ کر الوداعی ناشتا کیا۔ سامنے والی چیئر پر ڈاکر برہمان تھا لیکن خاموش، خاموش صرف چائے کے سب لیتے ہوئے، چلتے سے سب نے نائلہ اور عائشہ آنٹی کو گلے لگایا۔ ریحانہ ایک دم سنجیدہ سی نظر آنے لگی۔ نائلہ کو گلے لگایا اور چپکے سے کہہ دیا۔

”نائلہ مجھ سے ڈاکر بھائی کا اداس چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے ان سے بہت پیار ہے۔“ اس نے نائلہ کا گال چوم لیا۔ نائلہ کی آنکھیں پانچوں سے بھر گئیں۔

اور یوں پھر وہ سب سے جدا ہو کر ملکوال روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

گھر پہنچنے ہی وہ بابا سے لپٹ گئی۔ بابا کے بغیر پہلی مرتبہ اتنے دن اس نے گھر سے باہر گزارے تھے۔ باجی اور بھائی بھی اداس تھے۔

”بھئی ہماری گڑیا لاہور کیا گئی کہ گھر کی رونقیں ہی کہیں کھو گئیں۔ اب کہیں مت جانا، ہم تمہارے بغیر اداس ہو جاتے ہیں۔“ بھائی جان نے کہا۔ شہلا باجی نے حسب عادت امی جان کے کندھے دبائے شروع کر دیے، صغرا نے چائے بنا کر سب کو پیش کی۔

نائلہ نے چیخ کیا اور چائے کا کپ لے کر بابا کے پہلو میں آ بیٹھی اور پھر بابا کو شادی کا آنکھوں دیکھا حال ستانے لگی۔ بابا بیٹھ اس کی باتیں سن کر خوش ہوتے تھے وہ سب کچھ سچ اور مکمل بتایا کرتی تھی لیکن آج وہ کچھ، کچھ حذف کرتی گئی، کچھ باتیں دانستہ گول کر گئی۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں، تعلیمی ادارے کھل گئے۔

زندگی اپنی روٹین پر آ گئی۔ وہ بھی پڑھائی میں مصروف ہو گئی لیکن اب پہلے والی مصروفیت میں کہیں کچھ تانک جھانک تھی..... بھئی کتاب پر دو آنکھیں گھورتی ہوئی نظر آتیں: ور کہیں ایک آواز بھیجا کرتی۔

پھریوں ہوا کہ آنا فنا شہلا کی بات سچی ہوئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بازار کے پھیرے جہیز کی خریداری..... درزیوں کے پھیرے.....

ای جان نے اپنی بھانجی نیلم کو بھی بلا لیا۔ نیلم کی شادی چار پانچ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ نیلم، شہلا سے بڑی تھی اور انتہائی سلیقہ مند لڑکی تھی..... اس نے خالہ کا بڑا بوجھ بانٹ لیا۔ اس نے شادی کے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے..... ماموں کی بیٹی ارم نے بھی کالج سے واپس آ کر عائشہ پھپھو کے گھر میں آنا شروع کر دیا وہ نائلہ کی بیسٹ فرینڈ بھی تھی دونوں مل کر گپ شب اور شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو کر بہت خوش تھیں۔

”بھئی نائلہ میں تو اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتی جب تک ساتھ میں میوزک نہ لگا ہو۔“ ارم نے دوپٹے کے کناروں پر گونگا لگاتے ہوئے کہا۔

نائلہ نے جھٹ سے شیپ ریکارڈر آن کر دیا..... آڈیو کیسٹ پر طلعت محمود کی آواز گونج اٹھی۔ بے رحم آنسماں ارم نے ایک دم سوئی دھاگا اور دوپٹا ایک طرف رکھ دیا۔

”نیلی یار یہ گانا تم نے کہاں سے لیا۔ بھئی میں نے زندگی میں ایک بار سنا تھا پھر دوبارہ ہزار کوشش کے باوجود یہ کہیں سے ملا نہیں؟“

”بھئی ارم یہ بہت قیمتی گانا ہے اور ہر کسی کو سننے کو نہیں ملتا..... مابدولت کو اس گانے سے عشق ہے ہم جس روز نہ سنیں ہمیں بھوک لگتی ہے، نہ نیند آتی ہے اور نہ ہی کوئی کام کر سکتے ہیں۔“

”ارے، ارے..... ذرا میری طرف دیکھو..... ادھر رخ موڑو نیلی یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ نائلہ نے رخ موڑے بغیر سوئی میں دھاگا ڈالنا شروع کر دیا..... لیکن دھاگا ڈالنا محض ایک بہانہ لگا ارم کو..... اس نے فوراً اٹھ کر دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اور نیلی کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور پھر اس کا دل دیک سے رہ گیا۔ نیلی کی آنکھیں برسات کا سماں پیش نظر ہی نہیں۔

نائلہ کی مٹی میں دیتے ہوئے کہا۔

”بھئی ریحانہ باجی نے آپ کا نام ”مٹی“ کا مادھو“ ایویں ہی رکھ دیا تھا ہم تو آپ کو ”انارکلی“ کا نام دیتے ہیں۔“ کمرے میں موجود سب لوگ ہنس دیے تو طارق نردس ہو گیا اور فوراً بولا۔ ”نہیں مگر میں تو بھائی ہوں آپ کا۔“

”کوئی بات نہیں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... بہن کو انارکلی کہہ لینے میں کوئی حرج تو نہیں لیکن سچ میں، میں انارکلی نہیں مٹی کا مادھو“ ہوں.....“ اور پھر سب لوگ ہنسنے لگے۔

وہ دن بھی گزر گیا..... ذاکر اقبال کی بیگم اپنے درشن کرا کے چلی گئیں۔ نائلہ کو قطعی جیسی قیل نہیں ہوئی۔

☆☆☆

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی، نائلہ جب بھی اکیلی بیٹھتی تو ایک ہی آواز اس کا پیچھا کرتی..... ”جب تم اکیلے ہو گے ہم یاد آئیں گے“ اس نے بار بار ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن ول کے کسی نہاں خانے میں چپکے چپکے کوئی آن بسا تھا۔

نہ جانے کب اور کیسے دے پاؤں وہ کوئی آہٹ کیے بغیر زندگی میں شامل ہو چکا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا۔ ”نو، نو مس اس راستے سے واپسی ممکن نہیں، آپ جس سمت بھی مڑیں گی اس خاکسار کو اپنی راہ گزر میں پائیں گی۔“ وہ خاصی ڈسٹرب تھی۔ کیونکہ اس سے رابطہ کرنا فضول تھا اس کی زندگی میں کوئی اور آچکا تھا اور اسے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ ذاکر سے رابطہ کر کے اس کی بیوی کے لیے تکلیف کا باعث بنتی۔

شہلا نے ماسٹر کر لیا تو رشتے آنے شروع ہو گئے۔ گھر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی مہمان آیا رہتا..... کہیں نائلہ کو ای جان کے ساتھ جانا پڑا..... کبھی ابو اور ای دونوں چلے جاتے اور پھر جہاں اللہ کو منظور تھا وہاں شہلا کے لیے ہاں کر دی گئی۔ علی رضا سرگودھا یونیورسٹی میں لیکچرار تھا۔ اونچا لیاقد، خوب صورت نمون نقش سب سے بڑھ کر یہ کہ انتہائی مہذب لوگ۔ اور

”ارے نگلی ایسا کچھ بھی نہیں، تمہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔“

”تمہیں اگر سچ نہیں بولنا تو جھوٹ بولنے کا طریقہ تو سیکھ لو..... مجھے تم کیسے بے وقوف بنا سکتی ہو، تم سے دو تین سال بڑی ہوں۔“ ارم نے اس کا گال چھو کر کہا۔ وہ خاموش ہو گئی اور بے شمار ساتیں اس خاموشی کی نذر ہو گئیں۔

”چلو اب بکو بھی..... ورنہ.....“ اس نے چائے کا سب لیتے ہوئے کہا۔

”دراصل ارم میرا تو خیال ہے کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس شاید مجھے ہی غلط فہمی ہوئی یا واقعی وہ مجھے پسند کرتا تھا۔“ اس نے بڑے اداس لہجے میں کہا اور پھر اس نے عابدہ باجی کی شادی والا چند روزہ قصہ بتا ڈالا۔ عابدہ باجی کی فیملی اور حمید صاحب کی فیملی کے تعلقات کئی دہائیوں سے بڑے مضبوط چلے آ رہے تھے اس بات کا علم سارے خاندان کو تھا۔ نائلہ نے مڑا مڑا کاغذ جس پر وہ شعر درج تھا الماری سے نکال کر ارم کو دکھایا۔ ارم نے کاغذ پر لکھا شعر پڑھا۔

”اوہو میری جان تم واقعی میں بہت بھونی ہو، تمہارا نام ریحانہ نے مٹی کا ناؤ صبح رکھا تھا۔“ اس نے نائلہ کے گال پر پیار کر لیا۔ ”پاگل لڑکی یہ کیا عشق کی ڈگری الماری میں سنبھالے بیٹھی ہو۔“ بھئی رات گئی بات گئی اور جب اس نے شادی بھی کر لی ہے تو تم اس سوغات کے ٹکڑے کر کے چولہے میں جھونک دو۔“

”نہیں ارم اس نے سچ کہا تھا کہ اس راتے پر چل پڑنے سے دلچسپی کے سارے راتے بند ہو جاتے ہیں۔ میں جدھر کارخ کرتی ہوں وہ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔“

”نیلی مزید بکو اس مت کرنا۔“ وہ غصے میں لال پیلی ہو گئی۔ ”کچھ عقل کے ناخن تو تمہیں ان خازنوں پر ڈال کر وہ خود ہی نویلی دلہن کے ساتھ رنگ لیاں منارہا ہے اور تم اس کی شاعری کا ماتم کر رہی ہو، بھول جاؤ یہ سب کچھ ورنہ میں پھپھا جان سے کہہ دوں گی وہ تمہاری خیر نہیں ہے۔“

”یہ کیا میری جان..... تم نے مجھے کچھ بتایا کیوں نہیں؟ کیا بات ہے سچ سچ بتا دو۔“

اور پھر اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور سسک پڑی۔ ارم کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

”بیٹھو یہاں مجھے بتاؤ تمہیں کس نے رلایا ہے، میں اسے کالر سے پکڑ کر تمہارے قدموں میں نہ لاؤں تو میرا نام بدل دیتا۔“

”نہیں، نہیں ارم ایسا کچھ بھی نہیں ہے، میرا تو شہلا باجی کی جدائی کا سوچ کر دل بھر آیا ہے۔“ وہ بہانے کرنے لگی۔

لیکن ارم کو تسلی نہیں ہوئی اتنے میں ابو اور وقار بھائی گھر میں داخل ہوئے۔ برتنوں کے کاشن اور زیورات کے ڈبے لاؤنج میں لا کر رکھے.... ای اور شہلا باجی ابھی بازار میں تھیں۔ وقار بھائی نے شہلا کو زیورات پکڑائے اور خود کرسی پر بیٹھ کر پانی طلب کیا۔ ابو باہر مزدور کو اجرت دینے چلے گئے۔ اور ملازمہ نے جلدی سے چولہے پر چائے چڑھا دی۔

نائلہ واش روم سے باہر نکلی تو آنکھوں اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے ہوئے تھے تو لیا لے کر چہرے کو تھپتھپانے لگی۔ اتنے میں نیل پر چائے آگئی اور سب مل کر چائے پینے لگے۔

☆☆☆

کام کا رٹ تھا اور ارم کو دوبارہ نائلہ سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا لیکن اسے یہ بات ہضم کرنی بھی مشکل لگ رہی تھی۔

آخر کار موقع مل ہی گیا۔ ارم رات کو نائلہ کے کمرے میں ہی سوئی تھی۔ اس رات وہ چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھے کمرے میں داخل ہوئی۔

”اشو میری جان یہ کڑک چائے لو اور آج اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھو، آخر کون ظالم اس میں چھپا بیٹھا ہے ذرا میں بھی تو دیکھوں۔“ نیلی مسکرا دی۔

”ایسا کچھ مت کرنا ارم..... اس سے شادی کا تو اس کی طرز واری کرتی۔“ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔“

”واہ میری بنو واہ..... وہ تو شادی کر کے تیری دنیا سے بھاگ نکلا تو کیا ان دیواروں سے محبت کر رہی ہے؟“ ارم آسانی سے ٹٹنے والی نہیں تھی۔ لہذا نیلی نے سواری کہہ دیا اور بات وہیں ختم کر دی۔

شادی کی تیاریوں اور بھاگ دوڑ میں سب مصروف تھے اس لیے ارم نے دوبارہ نیلی سے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شہلا کی شادی قریب آگئی۔ کارڈ بانٹ دیے گئے سارا دن ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہتی۔ ساتھ والے پلاٹ کی صفائی ستھرائی کر کے اسے بارات کے لیے تیار کر دیا گیا۔

شہلا اور حسن بھائی ملکوال میں ہی رہتے تھے ان کے ہاں بھی کارڈ بھجوا دیا گیا۔ شہلا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ حمید صاحب نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا۔ حسن بھائی کی فیملی تو شادی میں شریک ہوئی لیکن لاہور سے صالحہ خالہ کے گھر سے کوئی نہ آسکا۔

شہلا رخصت ہوئی تو گھر میں گویا اداسی نے ڈیرے ڈال لیے۔ ای کی شہلا سے زیادہ دوستی تھی وہ تو بے حد اداس رہنے لگی تھیں نائلہ بھی بالکل اکیلی ہو گئی تھی گھر سے کالج اور کالج سے گھر..... وقار بھائی ایم بی بی ایس کے چوتھے سال میں تھے۔ لاہور میں ہی تھے۔ البتہ شام کو گھر میں ہوتے۔

☆ ☆ ☆

ماحول میں اچھی خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ شہلا باجی نے تعلیمی مصروفیات کے باوجود پورے گھر کو سنبھالا ہوا تھا۔ ای جان کو کسی کام کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب کافی وقت پیش آرہی تھی۔ نائلہ تو گھر داری میں زیر نعتی۔ ای اکثر اسے ڈانٹا کرتی تھیں کہ ”کبھی تو بھی کام کاج میں دلچسپی لیا کر..... شہلا اپنے گھر چلی گئی تو پھر دیکھنا کہ تیرا کیا حشر ہوگا۔“ نائلہ کو جب بھی ڈانٹ پڑتی وہ شہلا کے پہلو میں بناہ لیتی اور شہلا ہمیشہ

تھیں کہیں آس پاس ہے۔

”ارے بھی رونا مت..... ہم اگر نہ آسکے تو ہو سکتا ہے تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے لے جائیں.....“
شہلانے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا..... شہلا کا کہنا اور نائلہ کا سننا دو الگ، الگ ذہن تھے کچھ سمجھ نہ آسکی..... لیکن شہلانے جو بات کہہ دی وہ معنی خیز تھی۔

”نہیں شہلا باقی میں ہمیشہ اپنے ابو کے پاس رہوں گی یہی میری جنت ہے، جنت کو کیسے چھوڑوں؟“

شہلا چلی گئی تو گھر پھر ایک بار بے رونق ہو گیا۔ اداسیاں ہر سو چھا گئیں اور نائلہ کے اندر تو ویسے بھی سناٹوں کا راج تھا۔ اسے ہر چیز تنہا اور اداس نظر آتی۔

امی جان بھی اکثر بیمار رہنے لگی تھیں اور وہی خاموش قاتل بلڈ پریشر، شوگر اور نہ جانے کیا تھا..... ادھر سے نائلہ کے بارے میں فکرمند کہہ کر انہیں اوپر سے بلا دیا جاتا ہے تو نائلہ کا کیا بنے گا؟

☆☆☆

ارم آج صبح ہی نئی کوٹنے آگئی تھی۔

”بھئی آج تو بابدولت کا ارادہ پورا دن پھپھو جان کے ساتھ گزارنے کا ہے، پھپھو جان بیمار ہیں یہ سن کر تو میری جان ہی کل گئی اللہ نہ کرے کہ پھپھو جان کو کچھ ہو۔ تم نے مجھے فون ہی کر دینا تھا ظالم لڑکی.....“

”میں کیا بتاتی نیلم! امی جان اپنی تکلیف خود کب ظاہر ہونے دیتی ہیں۔ ابو کو بھی اسی بات پر غصہ آتا ہے، یہ اس وقت آرام کرتی ہیں جب بیماری انہیں نڈھال کر کے بستر پر گرا دیتی ہے۔ ہزار بار سلام کہا۔ امی جان خدا کے لیے اپنی تکلیف بروقت بتا دیا کریں لیکن مجال ہے جو تو کبھی ان پر اثر ہوا ہو۔“

”بھئی میرے متعلق کیا لیکچر دیا جا رہا ہے۔“ امی جان سرخ غلاف میں لپٹا ہوا قرآن پاک سینے سے لگائے آہستہ، آہستہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

”لائیں امی جان میں اسے رکھ دیتی ہوں۔“ نئی نے بڑے احترام سے قرآن پاک اس کی جگہ پر رکھا اور واپس آکر ماں کے کندھے دبائے لگی۔

”جب تم اکیلے ہو گے ہم یاوائیں گے۔“ وہ بہت اداس ہو جاتی..... اور اکثر سوچا کرتی کہ میں نے کس محبت کو کیلجے سے لگا رکھا ہے۔ وہ بندہ کہ جس نے مڑ کر بھی دیکھا بھی نہیں۔ وہ ہزار بار اس کے خیالات کو جھٹلانے کی کوشش کرتی..... اسے بھول جانا چاہتی لیکن جب دل میں جھانکتی تو اس غیر آباؤ گھر میں وہ اپنے قدم جمائے نظر آتا۔ ”لو، لومس جو اس راتے پر چل پڑتا ہے اسے داہسی کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ آپ بھی جس طرف رخ موڑیں گی اس خاکسار کو اپنے سامنے پائیں گی۔“

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے گھومتا رہتا ہے کون آگے نکل گیا کوئی پیچھے رہ گیا۔ اسے کسی سے کچھ غرض نہیں۔

شہلا اپنے گھر میں خوش تھی اس نے سسرال جاتے ہی سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ باہل کے گھر میں کبھی گئی سلیقہ شعاری نے زندگی میں چار چاند لگا دیے تھے وہ بہت کم ملکوال آتی تھی۔ یہ نہیں کہہ سیکے آئے کہ اس کا دل نہیں کرتا تھا بلکہ وہ بہت مجھدار تھی اور جانتی تھی کہ سسرال میں امتحان پاس کرنے کے لیے میکے کی محبتوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر پاؤں جمتے ہیں اور گھر آباد ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کافی عرصے بعد اس کا ملکوال کا چکر لگا۔ نائلہ خوشی سے پھولے نہیں سارے تھی بہن اور بہنوئی کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔ وقار بھی لاہور سے آیا ہوا تھا گھر میں رونق لگی ہوئی تھی... مزے، مزے کے پکوان بن رہے تھے، میر سپاٹے ہو رہے تھے..... چار دن بعد اچانک شہلا نے واپسی کا اعلان کر دیا..... نائلہ ایک دم بچھسی گئی۔

”علی بھائی چند روز اور رک جاتے تو کیا تھا ابھی شہلا باقی سے میں نے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔“
”نہیں چند انہیں بڑی مشکل سے اتنی چھٹی ملی ہے ہم پھر آجائیں گے۔“

”جو یہ کہتا ہے کہ ہم دوبارہ آئیں گے وہ پھر کبھی نہیں آتا۔“ نائلہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

لگالیا۔ نیلی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ارم نے اسے رونے دیا خوب سارا رونے کے بعد ارم نے اسے اپنے سے الگ کیا اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

”میری پیاری بہن تم نے یہ کیا روگ پال لیا ہے محبت و محبت سب بکو اس ہے، محبت صرف والدین کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے اور بس.....“ اس نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

”آج کے بعد تم نے اس برے آدمی کے لیے ایک آنسو بھی نہیں بہانا..... یہ سمجھ لو کہ تم نے ایک خواب دیکھا تھا اور ذرا کر نام کا کوئی بندہ اس دنیا میں نہیں۔“ نیلی خاموش رہی۔

دوپہر کا کھانا دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھایا۔ وہ بہانے، بہانے سے نیلی کو سمجھا رہی تھی۔ نیلی خاموشی سے سب سن رہی تھی۔

☆☆☆

گلے روز شہلا کا فون آ گیا وہ ای جان سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی امی بھی حسبِ عادت بڑی دھیمی آواز میں مجھ گنگتھیں۔

نانکھ سحن میں قطار در قطار گلے گلوں میں پانی دے رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پودوں کے نرم پتوں کو بڑی محبت سے دھور رہی تھی۔

کل ارم کے گلے لگ کر رونے سے دل کا بوجھ ذرا سا ہلکا ہوا تھا لیکن ان محبتوں کو جو دے پاؤں اس کی زندگی میں داخل ہو چکی تھیں انہیں نظر انداز کرنا بڑے جوکھوں کا کام تھا۔

”سنو نیلی..... بیٹا میرے بالوں میں ہلکا سا تیل لگا کر گنگھا کر دو۔“ ای جان جا نمازہ کرتے ہوئے نانکھ سے گویا ہوئیں۔

”جی ای جان ابھی لیجیے۔“ اس نے سارے کام چھوڑ دیے اور ماں کی طرف بڑھ گئی اور ای جان کے بال سلجھانے لگی..... تھوڑی دیر بعد ای اس سے مخاطب ہوئیں۔

”پھو جان آپ دوسروں کا اتنا خیال رکھتی ہیں اور اپنا کیوں نہیں؟“ ارم بھی بیڈ پر بیٹھ کر پاؤں دبانے لگی۔

”بیٹا تم سے کس نے کہا کہ میں اپنا خیال نہیں رکھتی، ویسے فکر دالی کوئی بات نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”خاک ٹھیک ہیں، آج میں ابو سے بات کروں گی کتنا پیلا رنگ ہو رہا ہے۔“ پھو نے ارم کو ساتھ لگا کر ماتھا چوم لیا۔

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں تم اور نیلی جاؤ کمرے میں گپ شپ لگاؤ اور میرے اوپر ایک پتلی دلائی ڈال دو، میں تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔“

ارم نے جلدی سے پاس رکھی دلائی پھو پر ڈال دی۔ ان کے ماتھے کا بوسہ لیا اور پھر کمرے کا دروازہ ادھ کھلا چھوڑ کر نیلی کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔

”بے رحم آسمان میری منزل بتا ہے کہاں.....“ ریکارڈ پلیئر کی دھیمی سی آواز کمرے کی فضا کو سوگوار بنائے ہوئے تھی۔

”بھئی تیری اس بے رحم آسمان سے کب جان چھوٹے گی..... نہیں تو میں آج چھڑوا دوں۔“ اس نے ٹھک سے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا اور آڈیو کیسٹ نکال لی۔ نانکھ کو یوں لگا جیسے بجلی کا کرنٹ چھنوا گیا ہو۔

”ارم ایسا مت کرنا، بخدا میں مر جاؤں گی، مجھے یہ واپس لوٹا دو۔“

”پاگل ہو کیا؟ کس سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو، کہاں ہے وہ ظالم انسان میرے سامنے آئے تو اس کا منہ نوج لوں، اس بد بخت کو شرم نہیں کہ چند لفظوں کے ہیر پھیر سے اس نے ایک معصوم لڑکی کا رخ تباہی کی طرف موڑ دیا ہے۔ میں آج پھپھا جان سے بات کر کے ہی جاؤں گی کہ ذرا بیٹی پر غور کریں۔“

”نہیں ارم تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گی۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”تم سمجھ نہیں سکتیں ہو کہ میں کس کیفیت سے گزر رہی ہوں۔“ اس کی آنکھیں اٹنی پڑتی تھیں کہ ارم کو ترس آ گیا اس نے اسے گلے سے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

میں لے کر کہا۔
 ”میرا رب میرے بچوں کے ساتھ، ساتھ پوری
 دنیا کے بچوں کی جان کو سلامت رکھے، آمین۔“
 ”اور میرا رب پوری دنیا کے والدین کو ہمیشہ
 سلامت رکھے، آمین۔“
 پھر دونوں ماں، بیٹی بڑا معصوم سا قبہ لگا کر ہنس
 پڑیں تو فضا خوشگوار لگنے لگی۔

☆☆☆

وقار ہاؤس جا ب کر رہا تھا اور لاہور سے ہر ماہ
 نہیں آسکتا تھا۔
 اب کسی دوست کے ساتھ پارٹنرشپ پرنٹسنگ کمپنی کا
 کام کرتے تھے۔ دونوں فریق بچپن کے دوست تھے
 اور بڑی ایمانداری سے تیس سال سے ایک کمپنی کو
 چلا رہے تھے کبھی کوئی ٹینشن نہیں ہوتی تھی۔
 دونوں فیملیوں میں بڑی محبت تھی ایک دوسرے
 کے گھر آنا جانا ہوتا تھا۔ حیدر صاحب کی بڑی بیٹی میڈیکل
 میں تھی بڑی پیاری اور ذہین بچی تھی، کشف نام تھا اور حیدر
 صاحب نے بچپن میں ہی اس پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔
 ”بھابی جان کشف میری بیٹی ہے اور وقار آپ کا
 بیٹا..... میرا خیال ہے مزید کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں
 پڑے گی۔ یہ آپ کے پاس میری امانت ہے۔“ بیس
 سال پہلے کی بات بھائی جا رہی تھی۔

آئے دن حیدر صاحب کچھ نہ کچھ کشف کے لیے
 بھجواتے رہتے تھے۔ شہلا اور نائلہ کے کپڑوں کے
 ساتھ ہی کشف کے کپڑے بنتے تھے۔ گھر میں آنے
 والی ہر چیز میں کشف کا حصہ موجود ہوتا۔ حیدر صاحب کی
 چار بیٹیاں ہی تھیں ورنہ نائلہ کے لیے اتنا سوچنا نہ پڑتا۔
 وقت کی چرخی اپنی رفتار سے گھومتی جا رہی تھی۔ آن
 کی آن میں نائلہ کے لیے رشتہ آیا جو دو پار کے رشتے دار
 ہی نکل آئے تھے۔ ای نے حیدر صاحب کے گوش گزار کیا
 اور رشتے والوں کو گھر آنے کا عندیہ دے دیا گیا..... گھر
 میں ناقاعدہ و عورت کا اہتمام کیا گیا۔ ارم کو بھی بلا لیا گیا
 تھا۔ اس نے نائلہ کو زبردستی تیار کر دیا۔

”نائلہ میری بچی تھی تو پتا ہے میں بیمار رہتی ہوں
 کچھ پتا نہیں کب بلاوا آجائے، میں چاہتی ہوں میری
 زندگی میں تو اپنے گھر کی ہو جائے۔“
 ”اللہ نہ کرنے کہ آپ کو کچھ ہو، ایسا کچھ نہیں ہوگا
 انشاء اللہ اور دوسری بات یہ کہ آپ کس گھر کی بات
 کرتی ہیں، میری جنت تو یہ گھر ہے اور اس لیے میں
 کہیں نہیں جا رہی۔ مجھے ہمیشہ یہی رہنا ہے۔“ اس کی
 آنکھیں بھرا آئیں۔

”نہیں بیٹا، بیٹیاں تو پرانی امانت ہوتی ہیں ان
 کے گھر کہیں اور ہوتے ہیں جیسے میں کراچی سے بیاہ کر
 یہاں بلکوال آگئی اور شہلا یہاں سے سرگودھا چلی گئی۔“
 ای جان اداس لہجے میں گویا ہوئیں۔

”لیکن کیا والدین کا گھر چھوڑنے والی آپ
 دونوں کا نہیں ہیں؟“ وہ عجیب بات کر رہی تھی۔
 ”نہیں بیٹا، ہم دونیں پوری کائنات میں ایسا ہی
 ہوتا آیا ہے، ہمارے نبی پاک کی بیٹی بھی اپنے باپ
 کے گھر سے وداع ہو کر دوسرے گھر چلی گئی تھیں تو ہم
 گناہ گار کیا چیز ہیں؟ ہم والدین ہیں ہمارا یہ فرض ہے
 کہ اپنی زندگی میں ہی اپنی بچیوں کو عزت و آبرو سے
 اس پاکیزہ بندھن میں باندھ دیں..... اللہ تبارک و
 تعالیٰ ہر ایک کی اولاد کے نصیب اچھے کرے..... اور
 سب کو اس فرض سے سبکدوش ہونے کی توفیق
 دے، آمین۔“

نائلہ کی آنکھیں بھرا آئیں اس کے پاس کوئی دلیل
 نہیں تھی۔ اس نے ای کے بالوں میں برش کیا اور پھر
 چٹیا بنا دی.....

”آپ کو چائے بنا دوں؟“ اس نے ماں کے
 گال پر بوسہ دیا۔
 ”واہ جی نیکی اور پوچھ پوچھ.....“ ای نے
 ماحول کو غناک دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسنے کی کوشش کی۔
 ”ارے بھئی آپ کے قدموں میں تو ہم اپنی
 جان بھی قربان کر دیں، یہ چائے کیا چیز ہے؟“ نیکی
 نے بڑی محبت سے ماں کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے

بڑا مچر تپاک استقبال کیا گیا..... بڑی خاطر
مدارت ہوئی، عامر بھی دل کو بھلا لگا۔

”عامر دینی میں ہوتا ہے اور چھٹی پر پاکستان آیا
ہوا ہے۔“ امام صاحب نے بتایا تھا۔

امام دین کی بڑی بہو اور بیٹی مہمانوں کے آگے
بچھی جا رہی تھیں۔ عائشہ اور ثریا دونوں ہی اس فیملی
سے متاثر تھیں۔

یہ بڑی عجیب منطق ہے کہ شادی سے پہلے تک تو
دونوں طرف سے محبتوں کی بارش ہوتی ہے..... لیکن
شادی کے بعد طبع اترنا شروع ہو جاتا ہے۔ شادی
ہونے تک کبھی اصلیت ظاہر نہیں ہوتی چاہے آپ دس
سال تک منگنی قائم رکھیں۔

دونوں طرف سے پسندیدگی کی سند مل گئی اور
یوں بڑی سادگی سے منگنی کی رسم ادا کر دی گئی اور فیصلہ
یہ ہوا کہ چھ ماہ بعد دقار اور بنا تلہ کی شادی ایک ساتھ کر
دی جائے۔ کشف کی باقی پڑھائی سسرال میں رہ کر مکمل
ہو جائے گی۔

☆☆☆

”نیلی، نیلی..... اسے میرا بیٹا کہاں ہے بھی،
چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی ہے۔“ حمید صاحب
ہاتھ میں تازہ اخبار لیے گھر میں داخل ہوئے۔
اور وہ دنیا جہاں سے بے خبر اپنے بیڈ پر لیٹی گاٹا
سُن رہی تھی۔

”بے رحم آسمان.....“ آنکھوں سے ننھے قطرے
نرم تکیے میں جذب ہوتے جا رہے تھے اور کمرے
میں نیم تار کی گئی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ابو کمرے
میں چلے آئے۔

”واہ جی واہ ان اندھیروں میں کیا ہو رہا ہے،
لائٹ جلا لیں میڈم، ہم آپ کے ہاتھ کی چائے کے
طلبگار ہیں۔“ بابا جان نے سوچ آج کیا اور کمراروشنی
میں نہا گیا۔

”آئیے بابا جان تشریف رکھیں۔“ نائلہ ایک دم

ای جان نے اماں صفراں سے کہہ کر نائلہ کو
مہمانوں کے سامنے بلوایا۔

وہ مکمل خاموش تھی اس کے گال تپ رہے تھے۔
وہ سر پر دوپٹا اوڑھے چپ چاپ ڈرائنگ روم
میں آگئی۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ ہماری بیٹی تو بہت پیاری
ہے۔ ایک بزرگ خاتون اپنی جگہ سے اٹھیں اور نیکی کو
گلے لگا کر پیار کیا اور پھر اپنے ساتھ جگہ دی۔

”بھئی حمید صاحب ہمیں اپنی منزل نظر آگئی۔
ہماری بیٹی اگر ہمارے نصیب میں ہے تو کچھو کہ ہمارے
بھاگ جاگ گئے۔“ امام دین صاحب نے اٹھ کر نائلہ
کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بھئی اتنی بھی کیا جلدی ہے امام صاحب ابھی تو
چند گھنٹے کی ملاقات ہے آپ بھی سوچیں اور ہمیں بھی موقع
دیں۔ دیکھیں جو اللہ کو منظور ہو۔“ حمید صاحب بولے۔

”حمید صاحب ہم تو سوچ چکے آپ بھی ہمیں
شرف و باریابی بخشیں.....“

”چلیے جی کھانا لگ گیا ہے۔“ عائشہ بیگم نے آکر
اطلاع دی اور سب ڈرائنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔

کھانا بہت اچھے ماحول میں کھایا گیا۔ حمید
صاحب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر مہمان
رخصت ہوئے۔ ارم ابھی تک صفراں کے ساتھ ہاتھ
بٹاری تھی۔ ای، ابو دونوں جاوڑہ خیالات کر رہے تھے۔

نیلی اپنے کمرے میں جا کر بستر پر وراز ہو گئی اور
آنکھیں بند کر لیں۔

”نو، نو مس اس راستے پر واپسی کی گنجائش
نہیں رہتی۔ آپ جس طرف مڑیں گی اس خاکسار کو
سامنے پائیں گی۔“ اس ایک جملے کی بازگشت اسے
مسلسل بے چین کیے دے رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے ہفتے حمید صاحب، عائشہ بیگم اور ثریا
خانم (ارم کی والدہ) کو ساتھ لے کر لڑکے والوں کے
گھر گئے۔

پلک جھپکتے چہ ماہ گزر گئے۔ شادی کی تیاریاں زور شور پر تھیں۔ دو، دو شادیاں تھیں وقار بھی ہاؤس جاب مکمل کر چکا تھا۔ شہلا بھی سسرال سے لمبی پھٹی لے کر آئی تھی۔

شادی کا دن آگیا اور کشف، حمید صاحب کے آنگن میں بہار بن کر اتری..... اور ناکہ زمانے بھر کی اداسیاں بخش کر پیادیس سدھا رہ گئی۔

زندگی اسی کا نام ہے اور دنیا میں ازل سے یہی پھر کی گھوم رہی ہے۔ حسب دستور شروع کے دن بڑے خواب ناک سے گزر رہے تھے۔ وقار اور کشف کی جوڑی تو گویا آسمانوں سے اتری تھی، ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ ہنی مون کوئی الحال موخر کر دیا گیا تھا کیونکہ کشف کا ایم بی بی ایس کا آخری سال چل رہا تھا۔ صرف چھ مہینے کی بات تھی۔ فائنل کے بعد لمبے چوڑے پرد گرام تھے۔

ادھر ناکہ پوری طرح کپڑوں کی کوششوں میں مصروف تھی۔ عامر نے پہلے دن ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ ”مجھے خواہ مخواہ کی دوستیاں پسند نہیں ہیں لہذا لڑکیوں کا زیادہ آنا جانا مناسب نہیں لگتا۔ اپنے بالوں کی سٹیٹنگ کو درست کرو..... چھپا بنانے کی عادت ڈالو، میک اپ تو ایک طرف خالی لب اسٹیک بھی پسند نہیں۔“ ناکہ نظر اس جھکائے میاں صاحب کے لپکھرتا کرتی۔ دل میں اک عجیب سی لہر اٹھتی۔ نظروں کے سامنے نہ جانے کیا گھوم جاتا، کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

”عامر جب تک پاکستان میں ہے تمہیں زیادہ میسجے جانے کی ضرورت نہیں، وہ واپس چلا جائے گا تو پھر ماں کے گھر چلی جایا کرتا.....“ ساسو ماں کا حکم تھا۔ ”جی اچھا.....“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں بولتی تھی۔ عامر کسی قسم کا جھگڑا تو نہیں کرتا تھا لیکن ناکہ کی زندگی کے سارے فیصلے اس نے ماں کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔

ناکہ نے محسوس کیا تھا کہ اس کی شادی کر کے ابو سے بڑا لگتا ہے کاسودا کیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر

ماہنامہ پاکیزہ 233 نومبر 2016ء

اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں..... نصیب دشمنیاں ہماری ننھی سی لڑکیاں اس قدر اداس کیوں ہے، بابا نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا تو آنکھیں برسنے لگیں۔

”ارے، ارے بھئی، ہم یہ ساون بھادوں نہیں دیکھ سکیں گے۔“ اور ننلی اپنے باپ کے سینے سے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

”ننلی..... میرا بیٹا کچھ بتاؤ آخر کیا وجہ ہے رونے کی؟“ انہوں نے بیٹی کا ماتھا چوم لیا اور پشت سہلانے لگے۔

”بابا جان آپ کے پاس میرے لیے دو وقت کا کھانا نہیں ہے کیا؟ میں نے بھی آپ کا دل دکھایا، آپ سے بغیر ضرورت کے کوئی ڈیماٹک کی؟ سمجھی اوہی آواز میں آپ سے سوال جواب کیا؟ پھر آخر کیوں آپ مجھے اس گھر میں رکھنا نہیں چاہتے؟ آخر میرا قصور کیا ہے؟ مجھے شادی نہیں کرنی، میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔“ بابا کی آنکھیں بھی پانیوں سے بھر گئیں۔ ننلی کو اپنے سے الگ کیا اس کے آنسو صاف کیے۔ چہرے سے بال ہٹائے۔

”میری پاگل بیٹی..... بہت پاگل ہو، کیا تمہارا کھانا ہم پر بھاری ہے بیٹا، یہی ازل سے ہوتا آیا ہے، بیٹیاں والدین کے گھر میں کسی کی امانت ہوتی ہیں تم امام دین صاحب کی امانت جو ان کی بیٹی ہو، حیدر علی کے گھر میں میری بیٹی پل رہی ہے وہ ہماری امانت ہے۔ اسی طرح ہوتا آیا ہے۔ چلو اب کبھی مت رونا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔ تم کون سا کسی دوسرے شہر جا رہی ہو، تمہارا جب دل چاہے چلی آنا۔ ہم سے دوری صرف ایک فون کال پر ہوگی، دل چھوٹا نہیں کرتے اٹھو پانی کے چھینٹے لو اور چائے بنا کر امی کے کمرے میں لے آؤ۔“ ننلی داش روم کی طرف گئی تو حمید صاحب آنکھیں پونچھتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔



☆☆☆

نانکھ کی شادی کو چار مہینے ہو گئے تھے ان چار ماہ میں اس نے تین چکر لگائے تھے فون پر جب بھی بات ہوتی وہ خود ہی کہتی۔

”ای جان میں بہت خوش ہوں یقین کریں۔ یہاں دل اتنا لگ گیا ہے کہ اب کہیں آنے جانے کو نہیں کرتا۔“

”بیٹا ہم کوئی اور نہیں ہیں۔ تمہارے والدین ہیں، اس گھر سے تمہیں بڑا پیار تھا، اپنے باپ سے بے پناہ محبت تھی پھر دل کیوں نہیں کرتا ہمارے پاس آنے کو؟“

”ای جان اب اپنے گھر میں دل لگانا بری بات تو نہیں ناں..... آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی جو شادی سے دوڑ بھاگتی تھی اب اس کا اپنے گھر میں دل لگ گیا ہے۔“

”شکر یہ بیٹا، شکر یہ ادا کرتی ہوں تمہارا کہ تم نے شکایت کا موقع نہیں دیا ورنہ میں ڈرتی تھی کہ باپ کا ہاتھ تھام کر ہونے والی لڑکی نے سسرال میں نہ جانے کیسے خود کو اینڈ جسٹ کیا ہوگا۔“ عائشہ بیگم کوشش کے باوجود خود کو مطمئن نہیں کر رہی تھیں۔ اندر ہی اندر دل میں کچھ پھانس ہی گڑبگڑ تھی لیکن انہوں نے کسی سے بھی اس اندیشے کا ذکر نہیں کیا بلکہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھیں کہ میرے مولا جو میں چھین سی محسوس کر رہی ہوں، کاش یہ میرا وہم ہو.....

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ماں جو اپنی اولاد کی تخلیق اپنے وجود کے اندر کرتی ہے اور اس پھول کی آبیاری اپنے خون سے کرتی ہے اور جب وہ وجود اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو پھر اپنی راتوں کی نیندیں اور دن کا آرام اس کی پرورش پر قربان کرتی ہے۔

اور پھر خدا نخواستہ اگر اولاد کو کوئی تکلیف ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ماں۔۔۔ محسوس نہ کرے..... عائشہ بیگم کے دل کی چھین بھی کوئی واہمہ نہیں تھا چند دن بعد ہی اس کا انکشاف ہو گیا تھا۔

کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ شادی سے انکار بھی کیسے کر سکتی تھی اس کے سامنے ایک چھیل میدان تھا۔ کہیں کوئی پگڈنڈی کسی طرف کو مڑتی نظر نہیں آتی تھی۔ انکار کر کے وہ آخر کس راستے کا انتخاب کرتی۔ وہ جھلی لڑکی ”مٹی کا ماٹھو“ تھی بہت پہلے اس نے چند شعروں اور چند گانوں کے عوض ایک آدھ جملے کے بدلے میں ایک بے پروا شخص کو دل کے ایک انتہائی نرم گوشے میں پوری دنیا سے چھپا کر بند کر لیا تھا..... اسے یہ علم نہیں تھا وہ شخص ایک سراب تھا۔

☆☆☆

ای، ابو بھی بہت کم آتے زیادہ تر فون پر ہیلو ہائے ہو جاتی تھی ای جان بڑی محبت سے کہتیں۔

”عامر بیٹے تم دونوں ہماری طرف آؤ، ہمیں خوشی ہوگی، چند دن ہمارے پاس بھی رہ لو پھر تو تمہیں واپس چلے جانا ہے۔“

”آئی میں جب بھی پاکستان آتا ہوں تو زیادہ تر اپنی ماں کو ہی وقت دیتا ہوں کہیں آتا جاتا نہیں۔ پردیس کا مسئلہ ہے، روزی کمانے کے لیے دھکے کھانے پڑتے ہیں۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا۔

”تاہر کون سا زندگی بڑی پرسکون گزرتی ہے ہر وقت آنکھوں کے سامنے والدین، بہن، بھائی اور گھر کا نقشہ گھومتا رہتا ہے، ایک سال بعد جب اپنی دھرتی پر پاؤں رکھنا نصیب ہوتا ہے تو پھر دل کرتا ہے کہ چھٹی کے چار دن بس گھر میں ہی گزارے جائیں۔“

عائشہ بیگم یہ سب سن کر خاموش ہو گئیں۔ اس گفتگو میں انہیں انتہائی کڑواہٹ محسوس ہوئی تھی ان کا دل اندر ہی اندر کہیں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

”نانکھ کے ساتھ ہم نے زیادتی تو نہیں کر دی؟“ عامر کی ساری گفتگو میں نیلی کا کہیں ذکر نہیں آیا..... وہ یہ سوچ کر سہمی گئی تھیں۔

”اے میرے پروردگار میرے دو جہانوں کے رب..... میری بچی تو بڑی معصوم، بڑی بے ضرر ہے مولا..... اسے اپنی پناہ میں رکھنا۔“ یہ وہی وہی ہے ان

کہ سب گھروالوں کو بھی ساتھ لے کر آؤں گی۔
”میں نے کہہ دیا تھا کہ گھروالوں کو لے کر آنا
لیکن عامر کے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے اس لیے وہ
دونوں اکیلے ہی آئیں گے۔“

”یہ کیا طریقہ ہے ملک صاحب شادی کو پانچواں
مہینہ لگ گیا ہے اور بیٹی چوٹی دفعہ آ رہی ہے اور وہ بھی
تھوڑی دیر کے لیے..... کیا ہم نے اسے.....“

”بس، بس بیگم بات بڑھاؤ مت، عورتوں کی
عادت ہوتی ہے بال کی کھال اتارنا، بیٹی اپنے گھر میں
خوش ہے تو تمہیں اعتراض کیوں ہے؟“

عائشہ بیگم خاموش ہو گئیں لیکن چہرے پر ایک غیر
مطمئن سا تاثر تھا۔



دوپہر کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ حمید
صاحب بہت خوش تھے اور نیلی کی پسند کے کھانے
بنوا رہے تھے۔ وقار اور کشف کو فون کر دیا تھا اور وہ
دونوں واپس آ رہے تھے۔ عائشہ بیگم بھی کچن میں صغراں
کے ساتھ ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ کشف گھر پہنچ چکی تھی اس
نے آتے ہی ای کا ہاتھ پکڑا کچن سے نکالا۔

”میں آگئی ہوں، اب آپ آرام سے اپنے بیڈ
پر بیٹھ جائیں۔ میں اور وقار سب سنبھال لیں گے۔
صغراں بھی ہمارے ساتھ ہے لہذا آپ کو دوبارہ کچن
میں آنے کی ضرورت نہیں۔“ کشف نے تمام تر تکلیفیں
سمیٹ کر عائشہ بیگم کو بیڈ پر بیٹھا دیا اور عائشہ نے اسے
اپنے قریب کر کے اس کا منہ چوم لیا..... اور دعائیں
دینے لگیں۔ وقار تین چار شاہ پرز گاڑی میں سے نکال کر
لایا اور ڈائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیے۔

”سلام ای جان.....!“ وہ آکر ماں کے گلے
لگ گیا..... ماں نے دعائیں دیں۔
”بھئی ہمارا نمبر تو بعد میں آتا ہے ہر کوئی جنت کی
طرف بھاگتا ہے۔“ حمید صاحب مسکراتے ہوئے عائشہ
بیگم کی طرف اشارہ کر کے بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

”ارے نہیں بابا جان آپ بھی کمال کرتے ہیں

اتوار کا دن تھا۔ صبح سبکے دن بچے حمید صاحب
حسب عادت اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وقار، کشف
کے ساتھ ایک دن پہلے ہی اپنی سسرال گیا تھا۔ اماں
صغراں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ پھٹی کے دن ناشتا اس
بچے تک ہوتا تھا۔ عائشہ بیگم اپنے کسی کام میں مشغول
نہیں۔ اتنے میں کاریڈور میں رکھے ہوئے نیلی فون
نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

”ٹرررن..... ٹرررن.....“

”یا اللہ خیر.....“ عائشہ بیگم نے حمید صاحب کی طرف
دیکھا..... وہ اخبار رکھ کر نیلی فون کی طرف بڑھ گئے۔

”ہیلو..... جی وعلیکم السلام، یہ تو میرا بیٹا بول رہا
ہے۔ واہ بھئی آج تو رب سے کچھ اور مانگ لیتے۔“

عائشہ بیگم کا دل دھڑک اٹھا انہوں نے الماری
بند کرتے ہوئے اپنے بیڈ کی طرف قدم بڑھائے۔
حمید صاحب، نالکھ سے بات کر رہے تھے۔

”لو بھئی عائشہ بیگم نیلی آ رہی ہے آج..... عامر کل دوپہی
جا رہا ہے، آج وہ دونوں ہماری طرف آئیں گے۔“

”اچھا عامر کل جا رہا ہے اور ہمیں پہلے بتایا تک
نہیں..... میرا تو ارادہ تھا کہ عامر نے جب جانا ہوگا
ساری فیملی کی دعوت کریں گے۔ سب کو ایک ساتھ مل
بیٹھنے کا موقع ملے گا۔ لیکن یہ اچانک آج آنے کی خبر
دے دی۔“ عائشہ بیگم اداسی سے بولیں۔

”چلو خیر ان چھوٹی، چھوٹی باتوں کو محسوس نہیں
کرتے۔ نیلی میری بھی اتنی ہی بیٹی ہے جتنی
تمہاری..... میں بھی اداس ہوتا ہوں لیکن اگر وہ اپنے
گھر میں خوش ہے تو بیگم ہم کیوں برا منائیں؟“ حمید
صاحب بڑی سادگی سے بولے۔

”خاک خوش ہے۔“ عائشہ بیگم منہ ہی منہ میں بوڑھائیں۔
”میں تو چاہتی تھی کہ نالکھ نے جب آنا ہوگا میں
ایک دن پہلے شہلا اور علی کو فون کروں گی وہ بھی
آجائیں گے سب اکٹھے مل کر دو دن گزار لیں گے۔
آج جب کشف اور وقار بھی گھر میں نہیں ہیں تو وہ

صاحبزادے نیلی کو لے کر آ رہے ہیں آپ نے کہا تھا

میں متہ آنا گری ہے۔ کشف نے اسے ای جان کے ساتھ بٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

صغراں کو لڈ ڈرنک اور ٹرے میں گلاس سجائے اندر آئی۔ عامر اور نائلہ کے سر پر پیار بھرا ہاتھ پھیرا اور بوتلیں کھول کر گلاسوں میں ڈالنے لگی۔

”عامر بیٹا تم بھی کچھ بولو، گھر والے کیسے ہیں تمہاری ای جان کا کیا حال ہے؟ ہم نے تو آپ کی ساری پھلی کو کھانے پر بلا یا تھا؟“ عائشہ بیگم بولیں۔

”آئی آپ کو پتا ہے کہ ای جان تو کہیں آتی جاتی نہیں ہیں، بھابی کے بغیر گھر نہیں چلتا اس لیے ہم دونوں آگئے ہیں۔“ عامر کے ماتھے پر ہل وکچہ کر کسی نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا..... وقار اپنی جگہ سے اٹھ کر عامر کے پاس آ بیٹھا اور اسے باتوں میں لگایا، وہ اس کی سنجیدگی محسوس کر رہا تھا۔ ٹیبل پر کھانا چن ویا گیا۔ نائلہ، عامر اور ای کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ گئی اور عامر کے لیے پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔

سب نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عامر کے تلخ حراج کو سمجھنے میں دیر نہ گئی۔

☆☆☆

کھانا ختم ہو گیا تو سب دوبارہ صوفوں پر آ بیٹھے۔ عامر نے بازو پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔ ”ہمیں تین گھنٹے ہو چکے ہیں، گھر میں بھی ملنے والوں کا آنا جانا لگا ہوا ہے، ای پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

”ارے بھئی اب اتنی بھی کیا جلدی ہے بیٹا..... آپ گھر میں تو بیٹا کر ہی آئے ہیں نا..... نیلی بہت دنوں بعد آئی ہے اس کی ماں او اس ہے تھوڑی دیر ماں کے پاس تو گزارے۔“

”چلیں پھر ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں اسے آپ رکھ لیں جب آنا چاہے گی وقار بھائی چھوڑ آئیں گے..... دراصل میرے بہت کام ہیں تیاری کرنی ہے، پیکنگ ابھی رہتی ہے لہذا میرا جانا بہت ضروری ہے۔“

عامر بڑے دوکھے پن سے بولا۔

ادھر جنت ہے تو یہاں دروازہ ہے جنت کا..... نیلی یہاں سے گزریں گے تو جنت میں داخل ہوں گے نا.....؟“ اور دونوں باپ، بیٹا ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑے۔

☆☆☆

دوپہر کے دو بجے باہر بانیک رکنے کی آواز آئی۔ ”میرا خیال ہے نائلہ آگئی ہے“ وقار باہر کی طرف لپکا۔

”السلام علیکم.....!“ دروازہ کھول کر اس نے عامر کو گلے سے لگا یا پھر نیلی کو ساتھ لگا کر پیار کیا..... بھائی سے مل کر وہ باپ کی طرف ووڈ کر لپٹ گئی اور بہت دیر تک سینے سے لگی رہی۔ بابا نے ماتھا چوم لیا۔

”تمہاری ماں بہت اداس ہے۔“ انہوں نے نیلی کو ماں کی طرف متوجہ کر کے عامر کو گلے لگا لیا۔ نیلی بہت دیر تک ماں سے لپٹی رہی..... یوں جیسے کوئی پیاسا مسافر کنواں دیکھ کر اس کی منڈیر سے اپنے ہونٹ تر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بہت ہی ساعتیں بیت گئیں ماں، بیٹی کی سانسیں بڑی خاموشی سے ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہی تھیں۔

”آ جاؤ بیٹا یہاں ڈرائنگ روم میں آرام سے سب بیٹھے ہیں۔“ بابا جان نیلی کو ساتھ لگائے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

”السلام علیکم عامر بھائی کیسے ہیں آپ.....؟“ کشف کچن سے تیزی سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی اور نندوئی کو سلام کرتی ہوئی نائلہ سے لپٹ گئی۔

”نائلہ میری جان ہم لوگ تو بہت اداس تھے، بھئی تم نے تو سسرال میں خوب ول لگایا کہ ہماری یاد ہی نہیں آئی۔“

”نہیں بھابی جان ایسی بات نہیں ہے۔“ پھر اس نے ایک دم عامر کی طرف دیکھا اور بات گول کر گئی۔ ”ارے بھابی، مجھے بھوک لگی ہے کیا بنا رہی ہیں؟“

”جو تم پسند کرو وہی تیار طے گا..... بس تم کچن

کہ آپ جا رہے ہیں اور میں اس لیے ادا اس ہوں؟“
 ”یہ سب دھکوسلے ہیں، عورتوں کے..... کوئی کسی کے لیے ادا اس نہیں ہوتا سوائے والدین کے..... جیسے تم اپنے والدین کو لپٹ لپٹ کر رہی تھیں۔“

”تو پھر اس گھر میں، میں کس حیثیت سے ہوں؟“
 ”جتنی ایک بہو کی حیثیت ہوتی ہے، تم نے دیکھا نہیں بھابی جان کس طرح کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہیں، بھائی جان کو اٹلی گئے تین سال ہو گئے ہیں، کبھی بھابی کی زبان پر شکوہ سنا؟ ابا جان کی مرضی کے بغیر تو وہ گھر سے قدم نہیں نکالتیں۔ تم نے بھی بھابی جان کو کاپی کرنا ہے، یہ آئے دن امی، امی کی گردان نہ کرتی رہنا۔“ یہ اتنا لبا لپھر سن کر نبلی کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنسو اندر ہی اندر چہتی گئی۔

اگلے دن اسے صبح گیارہ بجے گھر سے لاہور کے لیے نکلنا تھا۔ شام پانچ بجے کی فلائٹ تھی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ اور عامر ابھی تک اپنے ابو، امی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دو بج کر تیس منٹ پر وہ کمرے میں آیا۔

”تم ابھی تک جاگ رہی ہو، بھئی یہ نہ ہو کہ صبح تمہاری آنکھ نہ کھلے اور میری تیاری دھری کی دھری رہ جائے۔“

”صبح اگر میں نہ اٹھی تو آپ نے کون سا تردد کرنا ہے، میں جانتی ہوں آپ اپنا اٹیچی کیس اٹھائیں گے اور دوستوں کے ساتھ لاہور چل دیں گے آپ نے تو کبھی یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ آپ کی زندگی میں میری بھی کوئی وقعت ہے؟“ اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہوئی ہے، تم میری بیوی ہو خوب صورت ہو لیکن برانہ ماننا نائلہ بیگم میں خوب صورت عورتوں کو پسند تو کرتا ہوں، اعتبار نہیں کرتا۔ اب تمہیں چھوڑ کر جاؤں گا تو ہر وقت دھیان پیچھے ہی رہے گا کہ تم کہیں کوئی گل نہ کھلا دو.....“ وہ غصے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”نہیں بابا جان، واقعی دیر ہو رہی ہے، میں پھر کبھی آؤں گی عامر کی ابھی کافی تیاری کرنے والی ہے۔“ نائلہ نے التجائیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

”آپ سے گزارش ہے چاچا جی میں تو پرسوں چلا جاؤں گا۔ نائلہ کو روز، روز نہ بلا تے رہیے گا، اس کا دل لگنے دیں اپنے گھر میں، ویسے بھی ابو، امی اب بوڑھے ہو چکے ہیں، ہمارا فرض ہے ان کی خدمت کریں، بھابی جان کو تو گھر کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔ چار بچے بھی سنبھالتی ہیں، اس لیے امی، ابو کے پاس نائلہ کا ہمہ وقت ہونا ضروری ہے۔“ اس نے ساری بات ختم کر دی۔

عائشہ بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ملک صاحب کو مزید بولنے سے منع کر دیا۔ نائلہ کی آنکھیں برسنے کو بے تاب تھیں، وہ جلدی سے اٹھی اور واش روم میں گھس گئی۔ آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے، آنکھیں دوپٹے کے پلو سے خشک کیں اور باہر نکل آئی۔

”عامر صاحب ایک کپ چائے ہو جائے؟“
 وقار نے مؤدبانہ گزارش کی۔

”نہیں وقار بھائی اگلی دفعہ سہی، آج ٹائم نہیں ہے۔“ اور یوں نائلہ اس گرمی کے موسم میں ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح آئی اور چلی بھی گئی۔ عائشہ بیگم کی آنکھیں بھیکتی رہ گئیں کیشف نے پاس بیٹھ کر اپنے پلو سے امی کی آنکھیں یہ کہہ کر صاف کیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔

☆☆☆

نائلہ خاموش تھی۔ اپنی فیملی سے مل کر اتنی جلدی پھڑ جانے کا دکھ تھا یا عامر کو پا کر بھی نہ پانے کا دکھ.....
 ”یہ تمہارا موڈ خراب ہے کہ میں تمہیں وہاں سے جلدی لے آیا۔ میں نے تو کہا تھا کہ تم شام تک رک جاؤ۔ وقار کے ساتھ آ جانا۔“

”یہ آپ سے کس نے کہا کہ میرا موڈ خراب ہے؟“ نائلہ نے اٹیچی میں اس کی نمائش اور جرابوں کے جوڑے رکھتے ہوئے کہا..... ”اور اب نہیں جانتے

معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

سو داسلف لانا عورت کی ذمے داری نہیں ہونی بلکہ پٹھانوں میں تو باہر کا کام مردوں کا اور گھر کے اندر کا کام عورتوں کا ہوتا ہے۔ خیر..... آج کل تو حالات بدل گئے ہیں، آج کی عورت کے لیے ماحول بہت سازگار ہو گیا ہے..... وہ دھڑلے سے جا ب کرتی ہے جبکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ میں کل کی عورت کی بات کر رہی ہوں کیونکہ میں کل کی عورت ہوں، میری شادی ہوئی تو میرے میاں آس جاتے اور انہیں گھر کے کاموں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ نوکر سودا لینے جاتا تو ایک چیز لاتا چار چیزیں بھول جاتا کبھی مجھے قیمتیں زیادہ لگتیں..... خیر ٹھگ آکر میں نے سب کچھ اپنے ذمے لے لیا..... سودا سلف لانا اور دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی اپنے ذمے لے لیے۔ آہستہ، آہستہ گھر کے سارے کام میرے کندھوں پر ہی آگئے جن میں گھر کی خراب چیزوں کو ٹھیک کرنا بھی ہوتا تھا یعنی کاریگروں کے پاس جانا، انہیں گھر بلا کر لانا بھی میری ذمے داری بن چکی تھی۔ میرے میاں واہڈا کے ٹکے میں چیف انجینئر تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ بیوی تو اچھی طرح سے سب کچھ سنبھال رہی ہے تو مزید پیچھے ہٹ گئے اور آج تک پیچھے ہٹے ہوئے ہیں، کئی سال پہلے ہمارا اے سی خراب ہوا تھا میں نے پوچھا تھا چھ کر ایک اچھا کاریگر ڈھونڈنا، اسے اپنا ایڈریس دیا، وہ گھر آیا..... باہر بورڈ لگا دیکھا تو پوچھنے لگا..... یا جی آپ کے میاں واہڈا میں ہوتے ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا..... اس نے بڑے دل سے ہمارا کام کتنا جب میں نے اسے معاوضہ دینا چاہا تو اس نے صفا چٹ انکار کر دیا۔ میں پریشان ہوئی..... اب میں اصرار کروں اور وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ خیر میں نے بعد اصرار سے رقم کی ادائیگی کی..... اسے کوئی کام ہوتا تو میں اپنے میاں سے سفارش کرنا کر اس کے چھوٹے، موٹے کام بھی کر دیا کرتی اور پھر تو وہ ہمارا خاندانی بندہ بن گیا یعنی فریق خراب ہوتا، ٹی وی خراب ہوتا یا ٹی کی مشین خراب ہوتی..... ایک فون پر وہ اپنا بندہ بھیج دیتا..... اور معاوضہ نہ ہونے کے برابر لیتا اور کام تسلی بخش کر لیتا..... میں اکثر اس کی تعریف کرتی، ورکرز بھی اس کے پاس بے شمار تھے جو ہر طرح کا کام جانتے تھے..... اس کے

ہوں گے۔“ نیلی نے رسائیت سے کہا۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں، میں جتنی دیر ای جان کے پاس بیٹھا رہا ہوں وہ اتنی دیر میزا سر سہلانی رہی ہیں۔ میرا خیال ہے اب تم بھی سو جاؤ، صبح بھابی جان سے پہلے اٹھنے کی کوشش کیا کرو..... وہ بڑی ہیں ہماری ماں کا درجہ رکھتی ہیں، کوشش کیا کرو کہ ان پر گھر کا بوجھ زیادہ نہ پڑے۔ تمہارے اس عمل سے میری ماں اور خدا دونوں خوش ہوں گے۔ چلو اب سو جاؤ.....“ اس نے ہولے سے اس کے گال کو چھوا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ خاموش بیٹھی دو درخلاؤں میں کچھ تلاش کرتی رہی۔ ہلکی نیلی روشنی میں اسے گالوں پر آنسوؤں کی قطاریں موتیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ چند منٹوں میں عامر خیند کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا اور وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی اس نے دوپٹے سے آنکھوں سے بہتے پانیوں کو خشک کیا اور

”خدا کے لیے عامر..... میرے لیے آپ کے پاس کوئی اچھا جملہ نہیں جو آپ ہر وقت تیر برساتے رہتے ہیں، آخر میں نے کیا لگاڑا ہے آپ کا جو آپ پر دس جاتے ہوئے اس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں۔“ نیلی رو دینے والے انداز میں بولی۔

”پر دس کون سا پہلی مرتبہ جا رہا ہوں، بیوی کو البتہ پہلی بار چھوڑ کر جا رہا ہوں..... تم سے گزارش ہے کہ اپنا دھیان رکھنا..... میری عزت کا خیال رکھنا۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے کہ عامر امام بڑی عزت والا بندہ ہے، کبھی کسی نے انگی نہیں اٹھائی اس کی طرف.....“ اس نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ایش ٹرے میں اسے مروڑ کر بچھا دیا۔ نائلہ نے اسے سگریٹ توڑ موڑ کر بچھاتے دیکھا تو ایک عجیب سا خوف آیا۔ رب جانے یہ خوف اس کا وہم تھا یا حقیقت کہ اسے لگا عامر چیزوں کو اسی طرح مروڑ دیتا ہے۔

”میں آپ کا سر دباؤں، آپ ٹھگ گئے

ورکرز معاوضہ لینے میں آنا کافی کرتے اور اکثر صدیق صاحب کا فون آتا..... ناراضی سے کہتا۔ ”بابھی، آپ پیسے دے کر مجھے شرمندہ کرتی ہیں میں ان گدھوں سے کہتا بھی ہوں کہ آپ سے پیسے نہ لیا کریں۔“ وغیرہ..... میں جواب میں کہتی۔ ”تم کام اچھا کر لیتے ہو۔ یہی میرے لیے بہت ہے۔“

وقت گزرتا گیا..... چھوٹے موٹے کام اس کے بھی پیش آتے، میرے میاں، میری سفارش پر اس کے کام کر دیا کرتے۔ پھر میاں کی ریٹائرمنٹ ہو گئی..... اب کے گرمیاں آئیں تو اے سی چیک کیا..... صحیح طرح کولنگ نہیں کر رہا تھا..... اس نے کام ختم کیا تو میں نے اسے پیسے دیے..... پیسے دیکھ کر وہ بولا۔ ”یہ پیسے کم ہیں بابھی۔“ میں حیران رہ گئی۔ پہلے تو پیسے لیتے وقت اس کے ورکرز انکار کرتے لیکن آج؟ میں نے انہیں بتایا کہ ”اپنے استاد سے بات کر لو میں اتنے ہی پیسے دیتی ہوں۔“ خیر فون ملا یا گیا تو صدیق بولا۔

”بابھی مہنگائی بہت ہو گئی ہے، اب کہاں پورا پڑتا ہے اور ابھی چند دن پہلے میں آئس گیا تھا معلوم ہو صاحب تو ریٹائر ہو گئے ہیں، وہ مجھے تھوڑا سا کام تھا ان سے پر.....“

”صدیق۔“ میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں پیسوں کی بات کر رہی ہوں تمہارا بندہ بہت زیادہ پیسے مانگ رہا ہے..... ان سے کہہ دو کہ پیسے تو میں دیتی ہوں لیکن اتنی زیادتی بھی ٹھیک نہیں۔ اے سی میں بہت تھوڑا مسئلہ تھا جو جلد ہی ٹھیک ہو گیا۔“

”وہ جی..... پیسے تو آپ کو اتنے ہی دینے ہوں گے۔ جتنا ورکرز ڈیمانڈ کر رہا ہے اور..... ویسے بھی صاحب تو ریٹائر ہو گئے ہیں۔“

فون میرے ہاتھ میں لہرا کر رہ گیا..... صاحب کی ریٹائرمنٹ اور صدیق کا معاوضہ.....؟ دونوں کے درمیان بھلا کیا تعلق ہے؟ وہ بار بار صاحب کی ریٹائرمنٹ کا ذکر کیوں کر رہا تھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کیا آپ کی سمجھ میں آ رہا ہے؟

(شیمین فضل خالق..... پشاور)

ذکر اقبال نے اپنے اسٹائل میں اظہارِ محبت

کر دیا تھا۔ صرف چند جملوں سے ان نے ایک معصوم سی لڑکی کے دل میں چاہتوں کی خوشبو پھینک دی تھی اور اس نازان لڑکی نے چاہتوں کی اس خوشبو کو دلوں کے نہاں خانوں میں ہمیشہ کے لیے بند کر لیا تھا۔ لیکن وہ اس کا نصیب نہ بن سکا تھا۔ اس میں تصور کسی کا بھی نہیں تھا۔

قصور ان رسم درواج کا تھا، ان روایتوں کا تھا، جن کا پابند ہونا پڑتا ہے، یہ اس دور کی باتیں ہیں جن میں لوگ رشتہ طے کرنے کے لیے ذات برادری کا بھرم رکھتے تھے، خاندان اور برادری الگ، الگ ہوں تو محبتیں صرف دلوں میں مقید رہ جاتی تھیں..... کسی کو حدود پھلانگنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

ذکر اقبال کی بہن نے بھائی کی محبت میں ان روایتوں کو کراس کر لینے کا اظہار کیا تھا لیکن حمید صاحب اور عائشہ بیگم نے اپنی برادری کی حدود و قیود کو کراس

آنکھیں سچ کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

بہت کوشش کے باوجود آنکھوں میں نیند نہیں اتری بلکہ دور بہت دور کچھ تصویریں سی ابھرتی ڈوبتی نظر آئیں۔ وہی شادی والا گھر..... بڑے ہال میں قالین پر بیٹھی لڑکیاں، وہی سامنے اسٹیج پر بیٹھی شوخ اور چنچل سی ریحانہ اپنے بھائی کے کندھے سے کندھا ملائے لہک، لہک کر گاتی ہوئی بہت پیاری لگ رہی تھی۔

گوریے میں جانا پردیس..... یہ کوئی اور نہیں ذکر اقبال تھا جو ایسا پردیس گیا کہ پھر اس کی خبر تک نہیں ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور آج عامر امام پردیس جا رہا تھا۔ اس کی دنیا سے دور جا رہا تھا۔

ذکر اقبال نے جدا ہونے سے پہلے خوب صورت جملے بول دیے تھے۔

لیکن عامر امام ٹھوک و شبہات کے بیچ لو کر جا رہا تھا۔ آنے والا وقت نہ جانے کیسا ہو۔

اگلے روز فجر کی نماز کے لیے اٹھی تو بستر سے اٹھنا محال نظر آیا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور صوفے پر گر گئی۔ نہ جانے کب تک پڑی رہتی، بھابی جان نے دروازے پر دستک دی اور اندر آ گئیں۔

”نئی، نئی، کہاں ہو آج اٹھنے کو دل نہیں کر رہا؟“ اور ایک دم شاک لگا۔۔۔۔۔ ”ارے یہ کیا ہوا ہے تمہیں۔“ انہوں نے فوراً اس کے ماتھے کو چھوا۔ بہت تیز بخار تھا بھابی نے فوراً اپنے بیٹے ارسل کو آواز دی۔

”بیٹا جلدی آؤ دیکھو نئی چاچی کو کیا ہوا ہے۔“ ارسل بھاگتا ہوا اندر آیا ماں، بیٹے نے مل کر اسے بیڈ پر لٹایا اور ارسل سامنے رہنے والی لیڈی ڈاکٹر کو بلانے دوڑا۔ اس نے آکر چیک کیا۔

”ماشاء اللہ امید سے ہیں ان کا بہت خیال رکھیں بے حد کمزوری ہے، میں کچھ دوائیں لکھ دیتی ہوں باقاعدگی سے دیتے رہیں اور زیادہ سے زیادہ آرام کرنے دیں۔“ اور کچھ دیر میں ارسل قرصی اسٹور سے دوا لے آیا۔ بھابی نے جلدی سے اسے ناشتلا کر دیا اور دوا دے کر اسے آرام سے لیٹنے کو کہا اور خود کمرے سے باہر آ گئیں۔

”مبارک ہو ای جان، عامر باپ بننے والا ہے۔“ بھابی جان نے ای کے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ..... اللہ خیر کرے خیر مبارک بہو، اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے۔“ اس خبر سے گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ امام صاحب نے فوراً عامر کا نمبر ملایا اور بیٹے کو مبارک باد دینے لگے۔ کچھ دیر بعد نائلہ کے فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو..... جی.....“

”بھئی ہم یہ کیا سن رہے ہیں کہ ہم باپ بننے والے ہیں تم نے ہمارے یہاں پہنچے ہی بڑا اچھا سچ دیا ہے، چلو تمہیں شکر یہ کہہ دیتے ہیں۔“ وہ حسب عادت بڑا روکھا سا بولنے لگا۔

”دیکھو نئی، تمہیں اپنا بہت خیال رکھنا ہوگا، تم

کرنے کا سوچنا بھی گناہ کے مترادف سمجھا اور اس طرح وہ دونوں انتہائی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی محبتوں کو دل کے نرم گوشوں میں محفوظ کر کے اپنے، اپنے راستے پر چل دیے تھے۔ ذرا اقبال اپنی منزل کی طرف پہنچا تو اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا لیکن نائلہ حمید اپنی منزل پر پہنچ کر بھی دور تک کانٹوں بھری روش دیکھ رہی تھی۔ یہی راستہ اس کا مقدر رہے اسی کانٹوں بھری روش پر اسے چلتے رہنا ہے پاؤں چھلنی ہوتے ہیں تو بھلے ہوں۔ اسے اپنے آپ کو ایک فرماں بردار بیٹی اور ایک باعزت بیوی ثابت کرنا ہے۔

وہ رات بھر انہی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی، آنکھیں ساون بھادوں برساتی رہیں۔

☆☆☆

عامر نے دعویٰ پہنچ کر اپنی والدہ کو فون کیا۔

”شکر ہے بیٹا تو خیریت سے پہنچ گیا۔ میں تو سارا دن اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتی رہی ہوں۔“ ماں خوشی سے دیوانی ہو رہی تھیں۔

”جی ماں جی یہ آپ کی دعائیں ہی تو ہیں جو میں ہر مقصد میں کامیاب ہوتا ہوں، گھر میں سب کیسے ہیں؟ ابا جان کیسے ہیں؟ بھابی کا کیا حال ہے؟ میں نئی سے کہہ کر آیا ہوں کہ بھابی جان کا بھی خیال رکھے۔ ہماری بھابی بھی ہماری ماں کی ہی طرح ہیں۔“

ماں، بیٹا جادوئے خیالات کرتے رہے اور پھر فون بند ہو گیا۔

نائلہ حیران و پریشان کپڑے پر لیس کرتی رہی۔ ”کیا عامر کا رشتہ صرف اپنے ماں، باپ سے ہے تو میری جگہ کہاں ہے آخر؟ میں یہاں کس لیے لائی گئی ہوں؟“

”ای جان عامر کا فون تھا؟“ نائلہ نے ڈرتے، ڈرتے سوال کیا۔

”ہاں خیر سے پہنچ گیا ہے سب کو سلام کہہ رہا تھا۔“ ای نے بس اتنا جواب دینا مناسب سمجھا۔ نئی نے اس آگے کچھ بھی بوجھنا مناسب نہیں سمجھا۔

☆☆☆

میں موجود ہوں لیکن کہیں بھی فٹ نہیں ہو پارہی۔ میری جگہ آخر کہاں ہے یا میں آخر کس کی جگہ پر آگئی ہوں بھابی؟“ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

”بتائیں ناں بھابی جان.....“ اس نے بھابی کو دونوں کندھوں سے تھام کر تجن جوڑا۔

”نالہ میری جان اس دنیا میں ہر انسان کہیں نہ کہیں ان فٹ ہے، یہ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہوا۔

عامر کے بھی دل پر بڑا گہرا زخم آیا ہوا ہے، وہ تو شادی پر تیار ہی نہیں تھا۔ ہم نے زبردستی اسے منایا کہ شاید زندگی میں کسی کے شامل ہونے سے وہ سنبھل جائے اور اپنی زندگی ہنسی خوشی جینے لگے۔“ بھابی روہا نسی ہی ہو کر بولیں۔

”ایسا کیا چمن گیا عامر سے بھابی جان جس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔“ وہ بڑی بے چین تھی۔

”در اصل عامر جس لڑکی کو یونیورسٹی میں پسند کرتا تھا وہ ہمارے ہی گھر میں عاشر سے بچاہ کر آگئی، عامر بالکل بکھر کر رہ گیا۔ مونا جانتی تھی کہ

عامر اسے پسند کرتا ہے لیکن دونوں کے درمیان بھی اظہارِ محبت جیسے ڈائلاگ نہیں چلے تھے۔ عاشر کا

رشتہ کسی آئی نے کروایا تھا جو عامر کی ای جان کی دوست تھیں اور مونا کو کسی شادی کی تقریب

میں دیکھا اور اس کی والدہ سے فوراً رابطہ نمبر لے لیا۔ اور اس طرح یہ رشتہ چٹ مگنی پٹ بیاہ کے

مصدق اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ عامر کو اس وقت پتا چلا جب عاشر بھائی کی دلہن گھر میں آگئی اس

بچارے پر بجلی گر پڑی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے کسی دوست کے ذریعے دہلی میں بڑی اچھی جاب

مل گئی۔ وہ دیزے کی بھاگ دوڑ میں تھا اس کا خیال تھا کہ دہلی جانے سے پہلے ای کو بتادے گا کہ اس کی

پسند کون ہے؟ لیکن اسے اس کا موقع ہی نہ ملا اور وہ آئی بی بی میں ٹپک پڑیں اور مونا کو عاشر کا بتا دیا۔ یہ

سب قدرت کے کھیل ہیں، یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان جو پسند کرے اسے وہی مل بھی جائے۔“

پشیمامہ پاکیزہ 241 نومبر 2016ء

ماں بنتے جارہی ہو اس کنڈیشن میں زیادہ آنا جانا، بھاگ دوڑ مناسب نہیں ہوتی۔ یہ نہ ہو آئے دن ای جان کے لیے اداس ہو کر دوڑ لگا دو، جسے تم سے ملنا ہوگا خود آ کر فٹ لے گا دیسے کوئی کسی کے لیے اداس نہیں ہوتا۔ سب سیر پائے کے بہانے ہوتے ہیں۔ بہر کیف تمہیں میری امانت کو سنبھالنا ہوگا اس کے لیے چاہے تمہیں نو ماہ تک اسی کمرے میں بند رہنا پڑے سمجھیں بس اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔“

فون بند ہو گیا نیلی ہاتھ میں لیے ریسیور کو گھورتی رہ گئی۔ آنسوؤں کی دوہلی قطاریں رفتہ رفتہ اس کے دامن کو بھگور ہی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا تصور ہے؟

”اٹھو نالہ باہر چل کر بیٹھو۔“ بھابی نے اندر جھانکا اور ششدر رہ گئیں۔ ”یہ کیا؟ بھی خوشی کے اس

موقع پر اتنے ڈھیر سارے آنسو.....؟ چند اس حالت میں روتے نہیں ہیں، بچے پر برا اثر پڑتا ہے۔“ بھابی

نے اسے گلے سے لگا لیا اور وہ بے اختیار رو پڑی۔ بھابی نے اسے بہت سا پیار کیا۔

”چلو پہلے منہ دھو کر آؤ اور آنسو صاف کر دو پھر باہر لے کر جاؤ گی۔“ اس نے ہاتھ روم میں جا کر

آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے..... سرخ ہوتے چہرے کو منی ٹاول سے تھپتھپایا اور بھابی کا ہاتھ

پکڑ کر انہیں بیڈ پر بٹھالیا۔

”بھابی جان ایک بات آپ کو سچ، سچ بتانا ہوگی آپ نہیں بتائیں گی تو میں اس کمرے سے کبھی باہر نہیں

نکلوں گی۔“ اس نے بڑی بے بسی سے التجا کی۔

”بولو تمہیں کیا ابجھن ہے؟“ بھابی نے اس کی پیشانی پر آئے بال بڑی محبت سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

”بھابی یہ بتائیں کہ مجھ سے پہلے عامر کی زندگی میں کون تھا؟“

”یہ تم کیا بک رہی ہو، ایسا کچھ بھی نہیں تھا؟“ بھابی نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

”ایسا کہنے ہو سکتا ہے کہ میں عامر کی زندگی میں کون تھا؟“

بھابی کے الفاظ ختم ہوتے ہی نائلہ کو بہت پیچھے چھوڑ دھند کے پار سے کچھ ہلکا سا نظر آیا۔

خاکہ بننے والی ہیں اور اسریٰ بھی جلد آ پامن جائے گی۔
شہلا کی بیٹی اسریٰ گیارہ مہینے کی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں بیٹی کے گھر داخل ہوئے تو سامنے ہی نائلہ نظر آگئی جوں ہی اس نے باہر کی طرف دیکھا تو دوڑ لگادی اور ماں سے لپٹ گئی اور بہت دیر تک سانس روکے سینے سے لگی رہی۔ عائشہ بیگم نے چہرہ سامنے کیا تو آنسوؤں سے تر تھا۔

”نہ بیٹے نہ یہ روئے کا وقت نہیں یہ تو اپنے رب کا شکر ادا کرنے کا وقت ہے۔“ ماں نے بیٹی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا اپنے آنچل سے اس کے آنسو صاف کیے۔۔۔۔۔۔ عائشہ بیگم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نیلی اتنا کس لیے روتی ہے ماں کے لیے زندگی کا سب سے تکلیف دہ لمحہ وہی ہوتا ہے جب اولاد کی آنکھ سے آنسو گرتا ہے۔ انہوں نے بیٹی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔۔۔۔۔

”ارے بھئی آسمان سے اتری ہوئی منھی پری کچھ محبتیں ہماری جھولی میں بھی آپ کے لیے بھری ہیں ہمیں بھی موقع دیجیے۔“ حمید صاحب نے بائیں پھیلا کر کہا تو نائلہ بے اختیار باپ کے سینے سے لپٹ گئی اور دیر تک اسی کندھے سے سر نکالے رکھا جس کندھے سے لگ کر وہ جھوٹ موٹ سوئی بن جایا کرتی تھی۔

”بھئی اب سوتی نہ بن جانا، اب تو ہم تمہیں بازوؤں میں نہیں اٹھا سکیں گے تم جانتی ہو تم بڑی ہوگئی ہو اور دم بوڑھے۔“ انہوں نے خود سے الگ کر کے بیٹی کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔

اتنے میں صفیہ بیگم دوسرے دروازے سے اندر کمرے میں داخل ہوئیں۔

”آئیے، آئیے، بھئی آج تو بڑا اچھا دن چڑھا ہے ہماری سحر من صاحبہ تشریف لائی ہیں۔“ انہوں نے عائشہ بیگم سے گلے ملتے ہوئے مصنوعی محبت کا اظہار کیا۔

”تیری آنکھ کے آنسو پل جاؤں کسی میری تقدیر کہاں؟“

ذاکرا قبائل سے دھند کے اس پار بھی اپنے گیتوں سمیت نظر آیا۔

”بھابی ٹھیک کہتی ہیں ہر انسان اپنی زندگی کے خانوں میں کہیں نہ کہیں ان فٹ ہے۔ میں بھی تو ان فٹ ہوں اور شاید ذاکرا بھی۔۔۔۔۔“

”تم چپ کیوں ہو نیلی۔۔۔۔۔۔ دل چھوٹا مت کرو انشاء اللہ عامر تمہاری محبت اور اپنا پیچہ پا کر سب بھول جائے گا۔۔۔۔۔۔ تمہیں بہت خوشیاں ملیں گی انشاء اللہ۔“ نیلی کی آنکھوں میں ادا سیوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

بھابی جان اس کے لیے بہت بڑا سہارا تھیں۔ واقعی عامر سچ کہتے تھے کہ بھابی جان ہماری ماں جیسا درجہ رکھتی ہیں۔ اب نائلہ کو پتا چلا کہ عاشر بھائی اپنی نیلی کے ساتھ انگلینڈ کیوں سیٹ ہیں۔

☆☆☆

”حمید منزل“ میں جب یہ خبر پہنچی کہ ملک صاحب نانا بننے والے ہیں تو خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کشف اور وقار بھی مایہ مانا بننے کی خبر سن کر خوش ہو گئے اور عائشہ بیگم کے پاس بیٹھ کر مستقبل کے منصوبے بنانے لگے۔ عائشہ بیگم کو تو بیٹی سے ملنے کا بہانہ میسر آ گیا۔

”ملک صاحب آج آپ آفس سے چھٹی کر لیں۔ حیدر بھائی جو موجود ہیں دیکھ لیں گے سب۔ آپ مارکیٹ جائیں اور نیلی کے لیے کچھ ضروری چیزیں خرید لائیں میری بچی بہت کمزور ہے کچھ منہ میں جائے گا تو وجود میں طاقت پیدا ہوگی۔“ عائشہ بیگم کے چہرے پر مٹا بکھر گئی۔

”جی بیگم صاحبہ جیسے آپ کا حکم، آپ تیاری پکڑیں ہم یوں گئے اور یوں آئے۔“ حمید صاحب بولے۔

”ای جان آپ آج ہو آئیں ہم دونوں کل تھوڑی سی شاپنگ کر کے جائیں گے۔“ وقار نے چائے کا خالی کپ کشف کو بکراتے ہوئے کہا۔

”صفیہ آپا چند دن بعد نیلی کو ایک ہفتے کے لیے ہماری طرف بھیج دیجیے گا بلکہ فون کر دیے گا وقار آ کر لے جائے گا۔ عامر کے جانے سے اواس ی ہے۔ ذرا دل بہل جائے گا۔ جب سے شادی ہوئی ہے ہماری طرف رہنے نہیں آئی۔“ انہوں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”عائشہ بیگم بیٹیاں اپنے گھر میں خوش ہوں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔“ نائلہ نے ایک دم ماں کا چہرہ دیکھا۔ اواسی کی ایک لہری چہرے پر سے گزر گئی۔

”ای جان میں خود فون کروں گی جب آنا ہوگا آپ فکر نہ کریں۔“ نیلی بڑی خوب صورتی سے بات بنا گئی تھی۔

☆☆☆

بارش کی بوندیں تسلسل سے اک ہی راگ الاپ رہی تھیں۔ کبھی، کبھی بجلی چمکنے اور کڑکنے کی آواز سے دل ہولنے لگتا۔ سب کو ناشتا کروا کے وہ اپنا چائے کا گگ ہاتھ میں لیے اپنے کمرے میں آگئی گھر کے کام کے لیے ملازمہ رانی موجود تھی جو مستقل ای گھر میں ایک کمرے میں رہتی تھی آگے پیچھے کسی کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تھی۔ بڑی ایمانداری اور شرافت سے اس گھر میں رہتے ہوئے اسے چھ سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ بہت کم بات کرتی تھی لب پر کبھی کوئی شکوہ نہیں لاتی تھی۔ نہ ہی کسی کی بات کرتی تھی۔ نائلہ چائے کا گگ لیے اپنے کمرے میں داخل ہوئی گگ سا نڈ ٹیبل پر رکھا اور کھڑکی سے پروے ہٹا دیے۔

بڑا اواس کروینے والا منظر تھا۔ موسلا دھار بارش نے موسم کو نیم تاریک کر دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ون کے دس بجے ہی مغرب کا سماں ہو رہا تھا۔ نائلہ کے کمرے کی کھڑکی باہر لان میں کھلتی تھی۔ گلاب اور موتیا کی خوشبو بھیننی، بھیننی بڑی مسور کن محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے بھاپ اڑاتی چائے کا ایک سب لیا اور اور کھڑکی کے باہر سڑک پر نظر میں جما دیں۔ سڑک پر اکا وکا لوگ نظر آ رہے تھے کبھی کوئی گاڑی اور کبھی کوئی سر پر گھنٹری تانبے پائے اور پرچے ہائے گزرتا نظر آ جاتا۔

”نہیں صفیہ آپا، میں آپ کی مدد نہیں بہن کہلانا پسند کرتی ہوں آپ میری بڑی بہن ہیں اور میرے دل میں بڑا احترام ہے آپ کے لیے۔“ عائشہ بیگم پس پر وہ اپنی بیٹی کو سپورٹ کر رہی تھیں۔

”چلو عائشہ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ آپ دل میں ہمارے لیے احترام و محبت کا جذبہ رکھتی ہیں۔۔۔۔۔ سلام بھائی صاحب آپ کیسے ہیں؟“ وہ اب حمید صاحب سے مخاطب تھیں۔

”آپ کی دعائیں ہیں صفیہ بہن۔۔۔۔۔“ حمید صاحب بولے۔

بڑی بہو ثروت بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور بڑی محبت سے ملیں اور بولے سے عائشہ آئی کو تانی بننے کی مبارک باووی۔

”بھئی صفیہ آپ کو سب سے پہلے مبارک باو اور ثروت تمہیں بھی مبارک ہو اللہ پاک خیر کا وقت لائے۔“ اتنے میں رانی چائے کی ٹرائی و چھیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور سلام دعا کے بعد چائے اور دیگر لوازمات سر و کرنے لگی۔

بھئی خوشی سب خوش گیوں میں مصروف تھے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ نائلہ بھی والدین کی موجودگی میں بڑا سکون محسوس کر رہی تھی۔

اچانک سامنے دیوار پر لگے کلاک نے ٹن، ٹن، ٹن کی آواز لگا کر خوش گیوں میں مصروف لوگوں کو متوجہ کیا۔

”میرا خیال ہے عائشہ بیگم اب چلنا چاہیے بہت ٹائم ہو گیا ہے۔“ حمید صاحب بولے۔

”نہیں بھائی صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔“ صفیہ بیگم نے فارمیٹی بھائی۔

”پھر کبھی کھانا کھالیں گے ہمارا اپنا گھر ہے اور ہم کون سا دور سے آئے ہیں۔“ وہ بولے اور یوں باتوں، باتوں میں چلنے کی تیاری ہو گئی۔ نیلی کا چہرہ اواس ہو گیا۔

کبھی کبھی کوئی سٹائیکل پر بیٹھا اپنے آپ کو بھینکنے سے بچانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا گزرتا۔

عامر کی طرف سے فون اکثر ای جان کو آتا وہ گھنٹوں فون پر بیٹے سے بات کرتی، ہفتے میں ایک آدھ بار دو چار منٹ کے لیے نیلی کو بلا کر پاس ہی ریسیور پکڑا دیتیں وہ خیر خیریت پوچھتی اور اللہ حافظ کہہ دیتی۔

ای، ابو کے گھر سے ہفتے میں ایک بار فون آ جاتا تھا، اسے کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ شہلا باجی کبھی کبھار ہی فون کرتی تھیں۔

آج وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی، او ایسیوں نے ہر طرف ڈپرے جمالیے تھے۔ اس نے دراز کھول کر اپنی وہی پرانی آڈیو کیسٹ نکالی اور ٹیپ ریکارڈر میں لگا کر سوچ آن کر دیا۔

اس بھری دنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ ہو غیر تو غیر تھے انہوں کا سہارا نہ ہو ڈاکر اقبال اپنی مدد بھری آواز میں اتنے اداس ماحول کو اور بھی سوکوار کر دیتا تھا۔ یہ آڈیو کیسٹ جو تمام ڈاکر کی آواز میں ریکارڈ تھی یہ ریحانہ نے نیلی کو گفٹ کی تھی۔ ریحانہ نے کیسٹ نیلی کو پکڑا تے ہوئے بس اتنا کہا تھا کہ ڈاکر بھائی سے مجھے بہت محبت ہے..... نیلی کے سامنے وہ سارا منظر ایک قلم کی طرح چلنے لگا۔ ذل اور بھی بے چین ہونے لگا۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور الماری کھول کر اس کی دراز میں سے ایک ڈائری نکال لائی۔ ڈائری میں ڈاکر کے ہاتھ کا لکھا وہی مڑا مڑا کاغذ جس پر شعور ورج تھا۔ سب سے پہلے اس کے ہاتھ آیا۔

پھر وہ مختلف لوگوں کے فون نمبرز میں سے ایک نمبر ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی۔ رخسانہ شبیر مزنگ، لاہور۔ اس نے فوراً نمبر ڈائل کیا..... بہت دیر تک فون کی تیل بجتی رہی پھر کسی بچے نے فون اٹھا کر ہیلو کہا۔

”ہیلو بیٹا رخسانہ شبیر سے بات ہو سکتی ہے؟“

”جی آپ کون ہیں؟“ بچے نے پوچھا۔

”میں آپ کی خالہ نائلہ مات کر رہی ہوں ماما کو بتاؤ۔“

”جی اچھا میں ابھی ماما کو بتاتا ہوں“ اس نے ریسیور ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ ٹھیک دو منٹ بعد چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ رخسانہ ماؤتھ پیس میں گویا ہوئی۔

”ارے نائلہ کہاں ہو تم..... یار میں نے تمہارا نمبر بہت ڈھونڈا.....“

”السلام علیکم رخسانہ، میں نیلی بات کر رہی ہوں یار اپنی سانس تو درست کرو کہیں سے بھاگی آرہی ہو؟“

”ہاں بھئی تمہارا نام سنتے ہی استری کو وہیں چھوڑ کر بھاگی، بھاگی آئی ہوں مجھے لگ رہی کہ کہیں تم پھر سے نہ گم ہو جاؤ۔“

”کیا بتاؤں رخسانہ کون، کون... کہاں، کہاں گم ہو گیا۔ میں تو آج بھی وہی کھڑی ہوں۔“

”ٹھیک کہا تم نے کون کہاں کھو گیا ہے، کس نے کسی کو ڈھونڈنا چاہا لیکن بیکار گیا۔ یار بس جو ایک بار دنیا کی بھیڑ میں کھو گیا وہ واپسی کا راستہ بھول گیا۔“ رخسانہ کا بھی شاید کوئی زخم تازہ ہوا۔

”چلو چھوڑو تم اپنی سناؤ شبیر بھائی کہاں ہیں، کیسے ہیں، تمہارے بچے کیسے ہیں۔ ای، ابو کا کیا حال ہے؟“

”ابو چلے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر کبھی نہیں آتا۔ ابی، بیمار رہتی ہیں، بھائی اپنی بیگبات کے ساتھ خوش ہیں۔“ رخسانہ نے بتایا۔ ”تم نے نیلی شادی کر لی یا آج بھی میاں بچنوں کا انتظار ہے؟“

”کیسا انتظار رخسانہ.....؟ انتظار تو اس کا کیا جاتا ہے جس نے اپنے پیچھے کوئی وعدے چھوڑے ہوں وہ تو اپنے قدموں کے نشان تک مٹا گیا۔“ وہ اپنی آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسیاں سیٹھ بولی۔

”تو پھر تمہاری کھوپڑی میں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ تمہیں شادی کر لینی چاہیے، بیٹیاں اس وقت تک برداشت ہوتی ہیں جب تک والدین زندہ ہوتے ہیں، ان کے بعد بھائیوں اور بھابیوں کے سر پر بوجھ بن جاتی ہیں۔“

”میں نے شادی کر لی ہے رخسانہ جہاں

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”ہاں بھئی دو تھی جتنی پرانی ہوتی ہی مضبوط ہوتی ہے۔“ بھابی نے کہا۔ ”چلو آؤ میں نے رانی سے پکوڑے بنانے کا کہا ہے موسم بہت شاندار ہو رہا ہے۔“

نانکھ بھابی کے ساتھ وہ بڑے کمرے میں آگئی۔ بارش اب پہلے سے ذرا کم ہو گئی تھی۔ نیلی نے شمال اپنے ارد گرد لپیٹ لی تھی اور بڑے کمرے میں بچھے پلنگ پر بیٹھ کر کھیل اوڑھ لیا۔ سب کے ساتھ وہیں بیٹھ کر پکوڑوں اور گرم کبابوں کے ساتھ انصاف کیا۔

بچے بھی اسکول سے آگئے اور نیلی کے ساتھ مل کر لطف اندوز ہونے لگے۔ برسات کا دن بڑا پُر رونق رہا..... عامر کا فون بھی امی جان کے کمرے میں آیا اس تک صرف سلام پہنچا دیا گیا۔ آج جمعرات کا دن بڑا اداس لگ رہا تھا رات بھر دل عجیب سے وسوسوں میں گھرا رہا تھا..... نیند بھی کوسوں دور رہی۔ نانکھ درود شریف اور آیت الکرسی پڑھ، پڑھ کر دعائیں مانگتی رہی۔ صبح فجر کے بعد اس نے نماز سے فارغ ہو ایک کپ چائے بنائی اور کمرے میں آگئی۔

اچانک امی جان کے کمرے میں ٹیلی فون کی ٹھنسی بج اٹھی۔ اللہ خیر، اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور کپ واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

امام صاحب فون پر بات کر رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آئی۔ لیکن دل دھڑک رہا تھا۔ فون بند ہوا اور نیلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”تی بابا جان خیریت.....؟“

”خیریت ہے بیٹا تمہاری والدہ کی طبیعت تھوڑی سی خراب ہے اور تمہیں یاد کر رہی ہیں۔“

”کیا ہوا بابا جان؟“ وہ گھبرانے لگی۔

”کچھ خاص نہیں معمولی سا بخار ہے اور لگتا ہے تم سے دل اداس ہے، تم ناشتا کر لو تو پھر میں تمہیں لے چلتا ہوں۔“ بابا نے بات ختم کی اور باہر نکل آئے۔

ناشٹا کس کو سو جتا وہ تو بھابی کو بتانے ان کے کمرے میں چلی گئی۔

والدین کا حکم تھا لیکن جن سے شادی کی وہ کبھی اور تھا۔ وہ میرے ساتھ ان فٹ ہے اس نے بھی والدین کی آواز پر لبیک کہا اور میرا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔ ”چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔“

”نانکھ تم ٹینشن مت لو بھول جاؤ سب کچھ.....“

دل کی سختی پر جو لکھا تھا مٹا ڈالو سب صاف کر دو لوگ تو بڑے، بڑے گناہ کر کے بھول جاتے ہیں اور تم نے چند خوب صورت جملوں کے درمیان خود کو قید کر لیا ہے تم سمجھو کہ تم عابدہ باجی کی شادی پر گئی ہی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے تمہارے والدین نے جب صدیقہ باجی سے ذات برادری میں رشتہ کرنے کی روایت کو قائم رکھنے کی مجبوری بتائی تو ذرا کر کے دل کو بھی ٹھیس پہنچی ہو اور اس نے داپسی کے سارے راستے بند کر لیے ہوں؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو شاید میں سب بھول جاتی لیکن عامر کمپر و مائز پر تیار نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے، وہ جسے چاہتا تھا وہ لڑکی اس کی بھابی بن کر اسی گھر میں آگئی۔ تم قدرت کے کھیل تو دیکھو.....“

”ہاں نیلی یہاں دم مارنے کی کس کی مجال ہے انسان کچھ نہیں کر سکتا، وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہو۔ خیر تم سناؤ شادی کب اور کہاں ہوئی؟“

”شادی تو اپنے ملکوال میں ہی ہوئی ہے۔“

عامر دعویٰ ہوتے ہیں اور تم خیر سے خالہ بننے والی ہو۔“

نانکھ نے شرماتے ہوئے کہا۔

”ارے واہ..... اتنی بڑی خبر تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ مبارک ہو۔“

”بس تم سے ملنے کی خوشی میں یہ خبر سنانی بھول گئی۔ خیر مبارک.....“ پھر نہ جانے کتنی دیر تک دونوں باتیں کرتی رہیں۔ دوبارہ جلدی فون کرنے کا وعدہ ہوا اور فون بند ہو گیا۔

”یہ اتنی دیر سے تم کمرے میں کیوں بند ہو کر بیٹھ گئی ہو؟“ بھابی نے دوازے پر کھٹ کھٹ کی اور اندر آ گئیں۔

”وہ دراصل رخسانہ کا فون تھا بہت مدت بعد

اس سے بات ہوئی ہے۔“

آن پہنچے۔
صدیقہ بھائی کو عائشہ خالہ سے بہت محبت تھی وہ لوگ اب یہاں سے بہت دور شفٹ ہو چکے تھے۔ محسن بھائی کو اچانک کہیں سے خبر مل گئی تھی اور اتفاق سے ذاکر بھی ملگوال آیا ہوا تھا۔ کینیڈا روانگی سے پہلے وہ صدیقہ اور بچوں سے ملنے آیا تھا۔ اور یہاں آ کر عائشہ خالہ کی وفات کی اطلاع مل گئی اور وہ بہن اور بہنوئی کے ہمراہ عائشہ بیگم کی آخری رسومات میں شامل ہو گیا۔ یادوں کی نہ جانے کتنی لہریں دل میں اٹھیں اور محبوب کا چہرہ دیکھنے کو دل بے چین بھی ہوا لیکن زبان پر تالے لگ چکے تھے اس نے چاہنے کے باوجود بہن سے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا، اس کا خیال تھا نیلی اپنی دنیا میں بہت خوش ہوگی لہذا اس کا سامنا کر کے پرانے کسی زخم کو تازہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رخسانہ بھی لاہور سے پہنچ چکی تھی اس نے باہر گیٹ پر ہی ذاکر کو محسن بھائی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اس کا دل چاہا کہ بھاگ کر اس کے قریب جا کر اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑے اور پوچھے کہ بتائے ظالم شخص تو نے چند خوب صورت جملوں اور چند اشعار سنا کر ایک معصوم لڑکی کو اپنی محبت کے حصار میں قید کیوں کر لیا؟ لیکن اتنے بے شمار مردوں میں اس نے نیلی کی محبت کا بھرم رکھ لیا۔ اس نے خود پر قابو پا کر اپنی بہت پیاری دوست کی عزت کی لاج رکھ لی۔ اور اپنے جذبات پر کنٹرول کرتے ہوئے تیزی سے گھر کے اندر گھس گئی اور ایک چیخ مار کر شہلا سے لپٹ گئی۔

پھر اسے بتایا گیا کہ نائلہ تو کمرے میں بے ہوش پڑی ہے۔ جب اسے ہوش آیا تھا تو ڈاکٹر نے ہلکی سی غنودگی کا انجیکشن لگا دیا تھا تا کہ وہ دوبارہ ماں کی میت کے پاس آ کر بے حال نہ ہو جائے۔

حسب روایت جنازہ اٹھا تو خواتین میں کھانا سرو کر دیا گیا۔ رخسانہ اور صدیقہ بھائی نے اندر آ کر نائلہ کو دیکھا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر گردن تک کیبل اوڑھے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ رخسانہ نے قریب جا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس کی آنکھوں سے کتنے ہی

گاڑی گھر کے گیٹ تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ نیلی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنے لگا گیٹ دور سے کھلا نظر آیا اور لوگ آ جا رہے تھے۔
”ای جان یہ گھر میں اتنے لوگ کیونکر آ جا رہے ہیں؟“ وہ گھبرا گئی۔

”بیٹا حوصلہ رکھو اللہ پاک کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔“ صفیہ بیگم نے بہو کو ساتھ لگا لیا۔ دوسری طرف بھائی اس کی کمر سہلانے لگیں۔ گاڑی پورچ میں جا کر رک گئی۔ نیلی کو کانوں پر یقین نہ آیا۔ گھر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں، وہ گاڑی سے اتری اور بھاگتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ لاؤنج میں خواتین ایک دوسرے سے گلے مل کر رو رہی تھیں۔ کمرے کے عین وسط میں جا رہی پانی پر عائشہ بیگم ہمیشہ کی نیند سو رہی تھیں۔ نیلی چیخ مار کر ماں کی میت کے پاس گر کر بے ہوش ہو گئی۔ کشف... روتے ہوئے آ کر نیلی کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی، شہلا بھی بے ہوش نیلی سے لپٹ کر رونے لگی۔ ملازمہ پانی کا گلاس لے کر بھاگتی آئی اور نیلی کے منہ پر چھینٹے مارنے لگی اور اٹھکیوں کی پوروں سے اس کے منہ میں پانی ڈالنے کی کوشش کرنے لگی اتنے میں وقار کو کسی نے آواز دی وہ بھاگا، بھاگا آیا اور نیلی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔ بھائی جان بھی تیز قدموں سے نیلی کے پاس کمرے میں چلی گئیں۔

عجیب روح فرسا سا منظر تھا، رونے کی آوازیں پھر سے آنے لگیں۔ قریبی ڈاکٹر صاحب کو بلا یا گیا۔ انہوں نے آ کر نائلہ کو چیک کیا۔ اچانک ماں کی موت کا منظر اس سے دیکھا نہ گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے طاقت کا انجیکشن دیا اور اسے مکمل آرام کا مشورہ دے کر چلے گئے۔ بھائی نے شہلا کو اس کے پاس ہی رہنے کی تاکید کی اور دروازہ بند کر کے پھر لاؤنج میں آ گئیں۔

نمازِ عصر کے بعد جنازے کا ٹائم تھا اور اس سے ذرا پہلے صدیقہ بھائی، محسن بھائی اور ذاکر اقبال بھی

اپنے آپ کو مضبوط رکھنا ہے۔“

”تم بتاؤ رخسانہ میرے لیے ضبط کا ایک اور امتحان شروع ہو چکا ہے۔ آخر میں ہی کیوں..... میرا کیا قصور ہے کہ میں اپنی ماں کے لیے رو بھی نہیں سکتی۔“

”تم رو سکتی ہو، ماں کی جدائی میں تو بندہ عمر بھر بھی روتا رہے تب بھی کم ہے، میری جان.....“ رخسانہ نے انتہائی دکھ سے کہا۔ ”لیکن ذرا سوچو تم خود بھی ماں بن رہی ہو اور ناں اپنی اولاد کے لیے بڑے سے بڑا امتحان دینے کو تیار ہو جاتی ہے لہذا حوصلے سے کام لو۔ نیلی ماں کی یاد میں آنسو بہانے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔“ رخسانہ اسے اپنے کندھے سے لگائے اس کی کمر سہلا رہی تھی۔

☆☆☆

رخسانہ اس کے ساتھ ہی سوئی تھی اس نے رات بھر صدیقہ بھابی اور ذاکر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد نائلہ گن میں نکلی تو بابا جان مسجد سے فارغ ہو کر گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ نائلہ سے رہانہ گیا اور دوڑ کر بابا کے سینے سے لگ گئی اور بے اختیار آنسوؤں پر قابو نہ رہا۔

بابا اسے اپنے سینے سے لگائے تسلی کے بول بولتے رہے۔

سوئم پر صدیقہ بھابی آگئیں، نیلی سے ملیں تو دونوں کو خود پر قابو نہ رہا اور نہ جانے کتنے زخم تازہ ہو گئے۔

وقار، کشف اور شہلا، علی سب لوگ نیلی کو ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے۔ اس کی صحت کے پیش نظر سب اسے حوصلہ اور تسلی دیتے رہے۔ نائلہ کے سسرال سے سب لوگ آئے۔ عامر کا فون بھی آیا۔ اس نے نیلی سے نہ رونے کی تاکید کی مبادا اس کے بچے کی صحت پر اثر پڑے۔

☆☆☆

سوئم بھی گزر گیا۔ رخسانہ بھی چلی گئی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے گھر میں بڑی پراسراری مانتنامہ پاکیزہ 247 نومبر 2016ء

قطرے نائلہ کے چہرے پر جا کرے۔

”کاش نیلی تم ہوش میں ہو تیں تو میں تمہیں بتاتی کہ وہ ظالم شخص جس کی محبتوں کو دل کے نہاں خانوں میں چھپائے تم حالات سے کپور و ماڑ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو جینے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ شخص تمہاری والدہ کے جنازے کو کندھا دینے آن پہنچا ہے شاید وہ تمہاری بے غرض محبت کی قیمت چکانا چاہتا ہے۔“ لیکن نیلی کے چہرے پر چھایا کرب اور پہلی رنگت اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے کہ اسے گہری نیند سے ڈسٹرب کیا جائے۔

صدیقہ بھابی بھی نیلی کے بیڈ کے قریب والی کرسی پر بیٹھی اس کے چہرے پر نظریں جمائے بے آواز آنسوؤں سے اپنے دلی دکھ کا اظہار کر رہی تھیں۔

آہستہ، آہستہ لوگوں کا ہجوم کم ہونے لگا۔ شام آہستہ، آہستہ رات میں ڈھل گئی تھی۔ رانی نے آکر صدیقہ بیگم کے کان میں کچھ کہا تو وہ نیلی کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے گال کو چوم کر اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور رخسانہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

ذاکر کی کل رات کینیڈا کی فلائٹ ہے وہ ملنے آیا ہوا ہے۔ صبح فجر کے ٹائم پر وہ یہاں سے نکل جائے گا۔“ رخسانہ نے چندرسی جملے ادا کیے اور صدیقہ بھابی کو وداع کر دیا۔

☆☆☆

رخسانہ سوئم کر کے جانا چاہتی تھی اس لیے وہ رک گئی تھی۔ رات دس بجے کے قریب نائلہ کی آنکھ کھلی رخسانہ کو اپنے پاس پا کر اس کے گلے لگ گئی۔ رخسانہ نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا اور نیلی کو رونے نہیں دیا۔

”دیکھو ڈاکٹر صاحب نے منع کیا ہے تم نے بالکل رونا نہیں ہے اس طرح بچے کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔ تمہیں پتا ہے تمہارا بچہ یا بچی جو بھی اس دنیا میں آ رہا ہے۔ وہ تمہارے لیے دنیا کی بیش قیمت دولت ہے، تمہاری زندگی کا سب سے خوب صورت رشتہ تمہارے وجود کا حصہ ہے، تم نے اس کے لیے

خاموشی نے ڈیرے ڈال لیے۔ تمہارے آنسوؤں کا حساب لوں کی لیکن.....“
 ”بس، بس اس سے آگے مت بولو ارم.....“
 نیلی نے التجا کی۔

”وہ دھوکے باز نہیں تھا۔ اس کا کوئی قصور نہیں، صدیقہ بھابی نے میرا ہاتھ مانگا تھا لیکن بابا نے ذات برادری کی آڑ لے لی۔ برادری کے طعنوں کے ڈر سے انہوں نے صدیقہ بھابی سے انکار کر دیا۔“
 ”یار یہ کیا منطوق ہے پھوپا جان کو برادری کے طعنوں کا زیادہ احساس تھا انہوں نے ایک بار بیٹی سے پوچھ لیا ہوتا؟“

”ایسا نہیں کہتے ارم، بابا جان میرے دشمن نہیں ہیں، برادری ازم کی ایک ریت چلی آرہی ہے لوگ دوسری برادری میں رشتے داری کر کے اپنی ناک کھوانا نہیں چاہتے۔“

”لیکن میں اس رسم کو توڑ دوں گی۔ یہ ظالم رسم نہ جانے کتنے دلوں پر گھاؤ لگاتی ہے۔“ ارم بڑے جوش سے کہہ رہی تھی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ یہ فیصلے بزرگوں کے ہیں اور ان رسموں کو بنانا اور توڑنا بھی نہیں بزرگوں کا کام ہے، ہو سکتا ہے بھی کوئی بزرگ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو۔ اور یہ فضول رسمیں ختم ہو جائیں..... شاید۔“

☆☆☆

اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پر نائلہ کو نہ پا کر بابا ٹھک گئے۔
 ”نیلی کیا ابھی تک سو رہی ہے شہلا.....؟“ ان کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

”بابا جان سردرد کی گولی لے کر سوئی ہے، میں نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ ملک صاحب کرسی سے اٹھ کر نیلی کے کمرے کی طرف گئے۔ اندر جھانکا وہ بستر میں موجود تھی۔ بابا نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بخار میں تپ رہی تھی۔

”نائلہ میری بیٹی یہ اس قدر بخار ہے تمہیں اور بتایا کیوں نہیں۔“ انہوں نے بیٹی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں

علی کے گھر والے اسی دن سوئم کر کے سرگودھا چلے گئے اور وہ اگلے دن واپس گیا۔ شہلا اور نائلہ ابھی یہیں پر تھیں وقار اور کشف نے بھی چھٹیاں لے رکھی تھیں۔ شام کی چائے اماں صفراں نے لاکر ٹیبل پر رکھی اور ٹی پاٹ سے چائے کپوں میں انڈیلنے لگی پہلا کپ انہوں نے بابا جان کی طرف بڑھایا اور دوسرا نیلی کی طرف..... کپ پکڑتے سے اس کے کانوں نے سنا کہ ڈاکر نے بھی جنازے کو کندھا دیا تھا۔ یہ وقار بھائی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ تھے کہ بجلی کا شاک..... نیلی کے ہاتھ کو جھٹکا سا لگا اور چائے تھوڑی سی چھلک بڑی اور اس کے کپڑوں پر گری۔

”سنبھل کر نیلی میری جان.....!“ کشف نے کپ اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔
 ”نہیں بھابی میں ٹھیک ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے چائے کا ہلکا سا سپ لیا۔
 ”ڈاکر آیا تھا؟“ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”ڈاکر کو کیسے خبر ہوئی کہ میری دنیا لٹ گئی۔ میری جنت چھن گئی..... وہ کیوں آیا تھا، وہ مجھے پرسہ دینے آیا تھا یا میری جنت چھن جانے کا تماشا دیکھنے؟ یا پھر کوئی اور ذمہ دینا ابھی باقی تھا؟“ چائے ختم کرتے ہی اس نے سردرد کا بہانہ کیا اور اپنے کمرے میں آگئی اور اپنے بستر میں گھس گئی۔ اچانک دروازے پر ہولے سے ٹک، ٹک کی آواز آئی اور ارم اندر آگئی۔ عائنہ بیگم کی سب سے پیاری بیٹی اور نیلی کی بیٹ فرینڈ..... کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

”سنا تم نے نیلی، تمہارا وہ ڈاکر اقبال آیا تھا؟ وہ دھوکے باز ظالم شخص جس نے میری نیلی کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی۔ میں نے جب اسے دیکھا تو وہ پھوپا جان کے جنازے کو کندھا دیے ہوئے تھا۔ ورنہ میں نے جب سنا کہ صدیقہ بھابی کے ساتھ آیا ہوا ہے تو میرا پورا ارادہ تھا کہ اسے سب کے سامنے گرجان سے پکڑوں گی۔ اور

انمول موتی

☆ اگر کوئی تم سے بھلائی کی امید رکھے تو اسے مایوس مت کرو کیونکہ لوگوں کی ضرورتیں تم سے وابستہ ہونا تم پر اس ذاتِ واحد کی خاص رحمت کی نشانی ہے۔

☆ دوستی کی زینت ایک دوسرے کی بات کو برداشت کرنا ہے۔ بے عیب لوگ تلاش کرو گے تو تمہارے جاؤ گے۔

☆ عبادت کی معراج نیکی کرنا نہیں بلکہ گناہوں کو چھوڑ دینا ہے۔

☆ کیا انسان صرف دکھ کے دنوں میں ہی بہتر بن سکتا ہے جب اس پر عذاب نازل ہوا تو توجہ کر لی مگر جب اسے سکون، آرام ملا تب ہی اس نے دوسروں کا سکون برباد کر دیا۔

مرسلہ: ایمان چو بدری، فیضان آباد

”صغران ایسا کرونا شتالے آؤ، ہم سب نیلی کے پاس بیٹھ کر پیٹ پوجا کریں گے۔ آج یہ محترمہ ہماری پیرومرشد بن گئی ہیں۔“ وقار نے اس سے کہا۔

”وقار بھائی ایسا تو مت کہیں، میں تو آپ کی گڑیا تھی ابھی چند منٹ پہلے۔“

”چند منٹ پہلے کی بات اور تھی۔ تم جانتی ہو منٹوں میں دنیا کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ہم تو آپ کو پیرومرشد بنا رہے ہیں۔“

اس ننھی منی چھیڑ چھاڑ کا مطلب صرف نالکھ کو خوش کرنا تھا ورنہ جس گھر سے دو چار روز پہلے ماں کا سایہ اٹھ گیا ہو۔ وہاں تو مہینوں تک چہرے پر ہنسی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

سب نے ہلکا پھلکا ناشنا کیا اور نیلی کو آرام کا مشورہ دے کر بابا جان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

شور و زور..... شور و زور..... فون کی گھنٹی نے نالکھ کو

ماہنامہ پاکیزہ 249 نومبر 2016ء

میں تمام لیا۔ نیلی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ پوٹے بڑے بھاری ہو رہے تھے۔

”جی بابا جان.....“ اس نے آنکھیں پھر میچ لیں۔ ”اٹھو بیٹا، اٹھ جاؤ گھر میں دو، دو ڈاکٹر موجود ہیں اور تم بخار میں تپ رہی ہو۔“ بابا نے پیشانی چوم لی۔

نیلی نے آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی بابا نے بازوؤں کا سہارا دیا اور گاؤٹکے کے ساتھ ٹیک لگا کر اسے بٹھا دیا۔

”بابا جان پانی.....؟“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”ابھی لایا بیٹا۔“ وہ تیزی سے باہر نکلے، کشف اسی طرف آ رہی تھی۔

”نیلی بخار میں تپ رہی ہے گھر میں دو، دو ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے۔“

”کیوں خیریت بابا جان میں ابھی دیکھتی ہوں۔“ وقار اور شہلا ابھی ٹیبل سے اٹھ کر اُدھر لکے۔

کشف نے چیک کیا اور کچھ دوائیں تجویز کیں جو گھر میں موجود تھیں شہلا نے دوا کھلانے سے پہلے جائے کا ایک کپ نیلی کو پلایا۔ پھر دوا کھلائی اسے تسلی دی۔ انتہائی نرمی سے کندھے دبائے اور پھر اسے لٹا دیا۔

”میں اتنی بھی بیمار نہیں شہلا بھئی..... آپ لوگ کیوں فکر مند ہیں، میں تو ابھی اٹھ کر باہر آنے والی تھی۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”ہرگز نہیں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے گڑیا۔“ وقار نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے کہا۔

”آپ لوگ نہیں جانتے میں کتنی بہادر ہوں وقار بھائی۔“

”جی نہیں آپ بہادر نہیں، آپ بہادر بننے کی کوشش کر رہی ہیں، ہم بھی ڈاکٹر ہیں اور اپنے مریض کی ہر اواسے واقف ہیں۔“ وقار نے بی پی اپریٹس سے ہوا نکال کر کور میں رکھتے ہوئے کہا۔ سب لوگ بننے

لگے تاکہ کمرے کی سونگھاری کے اثرات ڈراما کم ہوں۔

اپنی طرف متوجہ کیا، اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا لیا۔

”ہیلو، جی ٹانگہ بات کر رہی ہوں۔“

”خالہ جان کی اچانک وفات کا سن کر بڑا دکھ ہوا۔“ عامر نے سلام دعا کے بعد بڑا احسان بھرا جملہ ادا کر دیا۔

”آپ کا بہت، بہت شکریہ.....“ اس نے دیکھی آواز میں کہا۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ ٹھیک ہو ناں.....؟“ وہ بڑے خشک لہجے میں بولا۔

”جی عامر، میں ٹھیک ہوں۔“

”دیکھو جلدی گھر جانے کی کوشش کرنا یہاں بھاگ دوڑ میں بیمار نہ پڑ جانا۔ اس طرح بچے کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔“

”دیکھیں عامر، ای جان کو گئے آج تیسرا دن ہے، میں کیسے جلدی گھر چلی جاؤں، آپ کو ذرا احساس نہیں میری جنت لٹ گئی ہے اور آپ کو اپنے بچے کی فکر ہے۔“ اس نے بڑی جرأت کر کے کہا۔

”دیکھو بی بی سب کو اس دنیا سے چلے جانا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا میں آنے والوں کا رستہ کھوٹا کر دیں۔ تم ماں کے غم میں بیمار پڑ گئیں تو میرا تو نقصان ہو گا نا۔“

”آپ کس قدر سفاک انسان ہے یہ۔“ ٹانگہ تڑپ اٹھی۔ ”مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور اس سفاک ظالم کو صرف اپنے بچے کی فکر ہے۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔

”ٹھیک ہے اللہ حافظ، میں پھر بات کروں گی کچھ مہمان آگئے ہیں۔“ اور ٹانگہ نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس نے انتہائی کرب سے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

☆☆☆

زندگی میں بڑے بے کیف اور تکلیف دہ دنوں کی شروعات ہو چکی تھی۔ ای جان کی جدائی، عامر کا کٹھور پن ان سے بڑی تکلیفیں بھلا کر لیا ہو سکتی تھیں۔ دن

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 250 ﴾ نومبر 2016ء

گزارتے جا رہے تھے۔

چالیسویں کے بعد امام صاحب اور صفیہ بیگم اسے ساتھ گھر لے آئے۔ اپنے کمرے کی سوگوار نقشا اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگی۔ بھابی اس کا بہت خیال رکھتیں، بچے بھی اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے..... لیکن جب دل کی دنیا ہی ویران ہو تو دل بہلتا کیسے؟

”تمہیں اس معصوم جان کے لیے ہی اپنا خیال رکھنا چاہیے۔“ بھابی نے بڑی محبت سے اسے دودھ میں کھیلان گھول کر دیتے ہوئے کہا۔

”بھابی جان کسی چیز کو دل نہیں مانتا کیا کروں..... مجھے لگتا ہے میں اس ننھے وجود کو دنیا میں نہیں لاپاؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو چٹک پڑے۔

”بکوست..... اللہ نہ کرے کبھی ایسا لفظ زبان پر مت لاتا۔“ بھابی نے اسے مصنوعی ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

”چلو دودھ پیو اور آرام کرو۔“

☆☆☆

بے شمار دن گزارے تو ایک ننھا سا وجود اس دنیا میں آ گیا۔ ٹانگہ نے پہلو میں لٹے ہوئے اس جیتے جاگتے کھلونے کو دیکھا تو ٹوٹ کر پیا ر آیا۔ اس نے بے اختیار اسے چوم لیا۔ ”کس قدر پیارا ہے یہ بچہ اور میں اس کی ماں.....“ یہ سوچ کر اس کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ ”تیرا شکر ہے میرے مولا۔“ گھر میں خوشیوں کا اک سماں بندھ گیا۔

امام صاحب نے پوتے کی پیشانی چوم کر اس کا نام دلی تجویز کر دیا سب نے اس سے اتفاق کیا۔ عامر خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ اپنی ماں کو گھنٹوں فون کرتا..... اور بچے کے بارے میں باتیں کرتا۔

”مبارک ہو آپ کو.....“ ننھی نے فون پر عامر کو مخاطب کر کے کہا۔

”خیر مبارک بھئی..... ہمارے دلی عہد نے دنیا میں آ کر ہمیں خوش کروایا۔ میں تو اسے دیکھنے کے لیے

تھی، کبھی دن بہت اداں ہوتا تو آؤ نوکیٹ نکال کر سن لیتی۔ جب تم اکیلے ہو گے ہم یاد آئیں گے۔

☆☆☆

آج ول بڑا اداں تھا۔ بھائی اور بھابی جان عمرے پر جانے کے لیے تیار تھے، گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ مہمان آ جا رہے تھے۔ کچن سے ہر وقت کھانوں کی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ ملازمہ بھی اب بوڑھی ہو چکی تھی اس لیے اپنی کبھی کو ساتھ لے آئی تھی۔ سلٹی بڑی پھر تلی تھی اس نے سارے گھر کو سنبھال رکھا تھا۔ کل صبح دس بجے کی فلاٹ تھی۔ باقر بھائی اور بھابی رات کو ہی اسلام آباد روانہ ہونے والے تھے۔ نیلی کو بابا جان شدت سے یاد آ رہے تھے۔

شام کو بھابی ثروت اور باقر بھائی نے تیاری مکمل کر لی۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانے کے بعد بھائی باقر سب گھر والوں سے مخاطب تھے۔ ارسل اب بڑا تھا۔ اس کے سپروواری میں سارا گھر دیا جا رہا تھا۔ طوبی اس کی بیگم بڑی ڈسے وار بھی تھی... بھابی عامر اور نائلہ کو بھی آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہی تھیں۔

نیلی تو ویسے بھی سب کا خیال رکھنے والی تھی۔ باہر گاڑی کے ہارن کی آواز پر سب لوگ ٹیبل سے اٹھنے لگے، عامر، ارسل اور طوبی کے ساتھ اتر پورٹ جا رہے تھے۔ جو بیچے پڑھائی سے چھٹی کر سکتے تھے وہ ساتھ اور باقی سب نیلی ماما کے پاس گھر میں ہی موجود رہیں گے۔ ملازمہ رانی تو ویسے بھی واویلوں کی طرح بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی لیتی تھی اور گھر کا ہر طرف سے خیال رکھتی تھی۔

سب لوگ جب گاڑی میں بیٹھنے لگے تو نیلی بانس کی تیلیوں سے بنی ایک باسکٹ میں گلاب اور موہیے کے پھول لے کر آ گئی۔

پھولوں کی ٹوکری دونوں ہاتھوں میں تھام کر ثروت بھابی کی طرف بڑھ گئی۔

بھابی جان میرے پاس اور کچھ نہیں بس یہی

بے چین ہو رہا ہوں۔ وہ اپنی دھن میں مسلسل بول رہا تھا۔ اس کی تمام گفتگو میں کہیں نائلہ کی محبت میں دو لفظ نہیں تھے۔ نائلہ کا سارا وجود جل رہا تھا۔ دکھ سے اس کے آنسو نکل آئے۔

”اے میرے پروردگار کیا نصیب لکھتے ہوئے لفظ محبت میرے حصے میں لکھنا تو بھول گیا۔ آخر میرا کیا تصور ہے میں تو پاؤں تلے مسلی جانے والی چیونٹی کو بھی اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتی ہوں کسی کا دکھ برداشت نہیں کر سکتی مولا لیکن تیری یہ دنیا اتنی سفاک کیوں ہے؟“

☆☆☆

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے گھومتا رہا دن ہفتے اور ہفتے، مہینے اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ بالوں میں چاندی اتر آئی۔

نائلہ کے آنگن میں خیر سے چار پھول کھل چکے تھے، ولی یونیورسٹی جوائن کر چکا تھا۔ نجر میٹرک میں تھی محمد اور انیس دونوں بہن، بھائی ٹرل میں تھے۔ عامر پاکستان واپس آ کر اپنا بزنس سیٹ کر چکا تھا۔

بھابی اور بھائی جان وقفے وقفے سے بچوں کی شادیاں کر رہے تھے۔ عاشر نے اسلام آباد میں بہت بڑا گھر بنایا تھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کبھی کبھار پاکستان آتا تھا۔ گھر ٹوکروں کی وجہ سے آباد نظر آتا تھا۔ امام صاحب اور صفیہ بیگم اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

نائلہ کے بابا جان حج اکبر کی ادا کئی کے فوراً بعد مکہ میں ہی وفات پا گئے تھے اور انہیں وہیں پر دفن کر دیا گیا تھا۔ وقار اور کشف اپنے دو بچوں کے ہمراہ سویڈن میں آباو تھے۔ شہلا اور علی اپنی فیملی کے ساتھ کراچی شفٹ ہو چکے تھے۔ شہلا کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ ارم کے ہاں دو بیٹیاں تھیں اور بڑی پیاری سی... رخسانہ سے فون پر ہیلو ہائے آج بھی تھی، وہ ایک بیٹے کی شادی کر چکی تھی اور بانی بھی اب جوان تھے۔

عامر اور نیلی آج بھی ریل کی دوپٹریوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ عامر اپنے کاروبار میں مگن تھا اور نائلہ گھر والے وارڈوں سے بے پروا آ رہی تھی۔

تمام رات یادوں کی یلغار نے اسے ہمیں سے
سونے نہ دیا۔

کبھی عامر کی کثور طبیعت کا دکھ تازہ ہو جاتا اور
اپنی انسلٹ محسوس ہونے لگتی لیکن کہیں پر عامر کی محبت
چھن جانے کا احساس دل میں پھل مچا دیتا۔

ثروت بھائی ٹھیک کہتی ہیں کہ ہر انسان اپنی
زندگی کے خانوں میں کہیں نہ کہیں ان فٹ ہے۔

تمام رات خیالات کا ہجوم اس کے گرد دائرے
کی شکل میں موجود رہا نہ جانے کب رات تمام ہوئی اور
کب وہ جانماز پر بیٹھی اپنی دعاؤں میں اپنے رب سے
دل کا قرار مانگتی ہوئی اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی
کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

وقت بے لگام گھوڑا ہے جو بھاگتا چلا جاتا
ہے۔ کون پیچھے رہ گیا۔ کس نے کیا پایا، کیا کھویا اسے
کچھ غرض نہیں کسی سے، اس کا اپنا اسٹائل ہے، وقت
کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آئیں۔

باقر بھائی کی زارا کی شادی ولی سے ہو گئی۔ ولی کو
پی ایچ ڈی کے لیے امریکا جانا تھا۔ عامر نے اسے شادی
کے بندھن میں باندھ دیا اور زارا کو ساتھ بھیجنے کی کوشش
کرنے لگے۔ فجر اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھی اور اس کی شادی
بتول پھوپھو کے بیٹے مظاہر سے کر دی گئی۔ بتول پھوپھو کی
سارہ بیواہ کرا اسلام آباد عاشق کی بہو بن گئی تھی۔ عاشق کا بیٹا
احمر ہارٹ اسپیشلسٹ تھا اور سارہ بھی ڈاکٹر تھی۔

عامر اپنے بھائی عاشق کے بیٹے کی شادی میں
شامل نہیں ہوا تھا۔ بتول آیا کے گھر بھی شادی
میں صرف ایک دن ہی شرکت کی تھی تاکہ مونا اور عاشق کا
سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ عامر کا دوسرا بیٹا احمد یونیورسٹی
میں کسی لڑکی کو پسند کرتا تھا اس لیے عامر کا ارادہ تھا کہ
تعلیم مکمل کرتے ہی اس کی شادی اس کی پسند سے
کر دی جائے گی۔ امینہ کو باقر بھائی نے اپنے بیٹے
موسیٰ کے لیے مانگ لیا تھا۔

☆☆☆

پھول ہیں، یہ بابا جان کی قبر پر ڈال دیجیے گا اور کہیے گا
کہ اتنی لمبی جدائی کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“
آنکھیں سادوں بھادوں برسار ہی تھیں اور بھائی بھی
نبلی کو گلے لگا کر بے اختیار رو پڑی تھیں۔ باقر بھائی نے
نبلی کو اپنے ساتھ لگایا۔

”نہیں بیٹا دل چھوٹا نہیں کرتے وہ تو بڑی اچھی
جگہ پر دفن ہیں وہ جگہ تو سب کا خواب ہے۔“ لیکن نبلی
کی آواز ہچکیوں میں بندھ گئی۔

☆☆☆

ثروت بھائی گھر سے کیا گئیں کہ ساری رونق بھی
ساتھ ہی لے گئیں۔ گھر میں اک عجیب اداسی کا
ساما حول لگ رہا تھا۔ بچوں کو ان کے کمروں تک پہنچا
کر سونے کی تلقین کر کے نائلہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

نبلی روشنی میں نائلہ نے الماری کا سیف کھولا
اس میں سے وہی من پسند آڈیو کیسٹ نکالی ٹیپ
ریکارڈر میں لگائی اور مین دبا کر گول ٹیکے سے ٹیک لگائی
اور آنکھیں میچ لیں۔

”جو نہ سوچا تھا وہ ہو گیا کیا نصیب میرا کھو گیا
غم کی ایسی گھٹا چھا گئی چھین دل کا کہیں کھو گیا
کیا کہیں دور تک روشنی کا نہیں ہے نشان
بے رحم آسمان میری منزل بتا ہے کہاں“
بڑی مدھم آواز میں ذاکر اقبال دردی اک داستان
سارہا تھا۔ وہ حسب عادت آنکھیں بند کیے پرسوز آواز
سن رہی تھی کہ آنکھیں بے آواز نیر بہا رہی تھیں۔

”ذاکر تم کہاں جا کر آباد ہو گئے، کیا تمہیں
میرے والدین کا جواب برا لگا تھا یا تم نے میری
خاموشی کو محبت کا انکار سمجھ لیا تھا۔ اگر یہ بھی نہیں تو پھر تم
محبوبوں کو فلٹ سمجھتے تھے۔ اظہار محبت تمہارے لیے
ایک ہلکی پھلکی شرارت تھی اور یہی شرارت شاید تمہارا
مشغلہ ہو، ذاکر اقبال تم پڑھے لکھے ایک آئیڈیل سی
شخصیت کے مالک تھے۔ یہ شرارتیں یہ مشغلہ آخر تم نے
کیوں اپنایا؟ تمہیں یہ احساس کیوں نہ ہوا کہ تمہاری
چھوٹی سی شرارت کسی کا عمر بھر کا روت بن جائے گی۔“

جی! اچھا! میں تیار ہو جاتی ہوں۔ اس نے نظریں جھکا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ آنکھوں میں مچلتے ہوئے پانیوں کے آگے بند باندھنے کے لیے اسے آنکھوں کو جھکا کر باہر نکلنا پڑا۔

یوں پھر ڈاکٹر رمیض کی بیگم نے جنت کی والدہ تک یہ خبر پہنچا دی کہ جنت جس کی پسند ہے اسی کے سپرد کر دی جائے تاکہ بچھتاؤں کی آگ میں عمر بھر جلنے سے بچ جائے اور یوں جلد ہی حمد کی مقلی جنت سے کر دی گئی۔

عامر بہت خوش تھا کہ کم از کم اس کے بیٹے کو اس کی پسند کا جیون ساتھی مل گیا اور نالکہ اس لیے خوش تھی کہ دو مختلف برادریوں نے آپس میں رشتے داری کر کے برادری کلچر کو ختم کرنے میں بارش کا پہلا قطرہ بننے کا ثبوت دیا۔

☆☆☆

چند ماہ بعدا بیض کی شادی موسیٰ سے اور حمد کی شادی جنت سے کر دی گئی۔ عامر کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور اسی خوشگواریت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نالکہ نے ناشتے کی ٹیبل پر عامر کی پلیٹ میں کھن لگے سلاکس رکھتے ہوئے ایک سوال کر دیا۔

”عامر میں نے بھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج آپ سے ایک سوال ہے؟“ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

”بولو کیا چاہیے؟“ عامر نے چائے کا کپ منہ کے قریب لے جاتے ہوئے ٹیبل پر واپس رکھ دیا۔

سب بچے ایک دم متوجہ ہو گئے۔

”میں عمرے پر جانا چاہتی ہوں۔“

”دیری گڈ ماما.....“ ولی اور حمد ایک ساتھ بولے۔

”لیکن کیسے..... کس کے ساتھ..... مطلب میں تو فارغ نہیں ہوں۔“ عامر بولا۔

”میں آپ کے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتی..... میرا مطلب ہے میں بالکل اکیلے جانا چاہتی ہوں..... میں عمرہ ویزا لگوا کر جاؤں گی پورا رمضان وہیں گزاروں گی اور حج ادا کرنے کے بعد ہی واپس پاکستان آؤں گا۔“

ماہنامہ پاکیزہ 253 نومبر 2016ء

نبی نے نبی کو ہی مانتا ہے۔ آج کی دنیا میں کسی کی آنکھ جو پر غم نہیں ہے نہ سمجھو یہ کہ اس کو غم نہیں ہے۔ کنارہ دوسرا دریا کا جیسے وہ ساتھ ہے مگر محرم نہیں ہے۔ امجد اسلام امجد کی اس شاعری نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ سننے میں محو تھی کہ عامر دندناتا ہوا لادنج میں داخل ہوا۔

”اگر تمہیں اپنے غموں پر ماتم کرنے سے فرصت ملے تو میری بات سن لیتا۔“ کہتا ہوا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور نبی کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ جلدی سے عامر کے پیچھے ہی کمرے میں گھس گئی۔

”جی آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھ سے؟“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”کچھ اولاد کی ذمے داریوں میں بھی دلچسپی لو اب غزلوں کا پیچھا چھوڑ دو۔“

”کیا ہوا ہے مجھے کچھ بتائیں بھی تو؟“

”حمد جس لڑکی کو پسند کرتا ہے سنا ہے اس کا رشتہ کہیں اور ہونے لگا ہے ڈاکٹر رمیض ان کے ساتھ والے گھر میں رہتا ہے تیار ہا تھا کہ ظفر صاحب کی بچی جنت میری بیٹی فاطمہ کی کلاس فیلو ہے اور فاطمہ کا کہنا ہے کہ جنت کے لیے کوئی رشتہ آیا ہے، ساری فیملی ناروے میں سیٹل ہے۔ میں کہتا ہوں تم فوراً تیار ہو جاؤ، ڈاکٹر رمیض کے گھر چلیں ان کی بیگم کے ذریعے ان تک پیغام پہنچائیں کہ جنت میرے بیٹے کی پسند ہے اور میں ہر قیمت پر اس کا رشتہ لینے پر تیار ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ حمد بھی میری طرح برباد ہو جائے، اس کے گلے میں بھی میری طرح غم کا طوق ڈالنا پڑ جائے..... میں اسے ہر قیمت پر خوشیاں دوں گا۔“ وہ بے اختیار بولے جا رہا تھا اور نالکہ سر سے لے کر پاؤں تک گویا آگ کی بھٹی میں جلنے کے لیے ڈال دی گئی ہو۔

”تو کیا میں عامر کے گلے میں غم کا طوق کی حیثیت میں ہوں؟ کیا عامر کی بربادی کی ذمے داری میں ہوں؟ لیکن میں کس کو گریبان سے پکڑ کر اپنی بربادیوں کا حساب لوں؟“

کی۔ وہ بلا بھجک کے بغیر بول رہی تھی۔

لیکن پاپا سے رقم لینا آپ کا حق ہے۔“ بڑی

بہوڑا رابولی۔

”یہ سب کچھ تم کیوں کر رہی ہو نائلہ بی بی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔ تمہیں جتنے پیسوں کی ضرورت ہے تم لے سکتی ہو میں تمہیں خدا کے گھر جانے سے کیسے روک سکتا ہوں۔“ عامر بولا۔

”نہیں عامر صاحب مجھے آپ سے کچھ نہیں

چاہیے، آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں آدھی صدی پہلے جب آپ کی زندگی میں آئی تو آپ نے اپنی محرومیوں کا بدلہ لینے کے لیے لمحہ، لمحہ اپنے اور میرے درمیان غیر محسوس طریقے سے ایک دیوار چھنی شروع کر دی۔ آہستہ، آہستہ وہ دیوار اتنی بلند ہوئی گئی کہ آسمان کو چھونے لگی۔

میں اپنی محرومیوں کا بدلہ آپ سے نہیں لینا چاہتی تھی کیونکہ مجھے آپ جیسا نہیں بننا تھا۔ میں اپنے آنسوؤں کو چھپائے، اپنے رب سے انصاف طلب کرتی رہی۔۔۔ اور

میرا رب۔۔۔ میرا رب جو دو جہانوں کا والی ہے جو ایک ماں سے بھی ستر گنا بڑھ کر اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ وہ پروردگار اپنے اور میرے درمیان دیوار کیسے کھڑی کر سکتا تھا..... دیواریں تو ہم گناہ گار کھڑی کرتے ہیں، وہ تو اوپر بیٹھا انصاف کا ترازو ہاتھ میں لیے سب کے ساتھ انصاف کرتا آ رہا ہے پھر میں اس کی رحمتوں سے جھولی کیسے نہ بھر پاتی۔“

نائلہ کسی بھجک کے بغیر بول رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ کسی نے اسے ٹوکا نہیں، اسے رونے دیا خوب رونے دیا تاکہ آدھی صدی پہلے سے دل و دماغ پر پڑا ہوا غبار دھل جائے اور وہ ہلکی پھلکی ہو جائے..... ذرا سے مزید برداشت نہ ہوا تو اس نے اٹھ کر نائلہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

”بس کریں ماما آپ نے بہت رولیا اس سے زیادہ میں آپ کے آنسو نہیں دیکھ سکتی۔“ جنت بھی اس کا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں لیے سہلا رہی تھی، بار بار چوم رہی تھی۔

”آپ سب کو پتا ہے کہ بلال ماموں اپنی نیلی سمیت جدہ میں مقیم ہیں، میں سیدھی ان کے پاس جاؤں گی انہی کے پاس ٹھہروں گی اور حج بھی ماموں جان کے ساتھ کروں گی، اور پھر جب دل چاہا واپس آ جاؤں گی اور اس کے لیے مجھے جتنی رقم چاہیے میرے اکاؤنٹ میں موجود ہے اس کے علاوہ مجھے ایک روپیہ نہیں چاہیے۔“ وہ بلا نکان بولتی چلی گئی اور نیلی پر بیٹھے سب لوگ حیران ہونے لگے خاص طور پر عامر پھٹی، پھٹی آنکھوں سے نیلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”مگر پوچھنا پڑے گا کہ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے.....“ عامر کے منہ سے نکلا۔

یہ آدھی صدی بعد اس بے زبان عورت کو بنا بھجک بولتے دیکھ کر عامر اور اس کے بچے حیران ہو رہے تھے۔

ولی اور محمد دونوں نے اٹھ کر ماں کے گرد ایک حصار بنالیا۔

”ماما یقین نہیں آ رہا کہ یہ آپ بول رہی ہیں، اور پاپا کے سامنے بے دھڑک بات کر رہی ہیں۔“

”ماما میں تو آپ کو شروع سے ایسے ہی اپنے حق کے لیے بولنے والی خاتون کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن آپ نے آج تک اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنی گوارا نہیں کی۔“ ولی نے ماں کی پیشانی کا بوسہ لے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ کو جتنے بھی پیسوں کی ضرورت ہے، پاپا آپ کو دیں گے، یہ ان کا فرض ہے۔“ حمد اور جنت بولے۔

”نہیں بچوں، مجھے عامر امام کی رقم کی ضرورت ہرگز نہیں ہے، میرے پیارے رب نے میرے حج کی رقم کا بہت پہلے بندوبست کر دیا تھا اگر بندوبست نہ بھی ہوتا تو میں عامر صاحب سے ایک روپے کا بھی مطالبہ نہیں کرتی۔“

عامر امام ابھی تک ہکا بکا سکتے کے عالم میں نظر آ رہا تھا۔ اس کی چائے رکھے، رکھے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

گلے مل رہی تھی۔ عامر اتر پورٹ پر نہیں آیا تھا۔ اسے عمر بھر کی شرمندگی نے نہیں آنے دیا یا پھر عاشر اور مونا اس کی وجہ تھے۔

جہاز نے براستہ کراچی جہدہ کے لیے روانہ ہونا تھا اور کراچی اتر پورٹ پر شہلا اور علی بھی ملنے آگئے تھے۔

☆☆☆

جہدہ اتر پورٹ پر اس کی دنیا ہی بدل گئی اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ یوں خدا کے گھر کبھی پہنچ سکے گی۔

ماموں جان اپنی فیملی کے ساتھ اتر پورٹ پر موجود تھے۔

کشم کے دوران میں اسے اپنے سامان سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑا سا چرمی بیگ نظر آیا۔ جس پر درج تھا۔ ڈاکر اقبال ایل فرام کینیڈا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سر کھومنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتی، اس نے ستون کا سہارا لیا اور پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر چند ساعتوں کے بعد اسے لگا کہ کوئی اس کے ہونٹوں سے پانی کی بوتل لگائے اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک گھونٹ اس نے اپنے حلق سے اٹارا اور آنکھیں کھولیں۔ اٹھارہ بیس سال کی بچی اسے پانی پلا رہی تھی۔

”بیٹا میں کہاں ہوں اور آپ کون؟“
”جی یہ ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھنے آئے ہیں، میں ماہین ہوں اور یہ میرے دادا جان ڈاکر اقبال ہیں، ہم کینیڈا سے عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔“ نائلہ کی آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔

”لو، نو مس..... اس راستے سے واپسی ناممکن ہے، آپ جس سمت کا رخ کریں گی اپنی راہ گزر میں اس خاکسار کو پائیں گی۔“ وہ حیران و پریشان اپنے سامنے کھڑے اس بارہلش آدمی کو دیکھ رہی تھی۔



شہزادے سے دنگے کے بعد وہ دوبارہ بوسے لگے گی۔

”عامر صاحب آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے لیے رقم کا بندوبست تو میرے مالک نے بیٹھے بیٹھائے کر دیا تھا۔ وہ اس طرح کہ بابا جان جب ہم سب سے آخری بار مل کر حج اکبر پر روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے وہ رقم جو امی جان کے حج کے لیے بینک میں بہت پہلے رکھوائی تھی، وہ میرا اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں جمع کرادی بلکہ اس سے کہیں زیادہ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردی اور خود ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔“ وہ پھر آنسوؤں کی لڑیاں پروردہ ہی تھی۔

”میں خاموشی سے دقت کا انتظار کرتی رہی کہ فجر اور ایض اپنے گھروں کی ہو جائیں اور بیٹے اپنی زندگی کے ساتھی جن میں حج پر چلی جاؤں گی۔ شاید ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں کیونکہ بابا جان بھی تو دعویٰ پر ہیں۔“ اس کی داستان ختم ہوئی تو ایک دم خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

پھر ڈیڑھ دو ماہ بعد وہ دن بھی آن پہنچا جب وہ گلے میں گلابوں کے ہار ڈالے سب سے رخصت ہو رہی تھی۔

ثروت بھابی، باقر بھائی اور سب کے بچے بڑے گھر میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ ایک عید کا سا گمان ہو رہا تھا۔ خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ سب کی ٹیلی فون کی گھنٹی پار بار بج رہی تھی۔

باہر دیکھیں پک رہی تھیں۔ قریبی رشتے دار بھی اکٹھے ہو چکے تھے۔ جن میں ارم بھی پیش پیش تھی۔

دقت رخصت آنسوؤں کی برسات میں رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اس نے عامر امام سے غلطیوں کی معافی مانگی، عامر خود بھی شرمندہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ دو تین گاڑیوں میں گھر کے افراد اسے اسلام آباد تک چھوڑنے گئے وہاں عاشر اور مونا بھی نائلہ سے ملنے پہنچ چکے تھے۔ اتر پورٹ پر ایک ہجوم سا تھا۔

فلائٹ کا وقت ہوا تو وہ کھلی پاکوں سے سب کو

ان کو عادت ہے بھول جانے کی

شائستہ زریں

جی کو برا تو نہیں منانا چاہیے ناں!
ہم نے چند خواتین سے معلوم کیا کہ ”عموماً آپ
کے شوہر نامہ دار کیا بھول جاتے ہیں جس سے آپ کو بہت
شکایت ہے؟“ آپ بھی شکایت بھری حکایتیں پڑھیے۔

مہناز رحمن

(ریزیڈنٹ ڈائریکٹر عورت فاؤنڈیشن۔ اہلیہ
احفاظ الرحمن ممتاز صحافی)

شادی کے ابتدائی سالوں میں ظاہر ہے شادی کی
سالگرہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن انہیں کبھی یاد نہیں
رہتی تھی۔ ہر یار میں اہتمام کرتی اور ان کے لیے تحفہ بھی
خرید کر رکھتی تھی۔ ان کو یاد نہیں رہتا تھا یہ ۱۹۷۹ء
یا ۱۹۸۰ء کا ذکر ہے میری ایک سہیلی کچھ بیٹھا بنا کر لائی
اور ان کا منہ بیٹھا کروا کر بولی کہ آج سے آپ میرے
منہ بولنے بھائی ہیں۔ اگلے روز ہماری شادی کی سالگرہ



مہناز رحمن

معزز قارئین! السلام علیکم!
بھول جانا تو رسم دنیا ہے
آپ نے کون سا کمال کیا
اور جب لوگ یہ کمال کر دکھاتے ہیں، غضب ہی
تو ڈھالتے ہیں ناں۔ بھولنے کا عارضہ اب عام ہوتا
جا رہا ہے کبھی یہ شکایت ضعیف العمری سے مشروط
تھی، اب اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں رہی۔ تعلق کی
نوعیت خواہ کوئی سی ہو جس سے آپ کی توقعات وابستہ
ہوتی ہیں اس کا بھول جانا بہت گراں گزرتا ہے۔ اکثر
خواتین شاکی ہوتی ہیں کہ ہمارے میاں کو تو کچھ یاد ہی
نہیں رہتا۔ ایک خاتون کی تو حیرانی ہی نہیں جارہی
تھی۔ حیرت ہے انہیں گھر آنا کیسے یاد رہ جاتا ہے؟ اس
سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شکر کے مقام پر بھی
لوگ ناشکری کرتے ہیں۔ بیویوں کی ایک قسم وہ بھی
ہے جن کا دعویٰ ہے کہ اپنے مطلب کی ساری باتیں یاد
رہتی ہیں، ہماری کبھی ہر بات بھول جاتے
ہیں۔ بالخصوص شادی کی تاریخ یاد نہ رکھنے کی شکایت تو
ہر دوسری بیوی کرتی نظر آتی ہے۔ ایک خاتون نے
اپنے میاں کی یادداشت کا امتحان لینے کی نیت سے اپنی
شادی کی سالگرہ کی تاریخ بتا کر کہا آپ کو یاد ہے آج کیا
خاص بات ہے میاں نے پُر جوش جواب دیا ہاں کیوں
نہیں پاک بھارت بیچ کا قائل ہے ناں اور جواب میں
موصوفہ مسکرا کر رہ گئیں۔ واقعی یادداشت تو بہت اچھی
لیکن اپنے مطلب کی۔ کبھی کبھی بہت معمولی اور کبھی
بہت اہم بات بھلا دینا بھی اکثر شوہروں کا خاصہ ہے۔

ایسے میں اگر بیگمہ منہ دہنر شکایت بھول دیں تو صاحب

ماہنامہ پاکیزہ 256 نومبر 2016ء

دفتر سے آتے ہی گرما گرم چائے کی
پرزور فرمائش ہوتی ہے۔ جو فوراً پیش بھی کر دی جاتی



پروفیسر خالدہ سمیع

ہے لیکن اکثر چائے پینا بھول جاتے ہیں۔ سبب؟ کبھی
آنکھ لگ جاتی ہے اور کبھی کوئی ضروری فون آجاتا ہے
اور یہ چائے پینا بھول جاتے ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو
جاتی ہے۔ نیند پر تو اختیار نہیں لیکن مجھے یہی گلہ رہتا ہے
کہ پہلے سکون سے چائے پی لیجیے پھر فون کال بھی سن
لیں اور آرام بھی کر لیں۔

خالدہ مظهر

(گھریلو خاتون۔ اہلیہ مظہر قریشی۔ سابق بنگر)

آر۔ جے ایف ایم (۱۰۵)

ان کو رات گئے تک مطالعے کی عادت ہے۔
دوران مطالعہ تیز گرم چائے طلب کرتے ہیں جو میں
فوری پیش بھی کر دیتی ہوں اور جب میں کپ اٹھانے
کے لیے جاتی ہوں تو یہ دیکھ کر مجھے بہت کوفت ہوتی ہے
کہ حسب عادت مطالعے میں غرق ہو کر چائے پینا
بھول جاتے ہیں۔ کھولتی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو چکی ہوتی
ہے اور یہ ٹھنڈی چائے ایک ہی گھونٹ میں پی کر

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 257 ﴾ نومبر 2016ء

تھی جو حسب سابق انہیں یاد نہ تھی۔ یہ میری سبکی یعنی
اپنی منہ بولی بہن کے لیے ایک مہنگا سا جوڑا خرید کر
لائے۔ گھر میں داخل ہوئے تو میز پر ٹیک اور تھکے سجا
ہوا تھا۔ یہ بہت پشیمان ہوئے کہ میرے لیے کچھ نہیں
لائے۔ کہنے لگے یہ جوڑا تم رکھ لو۔ میں نے کہا یہ آپ
نے اپنی منہ بولی بہن کی نیت سے خریدا ہے۔ اسے ہی
دیں، مجھے خوشی ہوگی۔ اور محض ہماری شادی کی سالگرہ
کی کیا بات ہے۔ انہیں اپنی، میری اور بچوں کی سالگرہ
کا دن بھی یاد نہیں رہتا۔ بھول جاتے ہیں۔

رشیدہ رضی حیدر

(سابق سرکاری آفیسر۔ اہلیہ خواجہ رضی حیدر، نامور محقق)

ہمارے میاں نامور محقق ہیں۔ دنیا بھر کی
شخصیات کی تاریخ ولادت مع سن اور دن کے یاد
رہتی ہے۔ لیکن اپنے صرف تین عدد بچوں کی
سالگرہ کی تاریخ بھول جاتے ہیں۔ ان کی
مصرفیت کی وجہ سے اور باتوں کا تو نگلہ نہیں کرتی



رشیدہ رضی حیدر

لیکن ان گنت شخصیتوں کی تاریخ یاد رکھنے اور
مرتب کرنے والے شخص کو صرف تین تاریخیں یاد
نہیں رہیں اور وہ بھی اپنے بچوں کی سالگرہ کی
تاریخ۔۔۔ کل نو ہرگاناں۔

کپ واپس کر دیتے ہیں۔ یہ معمول کا قصہ بن گیا ہے۔ اب اس کا کیا گلہ کروں۔
کہ آج ۱۲ فروری ہے اور وہ سالگرہ کی مبارکباد دینے کے ساتھ تحفہ اور پھول بھی لے کر آتے ہیں۔



شاہانہ جاوید

ہما سلیم

(گھریلو خاتون، اہلیہ محمد سلیم مغل۔ معروف صحافی،
استاد جامعہ اردو)

کیے وعدے پورے نہیں کر پاتے، وقت و سے کر بھول جاتے ہیں۔ صرف مجھے ہی نہیں کسی کو بھی اور ایسا صرف اور صرف مصروفیت کی وجہ سے ہوتا ہے، وعدہ خلاف نہیں ہیں۔ جب بچے چھوٹے تھے تو میری بڑی بیٹی امیرہ کو جو نیشنل موٹیسوری میں پڑھتی تھی اسے اسکول

چھوڑ کر دفتر چلے جاتے۔ امیرہ کی چھٹی ہوتی تو اسے ای کے گھر چھوڑ دیتے اور دفتر سے واپسی میں گھر لے آتے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ امیرہ کو اسکول سے گھر لانا بھول گئے، چھٹی کے بعد تین بجے تک اسکول میں رہی پھر اسکول سے ای کے گھر فون آیا کہ بچی کو لے جائیں تب ہانچل چلی۔ اس زمانے میں موبائل کی سہولت بھی نہیں تھی۔ ای امیرہ کو جا کر لے آئیں۔ اب جبکہ امیرہ کی تعلیم بھی ختم ہو گئی لیکن سلیم کی مصروفیت اور بھول کا عالم آج بھی وہی ہے۔ زیادہ مصروفیت میں کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔

نیلو فر اعوان

(گھریلو خاتون۔ اہلیہ ضیا اعوان۔ ممتاز قانون دان)
ضیاءے انتہا مصروفیت کے باوجود میری سالگرہ کا دن یاد رکھتے ہیں لیکن ہماری شادی کی سالگرہ پر بھول



نیلو فر اعوان

جاتے ہیں جو بچے یا دولاتے ہیں تو اہتمام بھی کرتے ہیں اور انجوائے بھی اور مجھے گلہ بھی ہے کہ اتنا اہم دن بھولتے کیسے ہیں؟

شاہانہ جاوید

(گھریلو خاتون۔ اہلیہ جاوید اظہر انصاری۔

الیکٹریکل انجینئر)

باشاء اللہ ہماری شادی کو ۳۵ سال ہو چکے ہیں اور اس زندگی میں اتار چڑھاؤ بھی آنے ہیں۔ لیکن ہم نے ایک پرسکون زندگی گزاری ہے۔ میرے میاں اکثر بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں تو پہلے تو میں انتظار کرتی ہوں کہ کب یاد آتا ہے اور جب شام ہونے لگتی ہے تو میں فون کر کے کہتی ہوں۔ خیریت ہے آج آپ نے کام شروع کرتے ہوئے تاریخ لکھی تھی۔ تو ان کو فوراً یاد آ جاتا ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





ارم کاشف

نازش گل

(ٹاؤن آفیسر تعلقہ ایجوکیشن - اہلیہ رفیع مصطفیٰ
ڈپٹی منیجر فنانس لکی سمنٹ)

اب تو میرے ساتھ رہ رہ کر ان کی یادداشت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے لیکن بعض باتیں اب بھی بھول جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بڑی، بڑی باتیں یاد رکھتے ہیں اور چھوٹی، چھوٹی باتیں بھول جاتے ہیں۔ بازار سے جو چیز لانے کو زیادہ زور دوں گی وہی عموماً بھول جاتے ہیں اور جس چیز کی اہمیت ثانوی ہوگی۔ وہ سب سے پہلے خرید لیں گے اور تاویل یہ پیش کرتے ہیں کہ آپ بھول رہی ہیں آپ

لگا دیتے ہیں۔ سب اپنی مصروفیات ترک کر کے ان کی چابی تلاش کرتے ہیں جو بالآخر ان کی جیب ہی سے نکلتی ہے۔

سمیرا یاسر

(ڈاکٹر آف فارمیسی - اہلیہ یاسر پیرزادہ،
نیوز اینکر میٹروون)

میرے شوہر اکثر جلد بازی میں دفتر جاتے وقت اپنا موبائل فون لے جانا بھول جاتے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر جلد ہی یاد آ جاتا ہے تو واپس گھر لینے کے لیے آتے ہیں۔ گھر سے فاصلے پر ہوں تو دفتر جا کر فون کرتے ہیں میرا سیل فون گھر پر رہ گیا ہے۔ ڈرائیور کو



نازش گل

نے ہی تو کہا تھا۔

ارم کاشف

(آر جے ایف ایم اے کراچی - اہلیہ کاشف
بقائی سینٹر پروڈیوسر نیوزون)

اپنی ذات ہی سے متعلق چیزیں بھول جاتے ہیں اور جب پوچھو تو بڑی معصومیت سے کہتے ہیں تم ہونا خیال رکھنے کے لیے۔ گاڑی کی چابی جیب میں رکھ کر بھول جاتے ہیں خود ڈھونڈتے رہتے ہیں اور سب کو پورے گھر میں تلاش کرنے میں



بھیج رہا ہوں بلی کو نیچے بھیج دینا سبیل فون دینے کے لیے۔ خود کہتے ہیں کہ اگر موبائل نہ ہو تو دنیا سے رابطہ کٹ جاتا ہے، نوز بستر ہیں اس لیے موبائل فون ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں لیکن دفتر جانے کی عجلت میں ایسا ہو جاتا ہے اور ان کی پریشانی کے خیال سے میں پریشان ہو جاتی ہوں۔

اسما جاوید

(گھریلو خاتون۔ اہلیہ پروفیسر جاوید اسماعیل)

یادداشت بہت اچھی ہے اور کیوں نہ ہو ریاضی کے پروفیسر جو ہیں لیکن چونکہ پروفیسر ہیں اس لیے عموماً نام بھول جاتے ہیں اکثر تو بہت قریبی عزیزوں کے نام تک یاد نہیں رہتے، تقریبات خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی ان کی تاریخیں بھول جاتے ہیں ہمیشہ میں ہی یاد دلاتی ہوں۔ بس ایک یہی شکایت ہے مجھے ان سے۔

☆☆☆

قارئین کرام!

آپ نے شوہر حضرات کی یادداشت کے حوالے سے ان کی بیگمات کے گلے شکوے پڑھے، ممکن ہے کہ جب پاکیزہ کے توسط سے شوہر حضرات تک اس کی رسائی ہو تب اپنی بیگم کی بہترین یادداشت پر شوہر کے لب پر یہی حیرت انگیز شکوہ ہوگا۔ مانا کہ

بھول جانا میرا کمال سہی
لیکن آپ کا ہنر بھی تو لائق ستائش ہے کہ میں نے
تو محض کمال کیا اور

یاد رکھنے کی تم نے حد کر دی
اور یہ باہمی گلے شکوے ہی زندگی کا حسن ہیں
بشرطیکہ کسی بھی فریق کی جانب سے اسے اتنا مسئلہ نہ بنایا
جائے۔ بے شک ورگزر سے کام لیں تو رشتوں کی ڈور بہت
مضبوط ہو جاتی ہے۔ ویسے قارئین اگلی دفعہ بیویوں کے
حوالے سے یہی سوال ہو سکتا ہے، لیکن آپ کا کیا خیال ہے؟

☆☆☆

غزل

ویسے امید کے بھجائی ہیں
کچھ ہوائیں عجیب ہوتی ہیں

معذرت دور کر نہیں پاتیں
کچھ خطائیں عجیب ہوتی ہیں

روک لیتی ہیں چلتے راہی کو
کچھ صدائیں عجیب ہوتی ہیں

ہاتھ اٹھتے ہیں لب نہیں ہلتے
کچھ دعائیں عجیب ہوتی ہیں

دل کو دل کے قریب لاتی ہیں
وہ فضا میں عجیب ہوتی ہیں

عشق کا انجام بے وفائی ہے
وہ وفا میں عجیب ہوتی ہیں

بھول جاتی ہیں اپنی ہستی کو
ساری مائیں عجیب ہوتی ہیں

موسم گل کو روکتی ہیں کنول
یہ خزائیں عجیب ہوتی ہیں

شاعرہ: یاسمین کنول۔ پسرور

بھروسا

آپ کی آنکھیں اکثر وہی لوگ کھولتے
ہیں۔ جن پر آپ اکثر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر
لیتے ہیں۔

میرزا غلام حیات خان۔ کراچی



نہایت اصغر

Downloaded From
Paksociety.com

پاروفا



پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی، بے شمار

حسین و یادگار تحریروں کی خالق

ماہیہ ناز مصنفہ... نکتہ سیمائے دانش گنگو

جذبات کہتے ہیں یہ بھی لکھو اور وہ بھی لکھو..... کچھ ایسی ہی صورت حال ہمیں محترمہ نکتہ سیمائے کے تعارفی کلمات میں بھی پیش آئی کہ ہماری یہ رائٹر سدا پاکیزہ کے ساتھ، ساتھ رہیں وہ بھی اپنی پیاری، پیاری خوش نما، سبق ماہنامہ پاکیزہ 261 نومبر 2016ء

اسنے باذوق قارئین کی خدمت میں سلام اور دعائیں لیے ایک مرتبہ پھر حاضر ہیں۔ جناب کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ جن کے تعارف کے سلسلے میں الفاظ کم پڑ جاتے ہیں، البتہ

شکریہ (گھٹت وارہ لوازی کا شکریہ..... ہم آپ کا ناول اختتام پزیر ہونے کے منتظر تھے)

پاکیزہ ❖..... قاری ہمیں ایک عرصے سے آپ کے بارے میں جانتا چاہ رہی تھیں، اپنے پڑھنے والوں کے لیے ہی تو آپ رائٹرز سے انٹرویو کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے تو ذرا بے تکلفی سے تشریف رکھیں اس لیے کہ سوالات کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہے آپ تیار تو ہیں نا؟

گھٹت سیما ❖..... ضرور جی، آپ بلا تکلف جتنے اور جیسے چاہیں سوال کر سکتی ہیں کہ یہ سوالات یقیناً میرے اور میرے قارئین کے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ ہوں گے۔ (بے شک)

پاکیزہ ❖..... سیما اگر بات آپ کے ابتدائی زمانے سے شروع کروں کہ جب آپ کوئی تحریر لکھنا چاہ رہی تھیں تو پہلی تحریر کہانی کی صورت کب اور کیسے کسی بھی صفحات کی زینت بنی؟

گھٹت سیما ❖..... میں نے لکھنے کی ابتدا بچوں کی کہانیوں سے کی۔ تب میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ کہانی سوچنا اور بنانا تو اس سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اکتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے کہانیاں سوچتی رہتی تھی۔ کراچی سے بچوں کا ایک رسالہ لکھتا تھا..... غنچہ..... اس میں کہانیوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ دیے گئے عنوان پر کہانی لکھنا ہوتی تھی اور پہلی پانچ بہترین کہانیوں پر انعام دیا جاتا تھا۔ یہ انعام کہانیوں کی کتابوں کی صورت میں ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں ہم بچوں کے لیے بچوں کی دنیا، اور تعلیم و تربیت آتا تھا۔ غنچہ پہلی دفعہ میں نے خود خریدا تھا۔ اس میں پریوں، شہزادوں، شہزادیوں کی کہانیاں نہیں تھیں۔ میں نے سوچا میں بھی اس مقابلے کے لیے لکھوں..... وجہ انعام میں ملنے والی کتابیں تھیں۔ سو میں نے اپنی اردو کی کاپی سے سادے صفحات نکالے..... کہانی لکھی اور گھر میں کسی کو بتائے بغیر عام ڈاک کے لفافے میں بند کر کے

آموزش چشم کشا اور بے حد یادگار اچھوتے موضوعات کی حامل تحریروں کے ذریعے..... ہم نے ان سے فرمائش کی اور انہوں نے ہماری یہ فرمائش بہت پُر خلوص انداز میں پوری کی۔

گھٹت سیما کی تحریریں ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں..... ان کے قلم سے نکلا ایک، ایک حرف قابل ستائش اور دلنشین ہے۔ گھٹت نے ہر دور میں ہر موضوع پر بھرپور لکھا اور قلم کی حرمت کا پورا حق ادا کیا..... دل تو یہی چاہتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں لکھتے چلے جائیں..... مگر مضمون کی طوالت کا خوف ہے سوائے ہی لکھے کو بہت جانیں۔ یہ بھی بتاتے چلیں کہ گھٹت سیما نے اپنے حالیہ ناول کے بارے میں بھی چند وضاحتیں دی ہیں اور جناب تصویر ملی ملاقات آپ کی اپنی اس ہر دلعزیز مصنفہ سے نہ ہو سکے گی لیکن آپ ان کی تحریر میں ان کی تصویر بخوبی تلاش کر سکتی ہیں تو بات چیت کے منتظر باذوق قارئین اب مزید دیر کیے بغیر ہم اپنی ہمان سے سوالات کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ❖..... گھٹت سیما آپ کو آج کی اس بزم میں خوش آمدید کہتے ہیں، بتائیے جناب یہاں آمد پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

گھٹت سیما ❖..... مجھے آپ نے اس بزم میں آنے کی دعوت دی بہت شکریہ..... مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے اور اچھا لگ رہا ہے کہ اس محفل میں محبتوں کی جہک ہے، پھولوں کی خوشبو ہے۔ میں نے اس بزم میں آنے والی سب رائٹرز کے جواب اور آپ کے سوالات کو پڑھا، بلاشبہ یہ ایک منفرد ہی محفل سجائی ہے آپ نے اور اس کے لیے ادارہ پاکیزہ انجم انصار، عذرا رسول اور نزہت اصغر آپ مبارک باد کی حقدار ہیں۔ ہر رائٹر سے عام انٹرویو سے الگ اور منفرد سوالات تھے۔ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کسی روز آپ مجھے بھی اس بزم میں آنے کی دعوت دیں گی..... بہت

گھر کے نزدیک بنے ہوئے ایئر باکس میں ڈال دی۔ ٹھیک سے مجھے یاد نہیں کہ اس کا عنوان کیا تھا انصاف یا ظلم کا بدلہ، کچھ ایسا ہی تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ کہانی جیسے گی کیونکہ میری اردو کی لکھائی اچھی نہیں تھی جو اب بھی نہیں ہے خیر..... لیکن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب اگلے ماہ میری کہانی پر پہلا انعام ملا..... اگر غنچہ اس سے پہلے ملا ہوتا تو شاید میں اس سے بھی پہلے کہانی لکھ چکی ہوتی۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا..... میں ہر ماہ ہی کہانی لکھنے لگی۔ میری بہن شاہدہ طلعت اور بھائی طارق شاہین بھی ہر ماہ کہانی بھیجتے گئے اور مزے کی بات یہ کہ ہر ماہ ہی ہم تینوں کو کوئی نہ کوئی انعام ملتا..... مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے رائٹر بنانے میں غنچہ کا بھی ہاتھ ہے۔ غنچہ کے ادبی مقابلوں نے لکھنے کا شوق ابھارا۔ میں بہت سارا لکھنا چاہتی تھی اس لیے میں نے ایک کہانی ایک غریب سپاہی لکھ کر سیارہ ڈائجسٹ میں بھیج دی نہ صرف یہ کہ وہ کہانی چھپ گئی بلکہ مقبول جہانگیر صاحب نے جو ان دنوں سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر تھے انہوں نے خط لکھ کر کہانی کی تعریف بھی کی اور مجھے بڑے ادیبوں کو پڑھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ آپ کے خط سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ اسکول کی طالبہ ہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ ایک روز بڑی کہانی نگار بنیں گی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنا مطالعہ وسیع کریں۔ (کتنا اپنا کارآمد مشورہ تھا گلہت) سیارہ ڈائجسٹ میں جو پہلی کہانی چھپی تھی اس کا اعزاز یہ مجھے پچاس روپے ملا تھا ان پچاس روپوں کی جو خوشی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ کے بعد میرا اگلا پڑاؤ اوراق تھا..... ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور میری کہانیاں اوراق میں چھپنے لگیں۔ ساتھ ہی ایک روز نامے کے خواتین کے صفحہ پر مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین بھی لکھنے لگی۔ ادبی پرچے چونکہ تین، تین چار، چار ماہ بعد چھپتے تھے اس لیے میں نے اپنی

کہانیوں کے لیے دیگر رسالوں کو چنا..... یوں میں ادبی پرچوں سے ڈائجسٹوں کی طرف آ گئی۔ جن دنوں میں غنچہ میں لکھ رہی تھی ان دنوں جام نو نام کا ایک پرچہ جو ہماری پڑوسن لیتی تھیں اس میں بھی دو تین افسانے لکھے تھے ایک دن مجھے اقبال بانو کا خط ملا اور انہوں نے مجھے دیگر ڈائجسٹوں میں لکھنے کے لیے کہا۔ یوں دیگر رسالوں میں لکھنے کے ساتھ، ساتھ ایک روز انجم انصار کا خط ملا اور میں پاکیزہ کے لیے بھی لکھنے لگی۔ یوں یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔ درمیان میں کبھی کبھی کئی مہینے نہیں بھی لکھا۔ تاہم سفر جاری ہے۔ محترم انور عنایت اللہ (مرحوم) اور امراؤ طارق نے میری کچھ کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور انور عنایت اللہ نے ایک کہانی کا ترجمہ ہرالد میں چھپوایا اور پھر ایک کہانی انٹرنیشنل شارٹ اسٹوریز رائٹرز میں بھی چھپی..... یہ کتاب امریکا سے چھپتی تھی اور اس میں مختلف ممالک کے ادیبوں کی کہانیوں کے تراجم چھپتے تھے۔ پاکستان سے میرے علاوہ ایک اور رائٹر کی کہانی بھی منتخب ہوئی تھی۔

پاکیزہ..... یعنی اسی وقت جتا چلا کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود ہے اور پھر گھر والوں نے کتنا ساتھ دیا؟

گلہت سہما..... باقاعدہ لکھنا تو غنچہ سے ہی شروع کیا تھا لیکن دل ہی دل میں کہانیاں بہت پہلے سے سوچتی رہتی تھی اور اسکول میں سہیلیوں کو سناتی تھی۔ بادشاہوں اور شہزادوں والی کہانیاں، تھری کلاس میں اسکول میں ہونے والے ڈرامے میں ایک شرارتی لڑکا بنی ہوئی تھی تو ٹیچر نے جو مکالمے رٹائے تھے ان میں تبدیلی اور اضافہ کر لیا تھا جو ٹیچر کو بھی پسند آیا تھا۔ یعنی صلاحیت تو بچپن سے ہی تھی۔ جہاں تک گھر والوں کے ساتھ دینے کی بات ہے تو گھر میں امی، ابو اور بڑے بھائی سب ہی اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ابو کے پاس کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ وہ اپنے دور ماہنامہ پاکیزہ 263 نومبر 2016ء

میں سستی ہو جاتی ہے اور میں فوٹو اسٹیٹ نہیں کروا پاتی..... ابھی پچھلے دنوں کانی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکیزہ ♦..... آپ نے کن موضوعات کو ترجیح دی؟

گنہت سیما ♦..... میں نے تقریباً ہر موضوع پر ہی لکھا۔ کوئی ایک خاص موضوع میری ترجیح نہیں رہا۔ کرنٹ افیئرز، سوشل ایڈیٹرز، نفسیاتی مسائل وغیرہ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ جنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر تو محبت بھی ان موضوعات کے ہم سفر رہی..... جب میں غنچہ میں لکھ رہی تھی تو تب بھی کرنٹ افیئرز میرا موضوع رہے۔ جیسے کشمیر، فلسطین، ویت نام وغیرہ..... ظاہر ہے وہ بچپن تھا تو کہانیاں بھی کشمیری، فلسطینی، بچوں کے دکھوں اور سوچوں پر مبنی ہوتی تھیں۔

پاکیزہ ♦..... آپ نے سوشل ایڈیٹرز سے لے کر سیاسی، عسکری اور بڑے بڑے گلوبل مسائل پر بھی لکھا اس کے لیے آپ کیسے اپنے آپ کو آمادہ کرتی ہیں مطلب پورا ہوم ورک کر کے؟ مشاہدہ کر کے؟ ان کرداروں کو عام زندگی میں جانچنا، مختلف رائٹرز کو پڑھنا؟ کرنٹ افیئرز سے باخبر رہنا؟

گنہت سیما ♦..... یقیناً ان سب مسائل پر لکھنے کے لیے مشاہدہ، مطالعہ اور کرنٹ افیئرز اور سوشل ایڈیٹرز سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ غنچہ میں جو کہانیاں میں نے کشمیری، فلسطینی اور ویت نامی بچوں پر لکھیں ان سے میں نے اپنے ارد گرد کی دنیا، حالات و واقعات کو محسوس کرنا اور انہیں لفظوں کا روپ دینا سیکھا۔ یہ کرنٹ افیئرز وغیرہ پر لکھنے کی ابتدا تھی۔ میں کوئی سیاسی بصیرت نہیں رکھتی، نہ میں کوئی بہت بڑی تجزیہ نگار ہوں میں حالات و واقعات سے اسی طرح متاثر ہوتی ہوں جیسے عام لوگ ہوتے ہیں لیکن میں انہیں اپنی سوچ، فکر اور احساس کے ساتھ دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں۔ میں ٹی ڈی... نہ دیکھنے کے برابر دیکھتی ہوں۔ اخبارات ہفتے میں تین دن پڑھتی ہوں لیکن اتنا اور جس قدر پڑھتی

میں چھپنے والی کتابیں اور تقریباً سب رسالے خریدنا کرتے تھے۔ میرے بڑے بھائی جمیل نے بھی اپنے تعلیمی دور میں اور بعد میں خوب صورت شاعری کی۔ شاہدہ طلعت نے میرے ساتھ ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ بہت خوب صورت کہانیاں اور افسانے لکھے۔ جمیل بھائی میری اور شاہدہ کی ہر کہانی پر تبصرہ کرتے تھے..... اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ہمیں انگریزی ادب پڑھنے کے لیے بھی کہتے تھے۔

پاکیزہ ♦..... آپ کے کریڈٹ پر بے انتہا افسانے، ناولٹ اور ناولز ہیں، کتابی شکل میں یہ کب منظر عام پر آئے؟

گنہت سیما ♦..... ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ 2000ء میں کتابی شکل میں آیا۔ مراجعت اس میں سوائے ایک کہانی کے باقی سب اوراق میں چھپنے والی کہانیاں تھیں۔ علامتی، نیم علامتی اور وہ ایک کہانی تھی طاق پر دھری عورت..... اور یہ پاکیزہ میں چھپی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی 2000ء اور 2001ء میں محترم طارق اسماعیل ساگر نے میری دو کتابیں تریاق اور سے ڈے چھاپیں..... اب تک میری 35 پینتیس کتابیں چھپ چکی ہیں، بچوں کے لیے ایک کتاب حدیث کہانیاں لکھی ہیں، جس کا حصہ اول چھپا جبکہ حصہ دوم کا مسودہ پبلشر سے کم ہو گیا ہے..... یہ بارہ کہانیاں تھیں (اوہو) یہ نہیں دوبارہ لکھ بھی پاؤں گی یا نہیں..... میں ایک ہی بار لکھتی ہوں اور اسے ری رائٹ نہیں کرتی۔ بس لکھا اور بیچ دیا..... اس عادت کی وجہ سے میں نے کئی اچھی کہانیاں کھو دیں۔ ایک بار ایک ناولٹ ڈاک میں گم ہو گیا۔ دوبار کہانیاں گم ہوئیں..... دوبارہ پھر وہ نہیں لکھ سکی۔ اب کچھ عرصے سے میں فوٹو اسٹیٹ کروا کے نقل رکھ لیتی ہوں۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ چند ایک کہانیاں ایسی بھی تھیں جن کے متعلق چھپنے کے بعد مجھے لگا کہ میں اگر انہیں دوبارہ لکھتی تو یہ زیادہ بہتر ہو جاتیں..... پھر بھی کبھی، کبھی جلدی بھیجنے کے چار ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 264 ﴾ نومبر 2016ء

میں اس کے والد سے لے آئے کہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہاں کیسپ میں جہاں انہیں ٹریننگ دی جاتی تھی مجاہدین کو ہر روز اپنا روزنامہ لکھنا ہوتا تھا اس نے وہ روزنامہ بھجوادیا تھا جس سے مجھے ان کے روز و شب کے معمولات اور دوسری باتوں کے متعلق علم ہوا..... ہالینڈ کے پاس منظر میں لکھی جانے والی کہانی کے لیے معلومات شیریں سے لیں جو دو سال ڈیلیف میں رہی..... وہاں یونیورسٹی ہاسٹل کا ماحول وغیرہ..... اس طرح بھائیوں، بھینچوں وغیرہ سے معلومات حاصل کرتی رہی۔

پاکیزہ ✦..... آج تو انٹرنیٹ نے آسانی کر دی ہے ہم دیکھتے ہیں کچھ مصنقات اس سے اپنے مطلب کا مکمل فائدہ اٹھاتی ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

نگہت سیماء ✦..... انٹرنیٹ سے فائدہ اٹھانا چاہیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں بھی سوچتی ہوں کہ مجھے اس جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن کچھ جاب کی مصروفیات اور کچھ سستی حالانکہ بہت پیاری سدرہ نے میرا page بنایا ہے لیکن میں نے صرف ایک بار ہی کھول کر دیکھا ہے۔ انٹرنیٹ صرف skype کی حد تک شیریں وغیرہ سے بات کرنے کا استعمال کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✦..... کوئی ایسا موضوع یا مسئلہ رہ گیا ہے جسے آپ چاہنے کے باوجود چھیڑ نہیں پائیں؟

نگہت سیماء ✦..... کچھ ایسا خاص موضوع یا مسئلہ تو نہیں کہ جس پر خواہش کے باوجود نہ لکھ سکی ہوں۔ البتہ مختلف موضوعات پر بے شمار نامکمل کہانیاں پڑی ہیں جنہیں مکمل کرنے کی خواہش ہے۔ بچوں کے لیے کچھ لکھنے کی خواہش ہے۔ ہمارے دور میں بچوں کے لیے بڑی اچھی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں لکھی جاتی تھیں مجھے یاد ہے..... الف، ن والے ان، کمال احمد رضوی صاحب کا ناول ایک مکان دو دیواریں اور پیتل کی ٹوپی وغیرہ سبق آموز بھی تھے اور دلچسپ بھی..... آج کل بچوں کے لیے ایسے ناول نظر نہیں آتے پکار

ہوں مجھ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ میری ساری کہانیاں تخیلاتی ہیں لیکن میں نے ان میں حقائق کو اس طرح سمونے کی کوشش کی ہے کہ کہانی وعظ نہ بنے اور اس کی دلچسپی برقرار رہے اور لوگ جان سکیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے فلسطین، افغانستان، کشمیر، بوسنیا، کراچی، عراق، مشرقی پاکستان، این جی اوز، جاوڈوٹو، صحافت پر بہت لکھا۔ یہ سب میرے اپنے احساسات ہیں ہاں اعداد و شمار میں نے اخبارات سے لیے ہیں۔

کبھی تو خود ہی کسی کہانی کا پلاٹ ذہن میں آ جاتا ہے اور کبھی میں کوئی ایک ایڈیٹور منتخب کر کے اس کے ارد گرد کہانی کا تانا بانا بنتی ہوں..... ہمیں وہ سہولتیں حاصل نہیں تھیں جو آج کی رائٹرز کو حاصل ہیں، انگلی کی ایک جنبش اور سب معلومات سامنے.....

میں نے مطالعے کے علاوہ اپنے ابو اور بھائیوں سے بھی بعض اوقات کسی خاص ایڈیٹور پر لکھنے سے پہلے معلومات لیں۔ ایسے موضوعات پر لکھنے کے لیے ہوم ورک تو ضروری ہے۔ مثلاً میں تنویر ڈھا کا کے پس منظر میں کہانی لکھنا چاہتی تھی تو میں اپنے کالج کی چھٹیوں میں جیل بھائی کے گھر ترہیل گئی ہوئی تھی تو ان کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ میں اس موضوع پر لکھ رہی ہوں تو پہلے تو انہوں نے مجھے اس موضوع پر دو کتابیں لا کر دیں۔ ایک تھی میں نے ڈھا کا ڈوبتے

دیکھا..... اور دوسری انگلش میں تھی، نام اب یاد نہیں..... انہوں نے اپنے ایک بریگیڈر پر دوست کو جو 71ء میں مشرقی پاکستان میں تھے اور جنگی قیدی بھی رہے۔ ان کی پہلی سمیت ڈز پر نوائٹ کیا اور ان سے کہا کہ میری سسٹر کو کہانی لکھنی ہے تو جو کچھ آپ بتا سکتے ہیں اسے بتائیں۔ اپنی پڑھائی کے چکر میں اس ناولٹ کو جیل بھائی کی زندگی میں نہ لکھ پائی لیکن بعد میں شکستہ آئینے کے نام سے اسے لکھا..... وہ جو نامہ بر ہے بہار کا..... یہ کشمیر کے ایڈیٹور پر لکھی گئی تھی اور اس کے لیے معلومات مجھے ایک اسٹوڈنٹ کے بھائی سے ملیں جو

کشمیر میں جہاز کرنے کے لیے چلا گیا تھا لیکن بعد

رقصم تیرہ اقساط پر مبنی لکھ چکی تھی لیکن قسط وار ناول کے متعلق میں سمجھتی تھی کہ یہ صرف مخصوص رائٹر ہی لکھ سکتے ہیں کیونکہ مجھے ایسا ہی باور کرایا گیا تھا۔ جب مجھے انجم نے ناول لکھنے کے لیے کہا تو حیرت کے ساتھ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ یہ ناول پاکیزہ میں تقریباً ساڑھے تین سال تک چھپتا رہا اور اسے کتابیات پبلیکیشنز نے کتابی شکل میں چھاپا۔ اور اب ایک بار پھر پاکیزہ نے مجھے ناول لکھنے کا اعزاز دیا۔ پاکیزہ کے لیے میرے دل میں بہت محبت ہے۔ پاکیزہ نے ہمیشہ سینئر اور جونیئر رائٹرز کو یکساں عزت دی۔ کبھی سینئر رائٹرز کو اس لیے ڈی گریڈ نہیں کیا کہ تنگ لڑکیوں نے ان کی تحریروں کو نہیں پڑھ رکھا۔ ایک اور بات جس نے پاکیزہ کی قدر میرے دل میں بہت بڑھادی ہے وہ یہ ہے کہ سینئر رائٹرز کو بان دیا جاتا ہے اور بلاوجہ کنگ نہیں کی جاتی۔ (بہت بہت شکر یہ نگہت آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔)

پاکیزہ ﴿..... اب تک کی پاکیزہ میں چھپی آپ کی تحریروں میں آپ خود کس سے مطمئن ہوئیں؟ نگہت سیما ﴿..... اگر رائٹر اپنے لکھے سے مطمئن ہو جائے تو شاید اس کے سفر کا اختتام ہو جائے..... مزید اچھا لکھنے کی خواہش میں وہ لکھتا چلا جاتا ہے۔ پاکیزہ میں چھپنے والی کئی تحریروں ایسی ہیں جو مجھے پسند ہیں بہت پرانی تو مجھے یاد نہیں ہیں لیکن گزرے چند سالوں میں جو چھپیں ان میں کوئی شہر ایسا بساؤں میں جو کارگل اور وزیرستان کے پس منظر میں تھی۔ ایک کشمیر کے متعلق تھی شاید راہ جنون نام تھا۔ پھر ایک امید صبح والی پاکستان اور کراچی کے حالات کے پس منظر میں لکھی تھی۔ نام یاد نہیں..... تو ایسی کئی کہانیاں ہیں۔

پاکیزہ ﴿..... اپنی تحریروں پر تنقید کس حد تک برداشت کرتی ہیں؟ کیا یہ اصلاح میں معاون ثابت ہوتی ہے؟

نگہت سیما ﴿..... مجھے اپنی تحریروں پر تنقید بری

کے نام سے بچوں کے لیے ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا اسے مکمل کرنے کی خواہش ہے..... یہ اس لیے ادھورا رہ گیا ہے کہ میں اسے انگریزی زبان میں لکھنا چاہتی ہوں یا پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو..... یہ دنیا بھر کے مظلوم بچوں کی پکار ہے۔ اسی طرح میرا ایک ناول..... اللہ صیب جی ہے جس کا پہلا حصہ ایک میگزین میں چھپ کر ایوارڈ بھی حاصل کر چکا ہے۔ وہ اپنی جگہ مکمل ہے لیکن اس کے مزید حصے بھی ہیں جو آدھے ادھورے لکھے پڑے ہیں۔ بچوں کے لیے سیرت نبی آسان اور سادہ زبان میں لکھنے کی خواہش بھی ہے۔ اور بے شمار ناولٹ کہانیاں اور افسانے ہیں جنہیں کتابی شکل میں چھپوانے کی خواہش ہے۔ خاص طور پر کہانیوں کا مجموعہ۔

پاکیزہ ﴿..... آپ کے خیال میں آج کی رائٹرز کیسے لکھ رہی ہیں..... کھل کر بتائیں، آپ کے یا آپ کے ہم عصروں کے مطابق ہے یا نہیں؟

نگہت سیما ﴿..... آج کل کچھ رائٹرز تو اچھا لکھ رہی ہیں اور کچھ گزارے لائق..... ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، میں نے اور میرے ہم عصروں نے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق لکھا اور وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق لکھ رہی ہیں، کچھ موضوعات تو ہر دور میں ایک ہی ہوتے ہیں، بھوک، محبت، غربت وغیرہ بس حالات و واقعات مختلف ہوتے ہیں۔ پہلے خطوط کا دور تھا اب انٹرنیٹ اور موبائل کا دور ہے تو کچھ نہ کچھ فرق تو ہے۔

پاکیزہ ﴿..... ماہنامہ پاکیزہ سے دوستی کی کیا کہانی ہے؟ کچھ ہمیں بھی بتائیں؟

نگہت سیما ﴿..... پاکیزہ کے ساتھ دوستی کا رشتہ بہت گہرا ہے اور مضبوط ہے یاد نہیں کتنے سال ہو گئے لیکن جب پہلی بار انجم نے لکھنے کے لیے کہا تو تب سے ہی لکھ رہی ہوں۔ میں نے پہلا قسط وار ناول بھی ”دھوپ، بارش اور سائے“ پاکیزہ کے لیے لکھا۔ اس سے پہلے ایک ناولٹ برنوگ خاری

نہیں لگتی اگر وہ مثبت اور تعمیری ہو..... ایک دو بار میرے قارئین نے میری معمولی غلطیوں کی نشاندہی کی تو مجھے اچھا لگا تھا کہ وہ اتنے دھیان سے پڑھتے ہیں۔

پاکیزہ ✦..... آپ کے خیال میں نئی نسل رسالے، جرائد اور ڈائجسٹ پڑھنے کی شوقین ہے یا اگر نہیں تو کیوں؟

نگہت سیما ✦..... میرے خیال میں نئی نسل میں کتابیں پڑھنے کا رجحان ہے تو لیکن مجھے اندازہ نہیں کہ پہلے زیادہ رجحان تھا یا اب..... میرے محدود مشاہدے کے مطابق تو رجحان کم ہوا ہے۔ جس طرح ہم سب بہن بھائی بچپن سے ہی مطالعے کے شوقین تھے۔ اس طرح ہمارے بچوں کو شوق نہیں ہے۔ صرف اشتیاق بھائی کے سب بچوں میں یہ شوق بہت زیادہ ہے بلکہ ان کی ایک بیٹی ماہم کھتی بھی تھی۔ مریم غازی کے نام سے۔ ہمارے بچپن میں ہماری فرینڈز کو بھی پڑھنے سے دلچسپی تھی اور ہم آپس میں کتابوں کے تبادلے کرتے رہتے تھے لیکن اب اس طرح نہیں ہے۔ شاید ترجیحات بدل گئی ہیں۔ کتاب کی جگہ انٹرنیٹ اور دوسری مصروفیات نے لے لی ہے۔

پاکیزہ ✦..... آج تو آن لائن پڑھنے کا رواج ہو رہا ہے کیا اس سے وہ لطف آتا ہے جو مزہ رسالہ ہاتھ میں لے کر اپنے فالتو وقت کو ہر لطف انداز میں گزارنے پر آتا تھا کہ اس کے لیے بجلی کا ہونا بھی ضروری نہیں؟

نگہت سیما ✦..... مجھے آن لائن پڑھنے کا مزہ نہیں آتا۔ میں تو اپنے بیڈ پر آرام و سکون سے ٹیک لگا کر پڑھتی ہوں۔ ایک دو بار میں نے ایک آدھ چیز دیکھی ہے، اسکول سے آکر نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر جب چار بجے میں بیڈ پر آرام کے لیے لیٹی ہوں تو پھر عصر کی نماز تک یہ میرا مطالعہ کا وقت ہوتا ہے۔ اخبار کوئی ڈائجسٹ یا کوئی کتاب..... دوسری شفٹ عشا کے بعد سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھتا..... درمیان

میں کچھ لکھنے کا موڈ بن جائے تو لکھنا۔

پاکیزہ ✦..... یہ بات تو ہے کہ جدید زمانے کے ساتھ جدید آلات کا استعمال بھی وقت کی ضرورت ہے، ظاہر ہے زمانے کے ساتھ تو چلنا پڑتا ہے مگر آج بھی ترقی یافتہ ممالک کے افراد کے ہاتھ میں اخبار اور کتابیں چاہے comics ہی کیوں نہ ہوں نظر آتی ہیں، کیا ایسا نہیں ہے؟

نگہت سیما ✦..... یورپ میں ٹرین میں بیٹھے ہوئے ہر دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی کتاب نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں کتاب سے ایسی محبت نہیں پائی جاتی۔ (اسی بات کا تو افسوس ہوتا ہے)

پاکیزہ ✦..... وہاں کوئی بوڑھا بغیر اخبار کے نظر نہیں آتا، ہمارے ہاں آج بچے، بڑے کیا اتنے ہی شوق و ذوق سے ڈیلی پیپر پڑھتے ہیں؟

نگہت سیما ✦..... نہیں، ہمارے ہاں اتنے ذوق و شوق سے اخبار نہیں پڑھا جاتا جس طرح دوسرے ممالک میں پڑھا جاتا ہے۔ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ کئی گھروں میں دو، دو اخبار آتے ضرور ہیں لیکن پڑھے نہیں جاتے۔

پاکیزہ ✦..... مطالعے کا رجحان یا اس کی ترغیب کون دلاتا ہے؟ والدین، استاد یا ماحول؟

نگہت سیما ✦..... مطالعے کا رجحان گھر کے ماحول اور والدین کی ترغیب سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ صرف استاد کے ترغیب دلانے سے نہیں ہوتا۔ میں اپنے اسٹوڈنٹ سے کہتی رہتی ہوں کہ اپنی انگریزی اردو بہتر کرنے کے لیے کتابیں پڑھا کریں لیکن میرا نہیں خیال کہ میرے کہنے سے کسی نے پڑھا ہو۔ ہم نے اپنے گھر میں فارغ وقت میں سب کو کتابیں پڑھتے دیکھا تو ہمیں بھی شوق پیدا ہوا۔ ابو نے ہمارے دل میں کتاب سے محبت ڈالی۔ بچپن سے ہی کتابیں ہم سب بہن، بھائی بہت احتیاط سے سنبھال کر پڑھتے اور رکھتے تھے۔ صفحے نہیں موڑتے تھے، ابو نے ورجنوں کے حساب سے بک ٹوکن لا کر رکھے ہوئے تھے۔ پھر

ہمارے نام اگک، اگک رسالے جاری کروا رکھے تھے۔ چھوٹا بھائی ون میں تھا تو اس کے نام بچوں کی دنیا آتا تھا۔ میں تحریر میں تھی میرے نام تعلیم و تربیت اور شاہدہ سکس میں تھیں تو ان کے نام زیب النساء آتا تھا۔ اور وہ ہمارے رسالے بھی پڑھتی تھیں اور اپنے بھی۔ مجھے یاد ہے جب داوی جان ہمارے گھر ہوتی تھیں تو وہ ہم سے ناول سنا کرتی تھیں۔ محلے کی لائبریری سے اے آر خاتون اور زبیدہ خاتون کے ناول منگوائے جاتے تھے اور رات کو جب ہم اپنے بستروں پر لیٹتے تو شاہدہ پڑھ کر سنایا کرتی تھیں اور ہم سب شوق سے سنتے تھے۔ ایک بار شاہدہ ٹائیس ہارڈی کا ناول ٹیس آف وی ڈی آر پروڈیوز پڑھ رہی تھی تو داوی جان بھند کہ خود پڑھ رہی ہے ہمیں بھی سناؤ۔ اب شاہدہ پہلے انگلش پڑھیں اور پھر ترجمہ کر کے سناتی جاتیں..... اب ہنسی آتی ہے لیکن ایسا ہی ہوا تھا اور ہم نے شوق سے سنا تھا۔ (واہ بہت خوب)

پاکیزہ ❖..... آج انسانوں کے موضوعات بدل گئے ہیں، خالص رومان اور انسانی محبت کہیں دور ہی چلی گئی ہے، آپ کس حد تک اس بات سے متفق ہیں؟

گفت سیماء ❖..... سچ ہے کہ آج انسانوں کے موضوعات بدل گئے ہیں لیکن محبت ایک ایسا لافانی جذبہ ہے کہ خالص انسانی محبت نہ ہونے کے باوجود ہر دور میں کہانیوں میں کسی نہ کسی صورت، محبت کم یا زیادہ موجود رہی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو خالص انسانی محبت بھی کہیں کسی کہانی میں نظر آ جاتی ہے۔

پاکیزہ ❖..... آپ کا تعلق درس و تدریس سے ہے اگر کسی اسٹوڈنٹ کے بیگ میں رسالہ دیکھتی ہیں تو کیا رد عمل ہوتا ہے؟

گفت سیماء ❖..... مجھے تقریباً تیس سال ہو گئے ہیں پڑھاتے ہوئے لیکن ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ میرے بچہ کے دوران کسی نے کوئی اور کتاب پڑھی ہو..... ہاں اگر بیگ کے اندر کسی نے کوئی کتاب رکھی

ہوتی ہو تو میں انکوری کروں گی۔
پاکیزہ ❖..... اپنے پسندیدہ مصنفین بھی بتائیں۔ کیا موضوعات پڑھتی ہیں؟

گفت سیماء ❖..... کوئی خاص موضوع نہیں جو مل جائے پڑھ لیتی ہوں، پسند نہ آئے تو تھوڑا سا پڑھ کر چھوڑ دیتی ہوں میرے پسندیدہ مصنفین کی فہرست بہت طویل ہے۔ بعض اوقات کوئی چھوٹا ادیب بھی بڑی کہانی تخلیق کر دیتا ہے اور کوئی بڑا ادیب چھوٹی کہانی..... اس لیے اگر مجھے کسی کی کوئی ایک تحریر بھی پسند آتی ہے تو وہ میرے پسندیدہ ادیبوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف مصنفین کو پڑھا اور پسند کیا..... آج آپ کے ان صفحات کے ذریعے ان سب مصنفین کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتی ہوں اگر اجازت ہو تو.....

(جی ضرور) بچپن اور لڑکپن میں ابن صفی اور نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کو پڑھا۔ پانچویں جماعت تک میں نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کے وہ سب ناول پڑھ چکی تھی جو ہمارے گھر میں تھے۔ نسیم حجازی کے خاک و خون، آخری چٹان اور رشید اختر ندوی کے ناول یلغار کو بے شمار بار پڑھا۔ اسی طرح پانچویں جماعت میں ہی ابن صفی کے بے شمار ناول پڑھ لیے تھے۔ خاک و خون نے پاکستان سے محبت پیدا کی اور ہجرت کے دکھوں سے آشنا کرایا۔ دوسرے تاریخی ناولوں نے اپنی شاندار اور کریناک تاریخ سے روشناس کرایا۔ انکل سام زکیمین، جیسے ناولوں سے دنیا کے حالات پتا چلے۔ طارق ابن صفی کے ناول پڑھنے کے لیے لاتا وہ جہاں بھی چھپاتا ہم (میں اور شاہدہ) ڈھونڈ لیتے تھے کے غلاف میں گدے کے نیچے، الماری میں..... ابن صفی وہ رائٹر ہے جس نے پڑھنے والا ایک بڑا طبقہ پیدا کیا۔ خیر اور شر کی جنگ میں خیر کی فتح اور وطن اور اہل وطن سے محبت کا جذبہ اور کچھ کر لینے کی آرزو ان ناولوں کو پڑھ کر خود بخود دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ابن صفی کو اتنی کم عمری میں

پڑھا کہ میں عمران، حمید اور فریدی کو حقیقی کردار سمجھتی تھی اور بس میں سفر کرتے ہوئے مسافروں میں حمید، فریدی اور عمران کو ڈھونڈتی تھی اور **imagination power** اتنی زیادہ تھی کہ بس میں بیٹھے، بیٹھے پوری ایک کہانی بنا لیتی تھی۔ ابو کے ذخیرہ کتب میں پیری مسن وکیل اور شرلاک ہومز کے تراجم بھی تھے لیکن ان میں وہ چاشنی نہیں تھی کہ جو ابن صفی کے ناولوں میں تھی۔

بچپن گزرا مطالعے میں وسعت پیدا ہوئی تو پہلے تو ابو کے پاس موجود بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ابو الکلام آزاد کی غبار خاطر بھی چھٹی ساتویں میں ہی پڑھ ڈالی تھی۔ کچھ کتابوں کے متعلق ابو نے کہا تھا یہ آپ کے پڑھنے کی نہیں ہیں جیسے عصمت کی **ٹیرھی لکیر**..... اور منٹو کی کتابیں..... اور ہم نے ان کی عدم موجودگی میں بھی ان کتابوں کو نہیں پڑھا۔ بی ایڈ میں مجھے مسز افضل تو صیف نے عصمت اور منٹو کو پڑھنے کے لیے کہا..... دو تین کتابیں پڑھیں۔ عصمت چغتائی کی تحریر میں مجھے **گفتگو** اور **جنگلی گلی** لیکن منٹو کی جو چند ایک کہانیاں پڑھیں وہ طبیعت پر گراں گزریں حالانکہ ایک دنیا انہیں بہت بڑا ادیب مانتی ہے۔ مزے کی بات بتاؤں ابو نے جن کتابوں کو تب پڑھنے سے منع کیا تھا آج تک نہیں پڑھیں۔ ابو نہیں ہیں اب اور ہم بوڑھے ہو گئے ہیں پھر بھی نہیں..... آپ کو شاید یقین نہ آئے لیکن ایسا ہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، عبد اللہ حسین، الطاف قاسم، نشاط قاسم، قراۃ العین حیدر، کرشن چندر، نجیب محفوظ گورکھی، مستنصر حسین تارڑ ان کی سب تحریریں تو میں نے نہیں پڑھیں لیکن جو پڑھیں ان میں سے کوئی نہ کوئی مجھے پسند ہے۔ اس لیے میرے پسندیدہ مصنفین میں شامل ہیں۔ الطاف قاسم کی چلا مسافر اور دستک نہ دو نے بہت عرصہ اسیر رکھا

جیلانہ ہاشمی کی **دوست سوس**..... کا سحر بھی عرصہ تک رہا..... بہت سے نام رہ بھی گئے ہوں گے۔ اب یاد نہیں آرہے۔ ڈائجسٹ پڑھنے شروع کیے تو پہلی پسندیدہ رائٹر بشری رحمن تھیں۔ پھر اس قافلے میں مزید رائٹر شامل ہوتے گئے۔ رفعت ناہید سجاد، انجم انصار کہ طنز و مزاح میں کوئی خاتون رائٹر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ رفعت سراج، غزالہ نگار، ہما کوکب، آسیہ رزاقی، آسیہ مرزا، رخسانہ نگار، فرحت اشتیاق، عزیزہ سید، عالیہ بخاری، فارحہ ارشد، سعدیہ آفریدی، اقبال بانو..... ان کی خالص رومانی کہانیاں بھی لڑکیاں پسند کرتی تھیں..... یہ سب وہ رائٹر ہیں جنہوں نے ڈائجسٹوں کے ادب کو مقبول بنایا۔ بشری سعید اور عمرانہ عبداللہ وہ رائٹر ہیں جن کی صرف ایک، ایک تحریر پڑھی ہے میں نے۔ بشری سعید کی سفال گر اور عمرانہ عبداللہ کی لڑکی ایک چار لکھن کی کیا تحریر تھی..... پھر نمرہ احمد ہیں وہ بھی اپنی تحریر کے حصار سے نکلنے نہیں دیتیں ان کی تحریر میں ابن صفی کے ناولوں کی چاشنی ہے اور جو خوبیاں ہیں وہ تو ہیں آج کل بنت سحر، سائرہ رضا، نایاب جیلانی، صائمہ اکرم و چند دیگر خوب لکھ رہی ہیں۔ میں یہاں اپنی چند بہت پیاری رائٹرز کا بھی ذکر کرنا چاہوں گی۔ جن کی مختصر کہانیاں مجھے پسند آتی تھیں۔ صبیحہ شاہ، وردانہ نوشین، فریدہ، نسیم نیازی وغیرہ..... خالدہ اسد اور عظمت عزی بھی یادگار ناموں میں سے تھیں اس سوال کا جواب بہت طویل ہو گیا ہے پھر بھی لگتا ہے بہت نام رہ گئے ہیں۔

عزیز قارئین محبت سیما کی خوشبو بھری گفتگو جاری ہے اور ابھی مزید سوالات بھی ہیں اور پھر ان کے ناول پر بھی بات ہوگی..... اس مرتبہ صفحات کا کوٹا محدود تھا لہذا معذرت..... اگلے ماہ دسمبر میں اس خوب صورت گفتگو کا سلسلہ دوبارہ ہمیں سے جوڑیں گے، فی الحال اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ

باتیں بہار و خزاں کی

زندگی کچھ خزاں کی ہے دن کی کچھ بہار کی گردش ہے

ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سہ ماہی نامہ حاضر خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی انکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور اظہار بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھا سا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضر خدمت ہیں۔

تگینہ ضیا بگلش..... کراچی

1۔ اگر آپ کو اپنا آپ منوانا ہے تو سب سے پہلے حسن اخلاق کو اپنا ساتھی بنا لیں آپ ہمیشہ مرخرو رہیں گی۔ شخصیت کو پُر اثر بنانے کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے پر دوسروں سے ملنے، بات چیت کے طریقے سے بھی خود کو منفرد بنا سکتے ہیں۔ اگر میں دل کی بات کہوں تو میری زندگی میں دو خاتون کا بہت بڑا کردار ہے۔ جن میں اپنی استاد مانتی ہوں اور ان کے زیرِ دست اخلاق نے مجھے ان کا گردیدہ بنا دیا ہے۔ ہارنی بیماری باجی انجم انصار اور میرنی بیماری بہبود ایجوکیشن کی پرنسپل میڈم شامینہ بیگم جو اپنے اخلاق اور محبت سے بہت دلوں میں جگہ بنا چکی ہیں، میرے خیال میں اخلاق ایک ایسی چیز ہے کہ اگر آپ تعلیم یافتہ نہ بھی ہوں تو تب بھی آپ کو کامیابی کی بلندی تک پہنچا سکتا ہے۔

2۔ میرنی زندگی کا دردناک واقعہ جس نے میرے لگرو خیال کا رخ موڑ دیا۔ کچھ عرصہ پہلے میں بے حد بیمار ہو گئی تھی اگر صاف کہوں تو نفسیاتی مریفہ ہو گئی تھی۔ دل و دماغ کو مایوسی نے اپنے جکڑ لیا تھا۔ ہر وقت یہی خیال کہ میں مر جاؤں گی۔ میرنی چھوٹی چھوٹی بیٹیاں اٹلی رو جائیں گی، شوہر تو دوسری شادی کر لے گا اور بیٹا بھی نہیں ہے کہ بہنوں کا خیال رکھ سکے۔ حالانکہ خیالے بیماری میں میرا اتنے خیال رکھا کہ میری دعا ہے کہ ایسا بند بہ ہر مرد میں پیدا ہو اپنی بیوی کے لیے گراسوتے اور مایوسی میرا ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں نے دنیا داری چھوڑ کر مکمل اپنے رب سے لو لگائی۔ آپ یقین کریں کہ اللہ سے میری دوستی اتنی گہری ہو گئی کہ پانچ وقت کی نماز قرآن پاک کی تلاوت نفل روزے تہجد پڑھنے لگی اور سب بھول گئی۔ میرے مالک نے ایسا کرم کیا کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئی لگتا ہی نہیں تھا کہ مجھے کوئی بیماری بھی تھی اور اللہ پاک نے دو پیارے پیارے بیٹوں سے بھی نوازا دیا۔ چل مولا نہ قربان شرم

تو بے واحد تو احد تیرے سوا کوئی نہیں
کیوں مانگوں غیر سے میرا خدا تو ہی تو ہے

مانگنے والے نے جو مانگا اسے دو مل گیا
اور میں مانگنے بھی جو کر دے عطا تو ہی تو ہے

(ذکیہ بگلری)

3۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے بے حد پسند ہیں جن میں ہر فہرست بہنوں کی محفل شمع ہدایت ایادوں کی الاء اور ایاء جلتی رنگ پاکیزہ ڈائری، بزم پاکیزہ اور اخلاقی مشورے، عزت اسفر کے کیے مجھے انٹرویوز اور شائستہ زبوں کے سرو سے بہت پسند ہیں۔ میری بی بی خواہش ہے کہ پاکیزہ ایوارڈز کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائے کیونکہ میں جب اپنے پانچ ایوارڈز کو دیکھتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ مجھے ناچیز کو بھی یہ ٹیسی ایوارڈز ملے ہیں تو اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے اور دل چھپنے سے سرگوشی کرتا ہے کہ اسے تمیناب اتنی بھی نالائق نہیں ہوا چھا..... بابا بابا.....

سو پتیز ہم سب بہنوں کو مزید ہوشیار بنائیں ہیں ان کو بھی ایوارڈز جیتنے کا موقع دیں بس بس میری خواہش ہے کہ یہ سلسلہ شروع ہو۔

4۔ پاکیزہ کی پاکیزہ ہی مصنفات کو سلام پیش کرتی ہوں اور دنی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت و تندرستی کے ساتھ ایسی نمرہ آئیں۔ ماشاء اللہ سب بہت محنت سے لکھ رہی ہیں اور ہم سب کو بہت اچھا پیغام دے رہی ہیں۔ اچھی تحریر دل پر اثر کرتی ہے جب دل پریشان ہوتا ہے تو آپ کی تحریر میں دل کو احساس دیتی ہیں۔ میری پیارنی، پیارنی مصنفات آپ سب ہمیشہ ہمیشہ خوش رہیں انی آمین۔

5۔ میں تو بہت ناچیز ہستی ہوں اپنے بارے میں کیا کہوں۔ دوسروں کی رائے آپ کے بارے میں صحیح شخصیت کی عکاسی کرتی ہے پھر بھی یہ شعر عرض ہیں جو میری فطرت اور شخصیت کا آئینہ دار ہیں۔

اداس رکھو یا خوش، کچھ کھد نہیں کرتے
خزاں کے نیچوں بھی یوں کھلا نہیں کرتے
ملا دو خاک میں ہم کو مگر وحیایاں رہے
ہم جیسے لوگ دوبارہ ملا نہیں کرتے

- 1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُر اثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے.....
 - 2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔
 - 3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟
 - 4۔ پاکیزہ منسفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں..... کوئی دل کی بات؟
 - 5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجئے۔
- آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

انجم ظاہر..... کراچی

لاہور میں اپنی قسمت آزماؤں کی خیر بات ختم ہو گئی۔ اگلے مہینے قرعہ اندازی ہوئی تھی نے فور نہیں کیا لیکن وہ صاحب چند روٹن بعد آئے اور منجانی بات میں لے لے، چونکہ ریگنیر کا سخت ہیں اس لیے کیشیرے کیلئے کلاں آفسر اور منیر سب ہی واقف تھے معلوم ہوا کہ ان کی چھوٹی بہن کا باندھا دوہرا انعام نکلا۔ مزید حیران اس بات نے کہ وہ ان کی بہن کی دعا کر رہی تھی کہ باندھ نکل آئے تو میں اپنی پہلی کوٹھے میں موبائل کی باتوں کی کیونکہ وہ کافی غریب لڑکی تھی ان کی بہن کی تو دعا قبول ہوئی۔ اس دوران صاحب نے یہ بات کہہ کر ہمیں مزید حیران کر دیا کہ ان کی بہن کی پہلی ای بزرگ شخص کی بیٹی تھی جو پھر وہاں میں باندھ بیٹھا تھا، حق سچہ اور سیدہ والی مثال ہو گئی۔ اس واقعے نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور میں خدائی قدرت پر مدد و رحمت حیران تھی۔ (واقعہ کافی لمبا ہے میں نے مختصراً لکھنے کی کوشش کی ہے)

1۔ جہاں تک اپنی شخصیت کو پُرستش اور پُر اثر بنانے کی بات ہے تو بہت سے طریقے ہیں۔ تعلیم تو بہت ضروری ہے اس کے ساتھ ساتھ کوئی ایک شہر، ماحولیت یا ہنر تو کیا بات ہے اور پھر اپنے کردار سے ثابت کریں کہ آپ ایک تعلیم یافتہ ذمے دار اور معاشرے کا فعال رکن ہیں..... روز و راتوں کے اس معاشرے میں اپنے آپ کو پُر اثر بنانا بہت مشکل کام ہے۔ یہاں تو گریجویٹوں پر ان حضرات کے ساتھ خواتین ہی ایک دوسرے کو ٹھکنے میں مصروف ہیں۔ اگر دیوانی نے اچھا کام کر لیا تو جناب جیسا کہ اور داشت نہیں اگر زندگی تریف ہوئی تو بھلا وہ ناراض یہاں تک کہ بہن، بھائیوں میں بھی مقابلے ڈرائیو سے ایک خاتون کیا کرے۔ جہاں تک میری بات ہے، شش شادی سے پہلے بھی جاب کر لی تھی پھر شادی ہوئی تو پوری سہ ماہی میں بھی سب کا خیال رکھنے کی کوشش کی۔ جاب جاری نہ کر سکی کہ بچہ پھر ہے ویسے بھی میری صحت اب صحیح نہیں رہتی آپ لوگ بھی دعا کیجئے گا اور جناب جاب اور گھر کی ذمے داری کی ہونے کی وجہ سے تمہیں پسند کیا گیا تھا۔ یوں میں تو پُر اثر رہی اس!

3۔ پاکیزہ کے سب سے پہلے پسند ہیں، آپ لوگ تہواروں اور موقعوں کے حساب سے اچھی اچھی چیزیں دیتے ہیں، میں تو ایک سلسلہ ایسا شروع کروں گی کہ لڑکیاں میک اپ کرنا اور منڈی لگانا سیکھ لیں گی یعنی یونیورسٹی کا کورس آپ کے رہنے والے کے ذریعے اور تصویروں کے ذریعے..... کیجئے گی کیا آئیڈیا میں نے بھی یونیورسٹی کا کورس کیا ہوا ہے۔

4۔ پاکیزہ کی منسفات بہت بہت پیارا تھی ہیں، نئے نئے موضوعات ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی طرح کے موضوعات بہت مختلف طرح سے سمجھی ہیں۔ جیسے میاں، بیوی کے رشتے پر ایک سے ایک نئی بات پڑھنے کو ملتی ہے..... یعنی اتنی باصلاحیت ہیں کہ ہر دن نئے پن کا احساس داتا ہے۔

2۔ جی ہاں اول تو شادی ہی فکر و خیال کا رخ موڑ دیتی ہے مگر میں ایک انوکھا واقعہ ضرور سناؤں گی۔ میں بینک میں جاب کرتی تھی۔ ایک دن ایک بوز صاحب نے 7501 روپے والا اڈسیدہ سا باندھ لے کر آیا کہ اسے کیش کر دیں۔ کیشیر نے کہا بوز گواہی اگلے ماہ اس کی قرعہ اندازی ہے شاید آپ کا باندھ نکل آئے اس نے کہا نہیں اتنے عرصے سے رکھتا نہیں نکلا نکھٹا بھی پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔ اتنے میں ایک صاحب جو چیک کیش کر رہے تھے انہوں نے وہ باندھ اس سے خرید لیا اور اسے ہاتھ کے ہاتھ پیسے مل گئے۔ بوز حادوا نہیں چلا گیا۔

5۔ جناب تصویر تو ہم چار سال پہلے دے چکے تھے شادی کے احوال میں اب تو مومے بھی ہو گئے ہیں اور تعارف تو بتا ہی دیا پھر بھی شہرستانی ہوں کہ میں بھی اسی پر عمل کرتی ہوں۔

دیتا ہوں میں غلوں سے آگ مشورہ تھے بہت کبھی نہ پاؤ مخالف سے ہارنا ہر چند زندگی کی زمیں شطراخ ہے لیکن کدال صورت فریاد ہارنا

کیشیر نے پوچھا صاحب آپ نے کیوں خرید اپنے اسے ہم پیسے ہی دیتے اس کے بدلے وہ صاحب بولے۔ وہ شخص مدد لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے تم کو اپنی تنخواہ کر رہا تھا میں باندھ لے سکتا تھا سو لے لیا ویسے بھی یہی ہوتی ہے۔

شادی مبارک

عظمتی آفاق سعید

ہیں جتنی بھی بارہم ملے ہیں ان سے مل کر ایک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ غرور اور تکبران کے پاس سے بھی نہیں گزرا اور یہی حال ان کے بچوں اور گھر کے باقی افراد کا بھی ہے۔ ان کے شو ہر سہیل بھائی ہمارے میاں کے بھی دوست ہیں اور وہ بھی ان کے اخلاق اور تمیز کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ہر تھوڑے دنوں پر ان کی طرف سے کھانے پورے محلے میں بانٹے جاتے ہیں اور کھانے بھی ایسے کہ آدی اپنے گھر کی ہانڈی پیچھے کر دے۔

”ای آپ بھی کچھ بھیج دیا کریں ہما آنتی کے گھر، ہر تھوڑے دن پر ان کے گھر سے کچھ نہ کچھ آجاتا ہے۔“ میری بیٹی اجیہ مجھ سے ایک دن کہنے لگی۔

”بیٹا ابھی میں سوچ ہی رہی ہوتی ہوں کہ ان کے گھر کچھ بھیجوں تو اتنے میں پھر ان کے گھر سے بریانی اور زردہ آجاتا ہے تو اس میں میری تو کوئی غلطی نہیں ہے ناں.....“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے، ہما آنتی کی ہی غلطی ہے کہ وہ اتنا بھیج رہی ہیں۔“ چھوٹے بیٹے علی نے میری سائڈ لیتے ہوئے کہا۔

اور بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ہما سہیل کے گھر سے شادی کے کارڈز آگئے جن کا انتظار پچھلے ایک دو مہینوں سے ہو رہا تھا۔ کارڈز تھے یا کہ چھوٹا سا ڈیکوریشن ٹیبل، کارڈ کے اوپر لکڑی کا جھروکا اس کے نیچے لکڑی سے دلہن انعم اور دو لہا بشر کے نام کا لوگو چسپاں تھا۔ کارڈز کے اندر مختلف رنگوں کے امتزاج کے کئی کارڈز موجود تھے۔ جیسے مایوں کا کارڈ پہلا، شادی کا لال جبکہ ویسے کے کارڈ کارنگ جامنی تھا۔

شادی کی تقریبات کا آغاز یوں تو اللہ کا نام لے

لفظ ”شادی“ اپنے اندر خوشی اور مسرت سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ لفظ آتے ہی اپنے تو اپنے غیروں کے بھی چہرے خوشی سے کھل سے جاتے ہیں۔ اپنوں کا تو سمجھ آتا ہے مگر غیروں کے خوش ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ جیسے آج رات کو کھانا نہیں پکانا پڑے گا..... دوپہر کو کچھڑی پکا لورات کو ڈٹ کر کھائیں گے۔ شاید بھائی، بیٹے کے لیے کوئی لڑکی نظر آجائے۔ وغیرہ، وغیرہ..... بہت دنوں سے ایک شادی ہونے کی گونج ہم اپنی پڑوسن کے گھر سے سن رہے تھے چونکہ ان کے بچے اور میرے بچے ہم عمر ہیں اس لیے شادی میں ہونے والی تیاریوں سے ہم خود بخود آگاہ ہو رہے تھے۔ شادی پڑوسن کی بھانجی کی تھی لیکن ہم اور ہمارے بچے خوش ایسے تھے جیسے شادی ہمارے ہی کسی عزیز کی ہو رہی ہے۔ ہماری پڑوسن ہما اپنی بہن فوزیہ، دیورانی اسما اور نند جیلہ باجی کے ساتھ اس شادی کی تیاریوں میں پیش پیش تھیں۔

”ای مایوں میں پہلے کرتے، مہندی میں واسکٹ اور سفید شلوار تھیں اور شادی کی تقسیم پرنس سوٹ ہیں.....“ میرے بچے (ایمان اور علی) مجھے آگاہ کر رہے تھے تاکہ اماں جلدی، جلدی تیاری کر لیں۔

”بیٹا ماموں کی شادی میں جو مایوں میں پہلے کرتے پہنے تھے وہ رکھے ہیں۔“ میں نے ان کو اطمینان دلایا۔

”ای، ماموں کی شادی کو دو سال گزر چکے ہیں اگر آپ نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں تو ہماری اولادوں کے لیے رکھ لیں کیونکہ ہم لوگوں کو تو وہ چھوٹے ہو گئے ہیں۔“ بڑا بیٹا ایمان مجھے کہہ رہا تھا۔

ہماری دوست اور پڑوسن ہما کافی محبت کی خاتون

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

میں جن میں ہمارا فہمیں جو اپنی بیٹی مومنہ کے ساتھ موجود تھیں۔ بڑی محبت کی خاتون ہیں، جب بھی ملتی ہیں ہمیشہ ایک پوزیٹو فیملنگ آتی ہے۔ پھر نوشین سائرہ، روزینہ اور روبینہ بھی موجود تھیں۔ نوشین ہمارے محلے کی انتہائی ماڈرن خاتون ہیں مگر وہاں ان سے بات کر کے لگا کہ جتنی وہ ماڈرن ہیں اندر سے اتنی ہی دہسکی ہیں، وہ بڑے پیارے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھیں۔ روزینہ کا تعلق سیاسی گھرانے سے ہے مگر خود کبھی سیاست نہیں کرتیں کم بولتی ہیں مگر ٹھیک بولتی ہیں، وہ بھی سلک کے سوٹ میں تھیں، سائرہ بھی موجود تھیں جو بڑی شفیق خاتون ہیں، ہمارے گروپ میں سب سے بڑی ہیں لیکن چونکہ دوست ہیں ہی لیے یہ طے ہوا ہے کہ سب ان کو ان کے نام سے پکارتیں گے۔ دوستوں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ ایک اور ہمارا انجم بھی اس تقریب میں آئی تھیں۔ ہنسی مسکراتی ہمارا کو جب دیکھو پیار آتا ہے۔ میزبان خواتین سب بہت خوب صورت گونے کے روایتی لباسوں میں ملبوس تھیں۔ سب ہی بڑے چھوٹوں نے ماتھاپٹی لگائی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دلہن کو اسٹیج پر لایا گیا اس کے آنے پر سندھی روایت کے حساب سے باجے بجائے جا رہے تھے۔ جیسا ہم نے وی پر سندھی شادیوں میں دیکھتے ہیں، تین چار پگڈنڈی باندھے لوگ جھومتے ہوئے بڑی دلکش دھنیں بکھیر رہے تھے۔ دولہا والوں کا استقبال شاندار آتش بازی سے کیا گیا۔ دلہن انجم اور دولہا مبشر دونوں ڈاکٹر ہیں۔ دولہا کے والد اور والدہ بھی ڈاکٹر ہیں (ماشاء اللہ) دلہن کے منہ پر لال رنگ کا گونا نکا ہوا کپڑا باندھا گیا۔ نقاب کے طور پر شاید مایوں پر لگایا جاتا ہو کہ لڑکی مایوں بیٹھ گئی ہے، سات سہاگونوں کے ماتھے سے چھو کر اسے پاندھا گیا..... سات کیا میرے خیال سے ستائیس ہو گئی ہوں گی۔ جیلہ باجی آئی ہوئی تمام مہمان خواتین کو عزت دینے کے لیے ان کا ماتھا چھو رہی تھیں۔ سچے، بڑے روایتی

کر شروع ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر تقریبی رشتے دار کے گھر ڈھولکی رکھی جا رہی تھی۔ جس سے آپس میں محبت اور اتفاق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

”ای، آج چاچا پرویز کے گھر ڈھولکی ہے، میں بھی جاؤں گا۔“ بڑا بیٹا ایمان ہمارے دیوروں کو چاچا ہی کہتا ہے چونکہ وہ ہمارے بچوں (حسین، راضی، عثمان اور ملائج کے چاچا ہیں) اسی لیے محلے کے تمام بچوں کے بھی چاچا ہیں، ان کی بیوی فوزیہ بھی بچوں کو ایسے ہی ٹریٹ کرتی ہیں جیسے کوئی اپنیوں کو کرتا ہے۔

”کل ٹیسٹ ہے تمہارا، کہیں میرے ہاتھوں تمہاری ڈھولکی نہ بچ جائے۔ کوئی نہیں جائے گا.....“ میں نے اسے دھمکایا۔

خیر جناب 21 اگست سے شادی کا باقاعدہ تقریبات کا آغاز ہوا۔ اس دن مایوں تھا، ظاہر ہے مایوں کی تقریب ایک بالکل نجی تقریب ہوتی ہے، خاص رشتے دار اس میں مدعو کیے جاتے ہیں۔ ہمارے مایوں کر رہی تھیں اس لیے ہمارے مایوں کریں اور محلہ مدعو نہ ہو یہ تو ہونے نہیں سکتا، ایک ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے کے لوگ مدعو تھے۔ چونکہ یہ لوگ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے ہاں سندھ کا کچھ دیکھنے کا بھی موقع میسر آ رہا تھا جو کہ عام طور پر نظر نہیں آتا۔

رات نو بجے کا بلاوا تھا اور ہم دس بجے ان کے گھر موجود تھے۔ میری ای بھی میرے پاس آئی۔ ہوئی تھیں۔ سو آج وہ بھی مہمان تھیں۔ پورے گھر کو گیندے کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ گھر کی چھت پر تقریب کا انتظام تھا۔ اسٹیج اجڑک، سندھی رنی اور کناروں کو لالٹینوں سے سجایا گیا تھا۔ ماحول میں سندھی گانے گونج رہے تھے۔ جیلہ باجی، فوزیہ، اسما اور ہمارا بہت تپاک سے ٹپکے اور اپنے گھر کی سب خواتین کو لا کر تعارف کراتی رہیں۔ دلہن کی ای فرزانہ باجی بھی بڑی محبت کی خاتون ہیں۔ میں پہلی دفعہ ملی تھی مگر ایسا نہیں لگا جیسے پہلی ملاقات ہو۔ تھوڑی دیر میں ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ہم اپنے محلے والوں سے

سندھی گانوں پر چھوڑ رہے تھے۔

ہمارے بہت پیارے شوکنگ پنک کلر کے سوٹ میں قیامت ڈھا رہی تھیں۔ ان کی بیٹی مومنہ بہت ہی کلر فل لہنگے میں تھی۔ فوزیہ گرین کلر کے لہنگے میں چوتھی کی دلہن لگ رہی تھیں۔

ہما (ہماری میزبان) ٹی پنک کلر کے ڈھاکا پاجامہ سوٹ جس پر سلور کام تھا۔ آفت لگ رہی تھیں۔ جیلہ باجی ہمیشہ کی طرح سویر لگ رہی تھیں۔ اندرون ملک جہڑا بادا دانا ندرون سندھ کے علاوہ بیرون ملک سے بھی مہمان آئے ہوئے تھے۔ اسما کالے اور سرخ کلر کے لہنگے میں ادھر ادھر ڈول رہی تھیں۔ نازک سی اسما اپنے آپ کو بھی سنبھال رہی تھیں اور بھاری بھر کم جوڑے کو بھی۔

تھوڑی دیر بعد گانوں پر ڈانس شروع ہوئے۔ خاص طور پر ڈانس فلور بنوایا گیا تھا۔ چاروں طرف گاؤں کی اور فلور کشن سیٹ تھے۔ کچھ طرف تخت سجے تھے ڈسکو لائٹ جگ جگ کر رہی تھیں۔ بال کی چھتوں سے زمین تک گیندے کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ بھرپور ڈانس پروگرام جس میں لڑکے والوں کی طرف سے شاندار پرفارمنس دی گئی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ہمارے بیٹوں حسین اور عثمان کے ڈانسز نے بھی چار چاند لگا دیے۔

تھوڑی دیر بعد ہی پرنکلف کھانے کا اعلان ہوا جس کو ہم نے بھی بے تکلف ہو کر کھایا۔ اور پھر گھر کی راہ لی۔ اگلے دن شادی کا ایونٹ تھا۔ صبح سے ہی بے موسم برسات ہو رہی تھی، جس سے پورا شہر جل تھل ہو گیا تھا۔ حالانکہ کراچی میں برسات شاذ و نادر ہی ہوا کرتی ہے۔

”اللہ، آج شادی میں کیسے جائیں گے؟“ ایمان پریشان ہو رہا تھا۔

”شادی میں رات کو جانا ہے بھائی، ابھی سے کیوں پریشان ہو رہے ہو.....“ چھوٹا بیٹا علی، بھائی کی پریشانی دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی خیر خیریت

دولہا کی والدہ ڈاکٹر روبینہ تمام چیزیں دیکھ کر کافی خوش ہو رہی تھیں۔ تمام چیزوں کا انتظام کافی طریقے اور سلیقے سے کیا گیا تھا۔ ہم بھی بہت خوش ہو رہے تھے۔ مگر ہمارے خوش ہونے کی وجہ ایک اور بھی تھی، وہ یہ تھی کہ کھانا لگ گیا تھا اور تمام مہمانوں کو کھانے کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ لذیذ کھانا ہو اور گھر جانے کی بھی جلدی نہ ہو تو پھر اس سے زیادہ آرام کی بات اور نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرے دن مہندی کا انتظام مقامی ہال میں کیا گیا تھا۔ ہر طرف خوشی اور مسرت کا ماحول تھا۔ ہما اینڈ فیملی نہایت قیمتی ملبوسات اور زیورات سے سجی ہوئی تھیں۔ آج کی تقسیم جیولری جھومر تھا۔ تمام میزبان خواتین نے جھومر لگایا ہوا تھا۔ سب کجرا سے کی ایشوریا میں لگ رہی تھیں۔

ڈھول کی تھاپ پر دلہن کی انٹری ہوئی پھر اسے اسپورٹس کار میں بٹھایا گیا جو بھائی چلا رہا تھا۔

ہماری بیٹی اجیہ کی کافی سہیلیاں ہیں، اسے ہر جگہ اپنی دوست مل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ پچھلے سال ہم لوگ فیملی ٹرپ پر جب ملائیشیا گئے ہوئے تھے۔ وہاں بھی ایک پہاڑی علاقے جیٹنگ ہائی لینڈ تک پر اس کی سہیلی اپنی فیملی کے ساتھ ٹکرائی تھی۔

”اجیہ یہاں اگر تمہاری کوئی دوست مل جائے تو میں مانوں؟“ میں نے ازراہ مذاق اس سے کہا۔

”ای مل گئی.....“ کوئی دس منٹ بعد اجیہ نے مجھ سے کہا۔

”کیا مل گئی.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”سہیلی ای اور کون.....؟“ اجیہ خوشی، خوشی کہہ رہی تھی۔ اس کی اسکول اور پھر کالج کی سہیلی حمزہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ موجود تھی۔

”ہم لوگ لڑکے والوں کی طرف سے آئے ہیں، بہت ہی اچھے اور ملنسار لوگ ہیں، ہمارے تو فیملی ڈاکٹر ہیں۔ یہ لڑکا لندن سے پڑھ کر آیا ہے۔“ حمزہ کی

ماہنامہ پاکیزہ 274 نومبر 2016ء

ذرا سوچئے

کچھ عرصے پہلے ایک ریس کا انعقاد کیا گیا..... ریس میں آٹھ بچوں نے بھاگنا شروع کیا..... ابھی کچھ ہی دور تک بھاگے تھے کہ ایک چھوٹی بچی گر گئی۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے زور، زور سے رونے لگی۔ جب باقی سات بچوں نے یہ دیکھا تو ایک لمحے کے لیے رکنے اور پھر پلٹ کر اس بچی کی طرف دوڑ لگا دی قریب پہنچ کر اس بچی کو سب نے مل کر اٹھایا اور پھر ایک ساتھ فٹنگ لائن تک پہنچے۔ یہ منظر دیکھ کر بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس ریس کا انعقاد national institute of mental health نے کیا تھا اور جن آٹھ بچوں نے اس میں حصہ لیا تھا وہ سب mentally retarded بچے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس ریس میں ہم لوگ شامل ہوتے، تو کیا یہی کرتے؟ شاید نہیں کیونکہ ہمارا دماغ اور ہماری انا ہمیں یہی بتاتی کہ ”چھوڑ سب کو اور جیت جا۔“ ہم شعور اور دماغ والے لوگ شاید یہی کرتے۔
مرسلہ: فرحین مران، کراچی

کھانے میں کیا تھا جو نہیں تھا۔ کھانے کی میز کا ایک چکر لگانے کے بعد ہی ہم جیسوں کا آدھا پیٹ بھر جائے..... لذیذ کھانا جو کہ چاق و چوبند اشاف سرو کر رہا تھا۔ حالانکہ کھانے سے پہلے اشارے کے طور پر جوس اور سمو سے کھا چکے تھے۔ لیکن کھانا تو کھانا ہوتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔

تھوڑی دیر بعد، معاف کیجئے گا کافی دیر بعد گھر کی راہ لی۔ ایک بھر پور شادی میں شرکت کر کے کافی دنوں بعد کافی مزہ آیا۔

اللہ دہن انعم اور دولہا مبشر کو خوش رکھے۔
اللہ ہمیں ایسی ہی بھر پور شادیوں کے کارڈز آتے رہیں کہ پھر ان کے حال لکھ کر کہیں کہ
”میری دوست کے ہاں شادی ہے۔“

☆☆☆

”آج اللہ بھی چاہ رہا ہے کہ ہم شادی میں ضرور جائیں۔“ ایمان خوش ہو کے کہہ رہا تھا۔ ”آج پرنس سوٹ پہننا ہے ناں..... آپ کوٹ پینٹ پہننے کے لیے کیوں نکال رہی ہیں.....؟“ ایمان کو کپڑے دیکھ کر غصہ آ رہا تھا۔

”پینا پرنس سوٹ کا دوسرا نام کوٹ پینٹ ہوتا ہے۔“ میں نے بچوں کو پٹایا۔

”پرنس سوٹ اور کوٹ پینٹ آپس میں رشتے دار ہوتے ہیں۔“

”سو تیلے رشتے دار، یہ بھی تو بتائیں.....“ بڑی بیٹی لقمہ دے رہی تھی۔

خیر جناب کسی طرح بیٹیوں کو منا کر راضی کیا گیا اور رات کو تیار شیار ہو کر مطلوبہ ہال پہنچے۔ جب ہال پہنچے تو وہاں پر نکاح ہو رہا تھا۔ مولانا صاحب نے بہت اچھی دعا کرائی جس پر تمام اہل محفل نے آمین کہا۔ اللہ تمام لڑکیوں کے نصیب اچھے کرے، آمین۔ سب سے پہلے میں نے دہن کی ای (فرزانہ باجی) کو مبارک باد دی۔ آج ان کے لیے بہت بڑا دن تھا۔ خوشی اور مسرت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کے بعد جمیلہ باجی، اسما اور ہانسے بھی فرداً فرداً ملاقات ہوئی۔ ہمارے آج بھی لائٹ مار رہی تھیں۔ ہال کھپا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دولہا اور دہن کی انٹری ہوئی دونوں ہاتھ پکڑ کر اندر آ رہے تھے۔ دہن بھاری جوڑے، قیمتی زیورات سے مزین تھی لیکن سب سے بڑی بات اس کی مصومیت اور خوب صورتی کی تھی یا شاید شادی ایک ایسا دن ہوتا ہے کہ ہر لڑکی ہی حسین لگتی ہے۔

دہن کی انٹری 3.D لائٹ کی مدد سے آتش بازی کر کے کی گئی جو ایک نئی چیز تھی۔ ہال میں ایک کونے پر اسکرین لگی تھی جس پر پچھلے پروگراموں کی تصویریں چل رہی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں کھانے کا اعلان ہو گیا۔

بلاوا اہی گیتا

رفعیہ ابدالی

کے عملے نے وہ فینچی رکھ لی۔ فلائٹ لیٹ تھی ایک بجے جہاز نے اڑان بھری ہم لوگ سعودی ائر لائن سے گئے تھے۔ تقریباً ساڑھے چار بجے جتدہ ائر پورٹ پر اترے وہاں سب مسافروں کا سامان بے کسی کی حالت میں پڑا تھا۔ ہم دونوں بہن، بھائی کا سوٹ کیس طے ہی نہیں اگرچہ میں نے دونوں سوٹ کیس پر گہرے جانتی کلر کا کپڑا باندھ دیا تھا۔ خیر بالآخر دونوں سوٹ کیس مل گئے اور اس کے بعد ایک ہی لائن میں لگ گئے جو عورتوں اور مردوں کی علیحدگی تھی آخر کار ہمارے فیکر پرنس اور تصویریں لی گئیں اس کے بعد رہائی ملی اور ہم دونوں بس پر بیٹھ گئے۔ جو ہمیں سیدھا مکہ لے گئی۔ ہوٹل پہنچ کر نہانے اور پھر کھانا کھا کر سیدھا عمرہ کرنے گئے۔ خانہ کعبہ پر جیسے ہی نظر پڑی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں کیا دعا مانگتے کچھ یاد نہیں رہا۔ عجیب ہی کیفیت تھی جسے بیان کرنے سے قاصر ہوں مگر جلد ہی خیال آیا کہ یہ قبولیت کی گھڑی ہے جلدی، جلدی اپنے لیے بھائیوں کے لیے اور جن، جن لوگوں نے کہا تھا اور ملک کے لیے تمام عالم اسلام کے لیے دعا مانگی طواف کے بعد سعی کی جہاں، جہاں نماز پڑھنا بھی پڑھی اور خوب دعائیں کیں۔ حتیٰ بھر کر آب زم زم پیا اور یونگوں میں بھر کر لائے۔ رات کے تین بجے ہوٹل واپسی ہوئی۔ میرے ایک کزن حسن عثمانی مکہ میں رہتے ہیں۔ ہم نے کراچی سے ہی ان کو بتادیا تھا پھر مکہ پہنچ کر فون کیا وہ فوراً ملنے چلے آئے فرودگاہ کے ساتھ وہ دس لیٹر کے کین میں آب زم زم بھی بھر کر لائے تھے۔

یہ یکم اپریل 2008ء کی بات ہے جب ہمارے بہار کالونی کے مکان کا سودا ہوا، یہ مکان ابو کے نام تھا اس لیے اسی نے سب ورثا میں تقسیم کر دیا۔ میں نے اس رقم سے حج کرنے کا ارادہ باندھا۔ گزشتہ سات سال سے میں روزانہ تہجد کے وقت اور رمضان میں اظہار سے دس منٹ پہلے بہت رقت سے دعا مانگا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے حج کروا دیجئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہے جسے بندہ نہیں سمجھ سکتا..... میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں عمرہ کرنے جاؤں گی۔ میرے ابو ڈاک خانے میں کام کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ای کو پنشن ملتی تھی ماں کے انتقال کے بعد حکومت غیر شادی شدہ لڑکی کو پنشن دیتی ہے سو مجھے ای کے انتقال کے تیرہ مہینے بعد پنشن ملی جو کہ اچھی خاصی رقم تھی۔ میرے بڑے بھائی نے مجھ سے کہا کہ اس رقم کا تم کیا کرو گی میں نے فوراً کہا میں عمرہ کرنے جاؤں گی انشاء اللہ بس پھر کیا تھا میں نے اور میرے چھوٹے بھائی نے پاسپورٹ بنوایا۔ اس کے بعد اس برق رفتاری سے سارے کام انجام پائے کہ میں خود حیران رہ گئی۔ میری خواہش تھی کہ میں ربیع الاول کے مہینے میں عمرہ کرنے جاؤں، میں پانچ جنوری 2015 بروز منگل بمطابق 25 ربیع الاول کو عازم سفر ہوئی۔ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے میری یہ خواہش پوری کی۔ تمام رات میں خوشی اور گھبراہٹ کی وجہ سے سو نہ سکی..... میں اگرچہ کراچی میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی لیکن شہر کی لڑکیوں کی طرح تیز طرار نہیں ہوں میں کبھی تنہا نہیں نکلتی ہوں اس کے علاوہ مجھے راستوں کی پہچان بھی جلدی نہیں ہوتی خیر مجھے اور میرے بھائی کو سی آف کرنے کے لیے میری دونوں بھابھیاں، بھتیجیاں، بھائی میری کزن اور ان کے شوہر ہمارے گھر میں ہمیں رخصت کرنے آئے۔ محلے والے بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ہماری فلائٹ دن کے گیارہ بجے کی تھی لیکن ہم لوگ آٹھ بجے ہی ائر پورٹ جانے کے لیے نکل گئے تھے۔ لو بجے ائر پورٹ پہنچے میری اور سامان۔۔۔ گی بھی اچھی طرح تلاش کی تھی، آخر کار ہمارے پاس پرس سے اسلحہ برآمد ہوئی گیا جو کہ ایک چھوٹے سائز کی چینی تھی جو میں نے عمرہ کرنے کے بعد بال کاٹنے کے لیے تو لیے میں چھپا کر رکھی تھی۔ ائر پورٹ

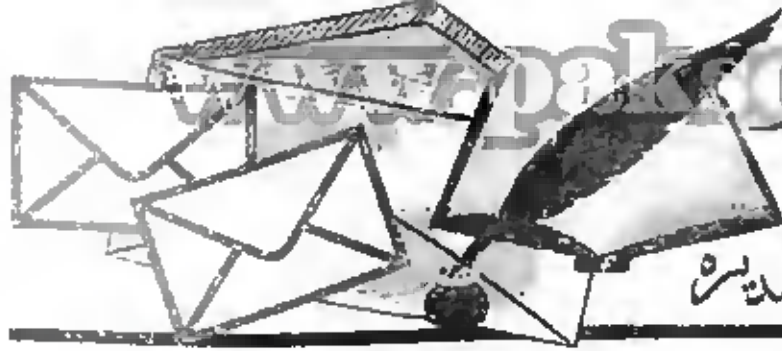
9 جنوری کی صبح مکہ سے مدینے کے لیے بس میں بیٹھے، مزے کی بات یہ تھی کہ اس دن میرے بھائی کی سالگرہ تھی۔ ایسی منفرد سالگرہ تو اس نے کبھی نہیں منائی تھی۔ بس میں ہمارے سا بیٹے والی سیٹ پر ایک مہذب سی خاتون اور ایک بیاری سی لڑکی بیٹھی تھی۔ میرے بھائی نے مجھ سے کہا کہ اس سے بات چیت کر لو۔ میں نے اس سے کہا کہ پہلے تم ان کے ساتھ آئے ہوئے آؤی سے بات کرو۔ میرے بھائی کی سمجھ میں یہ بات آگئی انہوں نے ان آؤی سے بات کی تو پتا چلا کہ وہ ریٹائرڈ کرٹل ہیں اور رقتی نام ہے انہوں نے بہت خوش دلی سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اور اپنی بیٹی کا موبائل نمبر لینے کی اجازت دے دی۔

ہوئی ہے۔ 19 تاریخ کو شام کے وقت احسن بھائی کا خون آیا کہ میں گاڑی لے کر آ رہا ہوں۔ تم لوگوں کو لینے کے لیے، آج رات دعوت ہے، بھائی نے کہا کہ ہم لوگ تو مغرب کے بعد جا رہے ہیں انہوں نے کہا کہ آپ نے کہا تھا کہ میں تاریخ کو واپس ہے۔ بھائی نے بتایا کہ ہماری فلائٹ تو صبح ساڑھے پانچ بجے کی ہے لیکن بس والا ای وقت ہم لوگ کو جدہ پہنچا رہا ہے۔ اگرچہ بس رات کے دس بجے آئی اگر صبح وقت بتاتے تو ہم لوگ احسن بھائی کے گھر ضرور چلے جاتے۔ بھائی سے نہ ملنے کا افسوس ہی رہا۔ میں نے دو تین باتیں نوٹ کیں جو مجھے بالکل اچھی نہیں لگیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ مسجد نبوی اور خانہ کعبہ دونوں جگہ موبائل سے تصویریں بنائی جا رہی تھیں جبکہ تصویر پھوٹانا ہی گناہ ہے پھر ایسی مقدس جگہوں پر تو اور بھی زیادہ گناہ ہے۔ دوسری بات جو میں نے محسوس کی کہ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں ایسا لگتا تھا کہ یہ کوئی پکنک پوائنٹ ہے کھانے کے ساتھ قہقہے بھی لگ رہے تھے۔ مسجد میں تو عزت اور احترام کی جگہیں ہیں..... ساتھ ہی گھوڑوں کی گھٹلیاں پانی کے گلاس ٹانگوں کے ربر لوگ پونٹھی چھوڑ کر چلے جاتے تھے جبکہ بڑے بڑے ممبر رنگ کے ڈسٹ بن ٹھوڑی، ٹھوڑی دور پر رکھے ہوئے ہیں، تیسری بات جو مجھے سخت بری لگی کہ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں لوگ کھانے پینے کی چیزیں بانٹتے تھے اور پاکستانی عورتیں اس بری طرح ٹوٹی تھیں جیسے بھی کہا یا یہ ہو۔ اس طرح کی حرکتیں کرنے سے پاکستانی قوم بدنام ہوتی ہے۔ خدا ان کو ہدایت دے، آمین۔ 20 جنوری کو دن کے ایک بجے واپس ہوئی اس طرح یہ مبارک سفر اختتام کو پہنچا۔ میں یہاں واپس تو آگئی ہوں لیکن بقول شاعر.....

ہم مدینے سے اللہ کیوں آگئے
 قلب حیراں کی تسکین وہیں رہ گئی
 دل وہیں رہ گیا جاں وہیں رہ گئی
 خم آبی در پہ اپنی جہیں رہ گئی
 ہم مدینہ سے اللہ کیوں آگئے
 زعمگانی وہیں کاش ہوئی بسر
 کاش بہزاد آتے نہ ہم لوٹ کر
 اور پوری ہوئی سب تمنا مگر
 یہ تمنائے قلب حزیں رہ گئی
 آخر میں اپنی تمام کار میں بہنوں سے یہ گزارش کر دیں گی
 کہ میرے لیے یہ دعا کریں۔

شبہ والا کے قدموں میں مرا گھر بار ہو جائے۔ آمین.....

لڑکی کا نام انعم رکھیں تھا۔ ہم دونوں نے موبائل نمبرز کا تبادلہ کیا۔ انعم نے کہا کہ میں نماز کے لیے جانے سے پہلے نکل دے دوں گی اس طرح ہم سب نماز میں ساتھ ہو جاتے تھے۔ پہلے ہی دن عصر کی نماز کے بعد آٹنی نے مجھے کہا کہ میں ہوئی واپس جا رہی ہوں، مغرب کی نماز کے لیے آؤں گی وہ تو چلی گئیں مگر میرے پاس کوئی لڑکی آئی اور مجھ سے بہت اپنائیت کے ساتھ بات کرنے لگی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کون ہے میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے بھائی کے ساتھ آئی ہوں پھر اس نے کہا کہ آپ نے ریاض الجنتہ کی زیارت کی میں نے کہا کہ میں آج ہی آئی ہوں اس نے کہا میں آپ کو ریاض الجنتہ کی زیارت کراؤں گی آپ اپنے بھائی سے پوچھ لیجیے۔ وہ لڑکی آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی لیکن دیکھنے میں بہت تیز طرار تھی، میز مشاہدہ ہے کہ کسی کی شخصیت جاننے کے لیے اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھیں آنکھوں ہی سے تیزی طراری یا سادگی عیاں ہو جاتی ہے۔ دوسرے ہی دن وہ دوبارہ موجود تھی اس نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنے بھائی سے کہیے کہ وہ عشا کی نماز کے بعد ہوئی واپس چلے جائیں۔ میں آپ کو ریاض الجنتہ کی زیارت کے بعد ہوئی واپس چھوڑ دوں گی اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے پاس ہوئی کا کارڈ ہے میں نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے اس سے کہا کہ اپنا موبائل نمبر دو اس نے کہا میرے پاس تو موبائل ہی نہیں ہے تو میں نے اس سے کہا کہ اپنی ای کا موبائل نمبر دے دو اس نے کہا کہ ای کسی کو اپنا موبائل نمبر نہیں دیتی ہیں۔ میں تو سوچ میں پڑ گئی کہ اگر میں اس کے ساتھ چلی گئی اور واپس ہوئی نہ پہنچی تو میرے بھائی مجھے کیسے تلاش کریں گے میں نے فوراً انکار کر دیا وہ لڑکی چلی گئی اور پھر کبھی نہیں ملی۔ میں نے آٹنی سے کہا میرا دل اس کے ساتھ جانے کے لیے بالکل راضی نہیں ہوا انہوں نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیے گا۔ دوسرے دن میں ان کے ساتھ ریاض الجنتہ گئی وہاں بہت پرس تھا میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور بہت ساری دعا میں مانگیں۔ واپس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ایک روز ہم لوگ مدینے کی زیارت کو گئے۔ حضرت عثمان غنی کے گھوڑوں کے باغات دیکھے اور ان کے کنویں کا ٹھنڈا پانی پیا۔ مسجد قبا، مسجد بلتیین میں نماز پڑھی غار ثور دیکھا۔ آٹھ دن کیسے گزرے کچھ چٹا نہیں چلا۔ 17 جنوری کو ہم آنکھوں اور بچھے دل کے ساتھ ہم واپس مکہ آگئے۔ 18 تاریخ کو مکہ کی زیارت کی، غار حرا، جبل رحمت کو دیکھا اور دعائیں مانگیں۔ مسجد نمبرہ کی زیارت کی۔ میدان عرفات دیکھا۔ مسجد نمبرہ کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ یہ مسجد سارا سال بند رہتی ہے، صرف حج کے موقع پر یہاں نماز



بہنوں کی محفل

مدد بریں

☆ عزیز از جان، بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!.....

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا..... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو..... یا الہی دونوں جہاں میں ازل سے ابد تک سب کی خیر ہو اور تو آم سے ہمیشہ راضی رہے..... الہی آمین

☆☆☆

☆ پیاری بہنوں نیا قمری سال شروع ہو چکا ہے، ہماری دعا ہے کہ یہ سال ہم سب کی خوشیوں اور کامرانیوں کا سال ہو جو ایمان کی سلامتی کے ساتھ بسر ہو، آمین۔

اس ماہ کئی خطوط ایسے ملے جس میں خانگی جھگڑوں کا تفصیل سے ذکر تھا۔ تند، بھاد جوں کی لڑائیاں تو سنا کرتے ہی تھے مگر بہنوں کی بہنوں سے لڑائیاں اور ماں کی اپنی بیٹی سے لڑائی کے احوال بڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور جب ان تمام معاملات کو بنظر عاثر دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف برداشت کی کمی اور تیز و ترش جملوں نے جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کیا تھا۔

پیاری بہنو..... اچھا اخلاق اور نرم لہجہ کسی بھی خوب صورت شخصیت کی عکاسی کرتا ہے..... یہ حقیقت ہے ایسے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو زبان سے کوڑے مارنے کا کام کرتے ہیں مگر ان لوگوں کو کوئی بھی دل سے پسند نہیں کیا کرتا..... سورہ کہف کی انیسویں آیت کا ایک لفظ ہے **وَلْيَخَافِ** یہ تھوڑا بڑا کر کے لکھنا ہوتا ہے کیونکہ یہاں قرآن کریم کا درمیان آجاتا ہے اور یہ لفظ پورے قرآن کا خلاصہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور اس کا ترجمہ ہے "اور نری سے بات کرنا" اور جب اللہ نے مومن کو فرعون کے پاس بھیجا تو بھی یہی کہا کہ تم اس سے نری سے بات کرنا شاید کہ وہ مان جائے۔ وہ انسان کہ جس سے زیادہ متکبر اور گھمنڈ والا شخص دنیا میں اور کوئی نہیں آیا۔ زندگی تقی ہی بدل جائے اگر ہم اس بات کو مان جائیں کہ نری سے بات کرنے کا مطلب بے وقوفی اور کمزوری نہیں بلکہ عاجزی اور اعلیٰ ظرفی ہے جس کو اپنا کر کسی سے بھی لڑائی جھگڑے کا امکان نہیں رہتا۔ مگر یہ خوبی شاید صرف وہ ہی اپنا سکتے ہیں..... جو دل سے صلح پسند ہوتے ہیں۔

اس ماہ کئی خطوط پر ہمیں اپنا اور اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئیں..... اور ظاہر ہے کہ وہ شامل نہیں ہو پائے..... اسی طرح ایک بہن نے اپنا اور اپنے گاؤں چند بیاں فیض اللہ کا تعارف لکھ کر بھیجا مگر اس میں وہ اپنا نام لکھنا بھول گئیں..... اب آپ ہمیں جلدی سے بتادیں کہ اس تعارف کے ساتھ کیا نام لکھا جائے..... اگر آپ اپنا اصلی نام پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں تو اپنا کوئی قلمی نام بھی رکھ سکتی ہیں۔ اس محفل میں ہم نے دو بہنوں کے نام رکھے ہیں..... جی ہاں قلمی نام انہوں نے ہم پر ڈسے داری ڈال دی تھی..... باجی آپ کوئی اچھا سا نام رکھ دیں..... اور ہم نے جمعٹ رکھ دیے..... (ظاہر ہے اس کام میں تو ہم ماہر ہیں..... درجنوں تو کیا سیکڑوں کہانوں کی ہیروئنز کے نام بھی تو سوچ بچار کر رکھے ہی تھے..... آم،)

آئیے اب! سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ اس ماہ ہمیں قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، لاہور کیٹ کی جانب سے دو بہت خوب صورت کتابیں ملیں..... پہلی کتاب خادم انسانیت عبدالستار ایدھی کے بارے میں ہے۔ جس کے مولف رانا عامر رحمن محمود ہیں..... جس میں عبدالستار ایدھی پر لکھے گئے، بچپن مضامین یکجا کیے گئے ہیں..... عبدالستار ایدھی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لکھا جا رہا ہے اور لکھا جائے گا..... ایسی شخصیات دنیا میں کم، کم ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانیت کی خدمت بے لوث کی جائے اور یہی ایدھی صاحب کا مشن تھا۔ اس کتاب کا اتساب معروف و مقبول سماجی شخصیت جناب رانا فضل الرحمن محمود (مرحوم) ایڈووکیٹ کے نام ہے اور دوسری کتاب مقبول اور محبوب مصنف انظار حسین کے نام ہے جس کا نام ہے، انظار حسین ایک عہد، ایک داستان اس کے مؤلفین افتخار مجاز اور عبدالستار

عاصم ہیں۔ اس کے صفحات 655 ہیں۔ یہ بڑے سائز کی بے حد ضخیم کتاب ہے۔ یہ انتظار حسین کے بارے میں 21 دسمبر 1925ء سے دوفرواری 2016ء تک پر محیط ہے۔ جس میں ان کا آخری انٹرویو تک شامل ہے۔ انتظار حسین پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہ ایک نہایت مفید کتاب ہوگی۔ انتظار حسین جیسے ادیب روز بروز پیدا نہیں ہوتے، ان کی اپنی ادبی خدمات اس قدر طویل اور لائق صد تحسین ہیں کہ ہمیشہ ملکی ادب کا قابل فخر سرمایہ رہیں گی۔ ان کے ہم عصروں نے ان پر جو مضامین لکھے ہیں اور جو اخبارات میں ادارے لکھے گئے وہ سب اسی کتاب میں شامل ہیں جو انتظار حسین کے حوالے سے نہ صرف پہلی کتاب ہے بلکہ ان کو خراج تحسین بھی پیش کرتی ہے۔ دونوں کتب کی قیمتیں انتہائی معمولی ہیں..... رابطے کے لیے آپ فون کر سکتے ہیں۔ 042.36613021.0300.0515101

☆ عظیمی آفاق کی کتاب ذرا سا گھوم لوں میں کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے قریب ہے، اس کتاب میں تین ملکوں کے سفر نامے بے حد دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں، فلیپ پر محترمہ عذرا رسول، عامرہ شاہد اور دیگر کی رائے ہے، قیمت صرف تین سو روپے، کتاب گھر بیٹھے بذریعہ وی پی حاصل کرنے کے لیے انٹرنیشنل پبلشرز لاہور سے اس نمبر پر رابطہ کیجیے..... اس سے قبل کہ کتاب آپ کو نہ مل پائے۔ (03004183997)

☆ معروف شاعرہ شگفتہ شفیق لندن میں نواسی کے خوب لاڈ اٹھا کر مشاعروں میں شرکت کر کے ٹی وی چینل پر اپنا انٹرویو دے کر واپس کراچی آگئی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ ہماری پیاری تبصرہ نگار نسیم ماپارا امریکا میں عزیز واقارب سے خوب، خوب ملاقاتیں کر کے کراچی پہنچ چکی ہیں اور انہوں نے یہاں آکر اپنی ساگرہ منائی۔ (ماشاء اللہ)

☆ مصنفہ سیمنا صاف کی بہن ریحانہ رومی ان دنوں پاکستان آئی ہوئی ہیں اور ماشاء اللہ اپنے بیٹے شارق رومی کی شادی کے سلسلے میں۔ شارق کی دلہن کی تصویر سوشل میڈیا پر دیکھی بہت پیاری ہے۔ (سیمنا آپ کو اور ریحانہ رومی کو ولی مبارک باد)

☆ ریحانہ پاکیزہ کی زبردست فنن ہیں اور پاکیزہ کے حوالے سے اپنے بیوٹی سیلون میں خصوصی ڈسکاؤنٹ دیتی ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کی بھانجی کے ہاں امریکا میں لڑکا ہوا ہے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ارم کمال، فیصل آباد کی بیٹی کرن کمال کے ہاں بیٹا ہوا ہے اور یوں اب ارم نالی اماں بن گئی ہیں، (مبارکباد)

☆ مصنفہ نگہت غفار کے بیٹے فہد غفار کی شادی گزشتہ دنوں انجام پائی۔

☆ مستقل قاری بشریٰ رضوی کی بیٹی بہن معصومہ بتول کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ (مبارکباد)

☆ پاکیزہ کی قاری سوز ستارہ شیخ بہت جلد کراچی میں اپنے نئے بنگلو میں شفٹ ہونے والی ہیں۔ (مبارکباد)

☆ پاکیزہ کی قاری عہدہ خاں، کراچی کی منگنی ہوئی ہے۔ (مبارکباد)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار فیروزہ بیگم کی چھوٹی بہن ان دنوں امریکا گئی ہوئی ہیں، اپنے بچوں کے پاس۔

☆ پاکیزہ کی قاری بساجدہ، سندھ کا نکاح بقرعید کے تیسرے دن ان کے گاؤں میں ہوا۔ (مبارکباد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

- ☆ پاکیزہ کی قاری شہلا ظفر کی طبیعت بے حد خراب ہے۔
- ☆ آرزو شاہد کا حال بستر عیلت پر ہیں۔
- ☆ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی طبیعت ناساز ہے۔
- ☆ غزل خاں، امریکا ہنوز بستر عیلت پر ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اینہ عند لیب، سلانوالی کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راول پنڈی بیمار ہیں۔
- ☆ ریحانہ شہناز صدیقی کی طبیعت ناساز ہے۔
- ☆ عظیمی زہری، اوستا محمد کے جیٹھ کے بیٹے کے لیے دعا کی ضرورت ہے

انتقال پر ملال

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کی چھوٹی بہن نسرین نے امریکا میں انتقال کر گئیں۔

www.paksociety.com
 کچھ مہینے نسرین نیل سیال، کجرات کے بہنوئی منظور صاحب اسلام آباد میں چلے آئے اور نسرین نیل کے شوہر کی جواں سال مہینہ سی را حیلہ وفات پا گئی۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین بار سورہ اخلاص پڑھ کر انہیں بخش دیجیے۔ اللہ تعالیٰ تمام مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

کچھ شمیم فضل خالق، شادور سے۔ "آج جی کچھ ماندہ، ماندہ سا ہے، دل پر بوجھ ہے اور طبیعت پریشان..... جب سے عندیاب انگلینڈ گئی ہیں اکثر ایسا کچھ ہو جاتا ہے کہ بچے یاد آتے ہیں تو دل جیسے کوئی تھی میں جکڑ کر زور، زور سے دبوچنے لگتا ہے..... زرک خان میرے ساتھ بہت خوش رہتا تھا اور چھوٹی سی عمر میں میرے ساتھ وقت گزارا کرتا تھا رات کو مجھ سے لیٹ کر سویا کرتا تھا۔ چھوٹا ہاشم خان رو، رو کر آنکھیں سجالیتا تھا کہ بڑی ماما کو لاؤ اور رات گئے عندیاب مجھے لینے آ جاتی کہ ہاشم چپ نہیں ہو رہا تم میرے ساتھ چلی چلو میں بھی سب چھوڑ چھاڑ اس کے ساتھ چلی جاتی۔ زرک خان اور ہاشم خان میرے نواسوں کے نام ہیں، انہیں ڈیئر..... ساری بہنیں آپ کے ساتھ اپنے دکھ سکھ شیئر کرتی ہیں..... میں ہمیشہ افسانوں کا ذکر کرتی ہوں یا تحریروں پر تبصرہ کرتی ہوں..... آج میرا دل بہت اداس ہے اس لیے نہ افسانوں کی بات کروں گی نہ کسی افسانے پر کوئی تبصرہ کروں گی..... آج اپنے دل کی باتیں کروں گی..... آج آپ سے اپنے احساسات شیئر کروں گی خیر..... خدا سب کی اولادوں سمیت میرے بچوں کو خوش رکھے لیکن دل پر کسی کا اختیار کہاں ہوتا ہے انجم ڈیئر۔" (شمیم بہن جب اولاد پر دلیس چلی جاتی ہے تو وہ ہمارا دل بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ تب ہم بھی پردہ سے ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر بے وجہ بھی رونے کو جی چاہتا ہے۔ اللہ ہمارے بچوں کو سلامت رکھے۔ ہمیں اپنے اہم رجحانات کو پیدا کرنا ہی ہے..... ورنہ کبھی کیا سکتے ہیں)

کچھ سکلی غزل، کراچی سے۔ "سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے، لا جواب اس لیے کہ آخر میں آپ نے بہت اچھی بات کی اکثر مہمان آتے ہیں یا کہیں جاتے ہیں تو ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل ہوتی ہے جیسے ابھی ابھی لندن یا امریکا سے آئے ہیں میرے گھر میں تو ڈپنسر لگا ہے اور آج کل ہم جیسے عام لوگوں کے گھر لگا ہی ہوتا ہے مگر میں کہیں بھی جا کر ہر طرح کا پانی پی لیتی ہوں اور اللہ کا شکر کہ کسی کچھ نہیں ہوا یعنی کدو، ہضم پھر ہضم..... اب آتے ہیں افسانوں کی طرف..... تم شدہ محبت سادگی میں بھکاری کہنا چاہیے پھر بہنوں کی محفل پڑھ کر مزہ آتا ہے اس مرتبہ عزیزہ سید نے بڑا مایوس کیا انجام پڑھ کر بڑا دل دکھا کہ صرف ایک جملے کے لیے کہ میرا اور آپ کا خون ایک جیسا ہے آپ نے اتنا بڑا افسانہ لکھا اور اینڈ بھی positive نہیں۔ اتنی اچھی اور بڑی رائٹ سے اس انجام کی توقع نہیں تھی اور کوئی ماں اتنی بے رحم اور سخت بھی نہیں ہوتی اس کے نتیجے میں اچھائی سے لوگوں کا اعتماد ختم ہو جائے گا بہنیں کان پکڑ کر لیں گی اچھائی سے سنگ سفر سا تباہ بھی فرمیں اظہر کی اچھی تحریر ہے، عقیدہ حق کی قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔ نے کچھ مزہ نہیں دیا کیونکہ کم از کم میں اپنے ایرے کی حد تک کہہ سکتی ہوں کہ ہر گھر کا ڈب ڈب فریزر نہ صرف ماسیوں، دھوبی، مسلمان جھدار اور مالیوں کے گوشت سے بھرا ہوتا ہے معلوم اس طرح ہوتا ہے کہ ملنے ملانے پر ہر خاتون یہ کہتی نظر آتی ہے کہ یار ماسیوں کی وجہ سے ڈب فریزر چلا رکھا ہے ورنہ ہمارے لیے تو فریج ہی کافی ہے کیونکہ آج کل لوگ ہیلتھ کا نفس بھی ہو گئے ہیں اور گوشت سے کافی حد تک (کم از کم میری جیسی عمر کے لوگ) پرہیز کرتے ہیں، تم جو مل گئے ہو ناویہ احمد نے خوب لکھا خاص طور پر سوتیلی ماں کا کردار positive مجھے اچھا لگا۔" (تبصرے کا شکریہ)

کچھ نگہت سیما، چکوال سے۔ "ابھی اگست اور ستمبر کا پاکیزہ نہیں پڑھا۔ سوائے آپ کی قسط کے بہت خوب، اچھا جا رہا ہے، اپنا خیال رکھیے گا۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔" (شکریہ)

کچھ نسرین نیل سیال، کجرات سے۔ "آپ سے بات کرنا بہت اچھا لگتا ہے آپ کی آواز سن کر ولی سکون ملتا ہے ایک عجیب سی محضک کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ فون اینڈ کرتی ہیں اور کبھی مایوس نہیں کرتیں۔ ابھی، ابھی عید گزری ہے اللہ تعالیٰ آپ سب کو ایسی ہزاروں عیدیں نصیب کرے اور ہر عید آپ سب کے لیے مبارک ثابت ہو، آمین۔ آپنی آپ کو پتا ہے میرا معصوم سا اکلوتا پوتا عرصہ دراز سے بیمار ہے۔ آپ پاکیزہ میں دعا کے لیے اپیل کر دیجیے گا موسیٰ کے لیے۔ (جی ضرور) پاکیزہ میں بہت سے نئے لکھنے والے ماشاء اللہ شامل ہو گئے ہیں اس لیے مجھے نہیں جانتے کیونکہ میرا آخری ناولٹ

1999ء ستمبر اور اکتوبر میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا میں نے 1983ء سے لکھنا شروع کیا تھا بہت سے پرچوں میں نسرین جمیل کے نام سے لکھتی رہی ہوں۔ 99ء سے بیمار ہوئی تو چھوڑ دیا۔ اب دوبارہ مئی 2016ء کو دوبارہ پاکیزہ سے رابطہ کیا ہے۔ پاکیزہ میں اب نسرین جمیل سیال کے نام سے دوبارہ حاضر ہوئی ہوں اب صرف پاکیزہ میں ہی لکھنے کا ارادہ ہے۔ (دوبارہ سے آجائیں آپ کو بھی خوشی ہوگی)

کچھ یا سیمین جاوید اقبال، کراچی سے۔ ”میں پاکیزہ کا آپ کا اور ڈاکٹر ذکیہ بلکرای کا جتنا بھی شکر یہ ادا کروں وہ کم ہوگا۔ آج میں نے آپ کو یہ بتانا ہے کہ ڈاکٹر ذکیہ بلکرای کی یادوں کی مالا پڑھنے کے بعد میں نے ہر جمعرات کو قرآن پاک پڑھنا شروع کیا اور اگلی جمعرات کو ختم کیا..... بفضل اللہ میں اب تک 25 قرآن پاک پڑھ چکی ہوں۔ اور اس کے پڑھنے سے میں بہت خوش ہوں..... اللہ تعالیٰ زندگی کا ہر مسئلہ خود ہی حل کر دیتا ہے۔ اور اب مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔“ (بیاری یا سیمین اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور ہم سب کو بھی ایسی توفیق عطا فرمائے، آمین)

✉ اختر جہاں، بمبکر..... آپ کو شمیم فضل خالق کی کتاب چاہیے..... میں شمیم سے کہہ رہی ہوں کہ وہ اپنی کتب بمبکر کے اردو بازار میں رکھوادیں۔ اور چند کتب مجھے بھی بھیج دیں..... میں بہنوں کو انعام کے طور پر دے دوں گی۔

کچھ مسز نرہت اشفاق، کراچی سے۔ ”ماشاء اللہ اس ماہ آپ کے ناول کی قسط نے دھاک بٹھادی۔ ہر کردار کے حوالے سے لکھا گیا اور بے حد خوب..... ایسے فاسٹ ناول پرٹی وی کے سوپ بھی اچھے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس شمارے کے افسانے بھی اچھے رہے۔ ام ایمان، ہاجرہ رحمان، عارفہ مسعود اور عزیزہ سید کی تحریریں بہت اچھی لگیں۔ اختر شجاعت کی تو میں فین ہوں اور وہ ہر بار بڑی ریسرچ کر کے موضوع کو بڑی عمدگی سے لکھا کرتی ہیں۔ عظمیٰ آفاق کے افسانے یا ناول کا انتظار ہے۔ شمیمہ عظمت کا انٹرویو اچھا اور تصویریں بہت ڈم لگیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ مسز ظاہرہ کافون خوشاب سے..... ”پاکیزہ بہنوں کی محفل سے پڑھنا شروع کیا تھا اور اب تو اس کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ پاکیزہ پڑھے بغیر رہنا نہیں جاسکتا..... گزشتہ ماہ ایک بہن کا ہولناک خط پڑھ کر کانپ کر رہ گئی..... کیسی، کیسی شریف زادیاں ان ہیروئن فیور کے چکر میں آ کر تھی دامن ہو جایا کرتی ہیں۔ میں نے اس خط کا تذکرہ اپنے شوہر سے کیا..... تب ہم دونوں نے نل کر سوچا اس لڑکی کی شادی ہم اپنے حلقہ احباب میں کسی نیک اور شریف شخص سے کروا دیتے ہیں اگر وہ بہن شادی کر کے شریفانہ زندگی گزارنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں..... تو میں ان کی مدد کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ مذکورہ بہن میرا فون نمبر انجم باجی سے لے کر پہلے مجھ سے بات کرے پھر ہم جلد ملاقات کر کے تمام امور طے کر لیں گے۔“ بیاری طاہرہ، اس وقت میں اپنی اس خوشی کے بارے میں نہیں بتا سکتی..... جو تمہارا فون سین کر مجھے ہوئی ہے، پاکیزہ کی یہ محفل واقعی محبت کے پھولوں سے گندمی ہوئی ہے..... جہاں ہر بہن دوسروں کا دکھ محسوس کیا کرتی ہے۔ اب آپ لوگ ایک دوسرے سے مل کر آئندہ زندگی کے بارے میں سب بات کر لیں آگے آئیے..... خود بہتر جانتی ہیں، تفصیلی طور پر میں نہ لڑکی کو جانتی ہوں اور نہ لڑکے کو مگر آپ سب کے لیے بے شمار دعائیں ہیں، اب جو بھی کچھ ہو وہ مثبت ہو اور دونوں فریقوں کو دلی خوشیاں ملیں۔ (ذ آمین، ثم آمین۔)

کچھ شاہینہ مبارک، ہالہ سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ پڑھا سب سے پہلے کم شدہ محبت پڑھنا شروع کیا کیونکہ گزشتہ ماہ بے حد سسپنس پر قسط ختم ہوئی تھی..... اس ناول کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ اس میں ہر بات تیزی سے ہوتی نظر آ رہی ہے ناول کی رفتار تیز ہے..... مجھے آہستہ، آہستہ چلنے والی قسطیں اچھی نہیں لگیں..... بہنوں کی محفل بار بار پڑھ کر پور نہیں ہوتی۔ میرے ساتھ میری دو بہنیں بھی پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہیں یہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں اور ان کی یہ فرمائش ہے کہ ڈراموں میں کام کرنے والی دو جڑواں بہنیں ایمین خان اور منال خان کا انٹرویو پڑھتا ہے۔“ (آپ کی فرمائش نوٹ کی جا رہی ہے)

کچھ امینہ عندلیب، سلطانوالی سے۔ ”گزشتہ شمارہ آہستہ، آہستہ پڑھا۔ سرورق عام انداز سے مختلف ہے۔ ادارہ یہ سب کے دل کی بات ہے۔ تمام ناول کی اقساط پسند آئیں۔ ہاتھیں بہار و خزاں کی دلچسپ انداز میں ہونا چاہیے۔ اس میں سعدیہ ہاشم کو مزاحیہ انداز میں انٹری دینی چاہیے۔ طیبہ عنصر دفیہہ دلچسپ انداز میں لکھیں تاکہ پڑھنے والوں کو حوا آئے۔ رفعت سراج اپنے ناول میں اگر انگریزی کا استعمال نہ کریں تو..... بس اس قدر عادی کر سکتے ہیں۔ سحر ماجد نے اچھا لکھا۔ ام ایمان، نلیم احمد بشیر، ہاجرہ رحمان، نرہتین انظر، عقیلہ حق، صاعقہ عاطف، عارفہ مسعود سب کے ہی افسانے پڑھے، نگہ، عزیزہ سید نے اپنے اپنے انداز سے مختلف لکھا، نرہتین انظر کا کیا گیا انٹرویو اچھا رہا۔ ان سے راکٹرز سے

لفصلی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں..... آخر شجاعت تو ہمیشہ ہی اچھا لگتی ہے۔ عظمیٰ کی ڈائری شاعر..... مگر اسے اور بھی کچھ لکھنا چاہیے۔ میں اپنی تمام بہنوں کی مشکور ہوں جو باقاعدگی سے میری صحت یابی کے لیے دعا کرتی ہیں۔“ (تیسرے کا شکر یہ آپ کی بہنیں کہہ رہی ہیں کہ جن سے محبت کی جالی ہے..... ان کے لیے دعائیں تو خود بخود دل سے نکلا کرتی ہیں)

بھ شگفتہ شیخ، کراچی سے۔ ”لندن سے آتے ہی پہلے پاکیزہ پڑھا..... کیا شاندار اوارہ لکھا ہے باجی آپ نے..... کم شدہ محبت پڑھ کر مزہ آرہا ہے۔ رفعت سراج بھی خوب لکھ رہی ہیں۔ سیمارضا روا کے منی ناول کی ابھی پہلی قسط پڑھی ہے اور ابھی لگی..... اب دیکھتے ہیں کہ آکے کیا ہوتا ہے۔ اس مرتبہ سارے کے سارے ہی افسانے بہت عمدہ ہیں مگر ان میں ام ایمان، ہاجرہ ریحان اور فرحین انظر بازی لے گئیں۔ عزیزہ سید کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ثمنینہ عظمت علی سے مل کر اچھا لگا۔ ہاں باتیں بہار و خزاں کی۔ میں مزہ نہیں آرہا۔“ (اس سلسلے میں سب شرکت کر سکتے ہیں، تم بھی کر سکتی ہو)

بھ رابعہ خان، جھنگ سے۔ ”پہلی مرتبہ رائے دے رہی ہوں..... جب ہمارے ہاں پاکیزہ آتا ہے تو میری ای کہتی ہیں کہ اب تو رابعہ کام سے گئی..... جب تک پورا پاکیزہ ختم نہیں کرے گی، اٹھے گی ہی نہیں..... اور میں تو بہت جلد پڑھ لیتی ہوں، مجھے سارے کا سارا ہی پاکیزہ پسند ہے پورا پڑھتی ہوں مگر جو کچھ سب سے زیادہ پڑھتی ہوں، وہ پاکیزہ کے خطوط لگانے والا حصہ ہے اپنے خط میں نے دوسرے ڈائجسٹوں میں نہیں لگے دیکھے..... یہاں اپنا سیت ہی لگتی ہے، مجھے پاکیزہ کے صفحات کے کونوں میں لکھی ہوئی تحریریں تک پسند ہیں اور پاکیزہ ڈائری بھی اچھی لگتی ہے۔“ (اس محفل میں خوش آمدید..... رابعہ تم اپنا اور اپنی سہیلیوں کا اثر دیکھ کر ہمیں بھیجو..... بغیر تصویر کے بھی لگ سکتا ہے، ہاں پاکیزہ کے لیے اتنی محبت کے لیے تو چراک اللہ ہی کہوں گی کہ یہ تو آپ کا اپنا ہی ڈائجسٹ تو ہے)

بھ ایک بہن، کراچی سے۔ ”انجم باجی میں بہت کام کرتی ہوں، گھر کے، باہر کے لوگوں کے سب کے کام آتی ہوں بس مجھ میں سب سے بڑی خامی ہے کہ مجھ سے باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھی جاتی، بہت کوشش کرتی ہوں کوئی آسان سی ترکیب بتائیں۔“ (بیاری بہن آپ کو ان بات کا اجناسا ہے تو انشاء اللہ آپ باقاعدگی سے پڑھنے لگیں گی۔ وہ تمام بہنیں جو سرے سے نماز پڑھتی ہی نہیں ان سب کے لیے بے حد آسان ترکیب ہے کہ سب سے پہلے آپ صرف عصر کی نماز پڑھنی شروع کریں، عصر کے بعد مغرب کا وقت ہو جاتا ہے تو آپ لا محالہ مغرب کی نماز بھی ضرور پڑھ لیں گی۔ جب تک آپ باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی عادی نہیں ہو جاتیں یہ کوشش ضرور کریں کہ آپ کا کوئی دن نماز کے بغیر نہ گزرے اور جب آپ کو مزہ آنے لگے گا تو پھر نماز پڑھے بغیر آپ کو خود سکون نہیں ملے گا۔ اللہ آپ سمیت ہم سب کو ہمیشہ نماز کا عادی بنائے رکھے، آمین)

بھ قیصرہ حیات، سیالکوٹ سے۔ ”میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ نہیں پڑھ پاتی۔ مگر پاکیزہ کو گاہے بہ گاہے دیکھتی ضرور ہوں۔ کافی عرصے کے بعد ایک افسانہ بد صورت پڑھا..... اور اس میں مجھے مصنفہ کا بد صورت لوگوں کے لیے پیغام بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔“ (قیصرہ میں آپ کی رائے سے متعلق ہوں، آئندہ مزید محتاط ہو کر ہم افسانوں کا انتخاب کریں گے، ہاں توجہ دلانے کا شکر یہ)

بھ مسز امین، ملتان سے۔ ”مسز انجم آپ سے پہلی بار رابطہ کر رہی ہوں، میں سچر ہوں، بے حد مصروف رہتی ہوں اس لیے وقت کم، کم ہوتا ہے مگر پاکیزہ ضرور پڑھتی ہوں، آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں، دوسری مصنفات بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں عظمیٰ آفاق کو میرا سلام اور اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ہے کہ ہر ماہ حاضری دیا کرو.....“ (اس محفل میں خوش آمدید، آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

بھ ایم ثمنینہ، کراچی سے۔ ”باجی آپ فیس بک پر کم ہی نظر آتی ہیں، (جی ہاں) یہاں کی دنیا ہی عجیب ہے..... ہر رائٹر اپنے آپ کو فلاطون سمجھتی ہیں۔ دو چار افسانے کیا شائع ہو گئے اپنے آپ کو افسانے پر کھنے کی جج سمجھتی ہیں..... ایک دوسرے سے محبتیں بھی جتاتی ہیں اور پیٹھ پیچھے نفرت بھی..... میرا تو دل اچھا ہو گیا اس فیس بک سے اب تو میں نے اپنی سہیلیوں تک سے رابطے میں کمی کر دی ہے کہ کسی پر کوئی اعتبار ہی نہیں رہا ہے۔“ (بیاری ثمنینہ، جو جیسا بھی کرے، آپ کو اس سے غرض نہیں رکھنی چاہیے..... افسانہ لکھ کر اور افسانہ جج کر کے ہی تجربے میں اضافہ ہوا کرتا ہے، اچھا ہے لڑکیاں اپنا پڑھنے لکھنے میں ہی وقت گزار رہی ہیں اور یہ کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ تم اپنے حزان اور روتے میں تبدیلی لاؤ..... پھر سب اچھا لگے گا۔)

بھ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ”تیسرے کا شمارہ بروقت ملا، ماڈل کا دلہن کا روپ دل میں سا گیا۔ اوارہ جج سے متعلق بہترین تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جج کروائے، آمین۔ کم شدہ محبت ٹاپ پر جا رہا ہے۔ شہلا کے محبت آمیز مظاہرے خوب مزہ دے رہے ہیں، رفعت سراج کا ناول یہ کہاں پھین کہہ دوں ہے۔ ابھی تمہاری میراٹن میں ہے۔ اسے عشق ترے ہیں کھیل عجب..... میں انصاف سے تو

دھا کا ہی کر دیا۔ ویسے طریقہ کار تو غلط تھا مگر کیا کریں کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ زویا اپنی نفرت کا بدلہ لینے کے لیے زارون کو نشانہ بنانے پر تلی ہوئی ہے، دیگر کہانیوں میں احسن الیٰ القین، پیام محبت لاکھی ہے عید، دیر سے سمجھے اور عمر قید بہت ہی متاثر کن تحریریں تھیں۔ نیلو فرعیاسی سے ملاقات سحر زدہ سی کر گئی۔ شادی مبارک میں ویسے تو ساری دلہنیں بہت پیاری تھیں لیکن معصومہ تو دل میں اتر گئیں..... بہنوں کی محفل سے سب بہنوں کے دکھ سکھ سے آگاہی تو ہوتی ہے۔“ (پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکر یہ)

بھہ صدف نورین، لاہور کینٹ سے۔“ آپ کی باتوں سے مجھے بہت ہمت اور حوصلہ ملا۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے حسین دن تھا جب آپ نے مجھے فون کیا، بہت اچھا لگا آپ سے بات کر کے اللہ پاک آپ کو صحت و تندرستی دے اور سدا سلامت رکھے، آمین۔ پاکیزہ پڑھا اور سب ہی سلسلے بہت عمدہ تھے۔ آپ کے ناول کم شدہ محبت کی تو کیا ہی بات ہے..... بہنوں کی محفل تو ہے ہی لا جواب یقین کریں آئی جب آپ سے بات کی تو ایسا لگا کہ آپ کا اور میرا کوئی رشتہ ہے، بالکل اپنوں کی طرح ہیں آپ میرے لیے جیسے ایک ماں اپنی بیٹی کو حوصلہ دیتی ہے۔“ (پیاری بیٹی تم خوش رہو، تمہارا خط پڑھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ اس لیے رابطہ کیا تھا۔ اس محفل میں آئی رہو..... تمہارا دل لگے گا، اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، آمین)

بھہ سببم کنول، گاؤں پاپاگری سے۔“ اس دن دعا کا بھی پاکیزہ زبردست تھا۔ ڈائجسٹ اے ون جا رہا ہے، کم شدہ محبت نے تو میرا دل ہی لے لیا۔ درشن بلال نے تو کیا ہی خوب لکھا ہے اگر پاس ہو تو آپ کے ہاتھ چوم لوں، رفعت سراج کی تو ہر تحریر ہی زبردست ہوتی تعریف کے لیے لفظ ہی نہیں ملتے۔ مدیحہ شاہد آپ کی پہلی تحریر پر بھی مزہ آ گیا جی۔ تمام سلسلے اے ون جا رہے ہیں۔ پردین فرینڈ کسی ہیں آپ میں نے آپ کو یہاں بھی ڈھونڈ لیا۔ کیا خوب لکھتی ہیں آپ بھی۔ حرافر لکھی آپ بھی یہاں موجود ہیں۔“ (یہ بھی اچھا ہے کہ آپ کو اپنی سہیلیاں بھی نظر آئیں)

بھہ سونیا ملک، فیصل آباد سے۔“ پاکیزہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے اس میں ہر وہ چیز ہے جسے پڑھ کر انسان کی طبیعت سیر ہو جائے اس کے ناول اور کہانیاں اس قدر دلچسپ ہیں کہ ایک بار شروع کریں تو پھر چھوڑ نہ سکیں۔ (خوش آمدید) اس میں ہر نئے آنے والوں کو اپنا نصیب دی جاتی ہے جس سے نئے آنے والوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ میں نے اپنی بہت پیاری اور ہر دلچیز آئی جو پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ہیں ذکیہ ایوب سے آپ کی محبت اور نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کا بہت ذکر سنا ہے۔ جس سے مجھے آج یہ حوصلہ ملا ہے اور کیا میں آپ کو اپنا افسانہ بھجواؤں تو کیا آپ اسے پاکیزہ کے خوب صورت صفحات کی زینت بنا دیں گی؟ (پیاری سونیا..... یہ آپ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ یہاں آنے والوں کی ہم حوصلہ افزائی ضرور کرتے ہیں۔ آپ کا افسانہ پہلے پڑھ تو لوں، اس کے بعد ہی کوئی رائے دے سکوں گی)

بھہ بھی فر دوس، گوجرانوالہ سے۔“ سب سے پہلے خبر کے سرورق پر براہمان خوب صورت اور نرسن موٹی کی دلہن سے نظریں چار ہوئیں..... چند لمبے آنکھوں ہی آنکھوں اس کے حسن و خوبی کی تعریف کی اور پھر آگے بڑھی..... بے تابی سے افسانوں اور ناولٹ وغیرہ کی فہرست کے کھنکھانے لگی۔ اپنا افسانہ نہ پا کر مایوسی تو ہوئی مگر یہ کہہ کر دل کو ڈھارس دی کہ یقیناً اگلے شمارے میں لگے گا..... خیر..... پھر ازان بھری اور بہنوں کی محفل میں جا پہنچی..... عمیرہ احمد اور دیگر نامور رائٹرز کا تبصرہ پڑھ کر خوشگوار سی حیرت ہوئی..... جو شہرت کی اتنی بلند یوں پر پہنچ کر بھی پاکیزہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں..... شاید ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کے ہاتھ آسمان تک بھی پہنچ جائیں تو قدم زمین پر ہی جمائے رکھتے ہیں..... انجم آئی میں بھی وعدہ کرتی ہوں..... میں جتنی بھی ترقی کر لوں..... پاکیزہ سے رشتہ کبھی نہیں توڑوں گی..... (صحیح میں) سب سے پہلے ہمیشہ کی طرح کم شدہ محبت پڑھی..... کہانی بڑی خوب صورتی سے آگے کا سفر طے کر رہی ہے۔ رفعت سراج کا ناول ان کے دلکش طرزِ تحریر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عقیلہ حق کی رسی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ماں کی غلط تربیت بیٹوں کی زندگی زہرا آلود کر دیتی ہے، مسجد یہ رئیس کا افسانہ عمر قید اچھا تھا..... مگر اس کا ایڈٹ پسند نہیں آیا۔ ڈیزائنر سوٹ ہم جیسے مدل کلاس لوگوں کے لیے باعثِ سبق تھی۔ میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ سوٹ کی قیمت سے زیادہ پہننے والے کی پر نائی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر آپ خوب صورت شخصیت کے مالک ہیں تو آپ پر ہر لباس اچھا لگے گا۔ چاہے وہ ڈیزائنر کا ہو یا کسی عام وکان کا۔ (بالکل) نظیر فاطمہ کا افسانہ دیر سے سمجھے سمجھ سے باہر لگا۔ بھئی آج کے دور میں ہمیں تو ایسی صابر اور کای بہو کبھی نہیں نظر نہیں آئی۔“ (بھر پور تبصرے کا شکر یہ)

بھہ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔“ مجھے کچھ کہتا ہے۔ ہمیں سن کر عمل کی کوشش کرنی ہے۔ کم شدہ محبت مل کے ہی رہے گی۔ لکنا

ہے عزم، عاصر ہے۔ یہ کہاں کہیں کہ دل ہے، عنوان تو سچ ہے ہم بھی نہ بیخ پائے شفاف جھاگ والے پرنس سے۔ کیا سچی تاریخی کہانی ہے یا آدمی حقیقت آدھا نسا نہ ضرور بتائیں؟ اے عشق ترے ٹھیل عجب من چلے کا سودا ہے۔ محبت ہے سمندری، فاخرہ جی جیسا آپ کا سنا تھا ویسا ہی پایا..... لیجئے ستائش بھی سمندری۔ کیا رواں قلم، کیا ساگری تالی..... کیا دریا سی حتا..... اور کیا موتی کو کو..... کیا ثابت قدم ارمان..... احسن الخالصین، صورت ہو اور سیرت نہ ہو تو زندگی اجیرن ہو جائے لہذا ہم تو دین کو ترجیح دیں گے انشاء اللہ سالوں کے رنگ میرے بھی تو ہیں ناں..... ڈیزائنر سوٹ حق ہا..... گولی مار دی..... دفع کرو..... سادگی میں سکون ہے جناب عمر قید، اچھی ہے ناں..... کام، کام اور بس کام..... فسانہ نہیں حقیقت ماشاء اللہ نیلو فر میں ایسی کشش ہے کہ دیکھ، دیکھ دل نہ بھرے..... اور باتیں کہ رک رک کر پڑھیں اور کہانی تو واقعی فلمی..... اور جوڑی بڑی پیاری..... بس رویا نہ کریں اور خواہ خواہ انہیں جنت میں اداس نہ کریں..... شادی مبارک پاکیزہ مہمان، دو لہا حسن اور ڈاکٹر شاہد کتنے ملتے جلتے ہیں۔ دین کی باتیں ہمارا سرمایہ حیات، بہنوں کی محفل نعت و حمد کے نور ابعاد دھر ہی تشریف لایا کرتے ہیں، پاکیزہ ڈائری شکر ہے اس میں تین، تین چار، چار حمد نعت ہیں، کاش یہ ساری نعتوں کے لیے مختص ہو جائے تو زیادہ لوگوں کی نعتیں پڑھ سکوں..... عالیہ بشر تم کہاں کھو گئی ہو۔ نعت لے کر آؤ ناں عالیہ ضیاء نے بھی تو نور حاصل کر لیا، مبارک ہو مصباح رضا سعید تم مجھے بہت پسند ہو..... اور فرح ناز، نکول تم میری بھانجی ہو بھی؟ جلتے تک نام ہی کافی ہے، کارڈ پڑھ کر تہی وہ نکلی کہ بس..... ورنہ ہم تو لقمان حکیم سے متاثرہ ہیں۔“ (دلیپ تبصرہ پڑھ کر ہماری ہنسی بھی نکل کر رہا نہیں کہاں چلی گئی)

بھہ نصیبہ آرا..... راس انیمہ یو اے ای سے۔ ہم تو دیار غیر میں پاکیزہ کے ذریعے اپنے پیاروں سے جڑے رہتے ہیں۔ جیسے سرگودھا کی ٹمہت اعوان سے اسی ذریعے.. دوبارہ ملاقات ہوئی اور پھرتی ہوئی دوست سے رابطہ ہو گیا..... یہ پاکیزہ کا ہی کمال ہے۔ اس کے علاوہ بہنوں کی محفل میں بہنوں کی آپس کی باتیں، محبتیں اور ایک دوسرے کے مسائل کے حل کے لیے ٹولے اور وعائیں بتانا بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ اب بات ہو جائے کچھ کہانیوں پر جو نئے ناول شروع ہوئے ہیں، سیمارضا اور رفعت سراج کا ناول تو لگتا ہے پندرہ بیس سال پہلے والا انداز ہے خالص انسانی اور سسپنس سے بھرپور آ رہا ہے پڑھنے میں..... مگر بیٹھام کا کردار بہت خوب صورتی سے چل رہا ہے اور پرنس کی بھی مکمل شخصیت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ سیمارضا کے ناول کی کہانی کچھ اچھی ہوئی ہے۔ ابھی آگے شاید واضح ہو..... مگر ساجد شایبہ بھی مگر بے حد خوب صورت عنوان کے ناول کے ساتھ آئی ہیں، معلومات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ٹمہت عظمت علی کا انٹرویو سادہ مگر بہت ہی باشعور شخصیت کو ظاہر کر رہا ہے راسخ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ خیر یہ تو الگ، الگ اپنی، اپنی طبیعت ہوتی ہے..... اکتوبر کے دہن نمبر میں سعید رئیس کی کہانی عمر قید بہت خوب صورت تھی۔ یہ تو شاید بیٹھام کیوں کے حالات کی عکاسی کر رہی تھی۔ عقیدہ حق نے کہانی میں کافی تفصیلات کی ہیں برائی کا انجام بے شک برائی ہوتا ہے۔ شگفتہ شاہ کی کہانی فیصلہ بہترین کہانی ہے۔ کاش کہ ہمارے معاشرے میں اس طرح کے مرد ہوں آج کل تو کسی لڑکی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو لوگ اس سے شادی نہیں کرتے کہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوگا۔ آخر لوگوں کی یہ جاہلانہ سوچ کب بدلے گی..... اپنے گھر میں بیٹیاں رکھ کر بھی ایسی، ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اللہ کی توبہ.....: (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

بھہ نیلو فر خان، بہارہ کہو سے۔ "باجی میں تو پاکیزہ خیر عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں اور میری بیٹیاں اب چند سال سے پڑھ رہی ہیں..... وہ بہت خوش ہوتی ہیں جب ان کے نام کی کوئی چیز شعر، ترکیب یا احوال وغیرہ لگ جاتے ہیں۔ میری بیٹی اپنے علاقے کا تعارف بھی بھیجتا چاہ رہی ہے۔ پہاڑی علاقہ ہے بہت خوب صورت ہے۔ (ضرور بھیجیں) باجی اس ماہ دو قسط وار سلسلے شروع ہونے ہیں جو ابھی تو پورے واضح نہیں ہو رہے ہیں مگر ساجد کی کہانی کچھ، کچھ ٹھیک لگ رہی ہے..... ہے ناں..... اس کے علاوہ شیریں حیدر کی سلسلے وار تحریر کی خوشخبری تو سن لی ہے بلکہ پڑھ لی ہے اب دیکھیں کب لگتا ہے۔ کیا آپ ٹمہت سیمارضا سے بھی ان کے ناول کے متعلق لکھوائیں گی میری بھی تعریف ان تک پہنچا دیں۔ (جی اس ماہ آپ نے ان کا انٹرویو پڑھ لیا ہوگا) ذکیہ آپا کے کیا حال ہیں؟ (ان دنوں وہ بیمار ہیں) اختر شجاعت کے دینی مضمون معلومات بڑھاتے ہیں، اچھا لگتا ہے پڑھ کر ہاں بھی اس دفعہ تو غزلوں کے انتخاب نے مزہ دے دیا۔" (تبصرے کا شکریہ ہاں آپ اپنی شاعری ہمیں ضرور بھیجیں)

بھہ ذریعہ مشتاق، منڈی بہاؤ الدین سے۔ "اب میں پاکیزہ مستقل لکھواری ہوں ورنہ تو سرگودھا سے منگوائی ہوں خیر..... آپ سے کہتا ہے کہ کیا کہانیاں کسی خاص موضوع پر لکھیں مطلق جلدی کیسے لگے گی۔ میں بھی لکھنا چاہتی ہوں (ضرور لکھیں، آپ کو دوسری

مصنوعات کی کہانیاں اور بڑھ کر اندازہ ہو جائے گا) انجم باجی آپ کا ناول کم شدہ محبت میں کیا فرزند دو ہیں؟ دوسرے صاحب تو اب مدیم خان کو پسند کرنے لگی ہے تو عامر کی انٹری ہوگی یا نہیں... یہ رقص سراج کے ناول کا نام شاعرانہ ہے مگر لہیا ہے پر بہت خوب صورت چل رہا ہے کہ لو اسٹوری لگ رہی ہے۔ ویسے جو لیڈی صوفیہ ہیں وہ بھی اپنی لوا اسٹوری ہی بتا رہی ہیں... کیا یہ بھی طویل ناول ہوگا۔ (جی ہاں) کہانیاں تو سب ہی ٹھیک تھیں۔ نلیم احمد بشر کی کہانی مغربی معاشرے کی کمزور شکل کو بیان کر رہی ہے۔ ہاں صاعقہ عاطف نے کچھ دار بہت ہی کچھ داری سے لکھی ہے کیا بات ہے بھئی..... صاعقہ مسعود کی کہانی میں جو ہوا وہ ہماری ملازمہ کی کہانی لگ رہی تھی کہ اس نے ایک نئے بعد خوش ہو کر ہمیں بتایا تھا کہ اس کا ظالم میاں بالآخر مر ہی گیا۔ ہاجرہ رحمان تو ہر مہینے ہی چھوٹی، چھوٹی کہانیاں لکھ رہی ہیں ویسے اچھی ہی ہوتی ہیں۔ شعری انتخاب ملا جلا ہوتا ہے۔ اس وقت مصطفیٰ زیدی کی غزلیں پڑھ کر اچھا لگا اور بھی دین ناں..... اچھے شاعروں کی شاعری پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ رائٹر شمیمہ عظمت بھی کاسٹریو لیا اچھا تھا۔ پڑھ کر مزہ آیا۔“ (تبرے کا شکر یہ)

کچھ معصومہ مدیم، اسلام آباد سے۔ ”میری شادی کا احوال میری تند نے لکھا تھا۔ اپنی تصویر دیکھ کر اچھا لگا۔ ویسے تفصیلات تو بہت تھیں مگر شاید ہر اک کو جگہ دینی ہوتی ہوگی..... کیا دوبارہ بھی اور حال لکھ سکتے ہیں (پر کسی اور کی شادی کا) آپ کا شکر یہ کہ پڑھنے والوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں، کیا کسی سالگرہ کا حال بھی لکھ سکتے ہیں؟“ (ہاں اگر دلچسپ ہو تو ضرور)

کچھ سیدہ مدیحہ، مقام نامعلوم ”پاکیزہ ایک انتہائی معیاری رسالہ ہے اور میں گزشتہ کئی سالوں سے اس کی قاری ہوں۔ اس بار میری توجہ کہانی ”دیر سے کچھ کے ایک جملے نے اپنی طرف مبذول کروائی۔ نظیر قاطمہ نے ایک جملہ بیٹیوں کی قسمیں اگر ماں، باپ خود اپنے ہاتھ سے لکھتے تو کبھی کسی کی بیٹی دیکھی نہ ہوتی۔ لکھ کر کہانی کو بد مزہ بنا دیا ہے۔ قسمیں لکھنے والا تو اللہ رب العزت ہے۔ مصنف کی بات کا بے شک ایسا کوئی مطلب نہ بھی ہو تو لکھنے میں احتیاط کرنی چاہیے آپ خود سوچ سکتی ہیں کہ اس جملے کا ادھر کیا مطلب نکل سکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ سے زیادہ ماں، باپ انسان کے غلط ہوتے ہیں جو ان کی زیادہ اچھی قسمیں لکھتے ہیں یہ انتہائی شریک جملہ ہے۔ ہم انسان جملے کے پتے ہیں یقیناً بھول چوک سے ایسی غلطی ہوگی جو آپ کی نظروں سے اوجھل ہوئی ہے۔“ (مدیحہ بہن، آپ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ بعض غلطیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور ایسے جملے بولنے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ عموماً اس طرح کے جملے اکثر خواتین عام بول چال میں بولتی بھی ہیں۔ آئندہ احتیاط کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہماری دانستہ اور غیر دانستہ خطاؤں کو معاف فرمائے، آمین)

یہ آری، بہنو! اس سے قبل کہ آپ سے رخصت ہوں..... آئیے پہلے درود پاک پڑھتے ہیں اور پھر وحدہ لا شریک کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم اے کریم اللہ ہمارے اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری اہمت کے سارے گناہوں کو معاف فرما دے اور ہمارے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے اور نیک کام کی توفیق، ہمت، طاقت اور مہلت ہم کو ضرور عطا کرنا..... اے پاک پروردگار موت سے پہلے ہماری مغفرت فرما اور موت کے وقت ہم پر رحم فرما اور موت کے بعد ہمیں عذاب نہ دینا اور قیامت کے روز ہمارا نامہ اعمال ہمارے ہاتھ میں دینا..... بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ، اے میرے محبوب، اے عرش عظیم کے مالک تو آدم سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامت تک آنے والے سارے ایمان والے لمرووں، عورتوں، انسانوں جنوں سب کو ہی بخش دے۔ ہمارے تمام مسائل حل کر دے..... اے سلامتی دینے والے اور سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہمیں ہر بیماری اور ہر پریشانی سے بچا، خاص کر علاج بیماریوں اور جان لیوا پریشانیوں سے بچا..... یا اللہ ہمیں تمام شرور سے بچا..... اور تمام خیر عطا فرمائے ہمیں ہمیشہ عافیت والی زندگی دے تاکہ ہم تیرے دین کو ساری انسانیت تک پہنچا سکیں..... آمین ثم آمین۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب (آخر میں ایک بار درود ابراہیمی پڑھ لیں)

دعا گو

آپ کی اپنی باجی، انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتہ

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ - c.63 فیز 111 یکسٹیشن، ڈیفنس - مین کورنگی روڈ - کراچی - پوسٹ کوڈ 75500
 فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783 021-35802552 EXT 107, 118



حمدِ باری تعالیٰ

وہ جس کے جلوے افق، افق ہیں
وہ جس کی کرنیں شفق، شفق ہیں
وہ جس کی رحمت نے دشت کے دشت
سبزہ و گل سے بھر دیے ہیں
وہ جس کی مدحت میں حرف، آواز گنگنائیں
خوشیاں جس کے گیت گائیں
ازل سے پہلے ابد سے آگے
اسی کو ہر اختیار حاصل
اسی کو عزت و وقار حاصل
وہ ایک مالک اسی کا سب ہے
بس وہی تو سب کا رب ہے

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلاٹوالی

نعتِ رسول مقبولؐ

آپؐ کا نور بنایا گیا سب سے پہلے
واہ کیا شان ہے کیا آن مدینے والے
آپؐ جیسا نہ ہوا ہے نہ ہی ہوگا کوئی
آپؐ پر جان بھی قربان مدینے والے
دل یہ چاہے کہ فقط دیکھ سکوں ایک جھلک
میری آنکھوں کا یہ ارمان مدینے والے
امتی آپؐ کے ہم اور گناہ گار بھی ہیں
پھر بھی بخشش کے طلب گار مدینے والے
آپؐ کہہ دیں گے تو ہو جائے گی بخشش سب کی
آپؐ پر ہی تو ہے یہ مان مدینے والے
آ رہی ہے جو مدینے سے یہ خوشبو شاید
پورا ہونے کو ہے ارمان مدینے والے
آپؐ سنتے ہیں جو تکبیروں میں ورود اور سلام
ہے یہی آپؐ کا احسان مدینے والے

دل میں اک نور بسا آنکھ میں ششدرک اتری
لے کے آئے ہیں جو قرآن مدینے والے
کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

دعا

مدینے کی گلیاں، مدینے کی راہیں
ڈھونڈتی ہیں ہر دم میری نگاہیں
روضہ نبیؐ پر میں پھر پہنچوں کیسے
اسی غم میں ڈوبی ہیں بھلی نگاہیں
کرم کر دے مولا بلا لے تو پھر سے
دعا کر رہی ہیں سوالی نگاہیں
کلام: عالیہ ضیاء، کراچی

اقوال حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ

☆ ہر عمل سوچ سمجھ کر کرو کیونکہ ہر عمل کے اندر اس
کا انجام اسی طرح چھپا ہوا ہے جس طرح بیج کے اندر
درخت۔

☆ سچائی زبان کی امانت ہے اور سچیدگی عقل کی
زینت۔

☆ جس دن ہم اللہ کی نافرمانی نہ کریں، وہ دن
ہمارے لیے عید کا دن ہے۔

☆ بیماری گناہوں کو اس طرح گراتی ہے جیسے
درخت خشک پتوں کو۔

☆ ایمان کی پہچان یہ ہے کہ جھوٹ کے مقابلے
میں سچ کو وہاں بھی اپنائے جہاں نقصان کا اندیشہ ہو۔

مرسلہ: فریدہ ہاشمی مٹھی، کراچی

استغفار

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جب شیطان مرود ہو گیا
تو اس نے کہا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ”انسان کو عقل اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس سے بہتر اور مفید چیزوں میں سے زیادہ بہتر اور زیادہ فائدہ مند چیزوں کا انتخاب کرے اور بری چیزوں میں سے کم سے کم نقصان دہ چیزوں کو چنائے۔“

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب۔ چونیاں

فیکٹ

پناہ تیری
چاہت ہے
مہجور کے درخت جیسی
جو دعویٰ لگے
تو سایہ نہیں
اور بھوک لگے
تو پھل دور

شاعرہ: سہیلہ بیگم
مرسلہ: مہبانور، لیہ

اپے انسان

☆ اے انسان صرف جینا ہی زندگی کا مقصد نہیں
ہم کو مرنا بھی ہے۔
☆ یاد رکھ..... عمدہ لباس کے شوقین، لٹھے کا کفن
بھی یاد رکھ۔
☆ اچھے مکان کے شیدائی قبر کی گہرائی بھی
یاد رکھ۔
☆ لذیذ چیزیں کھانے والے قبر کے کپڑے بھی
یاد رکھ۔
☆ برائی کر کے جھومنے والے موت کی سختی بھی یاد رکھ۔
☆ دنیا کے مال کا حساب رکھنے والے آخرت کا
حساب بھی یاد رکھ۔
☆ دنیا کی روشنیوں میں مست رہنے والے قبر کا
اندھیرا بھی یاد رکھ۔

مرسلہ: نازمہ شاہین اعوان۔ واہ کینٹ

ماہنامہ پاکیزہ ﴿ 287 ﴾ نومبر 2016ء

”اے رب تیری عزت کی قسم! میں تیرے بندوں کو ہمیشہ بہکا تار ہوں گا۔ جب تک ان کی رو میں ان کے جسموں میں رہیں گی۔“

اللہ رب العزت نے فرمایا۔ ”مجھے قسم ہے اپنی عزت اور جاہ و جلال کی اور اپنے اعلیٰ مقام کی جب تک وہ استغفار کرتے رہیں گے، میں ان کو بخشا رہوں گا۔“

مرسلہ: ممتاز خانم، اورنگی ٹاؤن کراچی

بہت زیادہ انعام

حضرت سعید بن المسیبؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دس مرتبہ قل ہو اللہ احد پڑھ لی اس کے لیے جنت میں ایک محل بنا دیا جائے گا اور جس نے بیس مرتبہ پڑھ لی اس کے لیے جنت میں دو محل بنا دیے جائیں گے اور جس نے تیس مرتبہ پڑھ لی اس کے لیے جنت میں تین محل بنا دیے جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! اس صورت میں تو ہم اپنے بہت زیادہ محل بنالیں گے۔“ آپؐ نے فرمایا: ”اللہ بہت بڑا داتا ہے، جتنا عمل کرو گے، اس کے پاس اس سے بہت زیادہ انعام ہے۔“

مرسلہ: نجمہ اصغر، کراچی

عقل اور انسان

امام ابو حنیفہؒ ایک روز امام جعفر صادقؑ کے پاس گئے، جو ان کے استاد بھی رہ چکے تھے، دوران گفتگو حضرت جعفر صادقؑ نے ان سے سوال پوچھا۔ ”عقل کا کیا کام ہے؟“

امام ابو حنیفہؒ نے جواب دیا۔ ”عقل اچھے اور برے میں تمیز پیدا کرتی ہے۔“

اس پر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ”یہ تو جانور بھی کر لیتے ہیں مثلاً اپنے دانہ، پانی اور چارادینے والوں کو وہ اچھی طرح پہچانتے اور ایک طرح کا انس کرنے لگتے ہیں (یعنی انہیں بھی دوست اور دشمن کی پہچان ہوتی ہے) تو پھر انسان اور جانور میں کیا فرق رہا؟“

یہ سن کر امام ابو حنیفہؒ نے کہا۔ ”آپ ہی اس پر“

سانچہ

چار سواشفاق ہے بس اک قیامت کا سماں
سانچہ ایسا ہے کہ سب کہہ رہے ہیں الاماں
شاعر: اشفاق احمد ایڈووکیٹ
مرسلہ: اسما جشید۔ ڈی آئی خان

غزل

درو دل میں دبا رکھے ہیں
اپنے جذبات چھپا رکھے ہیں
تجھ سے جو نین ملا رکھے ہیں
خوب ہی ربط بڑھا رکھے ہیں
دوست اس نے جو بنا رکھے ہیں
میزی نظروں سے بچا رکھے ہیں
رنگ پھولوں کے چڑا رکھے ہیں
تم نے کچھ راز چھپا رکھے ہیں
اور کچھ پاس نہیں ہے میرے
بس تیرے خواب سجا رکھے ہیں
تجھ کو روشن ملیں راہیں ساری
راہ میں دیپ جلا رکھے ہیں
پھول اس نے جو کبھی بیجے تھے
سب کتابوں میں چھپا رکھے ہیں
اپنی نظروں سے جہاں میں تم نے
کتنے طوفان اٹھا رکھے ہیں

شاعرہ: شگفتہ شفیق

مرسلہ: شمسہ الماس۔ ساروے

ایسا بھی ہوتا ہے

پیار میں لوگ بہت مضبوط ہو جاتے ہیں اور بہت
کمزور بھی۔

مضبوط اتنے کہ دنیا سے لڑ جاتے ہیں کمزور اتنے
کہ صرف اک انسان بتا رہے نہیں پاتے۔

مرسلہ: مصباح رضا سعید۔ فیصل آباد

دوست

دوستوں کے غم میں شامل ہوا کرو

ہر حال میں
لیکن
خوشیوں میں تب تک نہ جانا
جب تک وہ خود نہ بلائیں
مرسلہ: مہرین ضیا بنگش۔ کراچی

جاہتیں

لب خاموش سے اظہار تمنا چاہیں
بات کرنے کو بھی کیا تیری اجازت چاہیں
تم چلو ساتھ تو آہٹ بھی نہ ہونے پائے
درمیاں ہم بھی نہ ہوں یوں تمہیں تنہا چاہیں
کاوش: نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان

جوڑی

نوجوان نے رومانوی انداز میں محبوبہ سے کہا۔
”جان! تم اب بہت بدل گئی ہو، پہلے جیسی بات
نہیں ہے۔“

محبوبہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیسے...؟“
نوجوان نے کہا۔ ”اب میں تمہارا ہاتھ پکڑتا ہوں تو
تم شرماتی نہیں ہو۔“

محبوبہ نے اٹھلا کر کہا۔ ”پچھلی بار میں نے شرمناک
آنکھیں بند کیں تو پرس سے دو سو روپے غائب تھے، چور کہیں
کے۔“

مرسلہ: ارم کمال۔ فیصل آباد

مسکرائیں

استاد، شاگرد سے۔ ”تم نے جغرافیہ کا سوال
کیوں یاد نہیں کیا؟“
شاگرد۔ ”کل ایک سیاستدان ٹاک شو میں کہہ رہا
تھا کہ عنقریب دنیا کا نقشہ بدل دیں گے۔“

☆☆☆

ایک پاکستانی نے امریکا میں جلیبی بنانے کا کاروبار
شروع کیا تو ایک امریکی روز اس سے 5 کلو جلیبی خرید کر
لے جاتا رہا آخر ایک دن اس پاکستانی نے اس سے پوچھا۔
”آپ اتنی جلیبوں کا کیا کرتے ہیں۔ یہ آپ کو

اتنی پسند ہیں؟

امریکی یولا۔ ”ہم تو یہ جانتا چاہتے ہیں کہ ان ٹیویوں میں رس کیسے بھرا جاتا ہے؟“

☆☆☆

ایک شخص کو اتفاق سے ایک بڑا سرکاری عہدہ مل گیا۔ اس کے دوست احباب خوش ہو کر اسے مبارک باد دینے آئے مگر اس نے کسی کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اگلے دن پھر ایک دوست آ گیا۔ ”اس شخص نے پوچھا کون ہو اور کس لیے آئے ہو؟“

دوست نے جواب دیا۔ ”افسوس کرنے آیا ہوں جناب! میں نے سنا ہے آپ اندھے ہو گئے ہیں۔“

مرسلہ: ماہ نور خان، بہارہ کھو

خوب صورت بات

”اپنے دوست کی عزت کرو اس لیے نہیں کیونکہ وہ تمہارے عیب جانتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تمہارے عیبوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی تمہیں دوست مانتا ہے۔“

مرسلہ: شبیم کنول۔ پاپانگری

حشر تک

شاہجک کر کے آئے تو غصے میں تھی مز کیوں عورتوں کو آپ وہاں گھورتے رہے حملہ بہت شدید تھا میں بو کھلا گیا دل نے کہا لو آج تو ہم بھی برے پھنسے قلب و دماغ میں ہوئی میٹنگ منعقد یولا دماغ کوئی بہانہ تو سوچ لے میں سوچتا رہا کوئی صورت بچاؤ کی تدبیر ایک مل گئی پھر مجھ کو خیر سے میں نے کہا کہ جان جہاں بات سن مری ہرگز نہیں درست کہ تو مجھ پہ شک کرے چھوڑوں گا گھورنا میں اسی وقت خود بخود زیادہ حسین تجھ سے کوئی آئے سامنے سن کر مرا جواب بہت خوش ہوئی مز رک آن میں شکوے کے سبب دور ہو گئے

یولی وہ ناز سے میری خواہش ہے بس یہی تو عورتوں کو حشر تک گھورتا رہے کلام: تھنہ بریلوی
مرسلہ: نرگس نسیم صاحبہ۔ موہڑہ چکوال

سنہری باتیں

☆ دوستوں کو خوشی بھی دو تو یوں لگے حق دیا ہے احسان نہیں کیا۔

☆ کسی سے اتنی توقعات وابستہ نہ کرو کہ توقعات ٹوٹ جائیں تو آپ بھی ٹوٹ جائیں۔

☆ ”دریا اور زندگی“ دونوں کو مضبوط بند کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ضائع نہ ہو جائیں۔ دریا کو مٹی کا بند اور انسان کو ضبط کا بند درکار ہوتا ہے۔

مرسلہ: فرحت احمد۔ کراچی

پاکیزہ کی تمام تبصرہ نگار بہنوں کے نام

دعا

تم جس خواب میں آنکھ کھولو
اس کا روپ امر ہو جائے
تم جس پھول کو نہیں کر دیکھو
وہ بھی نہ مرجھائے
تم جس چہرے کو پیار سے دیکھو
بھی اس پر اداسی نہ چھائے
تم جس دعا کو ہاتھ اٹھاؤ
وہ منظورِ خدا ہو جائے

آمین، یارب العالمین
مرسلہ: بگینہ ضیاء بخش۔ کراچی

قابل اعتبار

انسان خود قابل اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اس کا کردار اور

اس کی سچائی اسے قابل اعتبار بناتی ہے۔

مرسلہ: منور شہزادی۔ گوجرانوالہ

☆☆☆



جہیزنگ

احمد انصار

پیشانیوں

آف، میرے خدا، کس قدر سمجھایا تھا، کس قدر تو مثالیں دی تھیں مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رہی تھی۔
اب نقصان تو ہونا ہی تھا۔

گو کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جب، جب وہ میرے ابرو پر چلے تھے، کبھی نقصان نہیں اٹھایا تھا مگر اس دن نہ جانے کہاں سے بہادری سمیٹ لائے، میرے ہر مشورے کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔

بات گواہی معمولی نہیں تھی جتنی کہ وہ سمجھ رہے تھے، میں نے..... صرف یہی کہا تھا اس واقعہ آپ کے خاندان میں شادیوں کا ٹورنامنٹ ہو رہا ہے، کیا خیال ہے، کچھ دنوں کے لیے دوسرے شہر گھوم پھر آتے ہیں، خواہ خواہ کے بچتے دینے سے جان چھوٹ جائے گی۔

”ارے، ان شادیوں میں شرکت کریں گے، بڑے قریبی عزیزوں کے ہاں شادیاں ہو رہی ہیں، ہم نہیں جائیں گے تو تقریب سونی ہی ہو جائے گی۔“ (احسن کہیں کے)

”اچھا تو یوں کرتے ہیں کہ جس جگہ سے لڑکی کی شادی کا کارڈ آیا ہے، ان کے صرف ویسے میں شرکت کر لیتے ہیں اور لڑکے والوں کے جو شادی کارڈ آئے رکھے ہیں ان میں صرف بارات میں شریک ہو جائیں گے، یوں کوئی گلہ بھی نہیں کر سکے گا اور بھتا دینے سے بھی بچ رہیں گے۔“ تجویز خاصی معقول تھی۔

”پائل ہو گئی ہو تم، آخر لوگ کیا کہیں گے.....؟“ ان کی پریشانی دیدنی تھی۔

”سنیے اگر آپ خوش رہنا چاہتے ہیں تو لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دیجیے۔“ میرا لہجہ پھنکاریں لیے ہوئے تھا۔

”کمال کرنی ہو تم بھی، کیا اپنے عزیزوں اور دوستوں کے بغیر بھی خوش رہنے کا کوئی جوا ہو سکتا ہے.....؟“ کر لوکل۔

”مگر آپ کی خوشیاں ایسی ہی چلی سح پر ڈبکیاں لینے سے جنم میں آتی ہیں تو یونہی سمی۔ میرا کیا ہے، میں بھی چلی جاؤں گی کہ آخر ہم صبح شام بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، جن کی شکل دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔“ میں نے کاندھے اچکا کر کہا تھا۔

اور پھر ہم روزانہ شادیوں میں جاتے کہ روزانہ ہی کہیں نہ کہیں کا بلاوا ہوتا، شام سات بجے بارات کا بلاوا ہوتا اور رات گیارہ بجے کے بعد بارات آتی اور پھر مووی اور تصاویر کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا کہ میزبان تاریخ تبدیل کرنے کے بعد کھانا کھلانے پر مشکل تیار ہوتے۔ ایسے میں نہ سچی سچائی دہن کو دیکھنے کو دل کرتا اور نہ ہی حواس باختہ دیکھا سیاں سے خوش گپیاں کرنے کو جی چاہتا..... پوریت کا گراف آہستہ آہستہ اتنا بلند ہوتا رہا کہ مووی اور تصاویر کھچوانے کو بھی دل نہ چاہتا۔ آئیے بھائی، آئیے باجی کی سریلی آوازیں بھی کان میں زہر گھولنے سی لگتی تھیں، پہلے تو ٹھٹھے سے ساری کی قال چنگی میں پکڑ کر چلتے ہوئے دہن کے برابر بیٹھ کر بڑے کروفر سے مووی ہواتے تھے مگر پانچ چھ شادیوں میں شرکت کے بعد یہ شوق بھی ہوا ہو گیا تھا کہ جس سیٹ سے اٹھ کر آتے، واپسی پر اس پر کوئی اور قبضہ کر چکا ہوتا۔

”دیکھیے، روزانہ ہی رات کو ایک بجے کے بعد واپسی ہوتی ہے، صبح بچوں سے اسکول بھی نہیں جایا جاتا، آپ جلدی سے اٹھنے کی کوشش کیا کیجیے نا۔“ ایک شب میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور نہ چھوٹے بچے اس سال بھی فیل ہوں گے۔“ اور میاں جی، میرے آخری جملے پر چونک سے گئے۔

”ان کی ہیڈ مسٹریس نے کہا تھا کہ آپ کے بچے کو کچھ نہیں آتا، کیونکہ آپ اسے بالکل نہیں پڑھاتے ہیں۔“
”کیا تم نے یہ نہیں کہا کہ آپ نے تو پورے سال پڑھایا ہے، آپ لوگوں نے اسے کیا سیکھا؟“

دعا میں بھی دین گئی۔ میں نے ہنسی ہی ہنسی میں دار کیا۔
 ”خیر، اب کل آخری شادی ہے، کسی مہزہ زار پر جانا ہے، مہزہ تو کل آئے گا، وہاں کی میٹری بہت اچھی ہوگی۔“
 انہوں نے بہت اچھی پر زور دے کر کہا۔
 مگر اس شب بڑی حیرانی ہوئی، جب مہزہ زار کا لان ڈھونڈتے، ڈھونڈتے تھک گئے اور مطلوبہ میزبان نظر نہیں آئے۔ نہ جانے کہاں چھپ گئے تھے۔
 ”امی، لان نمبر 4 میں چلیے ناں وہاں کھانا بھی شروع ہو گیا ہے۔“

”ای لان نمبر 3 میں چلیے، وہاں درانی پروگرام بھی ہو رہا ہے۔“ سچے اپنی، اپنی بولیاں بول رہے تھے۔
 حالانکہ دل میرا بھی یہی چاہ رہا تھا مگر میاں صاحب کی پریشان صورت دیکھ کر، میں بھی مہزہ بنائے ہوئے تھی۔
 ”خدا جانے، ایسا کیا سانحہ ہو گیا، جو یہ شادی ملتوی ہو گئی اور ہمیں علم ہی نہیں ہو سکا۔“ سارے ہی لان جھانک آئے تھے مگر مطلوبہ لان دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ گھر آ کر فون کیا تو معلوم ہوا کہ دولہا میاں کو اچانک چچک لکل آنے کے سبب شادی ملتوی کر دی گئی ہے۔

”سنیے، پاکستان میں تو اب چچک نکلتی ہی نہیں، شہر کی تمام دیواروں سے سنا ہے، آپ دولہا میاں کو پکڑو اور بیچے کم از کم چھ ہزار انعام ہی مل جائے گا۔ اتنی بہت سی شادیوں میں نبوتے دے دے کر جو تباہ ہوئے ہیں، کچھ آنسو تو کچھ جائیں گے اور پھر ثواب کا کام بھی ہے کہ چچک کے مریض کو ہم نے پکڑ دیا۔“
 ”یا گل ہو گئی ہو تم..... کیا رشتے دار بھی رشتے داروں کو زک پہنچایا کرتے ہیں.....؟“

”اچھا تو پھر کون پہنچاتے ہیں؟“ میرا لہجہ سوالیہ تھا۔
 ”جو اس مت کرو، ویسے ہی بہت پریشان ہوں، سارا بجٹ تباہ ہو چکا ہے، قرضے لے لے کر تھک چکا ہوں۔“
 ”ہونہہ..... اب جان جلاتے رہنا اپنی کام کی بات تو کبھی سمجھ میں نہیں آتی۔“ میں بڑ بڑاتے ہوئے اسے بد شوق بچوں کو پڑھانے کے لیے بیٹھ گئی تھی جو روز اسکول جانے کے باوجود باقاعدگی سے ٹیل ہو رہے تھے اور اس سال بھی ایسی امید تھی۔
 ☆☆☆

”ہاں کہا تھا مگر ان کا کہنا ہے کہ بچہ اسکول میں نہیں دینے کے لیے آتا ہے، بچوں سے دھینکا سستی سیکھتا ہے اور بڑیک میں آلو کے چپس کھاتا ہے اور فردو پیتا ہے، ہماری ٹیچرز بچوں کو بہت اچھا پڑھاتی ہیں مگر آج کے طالب علم اچھی چیز سیکھنا نہیں چاہتے، تو اس میں ہمارا کیا قصور..... سارا قصور تو والدین کا ہے، جن کے اتنے بد شوق اور نکلے بچے ہوتے ہیں، جن کی سزائیل کے سوا دوسری ہوئی نہیں سکتی۔“ میں نے ہنستے ہوئے اطلاع پہنچائی۔

”ٹھیک ہے کل سے جلدی واپس آئیں گے، ان سالوں کو کچھ پڑھاؤ، اگر ٹیل ہو گئے تو خواہ مخواہ دوسرے اسکول میں ایڈمیشن دلوانا پڑے گا، یہ اسکول بہت بے ڈھنگا نکلا۔“
 اگلے دن ”لو کیوں کی شادی تھی۔ پہلی بار ات نہ مشکل گیارہ بجے آئی، دوسری لڑکی کی بار ات میں تاخیر ہو رہی تھی معلوم ہوا کہ دولہا، اپنے تایا کو منانے سکھ گیا ہوا ہے، ٹرین لیٹ ہو گئی ہے، جب ٹرین آئے گی تب نکاح ہوگا۔ دولہا کو لانے کے لیے نہ صرف سٹی اور کینٹ پر میزبان کھڑے تھے بلکہ پیر اور ڈرگ روڈ تک پر کھڑے کر دیے گئے تھے کہ اگر وہاں دو منٹ کے لیے بھی ریل رکنے تو دولہا کو اسی حال میں پنڈال تک لے آؤ، نکاح کے بعد اپنا حلیہ درست کر لے گا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہم نے میزبان سے جانے کی اجازت مانگی، بیچارے بہت شریف لوگ تھے، نبوتے کے لفافے ہاتھ میں لینے کے بعد بصد خوشی جانے کی اجازت دے دی۔

”یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا، اس سال تو اس قدر شادیاں ہو رہی ہیں کہ لگ رہا ہے کہ شادی کا ہیضہ پھوٹ پڑا ہے۔ جس کو دیکھو اسی کا شکار ہے۔ میں تو جا جا کر تھک چکی ہوں، ایک جیسا مینیو ایسا لگتا ہے کہ روز باسی کھانے کھا رہے ہیں۔“

”بور تو خیر میں بھی ہو گیا ہوں، پوری تقریب میں کوئی ایسی شکل نظر نہیں آتی کہ جس کو دیکھ کر فرحت سی ہو۔“ وہ شکایتی انداز میں بولے۔
 ”جن کو دیکھ کر آپ کو فرحتیں اور شکستگی سی ہوتی تھی، اب ان سب کی شادیاں ہو چکی ہیں، اب تو لڑکیوں کی نانہوں اور دادیوں کو دیکھ کر خوش ہوا کیجیے کہ وہ آپ کو



دل و دماغ میں جب تک کہ ارتباط نہ ہو
بڑی کٹھن ہے رو منزل وفا ساقی

☆ ارم کمال..... فیصل آباد

ٹوٹ جائیں نہ رگیں ضبط مسلسل سے کہیں

چھپ کے تنہائی میں کچھ اشک بہا لے تو بھی

☆ کرن کمال..... کراچی

ٹوٹے رشتے وہ جوڑ دیتا ہے

بات رب پہ جو چھوڑ دیتا ہے

اس کے لطف و کرم کا کیا کہنا

لاکھ ہانگو کروڑ دیتا ہے

☆ حمیٰی قدیل..... کمالیہ

بہت مشکل سے ہوتی ہے تجارت تری یادوں کی

منافع کم سہی لیکن گزارہ ہو ہی جاتا ہے

☆ امین رانی..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

کتنا معصوم بنا دیتا ہے انساں کو خلوص

دشمنوں کو بھی محبت کا گماں ہوتا ہے

☆ عروہ بان..... کوئٹہ

جو بات کرتے ہیں کم اور مختصر سی عدم

وہ لوگ کتنے قرینے کی بات کرتے ہیں

☆ امین زرناب..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

یہ شرط ہے دستک ہو اگر دست یقیں سے

در چھوڑ کے دیوار بھی کھل جائے کہیں سے

☆ مہرین ضیا بخش..... سیماڑی

کتنے معصوم ہوتے ہیں یہ آنکھوں کے آنسو بھی

یہ نکلتے ہیں ان کے لیے جنہیں پروا نہیں ہوتی

☆ نگینہ ضیا بخش..... کراچی

گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے

بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

کون کیا ہے یہی فکر رہی تمام عمر

خود کیسا ہوں کبھی بھول کر بھی سوچا نہیں

☆ ملکہ شوکت..... سعودی عرب

یغین نہ ہو تو ایک بار پوچھ کر دیکھو

جو انس رہا ہے وہ دشمنوں سے چڑ لگے گا

☆ جمیں نیاز..... ملتان

چند خواہوں کے عطا کر کے اجالے مجھ کو

کر دیا وقت نے دنیا کے حوالے مجھ کو

جن کو سورج میری چوکھٹ سے ملا کرتا تھا

اب وہ خیرات میں دیتے ہیں اجالے مجھ کو

☆ شہناز قدیر..... کراچی

سکون قلب تو طیبہ میں چھوڑ آیا ہوں

میں کیا بتاؤں کہ لایا ہوں کیا مدینے سے

☆ نادیہ علی..... اسلام آباد

جلار ہے ہیں جو میرے مقابلے میں چراغ

وہ جگنوؤں سے زیادہ ضیا نہیں رکھتے

☆ صبا سجاد..... دہلی

کس کو ہے فرصت آرائش گیسوئے خیال

ورنہ اتنا تو میں ناواقف انجام نہیں

بن گیا آپ ہی میں اس کا پیای ماہر

جانب یار سے ورنہ کوئی پیغام نہیں

☆ عرشہ جنید..... کراچی

کس جرم کی سزا میں ہے یہ حال آدمی

جس کو بھی دیکھیے وہ کسی اجلا میں ہے

☆ ناظرہ علی..... سیالکوٹ

بڑے یقیں سے کیا تھا مظاہرہ جس کا

ترا وہ عہد محبت کہاں گیا ساقی

☆ ماہ نور ارسلان..... لاہور

تصورات کی دولت نصیب ہوتی ہے
شبِ فراق بھی کتنی عجیب ہوتی ہے
مزہ تو تب ہو کہ غربت میں ساتھ دے کوئی
خوشی میں تو ہر اک شے قریب ہوتی ہے

☆ فرح افتخار..... کراچی

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمعِ منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی راہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے

☆ آسیہ میر..... میانوالی

ہنستے بولتے لوگ بھی ہم کو حیراں، حیراں سمجھتے ہیں
تو ہی بتاے راہِ تنہا ہم کس دہس سے آئے ہیں
تم اک چاکِ گریباں دیکھ کے ہم کو سو کرنے لگے
اچھا کیا جو ہم نے تم سے دل کے چاک چھپائے ہیں

☆ زریہ..... حیدرآباد

ہناک میں ملنے دیکھے ہم نے کیا کیا راجِ دلارے لوگ
کسی بندرِ سندر کلیاں کیسے پیارے، پیارے لوگ
تیرے تیرے تو ان سے کبج اب بھی اس دکھِ نگری میں
تیرے بہانے، اپنے فسانے، کہتے ہیں دکھیارے لوگ

☆ امینہ مشیر..... فیصل آباد

لہو میں رنگ کی صورت بسا ہے تیرا خیال
میں کس طرح تیری یادوں سے فاصلہ رکھوں
کسی بھی شخص سے کوئی غرض نہیں ہے مجھے
میں صرف تیرے لیے سب سے واسطہ رکھوں

☆ فاطمہ بلال..... امریکا

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ
☆ شامِ رضی..... کراچی

ماہر میں وانہ چین زمیں تو ضرور تھا
لیکن بلند یوں پہ میرا آسماں رہا

☆ ماہ نور خان..... بہارہ کپور

تم ادھر رخصت ہوئے، ادھر جان نکلی میری
یہ کیسے حاوٹے ساوگی سے ہو گئے
کچھ ہمیں بھی موت کی آرزو تھی عشق میں
راستے آساں بھی تری بے رخی سے ہو گئے

☆ ثوبیہ ظہور..... ضلع انک

حرفِ حرف رٹ کر بھی آگہی نہیں ملتی
آگ نام رکھنے سے روشنی نہیں ملتی
آدی سے انساں تک آگے تو سمجھو گے
کیوں چراغ کے نیچے روشنی نہیں ملتی

☆ لاریب..... چوئیاں

موسم کو بدلنا ہے بدل جائے گا آخر
سورج ہے کوئی شخص تو ڈھل جائے گا آخر
آنکھیں ہیں تو ہو جائیں گی بے آب کسی روز
دل ہے تو کسی روز سنبھل جائے گا آخر

☆ ماہ زیب..... چوئیاں

دیوانگی سے کم نہ تھی کچھ اپنی جستجو
ہم بے وفا جہاں میں وفا ڈھونڈتے رہے
☆ فرح طاہر قریشی..... ملتان

یارب اب تو کوئی تعبیر بخش دے
کہ تھک گئی ہیں آنکھیں خواب بنتے، بنتے
☆ زریہ مشتاق..... منڈی بہاؤ الدین

وہ اب جو دیکھ کے پہچانتے نہیں امجد
ہے کل کی بات یہ لگتے تھے کچھ ہمارے بھی
☆ رابعہ شاہد..... راس النہد

سرِ محفل جو بولوں تو زمانے کو کھٹکتا ہوں
رہوں چپ تو اندر کی بغاوت مار دیتی ہے
☆ ممتاز خانم..... کراچی

ہمارے نام تو رسوائیاں ہی لکھی ہیں
وہ معتبر ہے اسے معتبر ہی رہنا ہے
کسی کے گھر کو گرا کے بنانا اپنا مکان
ہنر ہے یہ تو ہمیں بے ہنر ہی رہنا ہے

منتخب غزلیں

ماہ نومبر شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کا ماہ پیدائش ہے..... اقبال کی بیدار کن نظموں کے علاوہ غزلیات بھی بہت متاثر کن ہیں اسی مناسبت سے اس عظیم شاعر کی دو منتخب غزلیں نذر قارئین ہیں۔

دل مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

ترا بحرِ پُرسکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابی کنارہ

تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزہ ستارہ

ترے نیپتاں میں ڈالا مرے نغمہ سحر نے
مری خاک پے پر میں جو نہاں تھا اک شرارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہان روشن و فردا
خسے آگنی میسر مری شوخی نظارہ

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے، دم کے سوا کچھ بھی نہیں

مُحَل، تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بونی، گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تختہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں



خوشبوئی اور کھانسی

نکڑوں پر تھوڑا امیدہ، نمک اور سیاہ مرچ چھڑک دیں۔ پانی گرم کر کے چکن کیوبز گھول لیں اور پھر ٹھنڈا ہونے دیں۔ باقی میدہ، بیلنگ پاؤڈر، چاولوں کا آٹا، زیرہ پاؤڈر ایک پیالے میں ڈال کر کیوبز والے پانی میں گھول لیں۔ اب سفید تل اس میں ملا کر ڈھانپ کر رکھ دیں۔ تیل گرم کریں، میدے کے مرکب میں چکن کے ٹکڑے ڈبو کر نکال لیں اور گولڈن براؤن فرائی کر لیں۔ اس کے لیے آج درمیانی ہونی چاہیے۔ ٹمائو کچپ کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: سنبل ملک، شاہدرہ

چکن ننگٹیل

اشیا چکن بریسٹ ہیں، آدھا کلو چوکور نکڑے کر لیں۔ مسٹرڈ پاؤڈر ایک کھانے کا چمچ۔ سفید پیسی ہوئی مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ چینی، آدھا چائے کا چمچ۔ سویا ساس، دو کھانے کے چمچ۔ سرکہ، ایک کھانے کا چمچ۔ اٹھے، تین عدد۔ (پھینٹ لیں) آئل، تیلنے کے لیے۔ نمک، حسب ذائقہ۔ میدہ، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب چکن کے نکڑوں میں سویا ساس، سرکہ اور خشک مسالے لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کڑا ہی میں آئل گرم کر کے چکن کے نکڑوں کو پہلے میدے اور پھر اٹھے اور بریڈ کر مز میں لپیٹ کر پندرہ منٹ رکھ کر گولڈن فرائی کر لیں اور براؤن پیر پر نکال کر پھیلا دیں۔ چکن ٹلش تیار ہیں، فرنچ فرائز اور کچپ کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: عظمیٰ علی، لاہور

پالک بینبر

اشیا پالک، ڈیڑھ کلو۔ (کاٹ کر ابا لیں اور پین لیں) پالک اپنے پانی میں ابلے گی۔ سویا، تھوڑا سا خوشبو کے لیے۔ دودھ، ایک کپ۔ فریشن کریم، ایک ماہنامہ پاکیزہ 295 نومبر 2016ء

چکن بروسٹ

اشیا چکن، ڈیڑھ سے دو کلو۔ (کھال سمیت) لیمو۔ کارس، چار کھانے کے چمچ۔ نمک، ایک چائے کا چمچ۔ میدہ، ایک کپ۔ مسٹرڈ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ سفید مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ پیپرکا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ چائیز نمک، ایک چائے کا چمچ۔ دار چینی، (پسی ہوئی) آدھا چائے کا چمچ۔ اٹھا، ایک عدد۔ آئل، تیلنے کے لیے۔

ترکیب مرغی کے بارہ نکڑے کر دالیں۔ ان نکڑوں کو دھو کر خشک کر لیں پھر ان پر نمک اور لیمو... کا رس لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ میدے میں نمک، مسٹرڈ پاؤڈر، سفید مرچ، پیپرکا پاؤڈر، چائیز نمک، دار چینی پسی ہوئی ملا لیں۔ اٹھا اور دودھ پھینٹ لیں۔ اب مرغی کے نکڑے، اٹھے اور دودھ کے مکچر میں ڈبو کر سوکھے میدے میں لپیٹ لیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ کڑا ہی میں آئل ڈال کر آج درمیانی کر دیں۔ اب دودھ کر کے ان نکڑوں کو تلیں چکن کے نکڑے گولڈن براؤن ہو جائیں تو براؤن پیر پر نکال لیں اور گرم، گرم پیش کریں۔

مرسلہ: کلثوم عباس، کراچی

تلوں والا چکن

اشیا مرغی کے سینے کا گوشت، آدھا کلو۔ (لبانی میں کٹا ہوا) چاول کا آٹا، دو کھانے کے چمچ۔ تیل، دو چائے کے چمچ۔ سفید تل، تین کھانے کے چمچ۔ میدہ، ایک کپ۔ چکن کیوبز، دو عدد۔ بیلنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ زیرہ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ پانی، ایک کپ۔ تیل، تیلنے کے لیے۔ سیاہ مرچ اور نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب مرغی کے بارہ ایک اور نمٹے گھنٹے ہونے

دہی

دہی کے بہت سے فوائد ہیں، یہ ایک اچھا کلینرز بھی ہے۔ اسے کچھ دیر چہرے پر لگا کر رکھیں اور پھر نیم گرم پانی سے چہرہ دھوئیں۔ یہ میل مہاسوں کو صاف کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتا ہے۔ داغ دجوں والی جلد پر اگر دہی لگائی جائے تو اس سے جلد صاف شفاف ہو جاتی ہے۔ نہانے سے قبل اگر دہی کو سر پر لگایا جائے تو خشکی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دہی بالوں میں لگانے سے بالوں کو غذا سمیت ملتی ہے۔

مرسلہ: صدف نورین، لاهور کینٹ

ڈش میں الٹ لیں۔ کارن فلور کو نوڈ سیرپ میں حل کر کے گاڑھا ہونے تک پکائیں اور پھر اسے پڈنگ پر پھیلا دیں۔ ٹھنڈا کر کے پیش کریں، موسم سرما کے لحاظ سے یہ ایک بہترین ڈش ہے۔

مرسلہ: بشری زرین، کراچی

ماخوتی

اشیا: دودھ، ایک کلو۔ دال مونگ، دو سو گرام۔ کھویا، آدھا پاؤ۔ شکر، تین کپ۔ چھوٹی الائچی، تین سے چار عدد۔ پستہ، بارہ عدد۔ بادام بارہ عدد۔ کیوڑا، حسب پسند۔

ترکیب: مونگ کی دال کو نرم ابال کر تھوڑا سا پین کر باریک کر لیں۔ بادام اور پستہ باریک کتر لیں اور الائچی کے دانے بھی نکال لیں۔ سب سے پہلے دودھ کو ابال کر اس میں الائچی شامل کر لیں اور پھر دال بھی ڈال کر اسے 20 سے 25 منٹ تک ہلکی آئج پر پکائیں۔ جب گاڑھا پن محسوس ہونے لگے تو شکر بھی شامل کر دیں اور حرید پکاتے ہوئے کھویا بھی ڈال دیں اور جب یہ آمیزہ کھیر کی طرح گاڑھا ہو جائے تو چوڑھے سے اتار کر اس میں تھوڑا سا کیوڑا ڈال دیں اور پانچ منٹ تک ڈھکن بند کر کے رکھ دیں اور بعد میں بادام اور پستہ چھڑک کر فرنیج میں ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

مرسلہ: بشری کتول، حیدرآباد

کپ۔ لہسن، ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز، ایک عدد۔ (درمیانے سائز کی) کالی مرچ، پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ کاجی چیز، پچاس گرام۔ آئل، حسب ضرورت۔ اٹلی کا گودا، ایک چمچ۔

ترکیب: آئل گرم کر کے پیاز کو تل لیں۔ جب پیاز نرم ہو جائے تو اس میں اٹلی اور پسی ہوئی پالک ڈال کر اچھی طرح بھونیں پھر اس میں دودھ شامل کر کے پکائیں۔ گاڑھا ہو جائے تو آج ہلکی کر دیں، نمک اور کالی مرچ شامل کر لیں۔ اب کریم ڈال کر کس کر لیں پھر دہی کو چوڑھے پر سے اتار لیں۔ اب کڑا ہی میں تیل گرم کریں اور کاجی چیز کو چوکور ٹکڑے کر کے براؤن ہونے تک تلیں۔ جب براؤن ہو جائے تو اس کو ٹھنڈے پانی میں ڈال دیں تاکہ نرم ہو جائے۔ اب پانی سے نکال کر تیار پالک پر ڈال کر اوپر سے ہرا سویا شامل کر لیں۔ لیجی مزیدار پالک پھیر تیار ہے۔

مرسلہ: نگہت سلیم، کراچی

کھجور کی پڈنگ

اشیا: خشک کھجور، دو پیالی۔ آئج ایک کے ٹکڑے، دو پیالی۔ دودھ، چار پیالی۔ مکھن، ایک کھانے کا چمچ۔ انڈے، تین عدد۔ شکر، دو کھانے کے چمچ۔ کارن فلور، ایک کھانے کا چمچ۔ نوڈ سیرپ، (کسی بھی فلور میں) ڈیڑھ پیالی۔ دنیلا۔ سمنس، آدھا کھانے کا چمچ۔

ترکیب: رات بھر بھگی ہوئی کھجوروں سے مٹھلیاں نکال کر انہیں ٹکڑے کریں اور سمن کے سانچے میں رکھ دیں۔ ایک کے ٹکڑوں کو تین منٹ کے لیے دودھ میں بھگو دیں تاکہ نرم پڑ جائیں اور اسی دوران شکر، مکھن، دنیلا۔ سمنس اور انڈے ملا کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں اور اس میں دودھ میں بھیکے ہوئے ایک کے ٹکڑے شامل کر سانچے میں رکھے کھجوروں پر ڈال دیں۔ اب سانچا ڈھک دیں۔ ایک بڑے برتن میں پانی ابال کر اس میں بند کیا ہوا یہ سانچہ اس طرح رکھیں کہ وہ آدھا پانی میں ڈوبا ہوا ہو، اب اسے بیس منٹ تک بھاپ میں پکائیں اور پھر سانچہ نکال کر ٹھنڈا کر لیں اور کھول کر اندر موجود پڈنگ آہستہ سے کسی

اور پُرکشش ہو جاتا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے ملتان مٹی سے منہ دھولینا جلد کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس سے دن بھر کا گرد و خراب صاف ہو جاتا ہے۔ گلاب کے عرق میں ملتان مٹی بھگو کر رکھ دیں اور جب نرم پڑ جائے تو اس کا ماسک چہرے پر لگائیں۔ چہرہ نکھر جائے گا (بہتے میں دوبار کریں)

گلاب کا پھول

گلاب کی تازہ پتیوں کو ایک بائنی میں بھگو دیں۔ چند گھنٹوں کے بعد پانی کو چھان کر اس سے نہائیں تو جسم تازہ دم اور نکھرا نکھرا ہو جائے گا۔ گلاب کی تازہ پتیوں کو بار تک تیس کر چہرہ پر لگا کر آہستہ آہستہ مالش کریں اس سے جلد نکھر جاتی ہے۔ عرق گلاب بہترین موٹیو پمچراؤر بھی کہلاتا ہے۔ شدید دھوپ سے آکر عرق گلاب سے چہرہ دھونا چاہیے۔

لیمو

لیمو غذائی اہمیت کے علاوہ اپنی جمالیاتی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اس میں جیاتین اے، بی اور سی دوسرے پھلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ جن خواتین کے چہرے کی جلد بے حد چمکنی اور کھلے ہوئے مسام والی ہو ان کو چاہیے کہ چہرہ دھونے سے پہلے لیمن کلیننگ لوشن سے جلد صاف کریں۔ اس سے چہرے کی چمکانی ہٹ جائے گی اور جلد کے کھلے ہوئے مسام بند ہو جائیں گے۔

جن خواتین کی رنگت دھوپ میں نکلنے کے باعث سالونی ہونے لگے وہ صبح کے وقت آدھا لیمونیم گرم پانی کے ایک گلاس میں نچوڑ کر پیں اور رات کو سونے سے پہلے لیمو... چہرے پر ملیں۔ اس سے رنگت نکھرنے لگے گی۔

چہرے کے داغ دھبے دور کرنے کے لیے

لیمو... کے چھلکے دودھ میں پیس کر رات کو لگائیں۔ اس کے علاوہ بالائی میں لیموں کے رس کے چند قطرے ڈال کر لٹے سے یا دیسی سنگترے کے سوکھے ہوئے چھلکے پیس کر ایشن بنا کر لگانے سے بھی چہرے کے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔

پیاری بہنو! گزشتہ ماہ ہم نے آپ سب کی دلکشی اور رحمانی کے لیے آپ کے بی باور جی خانے سے چند اشیائے کران کے متعلق بتایا تھا تو اس مرتبہ بھی ہم سلسلہ وہیں سے جوڑ رہے ہیں..... تاکہ آپ بلاوجہ بازاری کریموں کے پیچھے پریشان نہ ہوں۔

گاجر

اس سبزی میں رنگ روپ میں نکھار پیدا کرنے کی خاصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ گاجر خون کو صاف کرنے اور جلد کو سرخی مائل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لہذا خواتین کو یہ سبزی بہت زیادہ خوراک کے طور پر استعمال کرنی چاہیے۔ گاجر کو اگر بھاپ یا پانی میں اہال کر استعمال کیا جائے تو جلد میں حیران کن حد تک دلکشی اور جاذب نظری پیدا ہو جاتی ہے۔ مٹی گاجر کا عرق بہت جلد اثر کرتا ہے۔ اس سے مساج بھی کریں۔

انڈا

انڈا بہت فائدہ مند ہے۔ اس کو پروٹین کا خزانہ کہا جاتا ہے۔ انڈے کی سفیدی میں شہد ملا کر لگانے سے جلد میں رونق آتی ہے۔ بالوں کو چمک دار بنانے اور دلکشی سے پاک کرنے کے لیے انڈا پھینٹ کر لگائیں اور آدھے گھنٹے بعد سردھولیں۔

شہد

شہد جلد کی بیماریوں، سوزش، جلن کے لیے بہترین ہے۔ یہ جلد میں مٹی کی مقدار کو برقرار رکھ کر اسے جھریوں، جھانپوں اور داغ دھبوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ عرق گلاب میں شہد ملا کر چہرے پر لگا کر مساج کریں۔ کم از کم بیس سے پچیس منٹ تک لگا رہنے دیں پھر بلکے ٹشٹھے پانی سے چہرے کو دھولیں، جلد نکھر جائے گی۔

ملتان مٹی

ملتان مٹی کیل، مہاسوں کے ساتھ، ساتھ چہرے کے داغ دھبے بھی صاف کر دیتی ہے۔ جس سے چہرہ چمک دار



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ حکیمہ ضیاء بخش..... کراچی

سوال: اگر ساس بھڑک جائے..... تو پھر کیا

کریں.....؟

جواب: محبت کی برکھائیں کراس پر چھا جاؤ۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ ناظمہ شاہین اعوان..... واہ کینٹ

سوال: شک کی دیوار کو آخر کیسے گرایا جائے؟

جواب: بھروسے کی کلھاڑی سے۔

دالیوں کو۔

☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ۔

سوال: یادوں کو اپنے چہرے پر سجانا ہوتا تو کیسے

سجاتے؟

جواب: ان کا جھومر بنا کر چہرے پر لگانے

پھرتے بلکہ بعض لوگ تو یہ جھومر کانوں اور گلے میں بھی پہنے ہوتے۔

☆ نازیہ نزی..... نوشہرہ کینٹ

سوال: تنہائی کی سیکواس بازی بھی اچھی لگتی

ہے..... مگر کب؟

جواب: جب اپنے آپ سے ہمدردی کرنے کو

دل چاہے۔

☆ شہلا نواز..... لاہور

سوال: اگر چڑچڑی سائیں نہ ہوتیں تو.....؟

جواب: بعض چڑچڑے شوہر بھی ظالم ساسوں کی

کی پوری کر دیتے ہیں۔

☆ صائمہ سجاد بخش..... کوہاٹ

سوال: بعض خواتین اتنی دہلی ہوتی ہیں..... جیسے

کسی نے ہینگر پر کپڑے لٹکا دیئے ہوں؟

جواب: اور وہ اپنے دہلے پن پر ناز کرتی ہیں اور

موٹی خواتین کا مذاق اڑاتی ہیں۔

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

سوال: میرے سعادت مند شوہر کو میری

سہیلیاں جو رو کا غلام کیوں کہتی ہیں؟

جواب: مارے حسد کے کہتی ہوں گی..... کہ

☆ حمنی قدیل..... کمالیہ

سوال: کس قسم کے نام دل کی ڈائری میں نشر ہوا

کرتے ہیں؟

جواب: جنہیں آپ سننا پسند کرتی ہیں۔

☆ فلک بیٹ عدیم..... حیدرآباد

سوال: عقل کے ناخن کس عمر تک نکل آتے ہیں؟

جواب: بعض لوگ تو ساری عمر ہوش کے ناخن

نہیں لیتے۔

☆ رفعت محمد یونس خادم..... ملتان

سوال: سلسلے محبتوں کے کبھی نہ ہوں گے

کم..... ایسے جملے کون بولا کرتا ہے؟

جواب: ہر سیاسی جماعت اپنی پریس کانفرنس

کے آخر میں اس قسم کے جملے بولا کرتی ہے۔

☆ صبانور..... لیہ

سوال: ساون میں بھی بھلا کوئی آگ لگا سکتا ہے؟

جواب: ہاں اکثر جب تقاریب میں خواتین ایک

سے بڑھ کر ایک کے تحت تیار ہو کر آتی ہیں..... تو ہر

موسم میں آگ لگ جایا کرتی ہے۔ ان سے جلنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



فرمانبردار اور حادثہ مندر شوہر تو قسمت والیوں کو ملا ہوں..... مگر اب تو وہ بھی ڈرامے ہی دکھتے ہیں۔

کرتے ہیں۔

☆ شاہینہ ناز..... راول پنڈی

سوال: برقعے میں لڑکیاں کتنی خوب صورت لگتی ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ہاں، واقعی لگتی ہیں..... مگر بعض میکس کی طرح چست برقع دیکھ کر لگتا ہے کہ انہیں اس پر ایک اور برقع پہننا چاہیے۔

☆ مسز روزینہ عابد..... کراچی

سوال: اگر لڑکیاں اپنے پرس میں چاقو اور چھریاں بھی رکھنے لگیں تو؟

جواب: اکثر خواتین سنڈے بازار سے شاپنگ کرتے ہوئے بہت سی چیزیں اپنے پرس میں ہی رکھا کرتی ہیں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

☆ ماہ رخ..... حیدرآباد

سوال: مینڈ کی کوز کام کب ہوتا ہے؟

جواب: جب وہ آنکس کریم زیادہ کھا لیتی ہے۔

☆ مسز واجد..... لاہور

سوال: اب دل توڑنے کی وارداتیں کیوں بڑھ گئی ہیں؟

جواب: ہم ان لوگوں پر بھروسہ کرنے لگے ہیں..... جن سے ہمیں گفتگو کرتے ہوئے بھی محتاط رہنا چاہیے۔

☆ سلیمی..... سیالکوٹ

سوال: وہ مجھے دیکھ کر راستہ کیوں بدل دیتے ہیں؟

جواب: تاکہ تم سمجھ جاؤ..... اور کسی بھی غلط چہن میں نہ رہو۔

☆ سدرہ کلثوم..... پشاور

سوال: شوہر بیوی کا غلام ہو تو اسے زن مرید کہتے ہیں اور بیوی اگر مرد کی غلام ہو تو.....؟

جواب: اسے نیک بیوی کہا جاتا ہے..... کہ شوہر کی مرضی کے بغیر آنکھ نہیں اٹھاتی۔

☆☆☆

☆ حلیمہ سعدیہ..... مدینہ آباد
سوال: بھری بہار میں امیدوں کے پھول اگر نہ کھلیں تو.....؟

جواب: صبر کر لیں۔

☆ سیدہ غزالہ عالم..... لاٹھی کراچی

سوال: یہ 2016ء سال گزر ہی گیا..... یہ کس کا سال تھا؟

جواب: یہ ہم سب کا ہی تھا..... سب نے اپنے اپنے رنگ اور ڈھنگ دکھائے۔

☆ کنول..... پنجاب

سوال: وہ مجھے اپنی آنکھوں کا خار ہی سمجھا کرتے ہیں، کیا کروں؟

جواب: اب تم ان کی آنکھوں کا موتیا (کیشرک) بن جاؤ۔

☆ عظمتی زہری..... اہستہ ٹر

سوال: آواز کی رفتار بتائیں؟

جواب: لڑائی جھگڑوں میں آواز کی رفتار..... روشنی کی رفتار کے برابر جاتی ہے۔

☆ نسreen بیگم..... کراچی

سوال: وہ کس کی ٹیگری کے شوہر ہوتے ہیں..... جو کہیں پر جاتے ہی اپنی بیوی کی تعریفیں کرنی شروع کر دیتے ہیں؟

جواب: عادی مجرم..... جن کے دل کا چور انہیں ڈراتا رہتا ہے کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے۔

☆ فریدہ یانوں..... پنجاب

سوال: دل خون کے آنسو کب روتا ہے؟

جواب: جب کلیجا جھلٹی اور جگر پارہ، پارہ ہوتا ہے۔

☆ ایسہ حامد..... کراچی

سوال: باجی آپ ٹی وی پر ڈرامے زیادہ شوق سے دیکھتی ہیں یا ٹاک شو؟

جواب: میں ٹاک شو زیادہ رغبت سے دیکھتی ہوں۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک

سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

نماز اوقابین

نفل نماز کم از کم دو رکعت پڑھی جاتی ہے اور یہ نفل مغرب کے بعد پڑھے جاتے ہیں۔

نماز اوقابین کے بارے میں صحابی عمار بن یاسرؓ نے کہا۔ میں نے رسول کو دیکھا کہ آپ مغرب کے بعد چھ رکعت پڑھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو یہ نماز پڑھے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے گناہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مغرب کے بعد 20 رکعتیں پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک محل تعمیر کروائے گا، نیز لکھا ہے کہ جنت کے ایک دروازے کا نام اواب ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے درخواست کرے گا کہ اے اللہ! جس نے میرے نام والی نماز پڑھی اس کو مجھ میں داخل فرما۔ اللہ تعالیٰ اس کی درخواست قبول کرے گا۔

ہر شہر سے حفاظت کا طریقہ

حضرت عبد اللہ ابن حنیبلہ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ ایک رات جب بارش ہو رہی تھی اور سخت امدھیرا تھا۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاش کرتے ہوئے نکلے۔ پس ہم نے آپ کو پایا۔ ہم سخت پریشانی کے عالم میں تھے۔

آپ نے فرمایا سورہ اخلاص، سورہ قلن اور سورہ ناس صبح شام تین مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ یہ تجھے ہر چیز کے لیے کافی ہو جائے گی۔

آپ سب اپنا یہ معمول بنالیں، یہ جو ہر نیا دن نئی نئی پریشانیوں لے کر آ رہا ہے۔ آپ کو مخلوق کے ہر شر سے نجات حاصل ہوگی۔ انشاء اللہ۔

امتحان میں آسانی ہو

آج کے طالب علموں کا یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ پڑھنے مابنامہ پاکیزہ نمبر 300 کو نمبر 2016

آسان آئیں، جنہیں وہ بہ آسانی حل کر سکیں اور انہیں اس میں فتح اور کامیابی حاصل ہو۔ امتحان کے دنوں میں پیچھے دینے سے پہلے سات مرتبہ گھر سے پڑھ کر جائیں۔ (پارہ نمبر 10..... سورہ انفال، آیت نمبر 62)

کند ذہن طالب علموں کے لیے

اگر طلبہ اور طالبات کند ذہن ہیں اور امتحان میں نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس نہیں ہو پاتے تو انہیں 121 مرتبہ پانی پر (پارہ نمبر 5۔ آیت 113، سورہ نساء) دم کر کے روزانہ پلائیں۔ انشاء اللہ اس کی برکت سے وہ عالم اور فاضل ہو جائیں گے۔

بخارا اتر جائے گا

بخارا کی تیزی ختم کرنے کے لیے یہ دعا پڑھ کر مریض پر دم کرویں۔ غصہ ضد کو ختم کرنے کے لیے بھی اس دعا کا استعمال مفید ہے۔ یہ پارہ نمبر 17 میں سورہ انبیاء کی آیت نمبر 69 ہے۔ **يُنَارُ كُونِي بَزْدًا وَسَلَامًا عَلٰى اٰبْرَاهِيْمَ**

ہر جائز کام کے لیے

اگر کسی شخص کا کوئی کام انکا ہوا ہو اس کے لیے اور اس کے علاوہ ہر جائز کام کے لیے اس دعا کو عقیدے کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے پڑھیں۔ یہ دعا فتح کے دروازے کھول دیتی ہے بے حد آزمودہ دعا ہے۔ **وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ** (پارہ نمبر 30 آیت 5 سورہ والنضیٰ)

بے قصور

اگر کوئی شخص کسی کے مکر و فریب میں پھنس گیا ہو اور وہ بے قصور ہو تو پارہ نمبر 12 کی سورہ یوسف کی آیت نمبر 34 کو کثرت سے پڑھے۔ وہ مکاری کے جال سے نکل آئے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم سب کو صبح شام سورہ بقرہ بھی ضرور پڑھنا چاہیے، چاہے چند

مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھ کر دم کر دیں اور بچوں کو بھی اشتعال میں نہ آنے دیں۔ کسی کی بات کسی کو نہ بتائیں۔ اگر بات بھی کریں تو تعریف کی ہو کہ تمہاری بہن تمہاری تعریف کر رہی تھی یا تمہارا بھائی تو ہمارے لیے بڑے اچھے خیالات رکھتا ہے۔ تم خواہ مخواہ اس سے لڑا کرتے ہو۔ یہ مائیں ہی ہوتی ہیں جو اپنے بچوں کو یکجا رکھنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اور وہ بھی مائیں ہوتی ہیں جن کی بے وقوفی کے طفیل گئے بہن، بھائی (عمر کے کسی بھی حصے میں) ایک دوسرے کی شکلوں سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ ان پر بھروسہ نہیں کیا کرتے۔ اس لیے کبھی اپنے بچوں کے معمولی سے بھی راز ایک دوسرے کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ بچوں کے سامنے ہمیشہ مثبت گفتگو کریں۔ لڑائی جھگڑوں کی باتیں..... خاندانی جھگڑوں کے قصے کبھی اپنے بچوں کے سامنے نہ دہرائیں۔

اولاد نرینہ ہو

جن کو اولاد نرینہ کی خواہش ہو بعد نماز عصر صرف ایک مرتبہ سورہ محمد پڑھا کریں بچے کے نام سے پہلے محمد ضرور لگائیں اور اسلامی نام رکھیں۔ پڑھنے کی مدت پہلے ماہ سے آٹھ ماہ تک کی ہے۔

حمل کی حفاظت کے لیے

روزانہ صبح شام چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھا کر اپنے اوپر دم کریں اور ایک مرتبہ سورہ محمد پڑھا کریں۔ گرم مسالاجات سے پرہیز کریں۔

بانجھ پن کو ختم کرنا

اس کے لیے آپ پیاز کا درمیانی سفید حصہ روزانہ نہار منہ سورہ فاتحہ میں بار دم کر کے کھائیں، تین ماہ میں امید پوری ہوگی۔

محرومی ختم ہونی

جو شخص اولاد سے محروم ہو وہ روزانہ 101 دفعہ سورہ کوثر بسم اللہ کے ساتھ پڑھے۔ انشاء اللہ اسے کامیابی ہوگی۔ مرد حضرات نہار منہ اچھی قسم کے تین چوہارے سات مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر تین ماہ تک کھائیں انشاء اللہ گرم ہوگا۔ ☆☆☆

صفحات ہی پڑھیں یا چند سطریں..... مگر پڑھیں ضرور۔

فتوحات کے دروازے

جو شخص سیدگی راہ سے بھگ گیا ہو..... یا بر سے کاموں میں پڑ گیا ہو۔ وہ روزانہ 101 مرتبہ پارہ نمبر 30 کی سورہ النزاعت کی آیت نمبر انیس پڑھ کر پانی پر دم کر کے پیں۔ وَأَهْدِيكَ إِلَى رَبِّكَ فَتَخْشَى

بچے بد زبان ہو جائیں تو

اب زیادہ تر گھرانوں کے والدین اس لیے پریشان رہتے ہیں کہ ان کے بچے نہ صرف ان سے جھگ آ میز لہجے میں بات کرتے ہیں بلکہ ان کا کہنا بھی نہیں مانتے ایسے بچے اپنی ہر بات صحیح اور دوسروں کی غلط سمجھا کرتے ہیں۔ غصہ ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتا ہے۔ گھر کا ماحول کشیدہ رہتا ہے۔ ایسے تمام بچوں کے بگاڑ کا سبب آپ خود ہی ہیں۔ جن کے والدین ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں یا ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتے یا جن کے گھروں میں اپنے بزرگوں کی عزت نہیں کی جاتی، ان کے اپنے بچے بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ وہ والدین جو بچوں کو ٹی وی اور انٹرنیٹ کے حوالے کر کے خود پرسکون رہتے ہیں ان کے بچے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایسے تمام بچوں کو سورہ فاتحہ کا دم شدہ پانی پلائیں اور جب وہ سو جائیں تو ان کی پیشانی پر تین مرتبہ سورہ فاتحہ کے ساتھ تین مرتبہ سورہ کوثر بھی دم کر دیں۔ عمل کی مدت تین ماہ ہے۔

بچے آپس میں لڑتے ہیں

اکثر گھرانوں کے بچے چھوٹے ہوں یا بڑے ان میں آپس میں اتنی لڑائیاں ہوتی ہیں جیسے وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔ میری فلاں چیز کیوں چھوٹی میری شرٹ کیوں بہن ٹی، میری بائیک کو کیوں ہاتھ لگایا..... میرے کمرے میں کیوں آئے، میری کرسی پر کیوں بیٹھے، میری بات میں کیوں بولے یا کوئی بھی معمولی بات جس کو وہ غیر معمولی بنانے میں ماہر ہوتے ہیں ان کی آپس کی لڑائیاں والدین کی زندگی کو عذاب بنا دیا کرتی ہیں۔ جب بچے گہری نیند سو جائیں تو ان کے سر ہانے سورہ خودی کی آیت نمبر 28 اول، د، آخر تین، تین



شوابعے ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیٹھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرنے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

پولیس اور سائنسائٹس

راحیلہ..... بہاول پور

میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں اور

ٹوکن

برائے شوابعے ہومیوکلینک

دسمبر 2016ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____

پتا: _____

ہومیوکلینک ضرور پڑھتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ دس سال سے الرجی ہے۔ پہلے پہل مجھے زکام لگا اور ناک بند ہو گئی۔ میں نے بہت علاج کروایا۔ ایکس رے بھی کروائے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ناک میں بائیں طرف کی ہڈی بڑی ہوئی ہے۔ میں نے آپریشن نہیں کروایا۔ لیکن ڈاکٹری، جیکسوں اور ہومیو علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ مجھے سردی گرمی زکام نزلہ رہتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں جو مجھے ریشہ نہ آیا ہو۔ اب جب الرجی کا دورہ ہوتا ہے تو ناک میں جلن ہوتی ہے۔ چھینکیں آتی ہیں۔ ناک فوراً بند ہو جاتی ہے۔ جلن اتنی زیادہ ہوتی ہے جیسے آگ لگی ہو یا مرچیں لگ جائیں۔ ریشہ اتنا ہوتا ہے کہ قطرے گرتے ہیں۔ صبح جب سو کر اٹھتی ہوں تو سر کے سائڈ اور پیچھے کی طرف درد ہوتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے سر میں ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔ سجدے میں جاتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ماتھا کھینچ رہا ہو۔ اور چکر آتے ہیں۔ ریشہ گلے میں گرتا ہے تو کھانسی ہونے لگتی ہے۔ لیکن کھانسی کچھ دن کے بعد ختم



میرے لیے کوئی اچھا نسخہ تجویز کریں۔

جواب: بی بی ہارمونز کی

خرابی کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ اپنے ماہانہ نظام کے متعلق بھی لکھیں، آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کا وزن کتنا ہے اور بازوؤں پر جو نشان پڑے وہ کب سے ہیں، کیسے ہیں۔ پہلے کے مقابلے اب ان کا سائز اور کلر وغیرہ کیا ہے۔

Oleumjec 30 ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی 5، 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ Graphites - 30 اور Pulsatilla 30 کے بھی 5، 5 قطرے ایک گھونٹ پانی دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد تفصیلی خط لکھ کر اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

خون کی کمی

روزینہ..... حیدرآباد

ڈاکٹر صاحب ایک ماہ کا مجھے حمل تھا جو کہ ضائع ہو گیا یعنی (ایارشن) اس بات کو تقریباً 12 سال ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد سے کمزوری بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ صبح اور دوپہر کو سونو کر اٹھتی ہوں تو طاقت نہیں ہوتی۔ آدھا گھنٹا پڑی رہتی ہوں پھر اٹھتی ہوں۔ اگر فوراً اٹھوں تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ میرے ہاتھوں کے ناخنوں پر لکیریں بھی ہیں۔ خون کی کمی بھی بہت زیادہ ہے۔

جواب: صحیح علاج کے لیے صحیح تشخیص ضروری ہے اور صحیح تشخیص کے لیے مرض کی علامات و کیفیات، معائنہ، متعلقہ رپورٹس کا ہونا ضروری ہے، الٹرا سائونڈ کی رپورٹس کا ذکر تو آپ نے کیا ہے لیکن وہ رکھنا بھول گئیں..... بہر حال ایک مادہ تک ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کر کے تازہ الٹرا سائونڈ اور کیفیات لکھ کر بھیجیں۔ Sabina 6

ماہنامہ پاکیزہ 303 نومبر 2016ء

ہو جاتا ہے۔

ریشہ بعض اوقات گھٹلیوں کی طرح منہ کے راستے نکلتا ہے۔ کبھی سبز اور کبھی سفید ہوتا ہے۔ لیکن ریشہ ختم نہیں ہوتا۔ اب تو ناک بھی زیادہ بند ہونے لگی ہے۔ میں نے ہر قسم کی گولیاں، ناک بند ہونے کے اسپرے، قطرے سب استعمال کر لیے ہیں لیکن آرام نہیں آیا۔ وزن بہت زیادہ ہو گیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے جو کہ موروثی ہے۔ تقریباً 160/95 تو رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں نے بڑی امید سے یہ خط لکھا ہے۔ میں اب دوایاں کھا کھا کر تھک گئی ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی ایسی دوائی دیں کہ میں بھی نارمل زندگی گزار سکوں۔

جواب: بی بی آپ کو کرائک سائٹو سائٹس اور پولیپس ہے۔ اس کے لیے دھول مٹی سے بچیں، ماسک کا استعمال کریں، نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر ناک میں اوپر چڑھائیں صبح اور شام، ساتھ میں ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Marum Varum 30 کے 5 قطرے 3 مرتبہ لیں، Viscum Pentarkan Ptk89 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ لیں۔ Cinabaris Pentarkan Ptk 31 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چوسیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔ چہل قدمی کی عادت ڈالیں، کھانے میں مرغی، نمک اور ٹھنڈی، کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔

چہرے پر بال

زریں..... فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب کچھ دنوں میں میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ ایک تو یہ ہے کہ میرے چہرے پر بال ہیں، تھریڈنگ کرا کر کے تنگ آگئی ہوں، دوسرا مسئلہ میرے بازوؤں پر نشان ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے یہ مسائل جلد از جلد حل ہو جائیں۔ برائے مہربانی



Carbo.veg 30 اور Stramonium 30

کے 5,5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ اور Passiflora Q کے 20 قطرے ایک گھونٹ پانی میں رات سونے سے ایک گھنٹا پہلے لیں۔

وزن کی زیادتی

عافیہ.....پتوکی

میرا وزن 115 کلو گرام ہے۔ میں ناشتے میں ایک کپ دہی، گیارہ بجے ایک کپ چائے، دوپہر میں کبھی ایک اور کبھی دو روٹیاں لیتی ہوں۔ رات میں بہت ہی کم، کبھی کبھی چکن پیس کھاتی ہوں (مہینے میں دو بار) فردٹ میں آم کا موسم ہو تو روزانہ 2 آم اور خربوزے یا تربوز کا موسم ہو تو 2 سے 3 قاشیں کھاتی ہوں اور بس۔ بیماری مجھے کوئی نہیں ہے الحمد للہ۔ ڈاکٹر صاحب میں بڑھتے وزن سے بے حد پریشان ہوں۔ فی سبیل اللہ میری رود کریں۔

جواب: اتنا وزن آپ کا کیسے ہو گیا؟ یہ نہیں لکھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد یا کوئی بیماری ہوئی؟ ورزش کیا کرتی ہیں؟ یہ خوراک جو آپ نے بتائی ہے کتنے عرصے سے لے رہی ہیں؟ کوئی ہارمونز کے ٹیسٹ وغیرہ کرائے یا نہیں؟ ان سب کی تفصیل بھیجیں۔ فی الحال 3 ماہ مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی استعمال کریں۔ Calc. Carb-200 ہفتے میں ایک مرتبہ لیں۔ یہ دوا لینے سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لینی۔ اس دوا کے ایک دن بعد Fucus ves-0 اور Phytolacca e baccis-0 کے 11-11 قطرے ایک گلاس پانی میں ڈال کر ہر کھانے سے پہلے لیں، دن میں 3 مرتبہ۔ کھانے میں تمام پھل اور سبزیاں لیں، اٹلی ہوئی بھی لے سکتی ہیں۔ چاول آلو بھی لے سکتی ہیں۔ آم اور کیلا کنٹرول کر کے کھائیں۔ سوپ بھی لیا کریں۔ چھل

قذی ایک گھنٹا ضرور کریں۔

کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ

ایک گھونٹ پانی میں لیں اور Thlaspi BursaQ,

Alfalfa Q دن میں 3 بار

5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں لیں۔

ڈپریشن

مائی اختراں.....راجن پور

عرض ہے کہ میرا بیٹا محمد علی عمر 26 سال غیر شادی شدہ، میٹرک پاس اور کوئی روزگار نہیں۔ ایک سال پہلے بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ روزگار نہ ہونے کی وجہ سے ٹینشن کا شکار ہے اور اب چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن لیتا ہے اس وجہ سے کافی ڈپریشن کا شکار ہے۔ کبھی روتا ہے اور کبھی ہنستا ہے، کبھی گالیاں بھی بکنے لگتا ہے۔ سر میں سخت درد ہوتا ہے، نیند بہت کم آتی ہے، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے کافی کمزور ہے، یادداشت بھی بری طرح سے متاثر ہوئی ہے۔ بچپن سے اسے شدید قبض رہتا ہے۔ ایلو پیتھی علاج کروا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میرا ایک ہی بیٹا ہے اور میں بیوہ ہوں۔ پائیزہ کی پرانی قاری ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ میرے بیٹے کا ٹھیک علاج تجویز کریں گے۔

جواب: آپ اور آپ کا بیٹا دو رکعت صلوٰۃ الحاجات پڑھ کر دعا کریں، صبح فجر کے بعد سورۃ یٰسین اور مغرب کے بعد سورۃ الواقعہ کی تلاوت کریں، نماز کی سختی سے پابندی کریں، ہر چیز کا مالک اللہ ہے اور کوئی کام اس کی رضا کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی بڑا کام کرنے کے بجائے کوئی چھوٹا موٹا کام کریں۔ گھر میں رہ کر جب کھائے پیے گا تو قبض تو ہوگا۔ بلڈ پریشر چیک کرائیں، ناک کا معائنہ کرائیں۔ کیا اس کو نزلہ ہوتا ہے؟ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات حسب ہدایات استعمال کریں۔ 15 دن کے بعد کیفیت سے مطلع کریں۔



نظر کی کمزوری

فاطمہ.....چونیاں

میرا مسئلہ نظر کی کمزوری کا ہے۔ اکثر سروروی کی شکایت رہتی تھی۔ مگر معمولی سروروی سمجھ کر کبھی پینا ڈول ٹیبلٹ لے لیتی تھی، مستقل سروروی ہونے پر ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ نظر کمزور ہو رہی ہے اور ڈیڑھ نمبر کا چشمہ تجویز کیا۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ ہر چند ماہ بعد چشمے کا نمبر بڑھتا رہا۔ اب یہ صورت حال ہے کہ نظر ساڑھے تین نمبر کے چشمے تک آگئی ہے۔ میرے لیے یہ بہت پریشانی کی بات ہے۔ سمجھ نہیں آتا ایسا کیا کیا جائے کہ تیزی سے گرتی ہوئی نظر ٹھہر جائے بلکہ ٹھیک ہونا شروع ہو جائے لیکن یہ ہے کہ میری خوراک بھی کافی کم ہے جس کی وجہ سے میں جسمانی طور پر قدرے کمزور ہوں۔ دوسرے مجھے نظر خراب ہونے کی سبب بھی بہت ہے اس وجہ سے اکثر رونے لگ جاتی ہوں۔ قبض کی شکایت بہت زیادہ رہتی ہے۔ آپ کوئی اچھی سی اور فوری اثر دکھانے والی دوا تجویز کر دیجئے جس سے نہ صرف نظر گرا ٹھہر جائے بلکہ بہتر ہونا شروع ہو جائے۔

جواب: آپ نے وزن اور قد نہیں لکھا جس سے ہم اندازہ کرتے کہ آپ کی نظر کتنی کمزور ہے؟ نظر کی کمزوری کی مندرجہ ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً آپ میں۔ (1) آنکھ کے پردے میں پیدا ہونے والی نقص۔ ماہر امراض چشم آنکھ کے معائنے کے بعد بتا سکتا ہے۔ اس میں مہل جوان ہونے تک نظر کمزور ہوتی رہتی ہے۔ (2) وٹامن A کی کمی، اس میں بھی رات کو اندھیرے میں نظر نہیں آتا۔ گاجر، سیب، چغندر، شلجم، بادام، آم اور دیگر موسم کے پھل یا قاعدگی کے ساتھ مناسب مقدار میں کھائیں۔ (3) پڑھنے کا طریقہ، سورج کی روشنی میں براہ راست نہ پڑھیں، لیٹ کر پڑھیں، پڑھتے ہوئے خیال کریں کہ کتاب کافی اور آنکھ کے درمیان ایک فٹ

کا فاصلہ ہو۔ روشنی اوپر سے کتاب کافی پر پڑے ڈائریکٹ آنکھوں پر نہ آئے۔ (4) ٹی وی اور کمپیوٹر کو مسلسل نہ دیکھیں۔ ٹی وی جتنے اونچے کا ہے اتنے فٹ کا فاصلہ رکھیں (کم از کم 12 فٹ) (5) سر پر کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟ (6) کوئی بیماری؟ (7) خون کی کمی کا ٹیسٹ ضرور کرائیں۔ (8) آنکھوں کی ورزش کرائیں۔ خصوصاً صبح سویرے سورج نکلنے وقت 2 سے 3 منٹ دیکھیں۔ بالکل صبح سویرے کی دھوپ 15 منٹ تک جسم کو لگائیں۔ ڈاکٹر ولہار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل میڈیسن 3 ماہ تک مسلسل استعمال کر کے حال بتائیں۔ Calc. Phystigma-30 اور phos-30 اور Calc flour-30 ہر شیشی میں سے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ صبح دوپہر اور شام استعمال کریں۔

منہ سے بدبو آنا

مسز شرجیل.....پاکپتن

میرے دو مسائل ہیں ان کے لیے دوائی تجویز کر دیں۔ مسئلہ نمبر 1: میرے بریسٹ کا سائز تارنل سے زیادہ ہے۔ ورکنگ woman ہوں اس لیے پریشان ہوں۔ پینز دوا تجویز فرمائیں تاکہ میری پریشانی دور ہو۔ مسئلہ نمبر 2: صبح اٹھنے پر اور زیادہ دیر منہ بند رہے یا کھایا چاند جائے تو منہ سے بدبو آنے لگتی ہے۔

جواب: اپنا قد اور وزن لکھیں۔ احتیاطاً UIS Breast کرائیں۔ ویسے عموماً ہارمونز کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے بریسٹ کا سائز کم ہو جاتا ہے یا بڑھ جاتا ہے جو قابل علاج ہے۔ آپ رات کو کھانے کے بعد برش کیا کریں اس کے بعد دھاگے یا خلال یا ڈنٹل فلاس سے دانتوں کے درمیان خالی جگہوں کو صاف بھی کیا کریں۔ دونوں مسائل کے لیے ڈاکٹر ولہار شوابے جرمنی کی ادویات استعمال کریں۔ Mercsol-30

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

خوبصورتی

رابعہ.....سرگودھا

میرا مسئلہ یہ ہے کہ 13 سال کی عمر میں ہی مجھے ماہانہ ایام آگئے اور اس وقت سے لے کر اب تک ان کی کوئی ترتیب نہیں۔ مجھے لیکوریا کی شکایت بھی ہے۔ پچھلے ایک سال سے میرے بال تیزی سے جڑوں سمیت نکل رہے ہیں۔ بال بے حد باریک، چھوٹے ہیں، سر میں خشکی، بال روکھے اور دمنہ کے ہیں۔ میرے جسم پر اکثر الرجی ہو جاتی ہے۔ خارش کر کر کے وہ جگہ سوچ جاتی ہے۔ وہ پھوڑ بن جاتے ہیں۔ ایک دو ماہ دوائی لی ہے۔ صافی بھی پی لیکن مسئلہ حل نہ ہوا۔ معدے میں بے حد جلن ہوتی ہے۔ پٹوں میں کھنچاؤ ہوتا ہے۔ درد بھی ہوتا ہے۔ ایک جگہ پر زیادہ دیر نہیں بیٹھا جاتا۔ پٹھے اکڑ جاتے ہیں۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے جس نے مجھے احساس کتری کا شکار بنا دیا ہے کہ میرے نسوانی حسن میں کمی ہے۔ میرے چہرے پر عرصہ چھ سال سے دانے اور کیل مہاسے ہیں۔ چہرے پر خارش بھی ہوتی ہے۔ اچکنی سوپ، ٹیوب ڈاکٹر نے دیں لیکن ایک ماہ استعمال کے دوران آرام رہا۔ پھر اسی طرح ہو گیا۔ میرے چہرے پر کوئی رونق نہیں ہے۔ مرجھایا ہوا ہے۔ چھٹے گال، سالولی رنگت، ہر وقت آنکھوں میں نیند اور چھٹکی چھٹکی رہتی ہوں۔ جب میں نے پاکیزہ میں آپ کے بارے میں پڑھا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے مجھے راستہ دکھایا ہے۔ مہربانی فرما کر میری رہنمائی کریں، شکر یہ۔

جواب: تمہاری اب تک صحیح تشخیص و علاج نہیں ہوا یا تم نے نہیں کیا۔ ذہنی آسودگی بہت سارے جسمانی افعال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ڈائریکٹ وان ڈائریکٹ دونوں طرح سے ذہنی آسودگی کے لیے صبر شکر اور قناعت کرو اور نماز اور قرآن پڑھ کر اپنے مسائل کے حل کے لیے دعا کیا کرو۔ متوازن خوراک دودھ، دہی، مکھن، پنیر، انڈے، گوشت (گائے بکرا و مرغی)، مچھلی، دالیں، سبزیاں اور پھلوں کو اپنی غذا میں شامل کرو۔ واک کیا کرو۔ ابتدا 5 منٹ، پھر ایک گھنٹا، آہستہ آہستہ بڑھاؤ۔ بچوں کو اپنے والدین سے اپنے مسائل ضرور شیئر کرنے چاہئیں۔ غذا ہلکی پھلکی سادہ لو۔ تلی ہوئی بھنی ہوئی اور تیز مرچ مصالحوں سے پرہیز کرو۔ کھانا خوب اچھی طرح چبا کر کھاؤ۔ جلدی جلدی نہ نکلے اور اس کے ساتھ پانی کا استعمال نہ کیا کرو۔ پانی ہمیشہ کھانے سے پہلے یا پھر 2 گھنٹے بعد چیا کریں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ کے استعمال کے بعد تمام حالات تفصیل سے بتائیں۔

Bismutum Pentarkan Ptk-16 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔

Magnsium phosphoricum Pentarkan Ptk-60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔

Ferrum Pentarkan Ptk-45 دو گولیاں دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔

Rhustoxicodendrom Pentarkan Ptk-73 اور Ptk-86 اور Ptk-86 اور Ptk-73 دونوں کے 10-10 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

☆☆☆



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شوا بے ایچ ایم ڈی ویلمار سوابہ جرمنی کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی

ماہنامہ پاکیزہ 305 نومبر 2016ء

